فہرست مضامین معارف

جلد ۱۳۴

ماہ جولائی ۱۹۸۴ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضمون نگاران معارف

جلد ۱۳۴

ماہ جولائی ۱۹۸۴ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جولائی سنہ ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد (فون [illegible])

مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ

۳۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک میں کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:- ۸ روپے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:- ۱۰ روپے،

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

......ہ،، مرتبہ ،،ہ......

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۳۴ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۵ء عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

اب سے تقریباً ۲۵ سال پہلے استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے تاریخ ہند کی تدوین کا ایک جامع خاکہ پیش کیا تھا، جس کی تکمیل کے سلسلہ میں ملک کے ممتاز مورخوں سے تعاون کے بھی خواہاں ہوئے تھے۔

ان کا تعاون تو حاصل نہ ہو سکا، مگر دار المصنفین کے اندر یہ کام جاری رہا، الحمد للہ کہ اس وقت تک اس کی ۱۵ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، امید کہ آیندہ یہ ملک کی قومی اور جذباتی یکجہتی میں مفید ثابت ہوں گی، بشرطیکہ ان کا مطالعہ سیاسی زاویۂ نگاہ کے بجائے خالص تاریخی پس منظر میں کیا جائے، ادھر حال ہی میں اس سلسلہ کی تین جلدیں "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری" کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں، اسلام میں مذہبی رواداری کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان کو بھی جاننے کی ضرورت تھی، اس لئے "اسلام میں مذہبی رواداری" کے عنوان سے ایک علٰحدہ جلد مرتب کی گئی ہے، اس میں قرآن مجید اور احادیث میں جو تعلیمات ہیں، ان کو واضح کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکومت کے زمانے میں عیسائیوں کو جو خصوصی مراعات دیں، ان کی تفصیل بتائی گئی ہے۔

جب پورا جزیرۃ العرب فتح ہو گیا تو آپ نے نجران کے عیسائیوں کو یہ حقوق دیئے کہ ان کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کے سفراء، ان کی مورتیں اللہ کی امان اور اس کے رسولؐ کی حفاظت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں تغیر نہ کیا جائے گا، ان کی مورتیں بگاڑی جائیں گی، ان کا کوئی اسقف، کوئی راہب، کنیسہ کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے ہٹایا نہ جائیگا، زمانۂ جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت نہ لی جائے گی، اور ان سے عشر

لیا جائے گا اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی، ان میں سے جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا، اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ (فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ مصر ص ۶۷)

غیر مسلموں کے ساتھ اسلامی حکومت کا یہ رویّہ اصول بن گیا، اسی پر خلفائے راشدین کا عمل رہا، اور بعض مسلمان حکمرانوں نے اس کی پابندی نہیں کی، اس نے اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی کی، اور وہ مسلمانوں کی نظروں میں مجرم رہا، مگر زیادہ تر مسلمان حکمراں اسی کے پابند رہے۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی پہلی جلد میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری کا یہ بین ثبوت ہے کہ ان کے عہد میں نظامِ اراضی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی، اس لئے گاؤں میں ان کی زندگی ویسی ہی رہی جیسی کہ پہلے تھی، تجارت بنیوں کے ہاتھوں میں رہی، اس لئے اس زمانہ میں بنیے سوسائٹی کے ضروری اجزا اسی طرح رہے جس طرح آج کل ہیں، عام ہندوؤں کے پرسنل لا میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی گئی، ان کے مذہبی اور معاشرتی رسم و رواج ویسے ہی باقی رہے، بعض سلاطین اپنی زندگی میں بہت زیادہ مذہبی رہے لیکن ان کے مذہبی عقائد ملک کے نظم و نسق میں حائل نہیں ہوئے، ان کی عدل پروری کا کوئی مذہبی تفریق نہیں ہوئی۔

محمود غزنوی کی بت شکنی بہت مشتہر کی جاتی ہے، مگر اسی کی معیت میں البیرونی نے ہندوستانی ہندو مذہب کو جس طرح سمجھا ہے، اس کی طرف توجہ کم کی جاتی ہے، اس نے اپنی کتاب الہند لکھ کر مسلمانوں کو یہ دعوت دی کہ وہ ہندو مذہب کو اچھی طرح سمجھیں، پھر صوفیائے کرام کی تعلیم و تلقین سے امیر خسرو ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے ہندو مذہب کو اسلام کے علاوہ دنیا کے اور تمام مذاہب سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی اور ہندوؤں کی بت پرستی میں جو نکتہ ہے وہ اس سے اپنے ہم مذہبوں کو سبق لینے کی تلقین کی۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی دوسری جلد میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بابر اپنے جانشینوں کے لئے یہ پیام چھوڑ گیا تھا کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹا کر ہر مذہب کے طریقے کے مطابق

اس [illegible] سے تمام ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کر سکے گا، اس مصلحت سے وہ صداقت کی قدر

کرے۔ اکبر نے اسی پر عمل کیا۔ اس نے ہندوؤں کی تسخیر کے لئے اپنے مذہب کو چھوڑ کر ایک نیا مذہب قائم کیا، لیکن

تبلیغ میں ناکام رہا۔ مگر بقول کے۔ ایم۔ پنیکر اس نے اپنے جانشینوں کے لئے اپنی حکمت عملی کے سلسلہ میں تین باتیں

چھوڑیں (۱) ریاست قومی بنی رہے (۲) ہندوؤں سے میل ملاپ رہے (۳) پورے ہندوستان کو متحد

کیا جائے، جہانگیر اور شاہ جہاں کا عمل ان ہی باتوں پر رہا۔ کے۔ ایم۔ پنیکر نے اعتراف کیا ہے کہ شاہ جہاں

کے عہد تک مغلوں کی حکومت قومی بادشاہت تھی۔

اورنگ زیب متنازعہ فیہ بن گیا ہے، مسلمان اس کو بہت اچھا سمجھتے ہیں تو ہندو اس کو بہت برا تصور کرتے

ہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تیسری جلد میں بڑی وضاحت سے اس پر مفصل بحث کی گئی

ہے، جو ہندو مورخین اورنگ زیب کو بہت برا سمجھتے ہیں، ان کے امام جدوناتھ سرکار ہیں، جنھوں نے اس کو بدترین

حکمران ثابت کرنے میں پانچ جلدیں لکھی ہیں، مگر ان کی تحریروں کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو ان میں اتنا تضاد نظر

آئے گا کہ وہ جو کچھ پورے زور سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، اسی زور سے دوسری جگہ اس کی تردید بھی کر دیتے ہیں۔

انھوں نے اورنگ زیب اور شیواجی کی لڑائی کو ہندو مت اور فادر لینڈ کی جنگ کا رنگ دینے کی

کوشش کی ہے، مگر ان کا خود بیان ہے کہ شیواجی کے داماد اچلاجی، ان کے باپ، اس کے چچا کا لڑکا مادھوجی نرائن اپنے پورے

خاندان کے ساتھ اورنگ زیب کے طرفدار رہے، پھر انھوں نے ان مرہٹہ سرداروں کی ایک لمبی فہرست دی

ہے جو اورنگ زیب کے وفادار بن کر اس کے دربار کے معزز منصبدار بنے رہے، اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ جدوناتھ سرکار

نے جس کو فادر لینڈ کی جنگ کہا ہے، وہ دراصل ذاتی مفاد کی جنگ تھی۔

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی ایذا رسانی کی وجہ سے راجپوت مغلوں کے تخت و تاج

سے ایسے برگشتہ ہوئے کہ وہ ان سے پھر قریب تر نہیں ہوئے، مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب اورنگ زیب

نے ملک میں امن و امان قائم کر لیا، اور اس کے فتح و تسخیر کے لئے خاص علاقے نہیں رہ گئے تو ان حالات

میں راجپوتوں کو فوج میں کوئی ملازمت نہیں ملنے لگی کیونکہ جنگ ہی ان کا پیشہ تھا۔ ان حالات میں ان کے گھرانوں کے حوصلہ مند افراد اپنے ہی رشتہ داروں اور اپنے ہی گھروں کو لوٹنے لگے یا پھر ڈکیتی کرنے پر آمادہ ہوگئے یا پھر اورنگ زیب سے جاگیر پانے کی خاطر اپنا مذہب چھوڑنے لگے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۵۵-۳۵۴) اپنی فال آف دی مغل امپائر کی چار جلدوں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مرہٹوں اور راجپوتوں کی باہمی خوں ریزی، غارت گری اور سفاکی کی ہولناک تصویریں کھینچی ہیں، ان کو پڑھ کر موجودہ دور کے مرہٹوں اور راجپوتوں کی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہونگی، یہ مرقع آرائی اس لئے کی گئی ہے تاکہ انگریزوں کی حکومت رحمت الٰہی سمجھی جائے، انھوں نے بہت خوش ہو کر لکھا ہے کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت مصیبت زدہ راجپوتوں کے زخموں پر پھایا بن گئی، مگر ان کو اس کا بھی دکھ ہے کہ راجپوتوں کی مردانگی مغلوں کی حکومت کے زوال کے بعد افیون کھا کر گہری نیند سو گئی، اور ان کی نسل نے انگلستان کی مشرق کی فتح میں ایک فوجی سپاہی بن کے مدد دینے کی (فال آف دی مغل امپائر ج ۲ ص ۳۰۸)

ایسے متضاد بیانات سے ان کی پانچوں جلدیں پر ہیں، ان کو اورنگ زیب پر بت شکنی اور مندروں کی بے حرمتی کے الزام رکھنے میں بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے، مگر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی تیسری جلد میں اورنگ زیب کے جو متعدد فرامین، دستاویزوں اور پروانوں کے متن پیش کئے گئے ہیں، ان سے اس الزام کی پوری تردید ہو جاتی ہے، یہ فرامین اور پروانے خود ہندوؤں کے پیش کئے ہوئے ہیں، اورنگ زیب نے بعض مندروں کے خلاف تشدد آمیز کارروائیاں ضرور کیں، لیکن ان کی نوعیت اسی طرح کی تھی جس طرح کہ ہماری موجودہ حکومت نے امرت سر کے سورن مندر کے خلاف کی ہے،

جدو ناتھ سرکار اس لحاظ سے بھی قابل شکایت ہیں کہ اورنگ زیب پر حملہ کرنے میں اسلام پر بھی حملہ آور ہو گئے ہیں، پہلا ایک باب اسلام کی مذمت میں لکھا ہے، جس میں ایک جگہ لکھتے ہیں،

مسلمانوں کا ایک خاص ذہن ہوگیا ہے، جس کی بنا پر وہ لوٹ مار اور قتل کو خاص مذہبی فعل سمجھنے کے عادی ہوگئے ہیں، ایک مذہب جو اپنے پیرؤں کو لوٹ مار اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرے، وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دیسکتا"

(ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۳ ص ۲۸۳-۲۸۴)

انھوں نے انگریزوں کی حکومت میں ایسی تحریریں ان کو خوش کرنے کے لئے لکھیں اور شاید اسی کے صلہ میں ان کو سر کا خطاب بھی ملا، مگر ان کو ایسی اشتعال انگیز تحریریں لکھتے وقت یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ جب ہندوستان میں قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی تحریکیں چلیں گی تو ایسی تحریریں کتنی مضر ثابت ہوں گی، اور واقعتہً ہوئیں۔

جدو ناتھ سرکار نے جا بجا اس کا اظہار کیا ہے کہ اورنگ زیب بلکہ مسلمانوں کی ریاست و حکومت کے مذہبی تخیل کی وجہ سے ہندوستانی قومیت کا بننا نا ممکن ہوگیا، لیکن اپنے اس غلط قسم کے موقف کی تائید میں شروع سے آخر تک جو طنز آمیز، زہرناک اور دل آزار تحریریں لکھی ہیں، کیا ہندوستان کی متحدہ قومیت کے بنانے میں معاون ہو سکتی ہیں، ان ہی کی مورخانہ تحقیقات کی ہنوائی اب تک کی جاری ہے۔

اورنگ زیب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو سب سے پہلے اپنے زمانہ میں جغرافیائی وحدت عطا کی، جدو ناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اتنی بڑی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی جتنی کہ اورنگ زیب کے عہد میں ہوئی غزنین سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک ہندوستان کا برصغیر ایک ہی حکم کا تابع ہوگیا، لداخ اور ملابار میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا، صوبہ کا کوئی گورنر خراج نہیں روک سکتا تھا، اور نہ اس کی حدود میں عمل کرتا، یہاں وہاں کچھ بغاوتیں ہو جاتیں لیکن کسی کی ہمت علیحدہ حکومت قائم کرنے کی نہ ہوتی (ج ۱ ص ۱۲) یہ اس حکمراں کی تصویر ہے جس کو بدترین ثابت کیا گیا ہے، اورنگ زیب نے ملک میں سالمیت پیدا کرنے کی خاطر راجپوتوں، مرہٹوں، بندیلوں، اور پھر گولکنڈہ اور بیجاپور کے

خلاف اسی طرح فوج کشی کی جس طرح گذشتہ ۳۰ سال کے اندر ہماری قومی حکومت نے حیدر آباد، کشمیر گوآ، آسام اور سکھوں کے خلاف پنجاب میں کی، ہماری حکومت ایسی محاذ آرائی میں بالکل حق بجانب رہی، تو پھر اورنگ زیب کی معرکہ آرائیاں کیوں نہ حق بجانب سمجھی جائیں، کے ام۔ پنیکر نے بڑی فراخدلی سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے کی ساری لڑائیاں ہندوستان کو متحد کرنے کی کوشش ہی میں لڑی گئیں۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ مرہٹوں، راجپوتوں اور سکھوں سے ضرور لڑے، مگر ان کی لڑائی میدان جنگ یا قلعوں کے محاصروں تک محدود رہی، کبھی ہندو مسلمان سڑکوں پر نہیں لڑے، ان کی ساڑھے چھ سو برس کی حکومت میں ایسی خونریزی اور غارت گری کی مثالیں نہیں ملتی ہیں جو گذشتہ ۳۰ سال کے اندر جمشید پور، راوڑکیلا، جبل پور، بڑودہ، مراد آباد، میرٹھ، آسام بمبئی اور بھیونڈی میں دیکھنے میں آئیں، خود حکومت کے ایک اعلان میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک چار ہزار دو سو اڑسٹھ ہندو مسلم بلوے ہوئے، گذشتہ کی تعداد چار سو چوہتر تھی، یعنی ایک سال میں فساد کا اوسط روزانہ ایک سے بھی زیادہ رہا، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے طویل دور میں صرف فرخ سیر کے عہد میں احمد آباد میں ہولی کے موقع پر ہندو مسلمان کا ایک جھگڑا ہوا جو سختی سے دبا دیا گیا۔ (سیر المتاخرین جلد دوم ص ۳۹۰)

مسلمانوں کی حکومت کے زمانے کے جزیہ کے ٹیکس کی بڑی مذمت کی جاتی ہے، لیکن اس کی نوعیت کو کھلے ذہن سے سمجھا جائے تو یہ غیر مسلموں کے لئے نعمت سمجھی جائے گی، اس ٹیکس کے ادا کرنے کے بعد غیر مسلم کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی جائداد، ان کی عبادت گاہیں، ان کے مذہبی پیشوا، ان کے مذہبی تہوار، ان کے کلچر اور معاشرتی رسم و رواج، اور ان کے پرسنل لا وغیرہ سب محفوظ ہو جاتے ہیں، ان کی پوری حفاظت کی ذمہ داری مسلمان حکمران اور عوام پر ہو جاتی ہے، اس فرض کی کوتاہی پر مسلمان حکمران اور عوام دونوں قابل مواخذہ

جاتے ہیں، [illegible] حکومت ہندوستان [illegible]
ضامن بن جائے کہ وہ مسلمانوں کو اپنی پناہ میں لے کر [illegible] کی طرف ان کی جانوں کی ہوش ربا خونریزی
اور ان کی انتہائی بھیانک غارت گری سے چھوٹ گئے تو مسلمان خوشی سے اس جزیہ کی بڑی سے بڑی رقم دینے
کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

اوپر کے۔ ام۔ پنیکر کے اس خیال کا ذکر آیا ہے کہ شاہجہاں کے عہد تک بادشاہت قومی بادشاہت تھی، مگر جدوناتھ سرکار نے پورے مغل امپائر کو قزاقی (Brigandage) قرار دیا ہے، اور لکھتے ہیں کہ جن مورخوں کی آنکھیں تخت طاؤس اور تاج محل یا اسی طرح کی دوسری چیزوں کی ظاہری چمک دمک دیکھ کر خیرہ نہیں ہوتی ہیں، ان کو مغلوں کا امپائر ایک قزاقی معلوم ہوگا، جس پر ایک مہین پردہ پڑا رہا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست اور یہاں کے لوگوں نے انگلستان کی حکومت کو آسانی سے قبول کر لیا (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۱ ص ۲۵۱)

اس تحریر سے جدوناتھ سرکار کے زمانے کی برطانوی حکومت تو ضرور خوش ہو گئی ہوگی، مگر اس قسم کے اشتعال انگیز بیانات کی چبھن سے ملک کے اندر جو سیاست بنی اس کا اندازہ جدوناتھ سرکار کو بھی ہوا ہوگا، اب بھی ایسے زہریلے بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں، جن کی ضرر رسانی برابر دیکھنے میں آ رہی ہے، اب جب ہماری حکومت قومی بن گئی ہے، اس کے ساتھ یہاں کے لوگوں کو بھی سوچنا ہے کہ حکومت قانون، دستور، اکثریت کی مرضی، اور فوج کے ذریعہ سے ضرور چل سکتی ہے مگر ہر دل عزیز حکومت کا اصل منشا دلوں کی تسخیر پر ہوتا ہے، جو نیت کی طہارت اور بے غرضی کے ساتھ عمل کی رواداری، فراخدلی، اور نیک نفسی سے حاصل ہوتی ہے، عداوت و مخالفت کے خارستان کو مہر و محبت کا سرسبز اور شاداب چمن بنانے کی خاطر خود بینی، خود نمائی اور خود سرائی کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

مقالات

مستشرقین اور مطالعۂ سیرتؐ

از
ڈاکٹر نثار احمد صدیقی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی

(۲)

یہاں زیر بحث دور کے کچھ مشاہیر مستشرقین کا مختصر تعارف کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے،

(۱) جان جاک سیدیلو (Sedillot.J.J) مشہور فرانسیسی مستشرق جس کا زمانہ (۱۷۷۷ تا ۱۸۳۲) تھا، متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں ایک تاریخ عرب بھی ہے،

(۲) دیورجے (Desvergers,A.N.) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۰۵ تا ۱۸۶۷) اس کے آثار میں متعدد تصانیف شامل ہیں، تاریخ ابوالفداء سے سیرۃ النبیؐ کا خلاصہ متن و ترجمہ کے ساتھ ۱۸۳۷ء میں شائع کیا، بلاد عرب پر کئی مجلدات بشمول تاریخ خلافت، عہد مغلیہ تک، مطبوعہ ۱۸۴۷ء (۳) ڈاکٹر پیرون (Perron,A) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۰۸ تا ۱۸۷۶) مصنف کتاب نساء العرب قبل الاسلام و بعدہ مطبوعہ ۱۸۵۸ء نیز ترجمہ کتاب الطب النبوی، از جلال الدین ابی سلیمان داؤد، مطبوعہ ۱۸۶۰ء (۴)

۴، گارسن دی تاسی (Tassy Garcin DE) فرانسیسی مستشرق زمانہ ۱۷۹۴ء تا ۱۸۷۸ء
احب تصانیف دین اسلام، قرآن، مذہبی تعلیمات، فرائض وغیرہ (۵)، جوزف وہائٹ،
J White) انگریز مستشرق، زمانہ (۱۷۴۶ تا ۱۸۱۴ء) اسلام اور نصرانیت کے تقابلی
طالعہ پر مشتمل مقالات و محاضرات، اسلام اور پیغمبر اسلام پر خطبات (۶)، ولیم رائٹ (Wri
ght, W) برطانوی مستشرق اور مصنف، زمانہ (۱۸۳۰ تا ۱۸۸۹) (۷)، ایڈورڈ ہنری پامر
Palmer, E.H.) برطانوی مستشرق اور مشہور مترجم قرآن، ترجمہ قرآن مطبوعہ آکسفورڈ
۱۸۸۰ء، زمانہ (۱۸۴۰ تا ۱۸۸۲ء) (۸)، ڈی جونگ (Jong, de) ہالینڈ کا مستشرق
مانہ ۱۸۳۲ء تا ۱۸۹۰ء، دوسرے ہم وطن مستشرق ڈی جوجے (Goeje, M.J. DE)
کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام پر کام کیا، متن اور لاطینی میں ترجمہ لیڈن سے ۱۸۸۱ء میں
شائع کرایا (۹) ڈی جوجے، ہالینڈ کا مستشرق، زمانہ (۱۸۳۶ء ۱۹۰۹ء) کثیر التصانیف،
وفیات الاعیان از ابن خلکان پر کام کیا اور اپنے ہم وطن مستشرق ڈی جونگ کے ساتھ مل کر سیرت
ابن ہشام کے متن و ترجمہ کی اشاعت کی (۱۰)، فلائشر (Fleischer H.L.) جرمن
مستشرق تھا، زمانہ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۸۸ء) متعدد کتابیں لکھیں، تاریخ ابی الفداء کو متن و ترجمہ کے ساتھ
اور تعلیقات و حواشی سے آراستہ کر کے لیپزگ سے ۱۸۳۱ء میں شائع کرایا۔ ایک اور کتاب
تاریخ عرب قبل اسلام پر لکھی جو لیپزگ سے اسی سنہ میں چھپی (۱۱)، وسٹنفیلڈ (Wusten
Feld, F) جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۰۸ء ۱۸۹۹ء) زود قلم مصنف تاریخ مکۃ
المکرمہ، سیرت ابن ہشام مع تعلیقات و حواشی (تین جلدیں) اراضی مدینہ منورہ اور تاریخ شرف کہ
دیگر کتابیں اسکی یادگار ہیں (۲)، بیریزین (Berezine, N) مشہور روسی مستشرق (۱۸۱۸ء ۱۸۹۶ء)
گویا روسی مستشرقین کے زمرۂ اساتذہ میں شامل متعدد تصانیف، مصادر اسلامی تہذیب و تمدن

اور اسلام کے درمیان تعلق پر کتابیں، روسی دائرۃ المعارف میں مشرق اور مشرقی علوم و آداب پر متعدد مقالات اسی مستشرق کے قلم سے ہیں (۱۳) بلانکو (White Joseph Blanco) مشہور مستشرق، برطانوی مذہبی مصنف (۱۷۷۵ء۔۱۸۴۱ء) مستند پادری، خاص کام کا میدان، اندلس کی تاریخ تھا (۱۴) ایڈورڈ سخاؤ، مشہور و معروف جرمن مستشرق، برلن میں مشرقی زبانوں کے کلیہ کا سربراہ، خود بڑا اسکالر اور زبان داں تھا، بقول مولانا شبلیؒ، پروفیسر سخاؤ کی ہی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط، سیرت نبویؐ میں کوئی تالیف نہیں شائع ہوئی (۱۵) سلیم نوفل، روسی استشراق کی تاریخ میں اہم نام، استادوں کا استاد، سرخیل مستشرقین روس میں سے ایک تھا، زمانہ (۱۸۲۸ء ۔ ۱۹۰۲ء) تو وطن لبنان، کام فرانسیسی میں کیا، سیرۃ نبویؐ اور اسلام تعلیمات پر تصانیف (۱۶) فان کریمر (Voncremer) آسٹریا کا مشہور مستشرق، ولادت ویانا میں ہوئی تعلیم بھی وہیں پائی، ترقی کرکے وزارت کے درجہ تک پہونچا اور وفات تک، وزارت خارجہ اور دوسری وزارتوں میں خدمات انجام دیتا رہا، اسلامی مصادر کی تقریباً بیس عربی کتابوں کو تلاش کرکے شائع کیا، ان میں سے واقدی کی المغازی، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، نشوان کا قصیدہ الحمیریہ وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس نے اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارہ میں کثرت سے کتابیں لکھیں، جو جرمن زبان میں ہیں (۱۷) سر ولیم میور، مشہور انگریز مستشرق، اس کا تفصیلی تعارف مقالہ کے ابتدائی صفحات میں آچکا ہے، (۱۸) مینارڈ (Meynord.B.DE) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۲۷ء ۔ ۱۹۰۸ء) اس نے استشراق پر پہلا رسالہ لکھا اور شائع کر دیا جغرافی تاریخی، ادبی لغت مرتب کی، مسعودی کی مروج الذہب کا متن و ترجمہ شائع کیا (۱۹) رینی باسے (Basset, Rene) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۵۵ء ۔ ۱۹۲۴ء) بے شمار کتابوں

مصنف طبقات الشعراء العربي قبل الاسلام مطبوعہ سنہ ۱۹۱۰ء بوصیری کا قصیدہ بردہ، فقہ شرعیات ترجمہ
مصنف وغیرہ وغیرہ (۲۰) ڈاکٹر لیبان (Lebon, D.G.) فرانسیسی مستشرق شہرۂ عالم طبیب
اور تمدن و حضارت مشرق کا جاننے والا مورخ تھا، سنہ ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوا، متعدد ضخیم کتابیں لکھیں،
تمدن مصر و تمدن عرب اور اندلس میں عربی تمدن پر کام قابل ذکر ہے، اس کا شمار ان معتدل مستشرقین میں
ہوتا ہے، جو انصاف پسند تھے، اور اسلامی خوبیوں کے قائل تھے (۲۱) گولڈزیہر ہنگری کا مشہور
و معروف مستشرق (۱۸۵۰ء، ۱۹۲۱ء) کثیر التصانیف شخص تھا، قرآن، تفسیر، حدیث، سیرت پر
بے شمار دراسات شائع کیے، گولڈزیہر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نولدکی کے نقد حدیث سے آگے
بڑھ کر انکار حدیث میں اس کا ہم نوا بن گیا، انکار حدیث کے بعد گولڈزیہر نے سیرت کے دوسرے
مصادر کو بھی نشانہ بنایا (۲۲) ولہاوزن، جرمن مستشرق (۱۸۴۴ء، ۱۹۱۸ء) بہت سی تصانیف
یادگار چھوڑیں، مختلف موضوعات پر لکھا، تاریخ یہود، محمد مدینہ میں، تدوین اسلام کے مطالعات،
عہد نبوی میں دستور مدینہ، مکاتیب نبوی اور وفود، منقول از ابن سعد مع متن و ترجمہ، وہ پروٹسٹنٹ
تھیولوجین اور بائبل پر عبور رکھتا تھا (۲۳) واشنگٹن ارونگ، معروف امریکی اسکالر اور مستشرق
(۱۸۸۳ء، ۱۸۵۹ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، خصوصاً سیرت محمدؐ اور خلفاء پر
دو جلدیں جو سنہ ۱۸۴۹-۵۰ء میں شائع ہوئیں، اس کی کتاب حیاۃ محمدؐ کا ترجمہ عربی میں شائع ہوا،
(۲۴) یوجین یونج (Eugen -younge) فرانسیسی مستشرق، متعدد کتابوں کا مصنف،
ایک ضخیم رسالہ نور اسلام کی خاص کرن، دوسرا مشرق جس طرح اسے مغرب نے دیکھا،
سیرۃ نبویؐ بزبان فرانسیسی وغیرہ وغیرہ، انتقال سنہ ۱۹۲۰ء میں ہوا۔

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ، قرون وسطی کا ذہن و دماغ
بھی بدلتا چلا گیا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اگرچہ ان کے عزائم، اور مقاصد میں

فرق نہیں آیا، تاہم دین اسلام اور سیرت رسول کے بارہ میں مستشرقین کا رویہ اور رسلوٹ یکساں نہیں رہا، اور جیسے جیسے عہد جدید کی منزل قریب آتی گئی مجموعی طور پر ان کے ظاہری رویہ میں معقولیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا، اور وہ خود یہ محسوس کرنے لگے کہ تعصب اور تشدد کی انتہا پسندی، خود ان کے لیے اور ان کی تحریک کے لیے ضرر رساں ہو گی، بہر حال اب ہم اگلے دور میں قدم رکھتے ہیں۔

عہد جدید | پچھلا دور جو بیسویں صدی کے ربع اوّل میں اختتام کو پہونچا، جیسا کہ ظاہر ہوا، تحریک استشراق کا نقطۂ کمال ثابت ہوا، اور ہر اعتبار سے استشراقی سرگرمیوں نے فروغ پایا، اب وہ دور جسے ہم عہد جدید سے تعبیر کر سکتے ہیں، بیسویں صدی کے ربع اول سے شروع ہوا اور تاحال جاری و ساری ہے۔

عہد جدید آیا تو اپنے جلو میں نت نئے رجحانات لے کر آیا اور سیاسی، عسکری، اور معاشی و سماجی سطح پر پچھلی بہت سی باتوں کو زیر و زبر کر گیا، چنانچہ عالمی جنگیں اور اس کے نتیجہ میں مشرقی و مغربی معاشروں پر ہمہ گیر اثرات، نوآبادیاتی علاقوں کی بیداری ظلم و استحصال کی تاریکیوں کے خلاف حریت و آزادی کی روشنی، استعماری قوتوں کی شکست و ریخت، ایجادات و اختراعات کا ظہور، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظریات کی نمو اور تہذیب و تمدن کے تنوع نے حالات و مسائل کی نوعیت کو بہت کچھ بدل ڈالا، اور استشراق کے حوالہ سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ تحریک استشراق پچھلے دور میں جس نقطۂ کمال تک پہنچ چکی تھی، ہر کمالے را زوالے کے مصداق، غالباً مزید پیش قدمی ممکن نہ رہی، اس لیے یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوا کہ کیا تحریک استشراق رو بہ زوال ہو گئی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کی کوششوں کا ایک رخ تو یہ ٹھہرا کہ جو کچھ حاصل کر لیا گیا تھا، اسے بہر طور باقی رکھا جائے، دوسری طرف اسلام، پیغمبر اسلام اور عالم اسلام کے احوال و احوال میں مزید

نہاک، توجہ اور امعان نظر برتا جانے لگا، جز وقتی اسکالرز کے بجائے کل وقتی علماء نے جگہ حاصل کی اور آکسفورڈ، کیمبرج، لندن اور مغرب کی دوسری جامعات میں قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دوسرے اسلامی و مشرقی مباحث کے لیے باقاعدہ نشستیں مخصوص کی جانے لگیں، یہ مطالعہ لازماً خلوص پر مبنی نہیں تھا، مگر ان کے اشتغال و انہماک پر ضرور دلالت کرتا ہے، کہ اس سے خال خال مفید نتائج بھی پیدا ہوئے، اور کعبہ کو صنم خانے سے بعض پاسبان بھی مل گئے۔

مطالعۂ سیرت کے حوالہ سے کسی حد تک اعتدال اور انصاف پسندی کی روایت، جیسے دیل، گوئٹے اور کارلائل وغیرہ نے آگے بڑھایا تھا، اس عہد میں بھی جاری و ساری رہی اور الفانسو آرچر، ٹائن بی، بلاشیر اور واٹ وغیرہ کے یہاں روایتی انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ معقولیت و معدلت کے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں، اسلامی مصادر کی تحقیق و دریافت، ان کی تبویب اور اشاریہ سازی کا کام نہ صرف آگے بڑھا، بلکہ ایک طرف تو مستشرقین نے اس معاملہ میں اپنی محنت و ریاضت سے ایک طرح کی اجارہ داری حاصل کرلی، اور دوسری طرف، اسلامی و مشرقی مصادر پر نقد و جرح کے کام کو بھی وسیع پیمانہ پر انجام دیا جانے لگا، یہ غالباً تحریک استشراق کے مزاج سے بھی ہم آہنگ تھا کہ مصادر و مآخذ کا اعتبار اسی طریقہ سے اٹھ سکتا تھا۔ اور مشرقی اذہان و قلوب میں تشکک و تذبذب کے بیج بوئے جاسکتے تھے، اس ضمن میں قرآن، سنت اور دوسرے مصادر سیرت کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا اور مآل کار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بس کچھ مفاد پرست، سیاسی رہنما تھے، اور مذہبی خلوص و سچائی ان میں بہت کم تھی، اس عہد میں جو نئے رجحانات پروان چڑھے، ان میں سے چند قابل ذکر ہیں۔

بعض مستشرقین نے سیرت نبوی کا مطالعہ طبی اور معالجاتی (Pathological) نقطۂ نظر سے کیا، کچھ نے اس عہد کے معاشی اور سماجی عوامل سے متاثر ہو کر آنحضرت صلعم کو محض

ایک معاشی اور معاشرتی مصلح کی حیثیت سے اہمیت دی، اور کچھ نے ان سب سے مرکب و مرتب نظریہ قائم کیا، یہ تمام نقطہ ہائے نظر در اصل مخصوص ذہنی و فکری پس منظر کی پیداوار تھے، طبی اور معالجاتی نقطۂ نظر سے سیرت کے مطالعہ میں یہ موقف قائم کیا گیا کہ آنحضرتؐ (خاکم بدہن) نفسیاتی و دماغی امراض کا شکار تھے، انھیں مرگی کے دورے پڑتے تھے، اور ہنری لانس کی در یہ ہے کہ یہ دورے حد درجہ شہوت کے نتیجہ میں پیدا ہوئے، اس سے پہلے اس نقطۂ نظر کی ترجما مشہور برطانوی مستشرق اسپرنگر بھی کرچکا تھا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرچکا تھا کہ خدانخوا آنحضرتؐ کا نظام اعصاب چونکہ مختل تھا، اور آپؐ نعوذ باللہ ہذیان و اضطراب اعصابی مریض تھے، اس لیے ان کے لائے ہوئے دین اور ان کی سیرت میں ان کی کارفرمائی نظر آتی ہے طبی اور معالجاتی نقطۂ نظر کو مزید تقویت، مطالعۂ سیرت میں علم النفس کے اصول کو اطلا سے ملی، اس کے تحت اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کی نفسیاتی تحلیل کی کوشش کی گئی اور را معاملہ میں فرانز بہل (Frants Buhl) اور طور اینڈرے (Tor Andrae) نے سبقت دکھائی، اور حق ترجمانی ادا کیا۔

زیر بحث دور میں جن نئے رجحانات اور نئی تحریکوں نے جنم لیا، ان میں اشتراکی نقطۂ کو خاص اہمیت حاصل ہے، مارکس اور اینجلز کے خیالات اور تاریخ کی مادی تعبیر نے ایک حلقۂ اثر پیدا کیا اور ایسے مستشرقین آگے آئے جن کی نظر میں اسلام کی اشاعت و فروغ او پیغمبر اسلامؐ کی کامیابیاں در اصل سیاسی سماجی اور معاشرتی عوامل کی کارفرمائیوں کا نتیجہ تھیں، چنانچہ اس ضمن میں جرمن مستشرق ہیوبرٹ گرائم (Hubert Grimme) کا نام معاشی نظریہ کے ارتقاء کی علامت بنا، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر اس کی دو کتابیں شائع ہوئیں، اس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ تھا، کہ اسلام کو ایک مذہبی و دینی نظام کی بہ نسبت

ایک سماجی اشتراکی نظام کی حیثیت سے سمجھنا چاہئے، اور آنحضرتؐ کو پیغمبر کے
بجائے صرف ایک سیاسی، سماجی، اور معاشی مصلح سمجھنا چاہئے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی
نقطہ ہائے نظر کا رنگ مارگولیوتھ نے اور گہرا کیا، اور اس نے اپنے مطالعۂ سیرت میں آنحضرتؐ
کو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے پیش کیا، اور اپنی کتابوں اور مقالات میں یہاں تک لکھا کہ
مکہ میں اپنی دکان سے لے کر مدینہ پہ ایک مملکت کی تعمیر تک تیئیس[۲۳] سال کا عرصہ لگا یا پھر دریدہ
دہنی کی انتہا کرتے ہوئے آنحضورؐ کو نعوذ باللہ ڈاکوؤں کا سردار، اور مدینہ کا ظالم اور مستبد لکھنے میں
بھی تکلف نہیں کیا، اطالوی مستشرق پرنس لیون کتانی نے اپنے دیوپیکر کام کا ماحصل یہ قرار دیا کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بس ایک چالاک سیاست داں تھے، اور انھوں نے معاشی و سیاسی
مفادات کی خاطر مذہبی داعیات کو قربان کر دیا تھا، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ دراصل محمدؐ پکے
مفاد پرست تھے، اور اپنی سیاست بازی میں انھوں نے اپنی مذہبیت کو پسِ پشت ڈال دیا تھا،
مطالعہ سیرت میں۔ انتہاپسندی، خلاف حقیقت بھی تھی اور خود گروہ مستشرقین میں سے بھی بعض
نے اسے پسند نہیں کیا، تاہم مستشرقین نے بین بین رویہ اختیار کیا، مثلاً عہد جدید کا مشہور مورخ ٹائن بی
اپنی عظیم الشان تصنیف مطالعۂ تاریخ میں دنیا جہان کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتا ہے، اور واقعات سے
اصولوں کو اخذ کرتا ہے، پھر اسلام کے بارہ میں بھی عمومی طور پر معقول رویہ کا اظہار کرتا ہے، لیکن
جب سیرتِ رسولؐ پر قلم اٹھاتا ہے تو آپ کی حیات طیبہ کو دو مراحل میں تقسیم کرتا ہے، اس کے
نزدیک پہلا مرحلہ تو وہ ہے، جب کہ آنحضورؐ کا قیام مکہ میں رہا، اس دوران میں بقول ٹائن بی آپ
کلیۃً مذہبی تبشیری سرگرمیوں میں منہمک رہے، لیکن دوسرے مرحلہ میں مدینہ پہونچ کر انھوں نے بقول
ٹائن بی، مذہبی مقاصد سے الگ ہو کر سیاسی سرگرمیوں کو جاری کیا، وہ بہرحال اس خیال کی
پرزور تردید کرتا ہے کہ آنحضرتؐ ایک بہروپیا تھے، ٹائن بی کے افکار کا خلاصہ یہ ہو کہ اس کے

نزدیک حضرت محمد ایک مثالی پیغمبر تھے، یا پیغمبر حضور کی زندگی آپ کی حیات طیبہ کے مصادر سے بحث کرتا ہے، اور غلو سے بچتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ احادیث و سیر کے ذخیرے میں بہرحال ایک حصہ ایسا ہے جسے جدید تکنیکی طریقوں سے جانچ پرکھ کر مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اسی قسم کا نقطۂ نظر منٹگمری واٹ کا بھی ہے، مطالعۂ سیرت کے ضمن میں واٹ نے متعدد کتابیں تحریر کیں، واٹ کی تصنیفات کو بہرحال آخری جدید ترین کوششوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نزدیک مصادر نے جہاں تک اجازت دی اپنی دانست میں ایک مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ واٹ کے کام کی خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال میں "علمیت" نے جو ترقی کی ہے اس کا مظاہرہ اس کی تصانیف میں نظر آتا ہے، اور اس کی تصانیف اسلامی ماخذ کی جدید ترین دریافت اور جرح و تنقید کے جدید اصولوں کی عکاسی کرتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واٹ کا موقف مارگن بی کے موقف سے زیادہ مختلف نہیں ہے، کہ وہ بھی آنحضرت کی شخصیت کو مکہ اور مدینہ میں مختلف سمجھتا ہے۔

بہرحال عہد جدید کا یہ عمومی جائزہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ عہد جدید کے مستشرقین اگرچہ اپنے انداز تحریر، اپنی علمیت اور طرز ہائے تحقیق میں اپنے اسلاف سے بہت مختلف ہو گئے ہیں، اور بہت سے معاملات میں انھوں نے بالکلیہ رجوع کر لیا ہے، تاہم یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تمام تر جدیدیت کے علی الرغم تحریک استشراق کا اصل محرک جذبہ ابھی کارفرما حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ عہد جدید کا ایک مصنف فرانسیسکو جرئیلی اپنی زبان قلم سے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ "پرانی دشمنی عہد جدید میں بھی جاری ہے"۔ علاوہ ازیں اس صورت حال میں ایک اور جدید ترین مصنف ایڈورڈ ڈبلیو سعید کا یہ تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ استشراق اور اس کی تحریک کا اہتمام و انضباط، بنیادی،

[illegible]

مستشرقین کی جانب سے مشرق پر سخت تنقید کیا گیا جب کہ مشرق، مغرب کے تسلط میں مغلوب

مشغول تھا، اور پھر قوت و ضعف کے اسی تفاوت نے بعض اوقات تنگ نگاہی پیدا کر دی۔ (ایضاً

حقیقت یہ ہے) استشراق کے درحقیقت دو چہرے، دو رخ ہیں، ایک اس کا داخلی اور پوشیدہ پہلو

(Esoteric)، اور دوسرا ظاہری، خارجی رخ (Exoteric)، پہلا داخلی رخ تو

ہمیشہ سے ایک ہے، جسے کبھی کسی زمانہ میں نہیں چھوا گیا، جب کہ دوسرا ظاہری پہلو متغیر ہوتا رہا۔

یعنی مشرقی معاشرہ و تہذیب، زبان، ادب، تاریخ، معاشرت وغیرہ کے بارہ میں خیالات و افکار

بدلتے رہے، مختصر یہ کہ مستشرقین کے خیالات میں تبدیلی اسی ظاہری استشراق کے حوالے سے آتی رہی،

لیکن داخلی جذبۂ استشراق ہمیشہ سے آج تک یکساں محکم و مستحکم رہا، اور کسی واضح تبدیلی سے آشنا

نہیں ہوا۔ (ایضاً ص ۲۰۲) بہرحال خلاصہ یہ کہ استشراق کسی مثبت اور تعمیری رویہ اور سلوک

و دستور کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ مغرب کی جاری کردہ مؤثر علمی روایت ہے۔ (ایضاً ص ۲۰۳)

عہد حاضر کے اس مختصر علمی جائزہ کے بعد مناسب ہے، کہ اس دور کے چند مشاہیر مستشرقین

کا تعارف پیش کر دیا جائے۔

۱۔ مونٹے (Montet, Ed) (۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۷ء) کی علمی یادگاروں میں اسلام

حال و مستقبل (مطبوعہ پیرس ۱۹۱۱ء)، الاسلام (مطبوعہ ۱۹۲۱ء)، تاریخ اسلام (مطبوعہ ۱۹۲۳ء)

اور فرانسیسی میں ترجمۂ قرآن (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) شامل ہیں۔ (۲) گاڈفرے ڈی ممبائن

(Gaudefroy Demombynes, M.) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۶۲ء

۱۹۵۷ء) پیرس میں مشرقی علوم و السنہ کے شعبہ میں عربی کا استاذ، متعدد کتابوں کا مصنف،

مثلاً اسلام میں نظم (۱۹۳۱ء)، مکہ و مدینہ (۱۹۱۸ء)، عالم اسلامی اور فلسطینی صلیبین کے

[illegible] وغیرہ (۳) کارل والٹر سٹون لینڈ، برطانوی مستشرق، زمانہ (۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۳ء)
مخطوطات و مطبوعات اس سے منسوب ہیں، مثلاً منتخبات القرآن، ریپزنگ ۱۹۱۳ء،
اسلام سے پہلے قبائل عرب کی مکمل و ترتیب (۱۹۱۳ء) تاریخ یمن قبل اسلام (۱۹۰۲ء)
الکت عرب کی اسلام کے بعد عصر حاضر تک تاریخ جغرافیہ، ثقافت، عادات، اسماء قبائل،
تراجم رجال، فہرست مخطوطات اور شخصیات کی تحقیق، رواۃ، روایت اور مصادر کی تحلیل وغیرہ
اور حیات محمدؐ جو اس کے انتقال کے بعد روم سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ (۴) سر تھامس
آرنلڈ، انگریز مستشرق، زمانہ (۱۸۶۴ء تا ۱۹۳۰ء) اس کی مشہور ترین کتاب دعوت اسلام
ہے، (مطبوعہ لندن ۱۸۹۶ء) (۵) رابرٹ بریفالٹ (Briffault, —
(Robert برطانوی مستشرق، انگریز سرجن اور ناول نگار، مشہور ترین کتاب "دی میکنگ آف
ہیومینیٹی" تھی (۶) اسٹینلے لین پول، مشہور برطانوی مستشرق . . . .
زمانہ (۱۸۵۴ء تا ۱۹۳۱ء) مورخ ماہر اثریات، برٹش میوزیم میں پرانے سکوں کا محافظ
(۱۸۷۴ء تا ۱۸۹۲ء) تاریخ مسلمانان اندلس پر خاص کام ہے (۷) نکلسن، مشہور برطانوی
مستشرق، متعدد تصانیف لیکن خاص کتاب عرب کی ادبی تاریخ (مطبوعہ لندن و نیویارک ۱۹۰۷ء)
اور اس کا مضمون محمدؐ اور قرآن، نیز محمدؐ کی ایک نامعلوم سوانح، نکلسن کا زمانہ ۱۸۶۸ء-۱۹۴۵ء
ہے (۸) نولدیکے، مشہور جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۳۶ء تا ۱۹۳۰ء) تصنیفات زیادہ تر سامی
زبانوں پر اور تاریخ اسلام پر، نیز قرآن کی اصل اور ترکیب پر بحث، نقد حدیث کے اسکول کا
مرحلہ، سیرت پر ایک کتاب کا مصنف (مطبوعہ ۱۸۶۳ء) (۹) ہرگرونجے (Hurgronje
S. H. —) ڈچ مستشرق زمانہ (۱۸۵۷ء - ۱۹۳۶ء) اس کے آثار میں مکہ کی تاریخ، فقہ،
اسلامی اور سیاست تحریکیں شامل ہیں، مذہباً عیسائی، زیادہ تر کام ولندیزی زبان میں، ماہر اسلامیات

... اس نے لکھا ہے کہ اسلام اپنی ابتداء سے ہی سیاسی مذہب تھا، بہرحال ...
...کے بارہ میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں، اور اس نے نجی اسلام اور سرکاری اسلام
درمیان فرق متصور کیا (۱۰) ونسنک، ولندیزی مستشرق (۱۸۸۲ء، ۱۹۳۹ء) اپنی
کی علمی یادگاروں میں یہود مدینہ کے بارہ میں رسول اللہؐ کا موقف، جو اس کے ڈاکٹریٹ
مقالہ کا موضوع بھی تھا، اور لندن سے ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا، نیز محمدؐ اور یہود الاسلام
لیوے سیل ۱۹..ء) وغیرہ خاص کتابیں ہیں۔ (۱۱) زاخاؤ، جرمن مستشرق زمانہ (۱۸۴۵ء
۱۹۱..ء) جیسا کہ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ابن سعد کی طبقات اسی کی کوششوں سے زیورِ طبع
آراستہ ہوئی (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۹۲) (۱۲) جوزف ہوروز (Horovits, J.
ن مستشرق زمانہ (۱۸۷۴ء، ۱۹۳۱ء) اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں مغازی واقدی پر
اٹھایا مطبوعہ ۱۸۹۸ء) (۱۳) جوزف ہیل، جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۷۵ء، ۱۹۵۰ء)
رمیں عربی تہذیب پر اس کی کتاب مشہور ہے (۱۴) کارل بروکلمان، جرمن مستشرق زمانہ
۱۸۶۸ء-۱۹۵۶ء) بے شمار کتابوں کا مصنف، لیکن مشہور ترین تصنیف، تاریخ اقوام مسلم
۔ اس میں آنحضرتؐ پر تحریر قابل ذکر ہے، (۱۵) بارتھولڈ، روسی مستشرق زمانہ (۱۸۶۹ء
۱۹۳۰ء) تصانیف کثرت سے ہیں مثلاً اسلامی تہذیب، تاریخ ترکستان، عالم اسلام
خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ وغیرہ، (۱۶) سموئل زویمر (Zawe-mer-S.
ریکی نژاد، اجل علما مستشرقین، اس کی تصانیف کثرت سے ہیں، خاص طور پر مسیحیت اور اسلام
کے تعلقات پر، اس کی دیگر کتابوں میں اسلام سے پہلے بلاد عرب، دنیائے اسلام، حیات محمدؐ
اسلام صحرائے عرب میں اور ورثۂ نبوی وغیرہ ہیں (۱۷) ایچ. جی. ویلز، انگریز مستشرق، زمانہ
۱۸۶۶ء، ۱۹۴۶ء) افسانہ نگار، ماہر عمرانیات اور مورخ، متعدد تصانیف یادگار ہیں

ہیومنٹری ووسٹ آف ہسٹری، میں محمڈ اور اسلام (۱۸)، گب، اس عہد کا مشہور ترین برطانوی
مستشرق ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوا، اور ابھی چند سال پہلے وفات ہوئی ہے، گب کی تصانیف
گرچہ بہت سی ہیں، تاہم اصل شہرت کتاب محمڈن ازم سے ہوئی جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی، کتاب کے
نام کے سلسلہ میں گب نے خود توجیہات پیش کی ہیں لیکن یہ نام و توجیہات خود اس کے شاگرد سمتھ
کو پسند نہیں آئیں، معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ گب کے یہاں مختلف نظریات، تصورات اور خیالات
میں ارتقاء واقع ہوا، اور وقت و حالات کے تحت بہت سے اندازے غلط ثابت ہوئے جس کا
ثبوت اس کی مختلف تحریروں سے ملتا ہے، اپنی عمر کے آخری ایام میں بہرحال اس نے اسلام کے
بارہ میں نرم روی کا مظاہرہ کیا۔ (۱۹) ولفریڈ کینٹویل اسمتھ، گب کا شاگرد، جولائی ۱۹۱۶ء
میں پیدا ہوا، پی، ایچ، ڈی کی سند ۱۹۴۹ء میں ایک اور مستشرق فلپ کے، ہٹی کی زیر نگرانی
تحقیقی مقالہ مجلۃ الازہر، تجزیہ وتنقید پر حاصل کی، مذہباً عیسائی، متعدد کتابوں کا مصنف، حال
پروفیسر ریلیجن ڈیویزن، یونیورسٹی کناڈا، (۲۰) جوزف شاخت، جرمن مستشرق، پیدائش ۱۹۰۲ء
میں ہوئی، خالص یہودی، اسلام اور علوم اسلامی پر متعدد تصانیف ہیں، لیکن اصل کام قانون
اور اصول فقہ اسلامی پر ہے (۲۱) برنارڈ لوئیس، عہد جدید کا مشہور انگریز مستشرق ۱۹۱۶ء
میں لندن میں پیدا ہوا، تصانیف کثرت سے ہیں لیکن مشہور کتابوں میں عربس ان
ہسٹری، اسلام ان ہسٹری، کیمبرج ہسٹری آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا
آف اسلام کا مدیر و مقالہ نگار ہے۔ اسلام دشمنی کے لیے مشہور و معروف
ہے۔ اور آج کل یہود پرستی اور اسلام دشمنی میں سر فہرست ہے۔

عہد جدید کے مشاہیر مستشرقین کا مندرجۂ بالا تعارف
اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن تحریکِ استشراق کے کیف و کم کا اندازہ

[illegible] ہے [illegible] مشرق

[illegible] دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کے بعد [illegible]

ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مصنفین اپنی اس تحریک کو اب بھی [illegible] ہوئے

ہیں لیکن رویہ اور سلوک کی وہ یکسانیت بہرحال نظر نہیں آتی جو پہلے ان کا خاصہ تھا۔ مشرق

کی نوجوان نسل، زمانہ کے حالات و وسائل کے پیش نظر ذہن و فکر کی نئی تبدیلیوں سے دوچار

ہو رہی ہے۔ ادھر اسلامی دنیا میں سوچ کی نئی لہریں پیدا ہو رہی ہیں اور بعض جدید مفکرین و مصنفین

مشرق کی تحریروں نے خود مغربی دنیا میں مد و جزر پیدا کر دیا ہے۔ پھر یہ بات بھی صاف ہے کہ

اب طاقت و قوت کے سارے اوزان و پیمانے بدل گئے ہیں، استعمار اور استحصال کی راہیں

بدل گئی ہیں، علمی و ذہنی مرعوبیت پہلے جیسی نہیں رہی اور اب مشرق بھی آنکھیں کھول کر، فلک

فضا اور زمین دیکھ رہا ہے۔ ایسے میں کیا عجب ہے کہ آنے والا زمانہ تحریک استشراق کے کوچ کا بگل

بجا دے۔ اس لیے بقول ایک مصنف "وقت آگیا ہے کہ اسلامی مفکرین و علما اپنے حریفوں

کے مدمقابل آئیں اور معاندین و مخالفین اسلام کے خلاف علمی محاذ پر حقیقی معرکے کے لیے

صف آرا ہوں، البتہ معروضیت کا خواہ مخواہ دعویٰ نہ کریں کہ علمی معروضیت تو درحقیقت

فریب نظر (Myth) ہے۔ (جانسن، دی ٹینٹ اسلام ص ۹۵ لندن [illegible])

<u>اسباب و محرکات</u> تحریک استشراق نے اپنے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک کا سفر جس انداز سے

طے کیا ہے، اس کا ایک عمومی جائزہ اگرچہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے، اور اسی سلسلہ میں

تحریک کے اغراض و مقاصد اور محرکات کی بڑی حد تک نشاندہی بھی ہو چکی ہے، تاہم

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے پس پردہ محرکات و اسباب کو صاف صاف بیان

کر دیا جائے، چنانچہ بطور خلاصہ ان کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) اسلام اور عیسائیت میں بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں، اسلام کا نظریۂ حیات، اس کا نظام فکر و عمل، اس کے تہذیب و تمدن کا انداز، یہودیت، عیسائیت اور دوسرے مشرکانہ مذاہب سے یکسر مختلف ہے۔ پھر دانائے سبل، ختم الرسلؐ نے اسلام کی جو دعوت پیش کی اس میں شروع ہی سے ادیان باطلہ کی نفی کر دی تھی۔ . . . .

. . . . اس لحاظ سے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبردار 'اسلام' اہل اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں سخت معاندانہ جذبات رکھتے ہیں، اور اپنے بغض و عناد کا اظہار ہر ممکن طریقے سے کرتے ہیں، ان کا یہ رویہ اور ان کی شقاوت و قساوت دراصل نظریاتی اور فکری بنیادوں پر استوار ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں ایک جگہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ "تم دیکھو گے کہ اہل ایمان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں، اور مشائخ بھی، اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ (المائدہ) جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان کے پورے گروہ میں نمایاں، یہود، نصاریٰ اور مشرکین ہیں، ان کو اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کی سرفرازی کسی طور پر پسند نہیں، بلکہ وہ ہر آن زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں، اس لحاظ سے تحریک استشراق کی اٹھان، اسلام دشمنی کے زیر سایہ ہوئی، اور مستشرقین کی مساعی کا ہدف یہ ٹھہرا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو دنیا کے سامنے کریہہ المنظر بنا کر پیش کیا جائے۔

(۲) نظریاتی سبب کے علاوہ ایک سبب تاریخی بھی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب آن کی آن میں پھیلتا گیا، اور اس کے علمبرداروں نے انتہائی مختصر مدت میں اسلام کا پرچم دنیا کے دور دراز علاقوں میں جا کر لہرا دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ پیش قدمی میں، اسلام نے

[illegible] آسانی کے ساتھ ختم کر دیا [illegible] مغرب [illegible]
[illegible] تک معلوم ہوتا [illegible] ہاتھوں [illegible]
[illegible] یوں سرنگوں کیا، کہ [illegible] بہر حال اسلام کی [illegible] کے
ساتھ وسعت و اشاعت نے جہاں ایک طرف دنیائے مغرب کی مذہبی و [illegible]
کو پارہ پارہ کر دیا۔ بازنطینی سلطنت کے زرخیز خطوں (شام، فلسطین، مصر وغیرہ) پر
مسلمانوں کا قبضہ ہوا، اور چرچ کے مضبوط قلعے فتح ہو گئے، شمالی افریقہ کی فتوحات،
اندلس اور سسلی کی عرب فتوحات نے دنیائے مغرب کو زیر و زبر کر دیا، اور یوں اسلام اور
مغرب کے درمیان عداوت کی مستقل بنیاد پڑ گئی۔ یہ تاریخی منظر مستشرقین کی معاندانہ تحریروں
اور مخاصمانہ کارروائیوں کا بھی نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

(۳) محاربات صلیبی کو اگر ہم تحریک استشراق کا فوری سبب قرار دیں تو غلط نہ ہوگا۔ صلیبی
جنگوں کو تاریخ یورپ بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے، اس کی
تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، البتہ اس حد تک نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دنیائے
اسلام کے خلاف دنیائے یورپ کی متحدہ کوششیں چونکہ ناکام و نامراد ہوئیں اور ۱۰۹۶ء
سے ۱۲۹۲ء تک کے معرکہ ہائے صلیب و ہلال کے نتائج ارباب کلیسا کے حق میں
اچھے نہ نکلے۔ اس لیے انھوں نے عسکری محاذ پر شکست کھانے کے بعد گویا یہ فیصلہ کیا کہ
مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے علمی و فکری محاذ کو منظم کیا جائے۔ یہی فیصلہ بالآخر تحریک
استشراق کی شکل میں سامنے آیا۔ اس سلسلہ میں لارڈ ایلنبی کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے، کہ "فوجی
اعتبار سے تو اب صلیبی جنگیں ختم ہو چکی ہیں، مگر یورپی لوگ دین اسلام اور اس کی تہذیب کے
بارے میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے، ان میں تعصب کے اثرات جیسے

ایک فرانسیسی Flottemer اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ جب عیسائی ترکوں کے ساتھ جنگ ہار گئے تو وہ ہرزہ سرائیاں کرنے لگے یہاں تک کہ انھوں نے عیسائیت کی شکست کا بدلہ میدان ادب میں لے لیا۔ چنانچہ تحریک استشراق کی صورت میں اہل یورپ اور ارباب کلیسا کی تمنائیں پوری ہوگئیں۔ اور اس طرح تحریک استشراق کے جلو میں دنیائے مغرب کا یہ منظم حملہ درحقیقت عسکری محاذ پر ان کے صلیبی حملوں سے کہیں زیادہ ...... خطرناک ثابت ہوا۔ مختصر یہ کہ اسلام دشمنی کی جو چنگاریاں پہلے سے دبی ہوئی تھیں وہ بھڑک اٹھیں اور رفتہ رفتہ ان کی آتش عداوت دامن مشرق کو جلانے لگی۔

(۴) مستشرقین من حیث المجموع چاہے قدیم ہوں یا جدید، مغرب کے ہوں یا مشرق کے، اصل و نسل کے اعتبار سے بہرحال یہودی، عیسائی اور مشرک ہی رہے ہیں گویا اختلاف دین و مذہب کی بنا پر ان کے جذبات و خیالات تو پہلے سے ہی، مذہبی بغض و عداوت [illegible] کے آئینہ دار تھے، اس پر مستزاد یہ امر ہوا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے حقیقی مآخذ سے صدیوں، صدیوں جہالت، بے خبری اور عدم واقفیت کا شکار رہے، اس کا واضح نتیجہ ایک حقیقت تو یہ سامنے آیا کہ اسلام اور داعی اعظم ﷺ کے بارے میں کم و بیش انیسویں صدی کے اواخر تک دانستہ یا نادانستہ طور پر وہ جو کچھ لکھتے رہے اور پھیلاتے رہے، وہ صرف ان کے تعصب و عدم علم [illegible] کی پیداوار تھا، چنانچہ بے سروپا روایات، من گھڑت حکایات، فسانہ و فسوں [illegible] کہانیاں اور اسی طرح کا بلاتحقیق خام مواد مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام کی نفرت انگیز تصویر پیش کرنے کے لیے بڑی دلیری کے ساتھ صدیوں استعمال کرتے رہے، جس کا کچھ اندازہ پچھلے تاریخی جائزہ میں بھی سامنے آچکا ہے، اور کچھ جھلکیاں آیندہ فصل میں سامنے آئیں گی پھر وہ

جب جہالت و بے خبری کا پردہ چاک ہوا اور مستشرقین اسلامی مآخذ کی تحقیق و تفتیش میں منہمک ہوئے تب بھی انھوں نے دانستہ طور پر قرآن و احادیث سے کھیلنے میں کوئی تکلف نہیں کیا۔ نیز مشرقی مصادر کی ترتیب و تہذیب کے سلسلہ میں، تمام محنتوں کے باوجود، فاش قسم کی غلطیاں کرتے رہے (سیرۃ النبیؐ از مولانا شبلیؒ ج اول ص ۱۱۰ - ۱۱۱) بہرحال ان تمام باتوں کا مقصد ایک تھا یعنی تشکک و تذبذب کے بیج بو کر اسلام اور سرور عالمؐ کے بارے میں مسلمانوں کے اعتقاد کو ٹھیس پہنچانا اور انھیں آمادہ بہ نفرت کرنا۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مستشرقین اپنی تحقیقات کے پردہ میں بقول ایک مصنف "ایسے خیالات کو خاموشی کے ساتھ اسلام کے نظام فکر میں داخل کر دیں جس کا ادراک راسخ العقیدہ لوگوں کے سوا دوسرے نہ کر سکیں۔ انھوں نے یہ خیال کر لیا کہ ان کی تحقیقات سے مرعوب ہو کر ان کی ہر بات کو بلا چون و چرا درست مان لیا جائے گا۔ چنانچہ علوم اسلامی کا ہر میدان انھوں نے اپنی جولانگاہ کے لئے منتخب کیا اور علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں انھوں نے غلط بحث سے کام نہ لیا ہو۔"

(ہ) مسلمانوں کا زوال و انحطاط بحیثیت مجموعی تحریک استشراق کے فروغ کا باعث ہوا، ادھر عالم اسلام سیاسی انتشار کا شکار ہوا۔ اندلس مسلمانوں کے قبضے سے نکلا، ادھر سیاسی انحطاط، معاشرتی و اخلاقی زوال اور تہذیب و ثقافت کے تنزل کا باعث ہوا۔ تو ادھر مسیحی یورپ کی ہمتیں بلند ہوئیں، بلکہ اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لیکر تو اتنا غرور پیدا ہوا کہ صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر پندرہویں صدی عیسوی کے بعد سے انھیں سیاسی عروج حاصل ہونے لگا تو اقوام یورپ نے ایشیا، افریقہ اور دوسرے مشرقی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا، اور یوں استعماریت کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔

اس کا نتیجہ واضح تھا، مغربی تہذیب کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ اور مغربی تمدن اپنا اثر جمانے لگا تو مسلم ثقافت مغلوب ہونے لگی اور تمدنی چمک دمک ماند پڑ گئی اور اس طرح مستشرقین کو موقع ملا کہ وہ اپنے ہتھیار تیز کر لیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی زبانیں سیکھیں، ان کے افکار و علوم سے واقفیت حاصل کی اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کے مآخذ کو استعمال کر سکیں اور یوں اپنی تحریک کو آگے بڑھا سکیں۔

(۶) پندرھویں صدی عیسوی کے بعد یورپ نے پھر انگڑائی لی، اس کے عہد تاریک کا خاتمہ ہوا۔ اور ان کے ہاں علم و تحقیق بیدار ہی۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ یہ ان کے سیاسی فروغ سے ہم آہنگ تھا، اور انھیں ضرورت تھی کہ ایشیا اور افریقہ میں انھوں نے اپنی جو کالونیاں قائم کی ہیں، انھیں مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے مادی وسائل اور اسلحہ سے زیادہ توجہ علمی و ذہنی کاوشوں پر صرف کی جائے، چنانچہ استعمار مغرب کے تحفظ کے لیے بجائے خود تحریک استشراق کی سرگرمی ناگزیر تھی یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے مفتوح ممالک کے تمام علوم و فنون کو حاصل کرنے اور تحقیقات کے پردہ میں اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے یورپی حکمرانوں کی تحریک استشراق کی مکمل سرپرستی کی۔ یہ سرپرستی صرف مالی صورت میں نہیں تھی، بلکہ مستشرقین کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی گئیں، جو ان کی تحقیق و تفتیش کے لیے ضروری تھی۔

(۷) مذہبی اور سیاسی محرکات کے ساتھ تجارتی مفادات بھی تحریک استشراق سے وابستہ تھے، اقوام یورپ اور مشرقی ممالک میں رابطہ کی ابتدار تجارتی تعلقات سے ہی ہوئی تھی، پھر آہستہ آہستہ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہی تجار بالآخر سیاہ و سفید کے مالک اور حکمراں بن بیٹھے۔ تاہم منڈی والی تجارت ہمارہ اب بھی منہمک تھے،

[illegible] کتابوں کی طباعت و اشاعت، [illegible]
[illegible] مستشرقین کی تعداد میں مسلسل اضافہ [illegible] کے مختلف شعبوں کے
فروغ کا باعث بھی ہوا۔

اسباب و محرکات کا یہ مختصر سا تجزیہ، تحریک استشراق کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے ما لہا و ما علیہ کو جاننے کے لیے کافی ہے۔ اس لئے اب ہم آگے بڑھ کر ایک نظر ان اعتراضات، الزامات اور مفتریات پر ڈالنا چاہتے ہیں، جو مستشرقین کی طرف سے ہمارے ہادیٔ برحق سید الانبیاء والرسلؐ کی شخصیت و کردار کو (نعوذ باللہ) مجروح کرنے کے لئے ان کی تحریروں میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔ (باقی)

مقالات جلد ششم

یورپ میں اسلام، اسلامی روایات، اسلامی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس و بابرکت اور تمام عالم کے لیے باعث رحمت زندگی کے مختلف پہلوؤں پر وہاں کے اسلام دشمن مستشرقوں نے بہت افسوس ناک غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں، مولانا شبلیؒ اپنی زندگی بھر ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو رفع فرماتے رہے، اور ان کے رد میں محققانہ مضامین لکھتے رہے، ایک بڑی غلط فہمی انھوں نے کتب خانۂ اسکندریہ کے خلاف پھیلا رکھی تھی کہ مسلمانوں نے فتح مصر کے بعد صدیوں کے اس بیش قیمت اور عظیم کتب خانہ کو جلا کر خاک کردیا، مولانا نے ایک مضمون لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتب خانہ مسلمانوں کے مصر میں داخل ہونے کے صدیوں پہلے جلایا جا چکا تھا، مقالات کی یہ جلد مستشرقین کے اعتراضات کے رد میں اسی قسم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت [illegible]

ترکی کا ایک نامور صحافی
حافظ اشرف ادیب

(۱۸۸۲ء تا ۱۹۷۱ء)

(از جناب ثروت صولت صاحب کراچی)

(۲)

سبیل الرشاد | صراط مستقیم کو اشرف ادیب اور ابو العلاء ماردین نے مل کر نکالا تھا، اور اسکی ملکیت مشترکہ تھی، کچھ عرصے کے بعد ابو العلاء ماردین، یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گیے، اور ان کا تعلق صراط مستقیم سے ختم ہو گیا، اب صراط مستقیم کے تنہا مالک اشرف ادیب ہو گیے، ملکیت میں اس تبدیلی کے بعد نام بدلنا ضروری سمجھا گیا، اشرف ادیب نے عاکف اور عباس حلیم پاشا سے نام کے بارہ میں مشورہ کیا، مختلف نام پیش کیے گیے جن پر اتفاق نہیں ہو سکا، اس پر عباس حلیم اپنے کمرے سے قرآن شریف اٹھالائے، اور کہا کہ اس میں جو نام نکل آئے وہ رکھدیا جائے، عاکف نے قرآن کھولا، یہ آیت نکلی

"اِتَّبِعُوْنِیْ اَھْدِکُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ"

چنانچہ سب نے اخبار کا نام "سبیل الرشاد" رکھنے پر اتفاق کیا، اب تک "صراط مستقیم" کے ایک سو اکیاسی شمارے (۱۸۱) سات جلدوں پر مشتمل تھے نکل چکے تھے، ۱۸۲ واں شمارہ "سبیل الرشاد" کے نام سے شایع ہوا، اور اس کے ساتھ آٹھویں جلد کا آغاز ہوا،

سبیل الرشاد کس تاریخ سے نکلنا شروع ہوا؟ اس بارے میں ترکی کتابوں میں صحیح تاریخ نہیں

ملتی، حلمی ضیا اُلکین نے اپنی کتاب "ترکی میں جدید افکار کی تاریخ" میں[1] لکھا ہے کہ "صراط مستقیم" ۱۴؍ اگست ۱۹۰۶ء سے ۶؍ فروری ۱۹۱۱ء تک جاری رہا، پھر ۲۴؍ فروری ۱۹۱۱ء سے ۱۰؍ مارچ ۱۹۲۴ء تک "سبیل الرشاد" کے نام سے جاری رہا، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، "صراط مستقیم" ۱۹۰۶ء میں نہیں بلکہ ۱۹۰۸ء میں نکلنا شروع ہوا تھا، بعض کتابوں میں اشاعت کی تاریخ ۱۱؍ اگست دی گئی ہے، ترکی میں اس زمانہ میں ہجری کیلنڈر کے ساتھ یونانی کیلنڈر بھی رائج تھا، جس کی تاریخوں اور موجودہ انگریزی کیلنڈر کی تاریخوں اور سال میں فرق ہے، مصنفین سے عام طور پر ان میں مطابقت پیدا کرنے میں غلطی ہو جاتی ہے، یہی "سبیل الرشاد" کے ساتھ ہوا، بہرحال یہ طے ہے کہ "سبیل الرشاد" کا پہلا پرچہ اشرف ادیب کے الفاظ میں "صراط مستقیم" کے پورے ساڑھے تین سال بعد نکلا، یہ ساڑھے تین سال فروری ۱۹۱۲ء میں پورے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ صراط مستقیم کی اس وقت تک سات جلدیں نکل چکی تھیں، اور ہر جلد چھ ماہ پر مشتمل ہوتی تھی، سبیل الرشاد کے پہلے پرچہ کی جو فوٹو کاپی میرے پاس موجود ہے، اس میں جلد آٹھ لکھا ہوا ہے، اس لحاظ سے بھی فروری ۱۹۱۲ء ہوتی ہے، ضیا اُلکین نے مہینہ صحیح لکھا ہے، اور سال غلط، اسی طرح سبیل الرشاد ۱۹۲۴ء میں نہیں، بلکہ ۱۹۲۵ء میں قانون تحفظ عامہ کے تحت بند ہوا، یہاں بھی حلمی ضیا نے سال غلط لکھ دیا لیکن مارچ کا مہینہ صحیح ہے، لہذا یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سبیل الرشاد کی اشاعت ۲۴؍ فروری ۱۹۱۲ء سے شروع ہوئی، اور مارچ ۱۹۲۵ء تک جاری رہی، اس کی تائید تورک دیل و انسی کلو پیدیسی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، کہ صراط مستقیم کے نام سے کل ایک سو اکیاسی شمارے نکلے، اس کے بعد ۱۸۲ واں شمارہ سبیل الرشاد کے نام سے نکلا،

---

[1] حلمی ضیا اُلکین: ترکی میں جدید افکار کی تاریخ ص ۲۰۰ (قونیہ ۱۹۶۶ء)

"سبیل الرشاد" اگرچہ "صراط مستقیم" ہی کا دوسرا نام تھا، اور لکھنے والے بھی وہی تھے، لیکن ملکیت میں تبدیلی کے بعد اس کے اغراض و مقاصد کا از سر نو اعلان کیا گیا، اور وضاحت کی گئی کہ جریدے کا کسی فرقہ یا پارٹی سے تعلق نہیں ہوگا، اور صرف حق بات کی حمایت کی جائیگی، اب مدیر کی حیثیت سے ذمہ داری بجائے عاکف کے اشرف ادیب نے خود سنبھالی، ممتاز لوگوں پر مشتمل ہیئت تحریر تشکیل دی گئی، اور مختلف موضوعات مختلف لوگوں کے سپرد کیے گئے، تفسیر اور حدیث عاکف کے سپرد کیے گئے اور ہدایت کی گئی کہ ان آیات اور احادیث پر زور دیا جائے، جو حیات اجتماعی سے متعلق ہوں، حلیم ثابت[۱] کے سپرد فقہ، حج اور خانہ کعبہ کی تاریخ کی گئی، فلسفیانہ موضوع عمر فرید قام اور شمس الدین گونالتای کے، تاریخ عرب، شریف عبداللطیف انور زادہ کے اور سیاسی مقالات یوسف آقچورہ کے سپرد کیے گئے، اخبار کے لیے مختلف ملکوں میں نامہ نگار مقرر کیے گئے، بلغاریہ میں ممتاز عالم دین احمد حمدی آقسیکی[۲] کو جو بعد میں ترکی کے محکمۂ مذہبی امور کے سربراہ ہوئے، نمایندہ مقرر کیا گیا، کاغذ بھی معیاری استعمال کیا گیا، مختصر یہ کہ سبیل الرشاد معنوی اور ظاہری دونوں اعتبار سے درجۂ اول کا ایک مکمل جریدہ بن گیا، یہ سب کچھ عباس حلیم پاشا کی مالی امداد کی وجہ سے ہوا،

اسی زمانہ میں روس کے مشہور ترک سیاح قاضی عبدالرشید ابراہیم استنبول آئے،

---

[۱] حلیم ثابت متوفی ۱۹۴۳ء کازان (روس) کے رہنے والے تھے، بعد میں اجتہاد کے مسئلہ پر اختلاف ہوگیا، اور سبیل الرشاد سے الگ ہوکر ضیا، گوک الپ کے رسالہ "اسلام مجموعہ" کے ایڈیٹر ہوگیے، مزید حالات کے لیے دیکھیے میرا مضمون "حلیم ثابت" جو المعارف لاہور اکتوبر ۱۹۸۱ء میں شایع ہوا، [۲] احمد حمدی آقسیکی (۱۸۸۷ء تا ۱۹۵۱ء) ترکی کے ممتاز عالم دین تھے، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک ترکی کے محکمۂ مذہبی امور کے سربراہ رہے، کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے،

[illegible] اسلامی دنیا کے [illegible] بہت کچھ [illegible]
[illegible] حلیم پاشا کے پاس لے گیے، عباس حلیم پاشا نے ایک ہفتہ تک ان سے [illegible] گفتگو کی
اور مجموعہ باتوں کے ان کے سپرد یہ کام بھی کیا کہ وہ اسلامی دنیا کے ممتاز لوگوں کے جن سے
سیاحت کے دوران ملے، پتے فراہم کریں، جب یہ پتے فراہم ہوگیے تو عباس حلیم پاشا نے ادیب
کو ایک رقم پیشگی دے دی تاکہ اس سے ان لوگوں کے چندے ادا کرکے ان کے نام سبیل الرشاد
جاری کردیا جائے، یہ سیکڑوں افراد تھے، اور مصر، شام، عراق، حجاز، یمن، ایران، افغانستان،
ہندوستان، ترکستان، روس اور جاپان سے تعلق رکھتے تھے، ان سب کے نام اور پتے کی
چٹیں تیار کرلی گئیں، اور ان کے نام سبیل الرشاد جاری کردیا گیا،

اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ اب سبیل الرشاد ایک مکتب ہوگیا تھا، اور اس کا دفتر ایک کلب
بن گیا تھا، عاکف روزانہ دفتر آتے، لکھنے والوں سے ملتے، چائے ایک برتن میں ہر وقت کھولتی رہتی
اور اس کے دور چلتے رہتے تھے، مہمانوں کو پلائی جاتی تھی، عاکف اپنی وہ نظمیں اور اشعار سناتے
جو اگلے پرچے میں شایع ہونے والے ہوتے ہفتہ کے دن خصوصی اجتماع ہوتا، تمام لکھنے والے جمع
ہوتے اصلاح و مشورے کرتے اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے،

سبیل الرشاد" کو شروع ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ ۸ راکتوبر ۱۹۱۲ء کو جنگ
بلقان چھڑ گئی، بلقان کی ساری مسیحی ریاستیں سلطنت عثمانیہ پر ٹوٹ پڑیں، حکومت اپنے اندرونی
اختلافات کی وجہ سے جو متضاد عناصر کے جمع ہوجانے سے پیدا ہوگیا تھا، حملہ کا مقابلہ نہ کرسکی اور
یورپ کے سارے عثمانی مقبوضات ہاتھ سے نکل گیے، اور صرف وہ حصہ باقی رہ گیا، جو اب بھی
ترکی کہلاتا ہے، عثمانی مقبوضات میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، اور لاکھوں بے گھر
ہوگیے، بے گھر لوگ سبیل الرشاد کے دفتر میں آتے، اور مظالم کی داستانیں سناتے، عاکف

کی گئی، مدتیں اسی دور میں لکھی گئیں اور سبیل الرشاد میں شایع ہوئیں۔

جنگ بلقان کے بعد سلطنت عثمانیہ میں صرف وہی علاقے رہ گیے جن کی آبادی مسلمان تھی، جس کے عناصر ترکیبی ترک اور عرب تھے، لیکن ترکوں اور عربوں میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی نے ان دونوں عنصر کو متحد نہیں ہونے دیا، "سبیل الرشاد" اس دور میں اتحاد اسلام کا سب سے بڑا علمبردار تھا، اس نے قوم پرستی کے مغربی تصور کی مذمت کی، اور ترکوں اور عربوں کو متحد کرنے پر زور دیا، قوم پرستی کے فروغ کے ساتھ ہی سبیل الرشاد کے حلقۂ ادارت میں بھی نظریاتی اختلافات پیدا ہو گیے، اور قوم پرستوں کا وہ گروہ جو اسلام کی آزادانہ تعبیر کرنا اور ترک قوم پرستی کی تائید کرنا چاہتا تھا "سبیل الرشاد" سے الگ ہو گیا، اور اس طرح سبیل الرشاد کے مضمون نگاروں کا حلقہ قوم پرستوں اور اتحاد اسلام کے علمبردار دو گروہوں یا تجدد پسندوں اور اسلام پسندوں کے دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا[۱]، تجدد پسندوں نے ضیا گوک الپ اور اتحاد و ترقی کے تعاون سے "اسلام مجموعہ" کے نام سے ۱۹۱۴ء سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا، جس کے ایڈیٹر حلیم ثابت شبانی (Shibay) تھے، اس گروہ کے دوسرے لکھنے والے شرف الدین یالت قیا[۲] اور محمد شمس الدین کوفالتای تھے، لیکن یہ رسالہ چلا نہیں، اور صرف تیئیس[۲۳] شماروں کے بعد ۱۹۱۸ء میں بند ہو گیا، اس موقع پر سبیل الرشاد کی طرف سے اتحاد و ترقی کے مرکز عمومی کے رکن ضیا گوک الپ کو ایک یادداشت بھی بھیجی گئی، جس میں ترک قوم پرستی کے رجحانات کو مستقبل کے لیے نقصان دہ کہا گیا تھا، اور یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ متنازعہ امور پر علمی انداز میں گفتگو کر کے مفاہمت کی راہ

---

[۱] عدنان آدیوار: علم و دین (استنبول ۱۹۸۰ء) [۲] شرف الدین یالت قیا (۱۸۷۹ء تا ۱۹۴۷ء) احمد حمدی کسے پہلے ترکی کے محکمۂ امور مذہبی کے رئیس تھے، تیئیس[۲۳] سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے،

مل جائے، لیکن اس یادداشت کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔[1]

آزادی کی جنگ | جنگِ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوگئی، اور ان کے سارے عرب مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جنگ بند ہوگئی، ۱۵ر مئی ۱۹۱۹ء کو یونانیوں نے اپنی فوجیں ازمیر میں اتار دیں، ۱۶ر مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادی فوجیں استنبول میں داخل ہوگئیں اور ترکوں کو بدنام زمانہ معاہدۂ سیورے کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا جانے لگا، جس کے تحت ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا، اب ترکوں کے لیے بقا کا واحد راستہ یہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے وطن کی حدود کا دفاع کریں، اس طرح ۱۹۱۹ء سے آزادی کی جنگ شروع ہوگئی، جو ۱۹۲۲ء میں فتح سے ہمکنار ہوئی،

اشرف ادیب نے اس زمانہ میں اپنے پرچے سبیل الرشاد کے ذریعہ آزادی کی جنگ کی حمایت کے لیے قوم کو تیار کیا، ۱۶ر مارچ ۱۹۲۰ء کو استنبول پر اتحادی قبضہ کے بعد وہ عاکف کے ساتھ استنبول چھوڑ کر شمالی ترکی کے شہر قسطمونی آگئے، سبیل الرشاد بھی ان کے ساتھ قسطمونی منتقل ہوگیا، اس موقع پر عاکف نے قسطمونی کی جامع نصر اللہ میں ۱۹ر نومبر ۱۹۲۰ء کو جو پر جوش تقریر کی تھی، اور جس میں انھوں نے معاہدے سیورے کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی عوام سے اپیل کی تھی، ترکی کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس تقریر کو جنوبی محاذ کے کمانڈر نے ہزارہا کی تعداد میں چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کیا، تاکہ عوام کے حوصلے بڑھیں سبیل الرشاد کے شمارے ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶ اور ۴۶۷، عاکف کی اس تاریخی تقریر سے بھرے پڑے ہیں،

اشرف ادیب سبیل الرشاد کے چند پرچے قسطمونی میں شایع کرنے کے بعد ۲۵ر دسمبر

---

[1] فوزیہ عبداللہ تنسل: محمد عاکف ص ۵۶ (استنبول ۱۹۴۳ء)

ء عاکف کے ساتھ قسطمونی سے انقرہ منتقل ہو گیے، جہاں آزادی کی جنگ کا صدر دفتر تھا،
ن کا قیام بھی عاکف کے ساتھ درگاہ تاج الدین میں تھا۔ اسی جگہ عاکف نے ترکی کا غیر فانی
ستقلال مارشی یعنی ترانۂ آزادی لکھا، یہ ترانہ سب سے پہلے سبیل الرشاد کی، ار فروری ۱۹۲۱ء
کی اشاعت میں شایع ہوا، اس کے بعد ۱۲ مارچ کو ترکی کی مجلس کبیر ملی نے اس کو قومی ترانہ
کی حیثیت سے منظور کر لیا،

۱۹۲۱ء کے وسط میں جب یونانیوں نے ایسکی شہر اور کوتاہیہ کی طرف سے جوابی
حملہ شروع کیا، تو اشرف ادیب نے قیصری جاکر عوام کو جنگ میں شرکت پر آمادہ کرنے کیلئے
کتابچے شایع کر کے تقسیم کیے،[1]

۱۹۲۲ء میں آزادی کی جنگ ختم ہو گئی، اور غیر ملکی فوجوں کا آخری سپاہی تک ترکی
کی سرزمین سے نکال دیا گیا، اس جنگ میں سبیل الرشاد نے جو کردار ادا کیا، اس کا اعتراف ممتاز
ترک ادیب احمد کبیکلی اس طرح کرتے ہیں :

"عاکف نے سبیل الرشاد کو آزادی کی جنگ کے شعلۂ جوالہ میں تبدیل کر دیا تھا، اور
انکا یہ نعرہ کہ ہماری قوم جو ڈھائی ہزار سال سے آزادی کی نعمت سے بہرہ ور رہی ہے غلامی
کی زندگی قبول نہیں کر سکتی، ہر طرف گونجنے لگا، یونان کے حملے کے آغاز کے وقت سے آخری فتح
حاصل ہونے تک انھوں نے لوگوں کے حوصلے بلند رکھے، اور امید کی شمع روشن رکھی،[2]

ظاہر ہے اس اعزاز میں اشرف ادیب بھی عاکف کے برابر کے شریک ہیں،

مئی ۱۹۲۳ء میں اشرف ادیب انقرہ سے استنبول واپس آ گیے، اور سبیل الرشاد

---

[1] ترک ولی و ادبیاتی انسی کلوپیڈیسی جلد سوم صفحہ ۱۹۳ مقالہ فرمن؛ اشرف ادیب استنبول ۱۹۵۸ء) [2] احمد کبیکلی : محمد عاکف صفحہ ۳۲ (استنبول ۱۹۵۲ء)

خصوصاً بھی پیرو مستشرقوں سے شایع ہوتے تھا، لیکن اب وہ ان کا تنہا حامل رہ گیا تھا،
جو صراط مستقیم کے آغاز سے اب تک ان کے ساتھ تھے، نوزائیدہ جمہوریہ ترکیہ کے بعض دینی
رجحانات سے دل شکستہ اور سنسر کی روز افزوں پابندیوں سے اکتا کر عباس حلیم پاشا کے ہمراہ
پر اکتوبر ۱۹۲۳ء میں مصر چلے گئے، و اشرف ادیب نے زیادہ مستقل مزاجی کا ثبوت دیا اور سبیل الرشاد
کے ذریعہ اسلام پر کیے جانے والے حملوں کا جواب دیتے رہے، اس زمانہ میں انھوں نے کئی طویل
مقالوں کے ترکی ترجمے قسط وار شایع کیے، ان میں ایک سعید حلیم پاشا کا مقالہ "اسلام میں
تشکیلات سیاسیہ" تھا، جو ۲۶ر فروری سے ۱۳ر مئی ۱۹۲۳ء کے شماروں میں شایع ہوا،
دوسرا عبدالعزیز جاوش کا مضمون "شراب کا انسانی زندگی پر مضر اثر" اور تیسرا انگریزی کلیسا
کے سوالنامہ کا جواب" یہ بھی عبدالعزیز جاوش کا تھا،

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی ایک جمہوریہ بنا دی گئی، اس کے بعد ترکی کی اسلامی
حیثیت کو ختم کر کے اس کو ایک یوروپی ملک بنانے کے لیے مسلسل اقدامات کیے گیے سبیل الرشاد
ان نام نہاد اصلاحات کے خلاف تھا، اور حکومت اس کے خلاف کارروائی کے لیے صرف
بہانے کی منتظر تھی، جب ۱۱ر فروری ۱۹۲۵ء کو ان نام نہاد اصلاحات کے خلاف مشرقی
ترکی میں شیخ سعید نے بغاوت کر دی، تو حکومت نے اشرف ادیب کو گرفتار کر لیا، اور
ان کو نو تشکیل یافتہ عدالت استقلال کے سامنے پہلے انقرہ میں، پھر دیار بکر میں پیش کر دیا،
اس کے بعد ان کو اس شرط پر چھوڑا کہ وہ آیندہ سبیل الرشاد شایع نہیں کریں گے، اس
طرح سترہ سال تک وطن اور اسلام کی خدمت کرنے والا پرچہ مارچ ۱۹۲۵ء میں بند کر دیا
گیا، اور جب تک ترکی میں ایک پارٹی کی آمرانہ حکومت رہی، سبیل الرشاد بند رہا، سترہ
سال کی اس مدت میں صراط مستقیم اور سبیل الرشاد کے کل چھ سو اکتالیس شمارے شایع ہوئے،

نشر کتب :- اشرف ادیب اس کے بعد بھی بیکار نہیں بیٹھے صحافت پر پابندی لگی تو انھوں نے کتب نویسی شروع کر دی، اور آثار علمیہ کتب خانہ قائم کر کے اپنی اور دوسرے مصنفین کی کتابیں شایع کرنے لگے، صحافت پر پابندی لگنے سے پہلے انھوں نے سبیل الرشاد کے دفتر سے متعدد کتابیں شایع کی تھیں لیکن اب یہ ان کا واحد مشغلہ بن گیا،

۱۔ محمد عاکف: حیات، تصانیف اور بعض مصنفین کے مضامین :- یہ اشرف ادیب کی پہلی اور شاید سب سے اہم اور قیمتی کتاب ہے، اس کی پہلی جلد جو سات سو صفحات پر مشتمل ہے ۱۹۳۸ء میں، اور دوسری جلد جو تین سو بیس صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۳۹ء میں شایع ہوئی، یہ ضخیم کتاب ان کے دوست، صراط مستقیم کے ایڈیٹر اور ترکی کے شاعر اسلام محمد عاکف کی زندگی اور تصانیف پر سب سے مفصل اور مستند کتاب ہے، اس میں انھوں نے عاکف سے متعلق مختلف اہل قلم کے مضامین بھی جمع کر دیئے ہیں، کتاب میں عاکف کی پیدایش سے لے کر ۱۹۳۶ء میں انکی وفات تک کے حالات اور عاکف کے دوستوں کے حالات شامل ہیں،

۲۔ انقلاب کے بالمقابل عاکف اور فکرت :- توفیق فکرت (۱۸۶۷ء تا ۱۹۱۵ء) ترکی کے مشہور شاعر تھے، شروع میں وہ ہمارے جوش ملیح آبادی کی طرح صاحب ایمان اور دیندار تھے، اس کے بعد الحاد اختیار کر لیا، اللہ، قرآن اور اسلامی روایات کے خلاف اپنی نظموں میں بدزبانی کی، ایک مرتبہ عاکف اور فکرت میں اس موضوع پر بحث بھی چل نکلی تھی، ۱۹۴۰ء میں استنبول کے اخباروں میں یہ بحث پھر چل نکلی، اور ایک کمیونسٹ خاتون صبیحہ سرتیل نے عاکف پر بھی حملے کیے، یہ کتاب اس کے جواب میں ہے، اور ۱۹۴۰ء میں آثار علمیہ کتب خانہ سے شایع ہوئی،

۳۔ گنجلیک وتان جیلر :- یہ کتاب بھی عاکف اور فکرت کے مناقشہ سے متعلق ہے،

...فسون نے جو اخبار تان کے گرد جمع تھے، عاکف کے ترانۂ ملی پر اعتراضات کی بوچھاڑ
...دیا تھا۔ اشرف ادیب نے یہ کتاب (نوجوانان اور تان اخبار کا حلقہ) اسی کے جواب میں لکھی
...بتایا کہ ترکی کی آزادی کا سرچشمہ عاکف کا ترانۂ آزادی ہے، توفیق فکرت کی نظم
...یخ قدیم نہیں ہے، جس میں اللہ اور قرآن کو برا بھلا کہا گیا ہے، اور اسلاف پر لعنت بھیجی
...ہے، یہ کتاب بھی ۱۹۴۰ء میں طبع ہوئی،

۴۔ اسلام ترک محیط المعارف:۔ ۱۹۴۰ء میں ترکی کی وزارت تعلیم نے لیڈن کی
...انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا ضروری ترمیم و اضافے کے ساتھ ترکی میں ترجمہ کرنا شروع
... اس پر اشرف ادیب نے ۱۹۴۱ء میں ایک کتابچہ شایع کیا جس کا نام میسیونلر و مستشرقلرن
...دکلری اسلام انسی کلو پیدیسی نن علمی ماہیتی (مسیحی مبلغوں اور مستشرقوں کی لکھی ہوئی
...امی انسائیکلو پیڈیا کی علمی حیثیت) تھا اس میں انھوں نے مذکورہ انسائیکلو پیڈیا کا ترجمہ
...نے کو نقصان دہ بتایا تھا۔ اس کے بعد ان کی تحریک پر ایک علمی جماعت نے جو اشرف ادیب
...رضا دوغرل، اسمٰعیل حقی ازمیرلی اور کامل میرات پر مشتمل تھی، "اسلام ترک محیط المعارف"
...نام سے ایک انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنا شروع کر دی، جس کے چوہتر[۷۴] اجزاء شایع ہوئے
...کے بعد اس کو رسالہ کی شکل دے دی گئی، جس کے ایک سو شمارے شایع ہوئے، اس
...بعد کام رک گیا،[۱]

۵۔ پنبہ کتاب (سرخ کتاب):۔ یہ چوسٹھ[۶۴] صفحہ کا ایک کتابچہ ہے جس میں محرر
...ب نے چالیس[۴۰] مصنفین کی تحریریں جمع کر دی ہیں، ان میں توفیق فکرت پر پانچ مختلف
...ؤں سے تنقید کی گئی ہے، آثار علمیہ کتب خانہ نے ۱۹۴۳ء میں شایع کی،

...توک دیلی و ادبیاتی انسی کلو پیدیسی جلد سوم ص ۱۹۳، مقالہ "اشرف ادیب فرغن"

۶۔ چو حقین میزہ دین کتابی (ہمارے بچوں کے لیے دینی کتاب) جار حصے (سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۳۹ء)

سنہ ۱۹۲۵ء کے بعد جب ترکی میں ایک پارٹی کی آمریت قائم کردی گئی، قانون تقریر سکون (تحفظ عامہ) کے تحت تمام مخالف اخبارات بند کر دیئے گئے، اصلاحات پر تنقید کرنیوالوں پر مقدمہ چلانے کے لیے خصوصی عدالتیں "عدالتہائے استقلال" کے نام سے قائم کردی گئیں، حزب اختلاف کے اکیس[۱] رہنماؤں کو پھانسی دے دی گئی، اور ڈیڑھ سو رہنماؤں کو جلاوطن کر دیا گیا، تو حکومت اپنی مرضی کی اصلاحات ملک پر ٹھونسنے میں آزاد ہوگئی تھی[۲]، اسی زمانہ میں دینی مدارس بند کیے گیے، عربی رسم الخط بدل کر لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا، اذان اور اقامت ترکی زبان میں کہنے کا حکم دیا گیا، اور عربی اذان کو جرم قرار دیا گیا، عورتوں کو پردہ ترک کرنے پر مجبور کیا گیا، ہجری تقویم کی جگہ انگریزی کیلنڈر اختیار کیا گیا، جامع ایا صوفیہ کو میوزیم بنایا گیا، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے قانونی ضابطے نافذ کیے گیے، اور آئین سے یہ دفعہ نکال کر کہ "ترکی کا سرکاری مذہب اسلام ہے" ریاست کو سیکولر ریاست قرار دیا گیا، ان اصلاحات کو اتنی سختی سے نافذ کیا گیا، کہ ان کے خلاف بولنا موت کو دعوت دینا تھا، چنانچہ تفسیر کے استاذ محمد عاطف آفندی کو محض اس جرم میں سنہ ۱۹۲۶ء میں پھانسی دے دی گئی، کہ انھوں نے پردہ سے متعلق آیات کی تفسیر بیان کی تھی، اسی طرح دو[۲] اور افراد علی رضا اور حاجی عسکری کو بھی اس قسم کے جرم میں پھانسی دے دی گئی، یہ تینوں افراد نام نہاد عدالت استقلال میں پیش کیے گیے تھے، جو اصلاحات کی مخالفت کرنے والوں کے لیے خصوصی طور پر قائم کی گئی تھی، لیکن ان تمام پابندیوں کے باوجود اس پورے دور میں جب

---

[۱] ترک دیلی و ادبیاتی انسیکلوپیدیسی ج ۱ ص ۳۲۵، [۲] صادق البانرقه: ترکیه ده دین غوغاسی (ترکی میں دینی مناقشہ) ص ۲۱۶-۲۱۸، ایک اور عالم احمد رسم کو عدالت استقلال نے سنہ ۱۹۲۵ء میں پندرہ سال قید کی سزا دی، ملاحظہ ہو اسی کتاب کا ص [illegible]

شخصیت ترکی کے خوف سے پیدا ہوکر اسلام پر ہونے والی تنقیدوں کو کمل کم ... احکام کی اپنے تفکیر کے مطابق تشریح و تعبیر کی، وہ بدیع الزمان سعید نورسی کی ذات ... سے ۱۹۵۰ء تک مسلسل پچیس سال تک یا تو قیدخانوں میں رہے۔ یا نظربند۔ ... ان پر اور ان کی تحریروں پر سیکڑوں مقدمے چلائے گئے۔ اشرف ادیب ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھے، اور شاید وہ پہلے اہل قلم ہیں جس نے آمریت کا دور ختم ہونے کے بعد ان کے حق میں قلم اٹھایا۔ اشرف ادیب نے اس سلسلہ کی پہلی کتاب:

۷۔ رسالۂ نور مولفی بدیع الزمان سعید نورسی، حیاتی، افکاری معلکی، ۱۹۵۱ء میں لکھی۔ اس کے بعد انہوں نے اس سلسلہ میں دو مزید کتابیں بھی لکھیں، یعنی (۸) بدیع الزمان نور ... دو جولک، تنقید و تحلیل (۱۹۶۳ء) (۹) رسالہ نور معارضہ یازلرن اسنادلرہ حقندہ علمی ... (رسالۂ نور پر اعتراض کرنے والے مصنفوں کے الزامات کا علمی تجزیہ) ۱۹۶۵ء۔

۱۰۔ قرآن غرب متفکرلرینہ گورہ (قرآن مغربی مفکروں کی نظر میں) ۱۹۵۷ء ... اشرف ادیب نے مغربی اہل قلم کی ان تحریروں کو یکجا کیا ہے، جن میں انھوں نے قرآن کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

۱۱۔ دین دہ رفورمجولر (دین میں اصلاحات کرنے والے) ۱۹۵۹ء۔ ترکی میں قیام جمہوریت کے بعد ہی یہ تحریک چلی تھی، کہ اسلام میں اسی طرح اصلاحات کی جائیں جیسی مغرب میں پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح دین کے تحت کی گئی تھیں۔ اشرف ادیب نے اس موضوع پر ...

لہ بدیع الزمان سعید نورسی کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے میری کتاب "بدیع الزمان سعید نورسی" شائع کردہ ادارۂ معارف اسلامی، کراچی ۱۹۷۷ء۔

دوسرے ممتاز دانشوروں علی فواد باشگل[1]، نورالدین توپچو[2]، اسماعیل حامی دانش مند[3] اور محیف اوزمن کو لکھنے کی دعوت دی، چھپن صفحہ کا یہ کتابچہ ان ہی تحریروں کا مجموعہ ہے، کتابچہ کے شروع میں خود اشرف ادیب نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں ترکی میں تحریک اصلاح دین کا پس منظر بتایا ہے،

۱۲۔ قراکتاب (کالی کتاب) :- اس کتاب میں اشرف ادیب نے بتایا ہے کہ قیام جمہوریت کے بعد ملت کو کس طرح دھوکا دیا گیا، اور دین پر کس طرح حملے کیے گئے، یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شایع ہوئی تھی، ۱۹۶۹ء میں اس کی وجہ سے حکومت نے اشرف ادیب پر مقدمہ چلایا، لیکن وہ عدالت سے بری کر دیئے گئے،

اشرف ادیب کی تالیفات میں تین اور کتابوں کے نام ملتے ہیں، ایک (۱۳) حج رہبری: جسے انہوں نے اے علوی اور ملکف کے تعاون سے لکھا تھا، دوسری (۱۴) ارقام کے محمود کامل کے وعظوں کا مجموعہ، اور تیسری (۱۵) مناستر کے اسماعیل حقی کے وعظوں کا مجموعہ۔ یہ اشرف ادیب نے خود مرتب کیے تھے، ان کی تاریخ اشاعت معلوم نہیں ہو سکی،

ان کتابوں کے علاوہ اشرف ادیب کے بے شمار مضامین جو بڑے اہم موضوعات پر ہیں، ابھی تک صراط مستقیم اور سبیل الرشاد کی فائلوں میں بند ہیں، اگر ان کو جمع کیا جائے تو کئی

---

[1] علی فواد باشگل (۱۸۹۳ء تا ۱۹۶۷ء) ممتاز ترک مفکر اور قانون دان، آزادیٔ فکر کی تحریک کے علمبردار، فرانس کے فارغ التحصیل تھے، اور ترکی میں دینی تعلیم کے نظام کی بحالی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے،

[2] نورالدین توپچو (۱۹۰۹ء تا ۱۹۷۵ء) پیرس کی سوربون یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا، ترکی میں اسلامی تحریک کے ممتاز مفکر تھے، کئی کتابوں کے مصنف اور اسلامی رسالہ "حرکت" کے ایڈیٹر تھے۔

[3] اسماعیل حامی دانشمند (۱۸۹۹ء تا ۱۹۶۷ء) ممتاز ترک مورخ تھے۔

جلدیں تیار ہو چکی ہیں، مثلاً مقالات مسلسل میں اشرف ادیب پر جو مضمون چھپا ہے اس کی روئیداد پچاس قسطوں میں شایع ہوئی ہے، ترکی کی جنگ آزادی میں سبیل الرشاد کے علاوہ اشرف ادیب کا مضمون تیس ۳۰ قسطوں سے زیادہ میں چھپا ہے، ان کا ایک اور اہم مضمون تعلیمات کے اصلاحات کے بارے میں ہے، جس کی انتیسویں ۲۹ قسط سبیل الرشاد دسمبر ۱۹۵۲ء میں موجود ہے، معلوم نہیں اس کے بعد کتنی قسطیں اور شایع ہوئیں،

سبیل الرشاد کا آخری دور ترکی صحافت کی تاریخ میں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۶ء تک کا زمانہ پابند صحافت کا زمانہ کہا جاتا ہے[1]، یہ وہ زمانہ ہے جب سرکاری جمہور خلق پارٹی یا پیپلز ری پبلکن پارٹی بلا شرکت غیرے حکمراں تھی، اور اس کی نافذ کردہ اصلاحات کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا جا سکتا تھا، اس دور میں صرف اخبارات ہی نہیں، تمام مطبوعات پر حکومت کی کڑی نگرانی رہی، لیکن اس کے بعد سیاسی پارٹیاں قائم کرنے اور آزادانہ اظہار رائے کی آزادی بحال کر دی گئی، چنانچہ اس آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشرف ادیب نے بھی یکم مئی ۱۹۴۸ء سے سبیل الرشاد پھر شایع کرنا شروع کر دیا، جو ۱۹۶۶ء تک جاری رہا،[2] لیکن سبیل الرشاد کا یہ دور پچھلے دور سے کمتر تھا، اشرف ادیب اپنے مخلص ترین ساتھی عاکف کی خدمات سے محروم ہو چکے تھے، وہ خود بھی بوڑھے ہو چکے تھے، اور پچھلے دور کی طرح محنت نہیں کر سکتے تھے، عباس حلیم جیسا کوئی سرپرست بھی موجود نہیں تھا، ذاتی طور پر ان کے پاس کوئی بڑا سرمایہ نہیں تھا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ حالات سازگار نہیں تھے، اگرچہ ان کو اخبار نکالنے کی اجازت مل گئی تھی، لیکن آئین میں سیکولرازم کی دفعات اور اس پر عمل درآمد کرانے کے لیے قانون تعزیرات کی

---

[1] تورک دیل وہ ادبیاتی انسی کلوپیڈیسی جلد اوّل ص ۴۲۳-۴۲۷، [2] ایضاً جلد سوم مقالہ اشرف ادیب فرغن۔

دعوت سے اس بنیاد پر کام کرنے والوں کی راہ میں بہت رکاوٹ تھی، چنانچہ سبیل الرشاد اپنے دورِ ثانی
میں معنوی اعتبار سے شکل و صورت کے لحاظ سے اور کثرت اشاعت کے لحاظ سے دور اول کے
سبیل الرشاد کا مقابلہ نہیں کر سکا، اس زمانہ میں سبیل الرشاد کا ایک شمارہ سولہ [۱۶] صفحات پر
مشتمل ہوتا تھا، بہر حال ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۶ء تک ترکوں کی دینی سرگرمیوں، اور اسلام
اور مغربی تصورات کے درمیان ہونے والی کشمکش کا حال معلوم کرنے کے لیے اس دور کا
سبیل الرشاد ایک اہم ماخذ ہے۔

اس دور میں سبیل الرشاد کی اشاعت بھی بے قاعدہ رہی، میرے پاس اس دور کے
سبیل الرشاد کے چوالیس [۴۴] پرچے ہیں، جو جون ۱۹۵۰ء سے مارچ ۱۹۶۵ء کی مدت سے تعلق
رکھتے ہیں، ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۹۶۵ء تک "سبیل الرشاد" کے کل
تین سو اُنسٹھ شمارے شایع ہوئے تھے، حالانکہ سترہ سال کی اس مدت میں ایک ہفت روزہ
کی حیثیت سے ساڑھے آٹھ سو کے لگ بھگ شمارے شایع ہونا چاہیے تھے، شمارہ ۱۴۹
جو اپریل ۱۹۵۳ء کا ہے میرے پاس موجود شماروں میں آخری شمارہ ہے، جس میں اندرونی
لوح پر "سیاسی، دینی، علمی، ادبی اور اخلاقی ہفت وار مجموعہ" لکھا ہوا ہے، حالانکہ پانچ سال
کی مدت میں کم از کم دو سو [۲۰۰] شمارے نکلنا چاہیے تھے، اس کے بعد میرے پاس شمارہ ۱۵۰
سے شمارہ ۲۱۴ تک موجود نہیں، شمارہ ۲۱۴ پر جو فروری ۱۹۵۶ء کا ہے، ہفت روزہ
کا لفظ موجود نہیں اور صرف "سیاسی، دینی، علمی، ادبی اخلاقی مجموعہ" لکھا ہوا ہے، معلوم ہوتا
ہے کہ اشرف ادیب نے حالات کو ناسازگار پاکر ہفت روزہ کو ماہوار کر دیا تھا، لیکن اب ان
کے لیے ماہوار رسالہ شایع کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا، ۱۹۶۳ء (شمارہ ۳۵۱) کے بعد شمارہ
۳۵۲ دسمبر ۱۹۶۳ء میں نکلا، اور شمارہ ۳۵۳ اپریل ۱۹۶۴ء میں، اس کے بعد اگست ۱۹۶۴

شمارہ ۳۰۲ تک رسالہ پابندی سے ہر ماہ نکلتا رہا، لیکن اس کے بعد بے قاعدگی ہو گئی اور شمارہ ۳۰۸ دسمبر ۱۹۶۴ء میں نکلا، اور شمارہ ۳۰۹ جو میرے پاس موجود آخری شمارہ ہے مارچ ۱۹۶۵ء میں نکلا، اس وقت اشرف ادیب کی عمر تراسی سال تھی، ۱۹۶۶ء میں سبیل الرشاد بند ہو گیا، ماہوار شمارے بھی سولہ صفحات پر مشتمل ہوتے تھے،

اس مدت میں اشرف ادیب کی ذاتی زندگی کے دو واقعات قابل ذکر ہیں، ایک ۱۹۳۲ء میں وہ مصر جا کر اپنے دوست عاکف سے ملے، یہ غالباً ترکی کے باہر ان کا پہلا سفر تھا، دوسرا واقعہ نومبر ۱۹۵۲ء میں اخبار وطن کے ایڈیٹر احمد امین یلمان پر مالطیہ میں قاتلانہ حملہ ہے، احمد امین یلمان کو ترک مسلمان عام طور پر دونمہ (یعنی وہ یہودی جو ظاہری طور پر مسلمان بنے ہوئے ہیں) کہتے ہیں، انہوں نے ترکی کے پہلے مقابلۂ حسن کی سرپرستی کی تھی، جس پر کسی شخص نے ان کو قتل کرنے کی کوشش کی، اس واقعہ کے بعد ترکی میں اسلام پسندوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی، ترک قوم پرستوں کی تنظیم ترک ملیت جیلر درنیگی کی تمام شاخیں بند کر دی گئیں، اور اگرچہ اشرف ادیب کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن ان کو گرفتار کر لیا گیا، اور دو ماہ تک قید میں رکھا گیا،

سبیل الرشاد بند ہونے کے بعد اشرف ادیب نے اخبار یئی استقلال (۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء) اور بوگون (۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۹ء) میں مضامین لکھے، ۱۹۷۰ء میں روزنامہ یئی آسیا کے مالک مصطفیٰ پولاد کے کہنے پر انہوں نے اپنے خود نوشت حالات لکھنا شروع کیے، لیکن ابھی ۱۹۱۲ء تک ہی پہنچے تھے کہ ۱۹۷۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا، یہ حالات ان کی وفات کے کئی سال بعد یئی آسیا میں ۵/جنوری ۱۹۷۸ء تا ۲۶/جنوری ۱۹۷۸ء میں بائیس قسطوں میں شایع ہوئے، اشرف ادیب نے توحید افکار، یئی صباح

ت اور دیانت میں بھی مضامین لکھے،

کتب خانہ سبیل الرشاد سے جسے بعد میں انھوں نے آثار علمیہ کتب خانہ[1] کا ام دے دیا تھا، جو اہم کتابیں شایع کیں، ان کے لیے ایک مستقل مضمون درکار ہے، اس سلسلے میں اہل پاکستان کے لیے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی، کہ شرف ادیب آخری عمر میں دار المصنفین اعظم گڈھ کی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سیر الصحابہ رض اور تاریخ اسلام کا ترکی زبان میں ترجمہ کروا رہے تھے، منصوبہ کے نت یہ کام دس ہزار صفحات پر مشتمل پچیس (۲۵) جلدوں میں پورا ہوتا تھا، اس سلسلہ ں تین جلدیں عصر سعادت کے نام سے ۱۹۶۴ء تک شایع ہو چکی تھیں، اور ہاجرین کے حالات پر مشتمل تھیں، چوتھی جلد سے انصاری صحابہ کے حالات شروع ہو رہے تھے، اور اس کا بھی ترجمہ ہو چکا تھا، اور اشرف ادیب نے اس پر ایک مقدمہ ہجرت کی اہمیت پر لکھ دیا تھا، لیکن معلوم نہیں کام بعد میں کہاں تک مکمل ہوا، عاکف کے داماد اور اشرف ادیب کے رفیق عمر رضا دوغرل نے شبلی کی الفاروق کا ترکی میں جو ترجمہ یا تھا، وہ ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہ بھی غالباً آثار علمیہ کتب خانہ سے شایع ہوا تھا،

---

[1] آثار علمیہ کتب خانہ سے جن ممتاز مصنفوں کی کتابیں شایع ہوئیں، ان میں عاکف، سمٰعیل حامی دانشمند، عمر رضا دوغرل اور احمد نعیم کے نام قابل ذکر ہیں۔

شمارہ ۳۵۵ تک رسالہ پابندی سے ہر ہفتہ نکلتا رہا، لیکن اس کے بعد بہم خلل پڑ گیا اور شمارہ ۳۵۸ دسمبر ۱۹۶۲ء میں نکلا، اور شمارہ ۳۵۹ جو میرے پاس موجود آخری شمارہ ہے، مارچ ۱۹۶۵ء میں نکلا، اس وقت اشرف ادیب کی عمر تراسی ۸۳ سال تھی، ۱۹۶۶ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا، ماہوار شمارے بھی سولہ ۱۶ صفحات پر مشتمل ہوتے تھے،

اس مدت میں اشرف ادیب کی ذاتی زندگی کے دو ۲ واقعات قابل ذکر ہیں، ایک ۱۹۳۲ء میں وہ مصر جا کر اپنے دوست عاکف سے ملے، یہ غالباً ترکی کے باہر ان کا پہلا سفر تھا، دوسرا واقعہ نومبر ۱۹۵۲ء میں اخبار وطن کے ایڈیٹر احمد امین یلمان پر ملاطیہ میں قاتلانہ حملہ ہے، احمد امین یلمان کو ترک مسلمان عام طور پر دونمہ (یعنی وہ یہودی جو ظاہری طور پر مسلمان بنے ہوئے ہیں) کہتے ہیں، انہوں نے ترکی کے پہلے مقابلہ حسن کی سرپرستی کی تھی، جس پر کسی شخص نے ان کو قتل کرنے کی کوشش کی، اس واقعہ کے بعد ترکی میں اسلام پسندوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی، ترک قوم پرستوں کی تنظیم ترک ملیت جیلر درنیگی کی تمام شاخیں بند کر دی گئیں، اور اگرچہ اشرف ادیب کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن ان کو گرفتار کر لیا گیا، اور دو ماہ تک قید میں رکھا گیا،

سبیل الرشاد بند ہونے کے بعد اشرف ادیب نے اخبار یئی استقلال (۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۷ء) اور بوگون (۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۹ء) میں مضامین لکھے، ۱۹۷۰ء میں روزنامہ یئی آسیا کے مالک مصطفیٰ پولاد کے کہنے پر انہوں نے اپنے خودنوشت حالات لکھنا شروع کیے، لیکن ابھی ۱۹۱۲ء تک ہی پہنچے تھے کہ ۱۹۷۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا، یہ حالات ان کی وفات کے کئی سال بعد یئی آسیا میں ۵ جنوری ۱۹۷۸ء تا ۲۶ جنوری ۱۹۷۸ء میں بائیس ۲۲ قسطوں میں شایع ہوئے، اشرف ادیب نے توحید افکار، یئی صباح

ملت اور دیانت میں بھی مضامین لکھے،

کتب خانہ سبیل الرشاد سے جسے بعد میں انھوں نے آثار علمیہ کتب خانہ[1] کا نام دے دیا تھا، جو اہم کتابیں شایع کیں، ان کے لیے ایک مستقل مضمون درکار ہے، اس سلسلے میں اہل پاکستان کے لیے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی، کہ اشرف ادیب آخری عمر میں دار المصنفین اعظم گڈھ کی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سیر الصحابہ رض اور تاریخ اسلام کا ترکی زبان میں ترجمہ کروا رہے تھے، منصوبہ کے تحت یہ کام دس ہزار صفحات پر مشتمل ۲۵ پچیس جلدوں میں پورا ہوتا تھا، اس سلسلہ کی تین جلدیں عصر سعادت کے نام سے ۱۹۶۲ء تک شایع ہو چکی تھیں، اور مہاجرین کے حالات پر مشتمل تھیں، چوتھی جلد سے انصاری صحابہ رض کے حالات شروع ہو رہے تھے، اور اس کا بھی ترجمہ ہو چکا تھا، اور اشرف ادیب نے اس پر ایک مقدمہ ہجرت کی اہمیت پر لکھ دیا تھا، لیکن معلوم نہیں یہ کام بعد میں کہاں تک مکمل ہوا، عاکف کے داماد اور اشرف ادیب کے رفیق عمر رضا دوغرل نے شبلی کی الفاروق کا ترکی میں جو ترجمہ کیا تھا، وہ ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہ بھی غالباً آثار علمیہ کتب خانہ سے شایع ہوا تھا،

---

[1] آثار علمیہ کتب خانہ سے جن ممتاز مصنفوں کی کتابیں شایع ہوئیں، ان میں عاکف، اسماعیل حامی دانشمند، عمر رضا دوغرل اور احمد نعیم کے نام قابل ذکر ہیں۔

اشعار وقصائد کی دینی حیثیت

از

مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈا نگری ناظم جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال

شعر وشاعری کی قیمت اسلام کی نگاہ میں کیا ہے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیا درجہ دیا ہے؟ اصحاب النبی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اشعار سے کیا دلچسپی رکھتے تھے؟ مندرجہ ذیل تحریر میں ان تمام چیزوں پر کچھ روشنی پڑے گی۔

امام بیہقی حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت سے نقل فرماتے ہیں کہ سورۃ شعراء میں عام شعراء کی مذمت کے بعد شعرائے اسلام کو اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا الخ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے خود مستثنیٰ فرمایا ہے، حضرت حسان بن ثابت عبد اللہ بن رواحہ، کعب بن زہیر شعرائے اسلام اسی زمرہ میں شمار کئے گئے ہیں (بیہقی ج عاشر باب شہادۃ الشعراء ص ۲۳۹، ادب المفرد ص ۱۲۶)

ظاہر ہے کہ محاسن اسلام ومعارف دین اور نعت النبی سے متعلق دلنشین وموثر مضامین شعروں میں باندھنے والے شعرائے کرام آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کے ذیل میں داخل ہیں، عموماً صحابہ کرام اچھے ہی اشعار کہتے تھے، امام بیہقی رح لکھتے ہیں کہ ایسے اشعار جو نصیحت آموز ہوں اور اسلامی تعلیمات پر مشتمل ہوں، ان کا پڑھنا، سننا سب مشروع ودرست ہے (بیہقی ج ۵ ص ۶۹) شعر میں خواہ عاشقانہ غزل کا لطف نہ آئے اور خواہ کوئی شوخی وتیزی باقی نہ رہ جائے مگر اس کے مضامین معرفتِ الٰہی وحب رسول وتقویٰ وغیرہ اسلامی تعلیمات ہی سے متعلق ہونا چاہئیں۔

بیہقی شریف میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً بعض اشعار میں دانائی کی باتیں ہوتی ہیں، پس دراصل ایسے ہی بصیرت افروز، علم آموز اشعار شریعت کی نظر میں مستحسن ہیں (بیہقی ج ۵ ص ۶۸)

علامہ خازنؒ اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں عن ابن عباس قال جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجعل یتکلم بکلام فقال ان من البیان لسحراً وان من الشعر لحکمۃ (ابوداؤد) (تفسیر خازن ج ۳ ص ۱۷۳) یعنی ایک بدو کے کلام پر آپ نے فرمایا کہ بعض بیان جادو اور بعض شعر حکمت ہیں

اشعار کے متعلق ایک فیصلہ امام بخاریؒ کی الادب المفرد میں ایک باب کا عنوان یہ ہے کہ الشعر حسن کحسن الکلام ومنہ قبیح یعنی جس طرح نثری عبارت میں اچھے برے مضامین ہوا کرتے ہیں، اسی طرح شعروں میں بھی اچھے برے معلومات و مواد ہوتے ہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فیصلہ فرمایا الشعر بمنزلۃ الکلام حسنہ کحسن الکلام و قبیحہ کقبح الکلام (الادب المفرد ص ۱۲۵ مطبع خلیلی آرہ سنہ ۱۳۰۶ھ) یعنی اشعار کو عام گفتگو کی طرح سمجھو، جیسے بعض کلام اچھے ہوتے ہیں ویسے ہی بعض اشعار بھی اچھے ہوتے ہیں، اور جس طرح بعض کلام برے ہوتے ہیں اسی طرح بعض اشعار بھی قبیح و ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں الشعر منہ حسن ومنہ قبیح خذ بالحسن ودع بالقبیح (الادب المفرد ص ۱۲۷) یعنی اشعار اچھے برے ہر قسم کے ہوتے ہیں تو تم کو اچھے اشعار کا انتخاب کر لینا چاہئے اور ناپسندیدہ و قبیح اشعار کو ترک کر دینا چاہئے۔

اشعار کی سادگی و پاکیزگی حضرت حسانؓ بن ثابت وہ شاعر اسلام ہیں جو حقائق دین و معارف اسلام و حب رسول وغیرہ پر سادہ و پرشکوہ اشعار کہتے تھے، ان کے کلام میں اسلام سے قبل والا عاشقانہ

رنگ منہ پھر کسی نے ان سے کہا ہو مشعر یف فی الاسلام یعنی تمہارے اشعار میں جو رنگ اسلام سے قبل تھا اب وہ باقی نہ رہا، اب تمہارے اشعار بوڑھے معلوم ہوتے ہیں، اس کا انھوں نے خوب جواب دیا کہ اسلام کذب بیانی سے مانع ہے اور اشعار کی زینت مبالغہ آرائی اور کذب بیانی ہی ہے یعنی رائی کو پربت بنا کر دکھانا، قطرہ کو سمندر کر دکھانا، شعروں میں لطف کی چیز سمجھی جاتی ہے، اور یہ چیزیں اسلام میں منع ہیں، شاعر اسلام حضرت حسانؓ کا یہ مقولہ ان الاسلام یمنع من الکذب وان الشعر یزینہ الکذاب، شعراء کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے

اشعار کو کذب و مبالغہ سے پاک ہونا چاہئے

اشعار میں کذب و غلو اور غصہ کے وقت ہجو ناجائز ہے اس طرح شعر گوئی میں ایسا انہماک و اشتغال بھی ناجائز ہے جس سے ذکر الٰہی، تلاوت قرآن کریم اور فرائض کی ادائیگی میں غفلت و کوتاہی ہونے لگے، امام بیہقیؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ کی یہی رائے ہے، اور انھوں نے اپنی کتابوں میں مندرجۂ ذیل باب بھی قائم کیا ہے باب ما یکرہ ان یکون الغالب علی الانسان الشعر حتی یصدہ عن ذکر اللّٰہ والعلم والقرآن (بخاری ج ۲ ص ۹۰۹ ایضاً بیہقی ج ۱۰ ص ۲۴۴، ایضاً الادب المفرد ص ۱۲۹ مطبع خلیل آرہ)

لیکن امام بیہقیؒ اور امام بخاریؒ کی یہ بات کچھ شعر گوئی کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ جس مباح عمل اور مشروع امر میں انہماک و اشتغال کسی دوسرے فرض کے ترک و ضیاع کا باعث ہو تو وہ بھی ناجائز ہوگا مثلاً مطالعہ کتاب یا تصنیف و تالیف یا تلاوت قرآن پاک یا مشق قرأۃ میں اگر اس قدر توغل ہو کہ اس کی وجہ سے نماز کا وقت نکل جائے یا نماز وغیرہ سے غفلت و بے پرواہی پیدا ہو جایا کرے تو یہ امور باوجود جائز ہونے کے ناجائز ہو جائیں گے (ملاحظہ ہو بیہقی ج ۱۰ ص ۲۱۹)

مدحیہ اشعار میں مبالغہ کی ممانعت

اشعار میں مبالغہ و اطناب بھی عموماً شاعروں کی عادت ہے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے، بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک شخص کی بے حد تعریف کر رہا ہے تو فرمایا تم نے اسے خاک میں ملا دیا پھر فرمایا کہ اگر تعریف ضروری ہو تو بھی حد سے زیادہ مبالغہ نہیں کرنا چاہئے۔ (بخاری ج کتاب الشہادۃ باب ما یکرہ من الاطناب من الکلام)

ہجو میں مبالغہ اور غلو ناپسندیدہ ہے ہجو میں مبالغہ اور غلو کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے، فرمایا کہ دو قسم کے آدمی مجرم ہیں، ایک وہ شاعر جو پورے قبیلہ کی ہجو کر رہا ہے دوسرے وہ آدمی جو اپنے باپ سے اپنی نسبت کو الگ کر رہا ہے (الادب المفرد، مطبوعہ مصر ص۱۲۶)

آج کل معاملہ برعکس ہے، مدح ہوتی ہے تو افراط اور غلو کا پہلو نمایاں، اور ہجو و مذمت کی نوبت آتی ہے تو تفریط کا پہلو غالب رہتا ہے، عام طور سے اخلاقی، اصلاحی، انقلابی شعار بہت کم نظر آتے ہیں، ایسی حالت میں ہمیں اپنے ذوق کے مطابق اشعار کا اچھا انتخاب خود کر لینا چاہئے فرمانِ نبوت میں اس کی طرف رہنمائی موجود ہے،

پیشہ ور ہنسانے والے شاعروں کا انجام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان الرجل یتکلم بالکلمۃ یضحک بہا جلساءہ یہوی بہا من ابعد من الثریا یعنی محض ہنسانے کی خاطر شعر و شاعری کرنے والے یا گپ بازی کرنے والے ثریا سے بھی زیادہ بلندی سے پستی کی طرف پھینک دیئے جاتے ہیں۔ (مسند احمد ج۲ ص۴۰۲)

آنحضرتؐ کا اشعار سننا اور پسند فرمانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اشعار کو سنتے اور پسند فرماتے تھے اور اس سلسلہ میں اپنے ذوقِ لطیف کا اظہار بھی فرماتے۔ (استیعاب لابن عبد البر ج۱ ص۱۳۲)

استیعاب میں عہد نبوی کے شعراء کا مفصل تذکرہ ہے، حسان بن ثابتؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ اور کعب بن مالکؓ شعرائے دربار نبوت یک شعرائے محسنین (اچھے شاعروں) میں شمار کیے جاتے تھے (بیہقی ج۱۰ ص۲۳۹)

ذیل میں اشعار کے سلسلہ میں چند روایات نقل کی جاتی ہیں [illegible]

میں اسلام کا موقف واضح ہو جائے گا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے [illegible]

ابیاتک کہ تمہارے اشعار کیا ہوئے ؟ میں کہتی اِحْ اَبیاتِی تُرِید یا رسول اللہ [illegible]

کہ حضور ! میرے بہت سے اشعار ہیں آپ کس قسم کا شعر سننا چاہتے ہیں [illegible]

آپ فرماتے اپنے وہ اشعار سناؤ جو خدائے تعالیٰ کی شکر گزاری میں ہیں آپ [illegible]

بحوالہ استیعاب تذکرہ عائشہؓ

امام بخاریؒ ادب المفرد میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کعب بن مالکؓ کے

اشعار و قصائد کے علاوہ دوسرے شعراء کے اشعار بھی مجھ کو حفظ تھے (الادب المفرد صـ۱۲۶)

اشعار سننے کی فرمائش | عرب میں عورتیں بھی عموماً شاعرہ ہوتی تھیں، خنساء ایک بلند پایہ شاعرہ

تھیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرمائش کر کے اشعار سنتے اور ان کے اشعار کو بہت پسند

فرماتے تھے۔ وہ سناتی جاتی تھیں اور آپ فرماتے ھیہ یا خنساء یعنی اے خنساء ابھی اور

سناؤ (استیعاب کتاب النساء صـ۷۴۳)

اشعار کی تعریف | سبعہ معلقہ کے مشہور شاعر لبید بن ربیعہؓ کے ان اشعار کو آنحضرتؐ خود بھی پڑھتے

اور ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے کہ یہ کتنے سچے اور اچھے اشعار ہیں

الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل   وکل نعیم لا محالۃ زائل

وکل امرء یوماً سیعلم سعیہ   اذا کشفت عند الالہ المحاصل

(صحیح بخاری ج ۱، باب ایام الجاہلیۃ صـ۵۴۳، استیعاب ج [illegible])

(ترجمہ) اللہ کے سوا ہر چیز معدوم ہونے والی اور تمام نعمتیں زوال پذیر ہونے والی ہیں اور

قیامت میں جب ہر شخص کو عمل کا نتیجہ ظاہر ہوگا تو اسے اپنی کوشش کی قدر و قیمت معلوم ہو جائے گی۔

[illegible] بن رواحہ [illegible]

[illegible]

[illegible] (استیعاب [illegible])

انی تفرست فیک الخیر اعرفہ — واللہ یعلم انی ما خاننی البصر

انت النبی ومن یحرم شفاعتہ — یوم الحساب فقد ازری بہ القدر

(استیعاب ج ا صفحہ ۳۵)

(ترجمہ) میں اپنی فراست سے آپ کی ذات میں بھلائی کو تاڑ گیا، اور اللہ خوب جانتا کہ میری نگاہ نے غلطی نہیں کی آپ وہ نبی اکرم ہیں جن کی شفاعت سے قیامت کے دن کسی محروم رہنا اس کے شومئ قسمت کی دلیل ہے۔

حضورؐ کا ایک نشست میں سَو شعر سننا

ایک صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضورؐ کے ساتھ تھا تو آپ نے امیہ ابی صلت کے اشعار سنانے کی مجھ سے فرمائش کی، چنانچہ میں سنانے لگا تو آپ کا یہ حال تھا کہ ہر شعر سننے کے بعد فرماتے کہ اور سناؤ یہاں تک کہ میں سَو اشعار سنائے۔ (مسند احمد ج ۴ صفحہ ۳۹۰)

امام بخاریؒ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک صحابی نے حضورؐ کی مسلسل فرمائش پر سَو شعر سنائے۔ (الادب المفرد صفحہ [illegible])

ان روایتوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوقِ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ آپ اچھے اشعار سننے کے لیے مشتاق رہتے تھے، نیز صحابۂ کرام اچھے اشعار کو یاد رکھتے تھے۔

مسجد میں اشعار سننے سنانے کی اجازت

مسجد میں بھی اشعار سنانے کی اجازت تھی، چنا

حضرت [illegible] اکثر [illegible] حضور [illegible]

اپنے اشعار سنانا اور حضور کا بھی سننے کی دعوت دینا کعب بن زہیر نے جب آپ کی خدمت [illegible] بانت سعاد سنایا تو حضرت نے اسے بڑی توجہ سے سنا [illegible]

ج ۱ ص[illegible]) اور دوسرے حاضرین کو بھی شریک مجلس ہونے کی دعوت دی، چنانچہ امام بیہقی نے لکھا ہے کہ واشار بکمه الی الخلق لیاتوا فلیسمعوا منه یعنی سب کو اس کے شعر سننے کے لئے حضورؐ نے اشارہ سے بلا لیا تاکہ سب لوگ آکر سنیں اور لطف اندوز ہوں۔ (بیہقی ج ۱۰ ص۲۴۳)

حضرت عباسؓ کے مدحیہ اشعار جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس ہوئے تو آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے فرمایا یارسول اللہ إنی ارید ان امتدحک یعنی اے اللہ کے نبی میں آپ کی مدح میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تو آپ نے فرمایا قل لا یفضض اللہ فاک ۔ اللہ تمہارا منہ تر و تازہ رکھے، چنانچہ انھوں نے ایک طویل مدحیہ نظم کہی جس کا آخری شعر ہے:

فنحن فی ذالک الضیاء وفی النور　　سبیل الرشاد نخترق

(زاد المعاد ج ۲ ص[illegible])

(ترجمہ) ہم لوگ آپ کے ضیاء نبوت اور آفتاب ہدایت کی روشنی میں راستہ طے کرتے ہیں،

فتح مکہ کے موقع پر مبارکبادی کے اشعار ضرار بن خطاب قریش کے بڑے زبردست شاعر تھے، فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے اور آپ کی خدمت میں یہ مبارکباد دیتے ہوئے حاضر ہوئے جس میں قریش کی درخواست بھی گذاری تھی، یہ قصیدہ بھی طویل ہے اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

یانبی الهدی الیک لجاء　　حیّ قریش ولات حین لجاء

(استیعاب ج ۲ ص[illegible])

(ترجمہ) اے ہادیٔ اکرمؐ آپ ہی کی ذات قبیلۂ قریش کی جائے پناہ ہے اور آپ کی ذات سب کا [illegible]

[illegible]

أتيت رسول الله [illegible] بالهدى ... ويتلو كتاباً كالمجرة نيرا

أقيم على التقوى وأرضى بفعلها ... وكنت من النار المخوفة [illegible]

یعنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت حاضر ہوا کہ آپ ہدایت لے کر آئے ہیں جو آسمان کی سفید دھاری کی طرح منور ہے میں تقویٰ پر قائم رہوں گا اور اس پر مداومت کروں گا اور جہنم کی آگ سے پرہیز کروں گا۔

علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ یہ قصیدہ تقریباً دو سو اشعار پر مشتمل ہے جسے حضورؐ نے سنا اور سن کر فرمایا اجدت لا یفضض اللہ فاک یعنی تم نے خوب کہا، اللہ تعالیٰ تمہارے منہ کو تر و تازہ رکھے، (استیعاب ج ۱ ص ۳۲۱ و ۳۲۲) اس واقعہ سے بھی اچھے اشعار کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بیماروں کی شاعری | جب مکہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ طیبہ پہونچے تو وہاں کی آب و ہوا اکثر اصحاب کو ناموافق ہوئی، حضرت بلالؓ بیمار ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ بھی بیمار ہوئے، حضرت عائشہؓ عیادت کو حاضر ہوئیں تو سب نے بیمار پرسی کے جواب میں اپنے اشعار سنائے، حضرت بلالؓ نے بڑی تمنا سے وطن مالوف کی یاد میں یہ شعر سنایا:

الا لیت شعری هل ابیتن لیلة ... بواد وحولی اذخر وجلیل

(استیعاب و کنز العمال ج ۷)

(ترجمہ) کاش مجھے ایک رات اس وادی میں گذارنا نصیب ہوتا جہاں میرے گرد اذخر و جلیل قسم کی گھاسیں ہیں

اسی سلسلہ میں حضورؐ نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ مدینہ کو ہم سب کے لئے محبوب بنا دے اور خوشگوار کر دے (سنن اربعہ)

...ان بن ثابتؓ اکثر کفار کے ہجو و اعتراض کا جواب دیتے اور ...

هجوت محمداً فاجبت عنه   وعند الله فی ذاك الجزاء

... محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمہاری بدگوئیوں کا جواب دیتا ہوں اللہ تعالیٰ سے ...
...جر کی امید رکھتا ہوں۔

فان ابی و والدتی و عرضی   لعرض محمد منکم وقاء

یعنی میری عزت اور میرے ماں باپ سب سرورِ کائناتؐ کی عزت کیلئے نثار ہیں۔ (بیہقی ج باب شمائل الشعراء ۲۳۳)

مجلس نبویؐ میں اشعار خوانی | امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام جب حضورؐ کی مجلس میں شعر گوئی و شعر خوانی کرتے تو آپؐ بعض اشعار کی لطافت و ظرافت پر مسکرا دیتے اور تبسم فرماتے (بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۲۴۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں باہم شعر خوانی کرتے جسے خود آپ بھی سنتے تھے۔

صحابہ کرام سے اشعار سنانے کی فرمائش | علامہ ابن عبد البرؒ حضرت ابو الدرداءؓ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کسی نے ان سے کہا مالك لا تقول الشعر وكل لبيب من الانصار قال الشعر (آپ کیوں نہیں شعر کہتے حالانکہ انصار کے تمام ذی ہوش لوگوں نے اشعار کہا ہے) فرمایا کہ میں بھی شعر کہتا ہوں تو سنو!

یرید المرء ان یوتی مناه   ویابی الله الا ما اراده

یقول المرء فائدتی ومالی   وتقوى الله افضل ما استفاده

یعنی آدمی چاہتا ہے کہ اس کی تمام آرزوئیں حاصل ہوں، مگر ہوتا ہے وہی جو اللہ چاہتا ہے، آدمی کہتا رہتا ہے کہ یہ میرا مال ہے یہ میرا نفع ہے مگر اللہ کا تقویٰ ہی اصلی دولت ہے (صفوۃ الصفوۃ صفحہ ۲۴۳)

مجلس مشاعرہ کا انعقاد | امام شعبیؒ سے روایت ہے کہ کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہؓ کے نام حضرت

غرض حضرت عمرؓ نے [illegible] کو لکھا کہ وہاں جو شعراء ہیں ان کو طلب کرکے ان سے جاہلیت اور اسلام کے زمانہ کے اشعار سنیں اور ان کی روداد ہمیں بھی لکھ بھیجو، چنانچہ مغیرہ بن شعبہ نے مجلس شعراء آراستہ کی انھوں نے سب سے پہلے لبید بن ربیعہ سے کہا انشدنی ما قلت من الشعر فی الجاھلیۃ و الاسلام یعنی زمانہ جاہلیت اور اسلام میں تم نے جو اشعار کہے ہوں ان کو سناؤ، انھوں نے جواب دیا سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی نعمت پانے کے بعد میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا، اللہ نے مجھے یہ نعم البدل عطا کیا۔ اب مجھے اشعار میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی، پھر اغلب عجلی سے کہا کہ تم اپنے شعر مجھے سناؤ، اس نے کہا أرجزاً تريد ام قصيداً لقد سألت هيناً موجوداً اور لوگوں سے بھی اسی طرح سوال وجواب ہوئے۔ جب حضرت مغیرہؓ نے یہ ساری باتیں لکھ کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیجیں تو انھوں نے حکم دیا کہ اغلب کے وظیفہ میں سے پانچسو ماہوار گھٹا کر لبید کے وظیفہ میں پانچسو ماہوار اضافہ کر دو۔ آخر اغلب حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور اپنا وظیفہ بحال کرا لائے، اور لبید کا بھی پانچسو ماہوار وظیفہ انھیں تا عمر بیت المال سے ملتا رہا۔ (صفوۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۳۱)

ادب، زبان، شعر وخطابت کا مقابلہ خود حضورؐ نے بھی کرایا ہے (زاد المعاد ج ۱ ص ۲۵)

حضرت عمرؓ کو لبید کا ادبی ذوق بہت پسند آیا جس کی وجہ سے وہ قرآن کی ادبی فصاحت وبلاغت اور معنوی لطافت کے سامنے اشعار عرب کو بے قیمت اور بے لذت خیال کرتے تھے، ان کی یہ ادا حضرت عمرؓ جیسے قدر شناس خلیفہ کو بھا گئی۔

قطع مسافت کیلئے اشعار خوانی

بیہقی میں حضرت عمر فاروقؓ کے اس سفر حج کا واقعہ موجود ہے جس میں ان کے ساتھ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ بھی تھے، جب ان دونوں نے خوات شاعر سے ضرار کے اشعار سنانے کے لئے کہا تو حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ تم خود اپنے اشعار سناؤ۔ چنانچہ وہ خود اپنے ہی اشعار صبح تک ان حضرات کو سناتے رہے۔
(بیہقی ج ۵ ص ۶۵)

طولِ سفر کیلئے اشعار خوانی | معرفت ثانی ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت
عمران بن حصین کے ساتھ ایک سفر میں کوذے بصرہ تک رہا اس سفر میں ہر منزل ہم
پر ہم قیام کرتے اور حضرت عمرانؓ تقاضہ کر کے مجھ سے اشعار عرب سنتے۔ (الادب المفرد)

حضرت عمرؓ نے بعض ایسے شعروں کا مصداق خود حضور کو ٹھہرایا | حضرت عمرؓ جب زہیر بن ابی سلمیٰ کا یہ شعر پڑھتے جو اس نے ہرم بن سنان کے متعلق کہا ہے:

ولو کنت من شیئ سوی بشر ۔۔۔ کنت المضیٔ للیلۃ البدر

یعنی اے ممدوح اگر تم انسان کے سوا کچھ اور ہو سکتے تو میں کہتا کہ ماہ کامل یعنی بدر میں روشنی پیدا کرنے والے تمہیں ہو۔

تو حاضرین مجلس سے کہتے کہ اس شعر کے مصداق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ (مسند احمد ج ۳ ص ۹۱)

شعراء کو انعام | سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض شعراء کو خوشی میں انعام بھی مرحمت فرمایا ہے۔ (بیہقی عاشر ص ۲۴۱)

شاعروں اور زبان دانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم | حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے مال کے ذریعہ اپنی آبرو بچاؤ لوگوں نے پوچھا کہ مال دے کر آبرو بچانے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا
تعطون الشاعر ومن تخافون لسانہ (یعنی جس کی زبان سے ذلیل ہو جانے کا خطرہ ہو جیسے شاعر وغیرہ تو اُن کو مال دے کر آبرو بچاؤ) (مسند احمد ج اول ص ۲۲۴)

حضرت عمران بن حصینؓ کے پاس ایک شاعر آیا، آپؐ نے رخصت کے وقت اس کو کچھ عطیہ دیا، کسی مصاحب نے دریافت کیا کہ شاعر کو کس قسم کا انعام دیا گیا ہے؟ فرمایا کہ عزت و آبرو کس کو نہیں عزیز ہے۔ (ادب المفرد ص ۵۲)

حضرت عمر فاروقؓ ایک مرتبہ باہر نکلے تو قبیلہ غطفان کا وفد موجود تھا، آپ نے چند اشعار پڑھکر پوچھا کہ یہ کس کے شعر ہیں، ان لوگوں نے کہا کہ نابغہ کے، فرمایا ھٰذا اَشعرُ شعراءکم یعنی یہ تمہارے سب شاعروں میں بڑے شاعر ہیں۔ (مرآۃ الجنان ج۱ ص۲۱۹)

سرمایہ دار کے خلاف شاعر کی شکایت پر توجہ حضرت عمرؓ کے پاس زبرقان بن بدر نے حطیہ شاعر کے ہجو کی شکایت کی، تحقیق سے حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ حطیہ نے واقعی ہجو کی ہے تو اس کو بلاکر جیل خانہ میں ڈال دیا، وہاں سے حطیہ نے لکھا کہ میں تو قید میں ہوں میرے بچے بھوکوں مر رہے ہیں، آخر حضرت عمرؓ نے اس کو جیل خانہ سے نکالا اور پوچھا کہ تو کیوں کسی مسلمان کی ہجو کرتا ہے، اس نے کہا کہ شاعری ہی میری کمائی، اور زبرقان میری قوم میں دولت مند ہے اس کو میری کمزوری اور میرے کثیر العیال ہونے کی خبر ہے لیکن کبھی اس نے خود سے خیال نہیں کیا، اور جب میں سوال پر مجبور ہوا تو اس نے سوال کے باوجود بھی محروم رکھا، وہ خود تو مزے اڑاتا اور اونٹ کی طرح ڈکاریں لیتا ہے اور میں اپنے بال بچوں سمیت روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کا محتاج تھا، یہ سنکر حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، آپ نے اس کے بال بچوں کی تعداد معلوم کرکے سب کا خرچ سال بھر کے لئے دیدیا اور فرمایا کہ ختم ہونے کے بعد پھر میرے پاس آنا۔ (منتخب کنز العمال ج۱ ص۳۰۱)

شاعر کے لئے سفارش و عطیہ حضرت عمرؓ نے حطیہ شاعر کو اس کی بدگمانی اور ہجو گوئی پر قید کردیا تھا، کیونکہ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے ان اعظم الناس جرماً شاعر یہجو القبیلۃ من اسرھا (الادب المفرد ص۱۳۷) یعنی وہ شاعر بڑا مجرم ہے جو پورے خاندان کی ہجو کرتا ہے۔

بہرحال جب ہجو گوئی کے جرم میں حطیہ قید ہوا تو حطیہ نے حضرت عمرؓ کے پاس چند شعروں کے ذریعہ رہائی کی درخواست کی کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے ایک نگہبان کو آپ نے قید میں ڈال رکھا ہے ؎

القیت کاسبھم فی قعر مظلمۃ　　فاغفر علیک سلام اللہ یا عمر

یعنی آپ نے بچوں کیلئے کمانے والے کو تاریک جیل خانہ میں ڈال رکھا ہے اے عمر! تم کو خدا تیری ہدایت کرے
حضرت عمرؓ نے لوگوں کی بدگوئی نہ کرنے کا عہد لیکر اس کو آزاد کر دیا، اس کے بعد اس نے کہا
کہ مجھ کو اشعار ہی سے میری کمائی ہوتی تھی، جسے آپ نے روک دیا، اس لئے علقمہ بن علاثہ کے پاس
آپ ایک سفارشی خط لکھ دیجئے"، انھوں نے بعض صحابہ سے مشورہ کے بعد علقمہ کو خط لکھ دیا،
مگر یہ جب خط لیکر وہاں پہونچا تو لوگ علقمہ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوکر واپس آرہے تھے حطیئہ نے
اس کے لڑکے کو حضرت عمرؓ کا خط دیا، لڑکے نے پوچھا کہ اگر میرا باپ زندہ ہوتا تو تم کو ان سے
ملنے کی کیا امید تھی؟ اس نے کہا کہ سو ایسی اونٹنیاں جن کے پیچھے ان کی اولاد بھی ہوتی، لڑکے نے
یہ سنتے ہی سو بچوں والی اونٹنیاں اس کے حوالہ کر دی، (مرآۃ الجنان جلد ۱ ص ۱۹۳)
"اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے ایسے مظاہرے پھر کہاں نصیب ہوں گے.

امام زین العابدین کا عطیہ فرزدق شاعر کے لئے | مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حج میں ہشام بن عبد الملک طواف کے بعد حجر اسود کا بوسہ دینا چاہتا تھا، لیکن کثرت ازدہام کے سبب نہ دے سکا
تو ایک اونچے مقام پر امرائے شام کے ساتھ جاکر الگ بیٹھ گیا، یکایک امام زین العابدین علی بن
حسین بن علی بن ابی طالب آئے جو بہت خوبصورت تھے، اور جن کے بدن سے خوشبو نکلتی تھی، انھوں نے
بڑے سکون و اطمینان سے طواف کیا اور جب حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے بڑھے تو لوگوں نے انکی عظمت
واحترام اور تقدس کی بنا پر جگہ خالی کر دی، یہ منظر رؤسائے شام کے سامنے ہوا، ایک سردار نے کہا
کہ یہ کون جلیل القدر اور عظیم المرتبت ذات ہے، ہشام نے کہا لا اعرفہ (مجھے خبر نہیں ہوگا کوئی)
فرزدق وہاں موجود تھا اس سے نہ رہا گیا اور فوراً بول اٹھا کہ یہ وہ شخص ہے جس کو ساری خدائی
پہچان رہی ہے، یہ کہکر اس نے امام زین العابدین کی شان میں ۲۵ شعروں کا ایک قصیدہ پڑھا

جس کے چند اشعار یہ ہیں :

هٰذا الذی یعرف البطحاء وطأته ۔۔۔ والبیت یعرفه والحل والحرم

هٰذا ابن خیر عباد الله کلهم ۔۔۔ هٰذا التقی النقی الطاهر العلم

یعنی یہ وہ شخص ہے جس کو ساری خدائی پہچانتی ہے اور بیت اللہ، اہل حرم اور ارض پاک بطحاء کے لوگ جس کا صدق دل سے احترام کرتے ہیں۔

ہشام ان کی یہ تعریف سنکر سخت خفا ہوا اور فرزدق کو جیل خانہ بھجوا دیا امام زین العابدینؓ کو خبر پہونچی تو انھوں نے بارہ ہزار درہم فرزدق کو انعام دیا۔ (مرآۃ الجنان ج اول ص ۲۳۹)

جریر شاعر کی قدر افزائی | شاعر اسلام جریر سے حضرت عمر بن عبد العزیزؓ بھی خاص انسیت رکھتے تھے یافعیؒ کے الفاظ ہیں کان عمر بن عبد العزیز لا یاذن لاحد من الشعراء ان یدخلوا علیه الا لجریر۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ شاعروں میں صرف جریر شاعر کو اپنے یہاں حاضری کی اجازت دیتے تھے۔

جریر کی قدر و منزلت | ابن خلکان نے لکھا ہے کہ شعرائے اسلام میں جریر ایک نامور شاعر گزرا ہے، ایک بار عبد الملک بن مروان کے دربار میں اس نے ایک قصیدہ پڑھا جس میں صرف ایک شعر میں دودھ سے سیرابی کی تمنا کا اظہار تھا، عبد الملک گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا جیسے شعر کو جب پڑھ رہا

الستم خیر من رکب المطایا ۔۔۔ وأندی العالمین بطون راح

یعنی کیا جتنے لوگ سواریوں پر سوار ہوتے ہیں انمیں تم سب سے بہتر نہیں ہو اور کیا سخاوت و فیاضی کے اعتبار سے پوری دنیا کے سب سے بڑے سخی تم لوگ نہیں ہو،

تو عبد الملک اٹھ بیٹھا اور کہا کہ ہو کفیف کی سو دودھ والی اونٹنیاں تمکو کافی نہ ہونگی کہا کہ بہت کافی ہونگی

پھر جریر نے کہا کہ امیر المؤمنین فمن مشائخ فلو امرت لی بالرعاء کہ ہم مشائخ ہیں آپ نگرانی چرواہا بھی عنایت [illegible] کے سامنے سونے کی بڑی بڑی سینیاں تھیں، انکو بھی دودھ کا برتن بنانے کیلئے عنایت فر

عورت اور پردہ

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

Zakir Husain Library, Jamia Nagar, New Delhi

اس خاکسار کے پاس دہلی کے بیت الحکمۃ کی طرف سے ایک سمینار کے لئے جب دعوت نامہ پہونچا تو اس میں فرمائش تھی کہ میرا مقالہ "عورت اور پردہ" پر ہو۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس چبائے ہوئے نوالے کو کس طرح چبایا جائے، اس پرانی بحث میں کونسی نئی بات کہی جا سکتی ہے جو اب تک نہیں کہی جا سکی، مقالہ لکھنا تھا اس لئے اس خیال سے لکھنے بیٹھ گیا کہ یہ پرانی بات شاید کسی نئے انداز میں بیان ہو جائے تو پہلے پردہ سے متعلق ذرا دل تھام کر احکامِ الٰہی سماعت فرمائیں، قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ سے فرماتے ہیں:

"مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی عصمت کی حفاظت رکھیں، اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو اس میں سے کھلا رہتا ہے، اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں، مگر ان لوگوں کے سامنے جیسے شوہر یا اپنے شوہر کے باپ، اپنے بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائیوں کے بیٹوں، اپنی بہنوں کے بیٹوں، اپنی عورتیں اپنے غلام و مرد خدمت گاروں جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے یا ایسے لڑکوں جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے واقف نہیں ہوئے ہیں، وہ چلتے وقت اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے" (النور ۳۱)

پھر سورۃ الاحزاب میں ہے:

اے نبی اپنی بیویوں بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (الاحزاب: ۸)

ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد عورتوں کے لئے حجاب لازمی ہو گیا، مگر وہ باہر نکل سکتی تھیں جس کے لئے وہ نقاب یا جلباب یا برقع استعمال کرتی رہیں۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ باہر نکلنے میں عورتوں کا اضطراری یا ناگزیر حالات و ضروریات میں ہاتھ یا چہرے کا کوئی حصہ کھول پڑے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ چہرہ اور کلائی کے جوڑ تک ہاتھ حصہ ستر میں داخل نہیں ہے۔ عہدِ رسالت میں عورتیں نقاب یا جلباب کے ساتھ برابر نکلتی رہیں بلکہ غزوات میں بھی شریک ہوئیں، جنگ احد میں حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ اپنی پیٹھ پر پانی کے مشکیزے لاد لاد کر لاتی تھیں اور لڑنے والوں کو پانی پلاتی تھیں، اسی جنگ احد میں ام سلیطؓ اور ام عمارہؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں ہر طرف رہ کر آپ کی حفاظت کے لئے جان لڑاتی ہوئی نظر آتی تھیں ام عمارہؓ تو دشمنوں کے ہاتھوں زخمی بھی ہوئیں، اسی جنگ میں ربیع بنتؓ معوذ خواتین کی ایک جماعت کے ساتھ زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول تھیں، اور مجروحین کو اٹھا اٹھا کر مدینے لے گئی تھیں، جنگ حنین میں ام سلیمؓ ایک خنجر ہاتھ میں لئے پھر رہی تھیں کہ اگر کوئی مشرک ان کے قریب آیا تو وہ اس کا پیٹ پھاڑ دیں گی، غزوۂ خندق میں حضرت زبیرؓ کی والدہ حضرت صفیہؓ نے بڑی بہادری دکھائی، بنو قریظہ کا ایک یہودی وہاں پہونچ گیا جہاں عورتیں تھیں، حضرت صفیہؓ نے اپنے خیمہ کے ایک ستون سے اس کو قتل کیا، ام عطیہؓ رسول اللہ کی سات لڑائیوں میں آپ کے ساتھ رہیں، کیمپ کی حفاظت کرنا، سپاہیوں کے لئے کھانا پکانا، زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری کرنا ان کے سپرد تھا۔ حضرت عائشہؓ تو جنگ جمل کی سربراہی خود ہی کر رہی تھیں۔

ان مثالوں سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی ضرورت اور مصیبت کے وقت عورتیں گھر سے باہر نکل کر میدانِ جنگ میں بھی کام کر سکتی ہیں، مگر اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ ضرورت مصیبت اور لڑائی ہو یا نہ ہو، عورتوں کو محکمۂ جنگ میں کوئی نہ کوئی ملازمت ضرور دیدی جائے کیونکہ عہد رسالت میں خواتین میدان جنگ میں کام کرتی رہیں یا ان کو کمانڈر ان چیف اس لئے مقرر کیا جائے کہ حضرت عائشہؓ سپہ سالاری کا فرض انجام دے چکی ہیں، حضرت عائشہؓ یا دوسری صحابیات جنگ میں خدمات انجام دینے کے بعد اپنے گھروں ہی کی طرف پلٹ آئیں، کیونکہ اسلام کی تعلیم کے مطابق عورت کی اصلی راجدھانی اس کے شوہر کا گھر ہے، جہاں بخاری شریف کی حدیث کے مطابق وہ حکمراں بن کر رہتی ہے اور وہیں اپنی اس حکومت کے دائرہ میں اپنے عمل کے لئے جوابدہ ہے،

(بخاری شریف کتاب الاحکام باب قول اللہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم)

وہ گھر کے اندر اس لئے نہیں رہتی ہے کہ مرد اس پر ظلم کر کے اس کو چار دیواری میں مقید کر دیتا ہے بلکہ وہ نسوانیت کی حیا، شرم، عظمت اور سطوت کا پیکر بن کر گھر کی زینت بنی رہتی ہے، اسی میں اسکی نسوانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایک بار حضرت اسماءؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا اے رسول اللہؐ مرد ہم سے بازی لے گئے، رسول اللہؐ نے پوچھا اے اسماء کس طرح؟ عرض کیا مرد کے لئے نماز جمعہ فرض ہے، وہ اس کا ثواب سمیٹتے ہیں نماز جنازہ میں شرکت کرتے ہیں، جہاد میں جا کر شہید ہوتے ہیں یا غازی، اور عورتیں گھروں میں بیٹھ کر ان تمام ثواب سے محروم ہیں، وہ صرف بچے پالتی ہیں، مردوں کے لئے روٹی پکاتی ہیں اور چولہے جھونکتی رہتی ہیں۔

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسماء تم عورتوں سے کہہ دو جن کی نمائندہ بن کر تم آئی ہو کہ مرد باہر کے اتنے کام کر کے مدارج پاتے ہیں، عورتیں گھر میں رہ کر بچوں کو تربیت دیتی ہیں، مردوں کے لئے کھانا پکاتی ہیں، گھر کا سکون بہم پہونچاتی ہیں تو درجے میں تم دونوں برابر

نہیں کہ مرد کو زیادہ درجات ملیں اور تم کو کم۔

گھر کے اندر رہنے کے باوجود عورت کے ایسے تمدنی، معاشرتی اور معاشی حقوق ہیں جو عورت کو دیئے نہیں گئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اس کے حقوق بھی ہیں؟ (البقرہ ۲۲۸)
آل عمران میں ہے کہ "میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو۔ (آل عمران ۱۹۵)

اور آج یورپ یا امریکہ کو اپنی صحیح یا غلط قسم کی آزادی نسواں پر جتنا بھی ناز ہو لیکن مسیحی یورپ کے ابتدائی دور کے ائمہ اور اولیائے کبار میں ترتولیان اور کرائی سوسستم کی تعلیم یہ تھی، عورت شیطان کے آنے کا دروازہ، شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی، خدا کے قانون کو توڑنے والی، مرد کو غارت کرنے والی، ایک ناگزیر برائی، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گر دلربائی، ایک آراستہ مصیبت ہے، مگر تقریباً اسی زمانہ میں رسول اللہؐ نے ماں، بیوی، بیٹی کے جو مدارج مقرر کئے اس پر آج بھی انسانیت ناز کر سکتی ہے، ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! مجھ پر حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ فرمایا: تیری ماں کا، اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں کا، اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا: تیری ماں کا، اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا: تیرا باپ۔ اللہ نے تم پر ماں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کر دی ہے۔ (بخاری کتاب الادب)

اسی طرح آپ نے فرمایا کہ دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔ (نسائی کتاب النکاح)
یہ بھی فرمایا کہ جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہونچ گئیں تو قیامت کے روز میں اور وہ اس طرح آئیں گے جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں (صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الاحسان الی البنات) خود رسول اللہؐ نے اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اپنی محبت کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان سے صحیح معنوں میں نسوانیت کا درجہ بلند ہو گیا ہے۔

مگر ہمارے تجدد پسند حضرات ان مولویانہ مواعظ کو پردہ کی حمایت میں [illegible] کے لئے تیار نہیں۔ وہ تو قرآن حکیم، حدیث شریف، اور اسلامی روایات کی ایسی تاویلیں اور تعبیریں چاہتے ہیں جن سے موجودہ دور میں عورتوں کو وہی آزادی حاصل ہو جو غلطی سے مغربی ممالک میں ہے۔ اب سے بہت پہلے جسٹس امیر علی کی اسلامی حمیت اور غیرت پر مسلمانوں کو ناز تھا، انھوں نے اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف سراسینز لکھ کر مسلمانوں کے بگڑے ہوئے ذہن کو اسلامی بنایا، مگر انھوں نے اپنے زمانہ یعنی ۱۸۹۹ء کا ایک انگریزی رسالہ نائنٹینتھ سنچری میں یہ لکھنے میں تامل نہیں کیا کہ

"یہ لمبا برقع، نقاب اور خار سلجوقیوں کے آخری زمانہ میں رائج ہوا، اور جس قسم کا پردہ آج کل مسلمانانِ ہند میں رائج ہے خلفاء کے زمانہ میں اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا، بلکہ برعکس اس کے اعلیٰ طبقہ کی عورتیں بلا برقع کے مردوں کے سامنے آتی تھیں، ساتویں صدی ہجری کے وسط میں جب خلفا ضعیف ہوئے اور تاتاریوں نے اسلامی حکومت کو درہم برہم کیا تو اس وقت اس پر نزاع ہوئی کہ عورتیں اپنے ہاتھ منہ اور پاؤں اجنبیوں کے سامنے کھول سکتی ہیں کہ نہیں"

جسٹس امیر علی کی اس پر زور تحریر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی بیوی ایک انگلستانی خاتون تھیں، ان کی موجودگی میں وہ اس پردہ کی حمایت کیسے کر سکتے تھے جس کے احکام قرآن حکیم میں ہیں، مولانا شبلیؒ نے ایک طویل اور مدلل مضمون میں اس کا جواب دیا کہ پردہ کے متعلق تمام دنیا میں مسلمانوں کا جو طریق عمل رہا وہ یہ تھا کہ کبھی کسی زمانہ میں عورتیں بغیر برقع اور نقاب کے باہر نہیں نکلتی تھیں، اور بجز کسی خاص حالت کے نامحرموں سے منہ چھپاتی تھیں، یہاں تک کہ یہ امر معاشرت کا سب سے بڑا اور مقدم مسئلہ بن گیا تھا، (پردہ اور اسلام مقالات شبلی جلد اول ص۱۱۱)

مگر اب مسلمانوں کی معاشرت کا سب سے بڑا مقدم مسئلہ یہ بنا ہوا ہے کہ پردہ رہے کہ نہ رہے اِیہ

بالکل صحیح ہے کہ عورتیں پردہ میں کیوں رہیں، اس کے مقابلہ میں یہ آواز ضرور اٹھتی
کیوں نہ رہیں مگر اب یہ آواز ضعیف اور کمزور ہوتی جارہی ہے، مگر دونوں فریقین کے دلائل
جو فرق ہے وہ قابل غور ہے، بے پردگی کے حامی مستقبل کو سامنے رکھ کر اپنے دلائل دیتے ہیں جن میں
مات، ظنیات اور احتمالات کو زیادہ دخل ہوتا ہے، پردہ کے حامی جو کچھ کہتے ہیں وہ ماضی کے
ہات، تجربات اور یقینیات پر مبنی ہوتا ہے، بے پردگی کے حامی کہتے ہیں کہ سائنس کی ترقی سے
معمولی تمدنی، معاشرتی، صنعتی اور معاشی انقلابات پیدا ہو رہے ہیں ان میں اپنے نصف بہتر
رسے باہر نکال کر ان کو فعال اور متحرک بنایا گیا تو ترقی یافتہ ممالک کی طرح ہمارا معاشرہ بھی
ت مند، توانا، خوشحال اور شاندار ہو سکتا ہے، ہم نے بھی گولڈا مائر، مسز اندرا گاندھی اور مسز تھیچر
رکے، تو ہماری سیاست بھی بہت آگے بڑھ سکتی ہے مگر ممکن ہے کہ یہ محض خیالی جنت ثابت ہو،
نکہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم جو سمجھیں یا خواہش کریں وہ ہو بھی جائے۔

پردہ کے حامی صدیوں کے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک کا
اشرہ خوشحال اور مادی حیثیت سے شاندار ضرور ہے، مگر وہ توانا اور صحت مند اس لئے نہیں
ا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں کی بے پردگی کی وجہ سے ان کی خانگی، خاندانی، اخلاقی اور روحانی
سرتیں چھین لی گئی ہیں، اور کیا یہ تصور کرنا صحیح ہوگا کہ ہر زمانہ میں مسز تھیچر اور مسز اندرا گاندھی پیدا
وتی رہیں گی۔ انگلستان میں وزارت عظمیٰ کے لئے کوئی ڈس رائیلی، کوئی گلیڈ اسٹون، کوئی چیمبرلین
وئی چرچل اور ایٹلی تو پیدا ہوتا رہے گا، لیکن ایک مسز تھیچر صدیوں کے بعد ہوئی ہیں، اور شاید صدیوں
کے بعد ہی دوسری مسز تھیچر پیدا ہوں، ہندوستان کی پوری تاریخ میں صرف ایک مسز اندرا گاندھی
پیدا ہوئیں، اس کی تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہر زمانہ میں ہندوستان میں کوئی نہ کوئی مرار جی ڈیسائی
اور چرن سنگھ پیدا ہوتے رہیں گے مگر شاید دوسری مسز اندرا گاندھی نہ پیدا ہو، مسلمانوں کی تاریخ میں

ولید بن عبد الملک، ہارون رشید، عبدالرحمٰن ناصر، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، شمس الدین التمش، اکبر، شاہ جہاں، اور اورنگ زیب جیسے حکمران پیدا ہوئے جن پر مسلمانوں کو آج تک ناز ہے۔ مگر اس پایہ کی کوئی مسلمان عورت حکمران نہیں گزری۔ خود اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق کا مقصد بھی یہی قرار دیا ہے کہ وہ جلیل القدر فرمانروا کیا بلکہ انبیاء پیدا کر سکتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی کو نبوت نہیں دی، عیسائیوں نے حضرت مریمؑ کو تثلیث کے ذریعہ سے الوہیت کا درجہ دیا لیکن کلام پاک نے اسکی نفی پورے طور پر کی، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت مریم کے بطن سے بن باپ کے حضرت عیسیٰؑ کو پیدا کیا، لیکن حضرت مریمؑ کو نبوت عطا نہیں کی، نسوانیت کی تکمیل بلکہ معراج اسی وقت ہوتی ہے جب عورت کی گود بھر جاتی ہے، خواہ یہ گود بھر نے والا آگے چل کر نبی ہو، یا فلسفی یا ادیب یا مورخ یا سائنسداں یا دفتر کا ادنیٰ کلرک۔ یا فیکٹری کا مزدور ہی کیوں نہ ہو۔

پردے کے حامی اپنے ماضی کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ عورتوں کی خانہ نشینی کی وجہ سے معاشرے کے توانا، تندرست، خوشحال اور شاندار ہونے میں کب رکاوٹ ہوئی۔ بنو امیہ نے جو عرب امپائر بنایا، تو اڈورڈ گبن کا بیان ہے کہ یہ دو سو دن میں طے ہوتا تھا اسکی سرحد ہندوستان اور تاتاریوں کے علاقہ سے پھیل کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک تھی، بنو امیہ کی ایک شاخ نے اندلس میں جا کر حکومت قائم کی، تو بقول موسیولیبان یہ یورپ کی حکومت کی سرتاج بن گئی، بنو عباس کے بعض حکمرانوں نے رومن امپائر سے ٹکرے کر ان کو جزیہ اور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا، دولت عثمانیہ نے تو رومن امپائر کو ختم ہی کیا، اور ان کا امپائر رومن امپائر سے زیادہ شاندار بن گیا تھا، ہندوستان کی مغل حکومت بقول کے۔ ام پنیکر شاہ جہاں کے دور تک آتے آتے دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور ترین اور متمدن ترین حکومت بن گئی تھی، ان تمام حکومتوں کے زمانہ میں عورتیں چراغ خانہ ہی بنی رہیں، میدان جنگ یا دفتروں یا کارخانوں میں کام کرتی نہیں پائی جاتی تھیں۔

خود علامہ اقبال کی نظر اسلام کی پوری تاریخ پر رہی، اس لئے انھوں نے عورت کی
زندگی کا مقصد امومت قرار دیا ہے جس کی تکمیل جلوت کی ہوس میں نہیں بلکہ خلوت کی خاموشی
سے ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک امومت اپنی تکمیل کے بعد شفقت پیغمبری سے قریب ہو جاتی ہے
اور اسی امومت سے قوموں کی سیرت بنتی ہے، کہتے ہیں :

نیک اگر بینی امومت رحمت است — زانکہ او را با نبوت نسبت است
شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است — سیرتِ اقوام را صورت گر است
از امومت پختہ تر تعمیرِ ما — در خطِ سیمائے او تقدیرِ ما

(رموز بےخودی ص ۱۴۹)

اقبال نے اسلامی احکام ہی کے مطابق یہ قرار دیا ہے کہ عورت کا اصل نگہبان مرد ہی ہوتا ہے
کہتے ہیں :

اک زندہ حقیقت میرے سینے میں ہے مستور — کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی — نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا — اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

مگر مرد کی نگہبانی میں رہنے والی عورت ہی مردوں کی سیرت بنانے والی، ان کے ناموس کو محفوظ
رکھنے والی قوت دیں، اساس ملت اور امین نعمت دین حق اور سوز دیں ہوتی ہے۔ مخدرات اسلام
سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں :

اے ردایت پردۂ ناموسِ ما — تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما
طینتِ پاکِ تو ما را رحمت است — قوتِ دین و اساسِ ملت است
کودکِ ما چوں لب از شیرِ تو شست — لا الٰہ آموختی او را نخست

اے امینِ نعمتِ آئینِ حق در نفس ہائے تو سوزِ دینِ حق

(رموزِ بے خودی ص ۱۵۲)

اقبال کے نزدیک مخدراتِ اسلام سے مراد وہ خواتین ہیں جو چراغِ خانہ بنی رہیں، وہ نہیں ہیں جو شمعِ محفل بننے کی کوشش کرتی ہیں جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے

وان تہی آغوشِ نازک پیکرے خانہ پروردِ نگاہش محشرے

فکرِ او از تابِ مغرب روشن است ظاہرش زن، باطنِ او نازن است

(رموزِ بے خودی ص ۱۵۰)

آخر میں یہ کہنا ہے کہ پردہ سے متعلق احکامِ الٰہی ہوں یا حکیم الامت کی فلسفہ طرازی ہو، اس پر تھوڑی دیر کے لئے مذاکرہ، مناظرہ، مجادلہ اور مباہلہ تو کر لیجئے، لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں بے پردگی کی جو لہر نہیں بلکہ جو سیلِ رواں چل کھڑا ہوا ہے وہ روکے نہیں رک سکتا۔ اسلامی ممالک کی عورتوں کی اکثریت باہر نکل پڑی ہے اور وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ مردوں کی طرح اشرف المخلوقات میں داخل ہیں تو کیوں نہیں کائنات کی کھلی فضا میں کائنات کی تمام چیزوں سے مستفید ہوں، وہ چار دیواری کے اندر کیوں رہیں۔ عورت اپنے جسم کی ساخت اور دوسری حیثیت سے مردوں سے چاہے مختلف کیوں نہ ہو، وہ جب مردوں ہی کی طرح شہسواری کر سکتی ہے، موٹر چلا سکتی ہے، پائلٹ بن سکتی ہے، بندوق چلا سکتی ہے، پیر کر دریا عبور کر سکتی ہے، ہاکی کھیل سکتی ہے، سیاست کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے، تصنیف و تالیف افسانہ و ناول لکھ سکتی ہے، سائنس کے تجربات میں حصہ لے سکتی ہے، ملک کے فلاحی کاموں کو بہتر سے بہتر انجام دے سکتی ہے تو وہ چار دیواری کے اندر صرف امومت کے فرائض کیوں انجام دینے پر قناعت کرے۔ کیوں نہیں مردوں کی طرح زندگی کے تمام لذائذ سے متمتع ہو۔ ان کے لئے اخلاقی اور معاشرتی قدریں مردوں سے مختلف کیوں متعین کی جائیں، وہ ان کے تردیدی جواب

سننے کے تیار نہیں، بلکہ وہ دعویٰ کرتی ہیں کہ بے پردگی میں بھی وہ سب کچھ ہو سکتی ہیں جو اسلام چاہتا ہے۔

زمانہ ان کے حق میں قیامت کی طرح چل چکا ہے، اس لئے اب احکامِ الٰہی کے پابند بڑے بوڑھے زمانہ کو آیندہ کی نئی نسلوں کے حوالہ کر دیں کہ وہ انتظار کریں، اور دیکھیں کہ بے پردگی سے جو معاشرہ آئندہ کے لئے بنے گا اس میں عورتیں۔ خدیجہؓ، عائشہؓ، فاطمہؓ، زینبؓ، ام اشارہ، ام سلیمؓ، ام سلمہؓ، ام حلیمؓ، اور ام عمارہؓ وغیرہ بن کر رہینگی، ان کے بیٹے ان کی نافرمانیوں کو حرام قرار دیں گے، ان کی بیٹیاں اپنے باپ کو قیامت کے روز رسول اللہؐ کے ساتھ چلتے دیکھیں گی، وہ مردوں کی ناموس کی پردہ دار اور سرمایۂ ناموس کی تاب، دین کی قوت اور ملت کی اساس ثابت ہوں گی، یا بے پردگی سے ایسا معاشرہ بنے گا جس میں یہ عورتیں مردوں کی محض ذوقِ نظر اور سوزِ جگر کی تسکین بن کر رہ جائیں گی، یا یہ معاشرہ مردمؤنث۔ زن مذکر بوائے فرینڈ، گرل فرینڈ، کورٹ شپ آزادانہ خوش وقتی، عریانی، جوڑوان ناچ، کنواری ماؤں، حسن گاہوں، بالوں کو خوبصورت بنانے اور بال سنوارنے کی دوکانوں، مالش کدوں، حسن کی نمائش کے بے پناہ جذبہ، فیشن کے قیمتی لباسوں اور حسن افزائی کے مختلف النوع سامانوں کی حرص کا معاشرہ ہو جائے گا، زمانہ خود بتائے گا کہ آئندہ کون سا معاشرہ مرتب ہو کر رہے گا۔

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش   مجبور ہیں، معذور ہیں مردانِ خردمند

سیرۃ النبی جلد ششم

اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کو قرآن و حدیث و اسوۂ رسول کی روشنی میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ پیغمبر اسلام کا مقصد عبادات کے ساتھ اخلاق کی بھی تعلیم دینا تھا، جن کو اختیار کئے بغیر کوئی کامل مسلمان نہیں ہو سکتا دونوں لازم و ملزوم ہیں،   قیمت: ۔ ۔ ۳۰ روپیے۔

ادبیات

غزل

از جناب بسنت کمار ایڈووکیٹ، رکاب گنج لکھنؤ

منزل پہ کھینچ لائی رہِ پرخطر مجھے
رہزن لئے تھے یوں تو کئی گام پر مجھے

آیا جو میکدے میں تو جھکنے لگے ہیں جام
اٹھا تو دیکھنے لگے دیوار و در مجھے

دیر و حرم سے کوچۂ جاناں کو لے گیا
لے جائے گا کہاں یہ فریبِ نظر مجھے

میں ہم کلامِ جلوۂ نورِ ازل سے ہوں
دنیا سمجھ رہی ہے ابھی بے خبر مجھے

لبریز مے سے ہو گئے پیمانہ و سبو
جب وہ نگاہِ مست اٹھی دیکھ کر مجھے

وہ راہرو ہوں جس کی ہو منزل کو جستجو
آواز دے رہی ہے ہر اک رہگذر مجھے

ترکِ تعلقات بجا ایک شرط ہے
آنا نہ اب سے یاد کبھی بھول کر مجھے

میں نے کیا سوال نظر سے تو ہنس دیئے
کیا مختصر ملا ہے جوابِ نظر مجھے

دیکھا مجھے تو دیکھ کے چپ ہو گئے ہیں وہ
انجان بن گئے ہیں وہ پہچان کر مجھے

منزل نے بڑھ کے چوم لئے راہ میں قدم
عزم و یقیں نے دے دیا رختِ سفر مجھے

یہ ہے نصیب اپنا یہ ہے اپنی اپنی بات
ان کی خوشی ملی تو ملی چشمِ تر مجھے

آنسو بہا کے جھوٹے مجھے بس میں کر لیا
جادو جگا کے چپ ہے تری چشمِ تر مجھے

مدت سے تھا تلاش میں شیخِ حرم کی میں
ڈھونڈا تو میکدے میں کل آیا نظر مجھے

ترکِ تعلقات پہ پچھتا رہے ہو کیوں
کیوں یاد کر کے روتے ہو شام و سحر مجھے

چلتا رہا میں راہِ صداقت پہ اے بسنت
بہکا سکے نہ راہزن و راہبر مجھے

مطبوعات جدیدہ

ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (حصہ اول، دوم و سوم) مرتبہ جناب ثروت صولت صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات بالترتیب ۴۰۰، ۵۰۶، ۴۴۲، قیمت: ۳۶ و ۴۰ و ۳۷ روپے، پتہ: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۳۔ای شاہ عالم مارکٹ، لاہور، پاکستان۔

جناب ثروت صولت پاکستان کے اچھے اہل قلم ہیں، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ان کے مضامین اور کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، اسلامی تاریخ اور دنیائے اسلام کے حالات و مسائل ان کی دلچسپی اور توجہ کا خاص موضوع ہیں، انھوں نے اس کتاب میں ملت اسلامیہ کی سرگذشت اور روداد قلمبند کی ہے، اس اعتبار سے یہ گذشتہ چودہ سو برس کی مسلم حکومتوں کے اہم واقعات و حالات کی تاریخ اور ان کے عروج و زوال کی داستان ہے، جو چار حصوں میں مکمل ہوگی، ہمارے پیش نظر تین حصے ہیں، پہلا حصہ ۲۳ ابواب کا مجموعہ ہے، یہ ساتویں صدی ہجری کے نصف تک کے واقعات پر مشتمل ہے، اس کی ابتدا آغاز اسلام یعنی عہد نبوی سے ہوئی ہے اور خاتمہ زوال بغداد پر ہوا ہے، شروع میں اسلام سے پہلے کے بعض مذاہب اور دنیا کے حالات کا ذکر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی و مدنی زندگی کے ضمن میں آپ کے مختصر سوانح اور کارنامے بھی تحریر کئے ہیں، ایک باب میں مدینہ کی اس ریاست اور معاشرہ کے خط و خال کا تذکرہ اور اس کی نمایاں خصوصیات بیان کی گئی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا اور جس کی بنیاد خالص اسلامی اصولوں پر مبنی تھی، پھر خلافت راشدہ اور اس عہد کی فتوحات اور اہم کارناموں کا ذکر ہے، اسی جلد میں اموی و عباسی سلطنتوں، غزنویں، سلجوقیوں اور غوریوں کے واقعات کا تذکرہ ہے، آخر میں اندلس میں اموی

حکومت کے قیام و زوال، مشرق میں عباسیوں کی حکومت کے خاتمہ، سقوطِ بغداد اور صقلیہ کے ..
ذکر ہے، بغداد کے عروج کے عنوان سے دو ابواب میں عباسیوں کے عہد میں مختلف حیثیتوں سے اس کی
ترقی دکھائی گئی ہے، آخری باب مسلمانوں کے عروج کے دور اول کے خاتمہ پر اس عہد کی
مجموعی خوبیوں اور خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے، دوسری جلد ۳۶ ابواب پر مشتمل ہے اس میں مسلمانوں کے
زیرنگیں ملکوں اور حکومتوں کی اس زمانہ تک کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے، جب ان پر غیر مسلموں کا تسلط و
اقتدار قائم ہوا، اس طرح اس جلد میں ساتویں صدی کے نصف آخر سے بارہویں صدی کی ابتدا تک
کے واقعات زیر بحث آئے ہیں، اس کی ابتدا چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کے تذکرہ سے ہوئی ہے
اس میں پہلے ایلخانی حکمرانوں، وسط ایشیا کے تیموری فرمانرواؤں، مصر کے مملوک سلاطین، شمالی افریقہ
کے موحدین، مشرقی افریقہ اور مشرق بعید میں اسلام کی اشاعت اور وہاں کی مسلم حکومتوں کا تذکرہ ہے
اور آخر میں سلاطین دہلی، دولت عثمانیہ، وسط ایشیا کے ازبک اور ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کا ذکر
ہے، مغلوں کے انحطاط اور یورپ کے عروج کے ضمن میں محمد شاہ سے بہادر شاہ کے عہد تک کا تذکرہ ہے
اسی سلسلہ میں شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد، نادر شاہ اور احمد شاہ قاچار اور افغانی
حکمرانوں احمد شاہ ابدالی وغیرہ کا ذکر ہے، آخر میں آلِ عثمان کے زوال اور شمالی اور مغربی افریقہ پر
انگریزوں کے تسلط کا حال بیان کیا ہے، اور آخری باب اسلامی دنیا کی بیداری میں محمد بن عبدالوہاب
سعودی حکومت، سنوسی تحریک اور جمال الدین افغانی کی اصلاحی کوششوں کا ذکر ہے، تیسری جلد
میں موجودہ دور کے مسلم ملکوں کی تاریخ پیش کی گئی ہے، اس میں انڈونیشیا، ملیشیا، برونئی، پاکستان
بنگلہ دیش، کشمیر، افغانستان، ایران، ترکی، عراق، شام، لبنان اور اردن کی حکومتوں کے موجودہ حالات
و مسائل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، باقی ملکوں کا تذکرہ چوتھی جلد میں ہوگا، پہلے بطور پس منظر اسلامی
تاریخ کے امتیازی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے پھر مغربی و اسلامی نظریات کے تصادم پر گفتگو کی ہے ...

یہ ملوکی حکومت کی تاریخ اور اس کے بعد فلسطینی تحریک اور اس کے لیڈروں کا ذکر ہے، تینوں
جلد مکمل و مستند نقشے بھی شامل ہیں جن سے اسلامی تاریخ کے گذشتہ اور موجودہ واقعات
وغیرہ کے فہم میں آسانی ہوتی ہے، گو مصنف نے واقعات کو اہمیت کی نقطہ سے لکھا ہے تاہم آغاز اسلام
سے جنگ ... کے ہر اس خطہ کی اس میں تاریخ آگئی ہے جہاں مسلمانوں نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا
ہے اور یہ صرف فتوحات کی داستان حکومتوں کی تاریخ اور سیاسی واقعات کی کھتیونی ہی نہیں ہے بلکہ
مسلمانوں کی علمی، ادبی، معاشرتی اور تمدنی تاریخ بھی ہے، اس طرح لائق مصنف نے رزم میں بزم کی
شان پیدا کر دی ہے، تاریخ اسلام پر عربی، اردو، انگریزی ہر زبان میں کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر یہ کتاب
ایک گونہ منفرد نوعیت کی ہے، مصنف کے نزدیک مسلمانوں کی تاریخ ایک تحریک کی تاریخ اور ایک
نظریہ کے عروج و زوال کی داستان ہے، انھوں نے اپنے قارئین کو دعوت دی ہے کہ وہ اس تاریخ کا
مطالعہ ان اصولوں کی روشنی میں کریں جن پر ملت اسلامیہ کی بنیاد ہے، اور دیکھیں کہ مسلمانوں نے کہاں کہاں
ان اصولوں پر عمل کیا ہے اور کہاں کہاں ان سے انحراف کیا ہے، انھوں نے اسلامی تاریخ کے مطالعہ میں
اسلام ہی کو معیار بنانے پر زور دیا ہے، اور اسلامی نقطۂ نظر کے بجائے قوم پرستانہ نقطۂ نظر اختیار کرنے کی
مذمت کی ہے، وہ غیر اسلامی نقطۂ نظر کے حامل مسلمانوں کے بعض نامور اشخاص اور حکمرانوں کے کارناموں
کو صرف اس لئے سراہنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں کہ وہ غیر قوم کے مقابلے میں انجام دیئے گئے ہیں، کتاب
علمی حیثیت سے چاہے زیادہ بھاری بھر کم نہ ہو مگر مفید معلومات پر مشتمل اور اس لائق ہے کہ اسکولوں
اور کالجوں کے نصاب میں داخل کی جائے۔

تصوف کی تین اہم کتابیں: از مولانا سید احمد عروج قادری، تقطیع خورد، کاغذ،
کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت: سات روپیے پچاس پیسے، پتے:- (۱)
مرکزی مکتبہ اسلامی، چتلی قبر دہلی ۶ (۲) کریسنٹ پبلشنگ کمپنی ۲۴۵-۳۴۷-۳ گلی قاسم جان دہلی ۶

[illegible] زندگی کے ہر پہلو کو تصوف سے [illegible]
اور وہ صاحبِ نسبت و تعلق بھی ہیں، مگر وہ خالص اسلامی تصوف اور اس کی خوبیوں کے جہاں قائل و معترف ہیں، وہاں مروجہ تصوف اور اس کے بعض اعمال و اشغال اور نقائص کے ناقد بھی ہیں، اسی حیثیت سے اس کتاب میں انھوں نے تصوف کی مندرجۂ ذیل تین امہات کتب کا جائزہ لیا ہے (۱) کشف المحجوب (حضرت سید علی ہجویریؒ) (۲) فوائد الفواد (ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ) (۳) مکتوباتِ امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ، لائق مصنف نے ان کتابوں کے بارہ میں اپنے مطالعہ کے نتائج پیش کیے ہیں، پہلے انھوں نے ان کتابوں کا مختصر تعارف کرا کے ان کی اور ان کے مصنفین کی عظمت بیان کی ہے، پھر ان کے مندرجات کا جائزہ لیکر ان کی بعض مفید اور قیمتی بحثوں کو نقل کیا ہے، آخر میں ان کتابوں کے بعض ایسے مندرجات کی نشاندہی کی ہے جو ان کے نزدیک کتاب و سنت کی تصریح اور اسلامی تعلیم و ہدایت کے منافی ہیں، اس سلسلہ میں ان کتابوں کی بعض بے سروپا حکایتوں اور روایتوں کی تردید بھی کی ہے، کتاب کا خاتمہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے ایک بیان کی تردید پر ہوا ہے، جو حضرت مجدد صاحبؒ کی مدح و منقبت پر مشتمل ہے، ممکن ہے مصنف کے بعض خیالات سے کچھ لوگوں کو اتفاق نہ ہو، مگر ان کا یہ موقف درست ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کے مندرجات کے رد و قبول کا معیار کتاب و سنت کو بنایا ہے جو نہ صرف تصوف بلکہ دوسرے فنون کی کتابوں کے مطالعہ کا بھی صحیح و صائب معیار و اصول ہے۔

تحفۃ اہل الفکر فی مصطلح اہل الاثر (عربی)؛ مرتبہ مولوی عبد الرحمٰن عبید اللہ رحمانی مبارکپوری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ: مکتبہ رحمانیہ، رانی پور، اعظم گڈھ، اترپردیش۔

مولوی عبد الرحمٰن مبارکپوری نے اپنے والد بزرگوار مولانا عبید اللہ رحمانی کے ایما سے یہ رسالہ

لکھا ہے جس میں حدیث کے مصطلحات کی تعریف و توضیح کی گئی ہے، یہ دراصل ان کے والد ماجد
کی عظیم الشان تصنیف مرقاۃ المفاتیح کا دیباچہ ہے جو حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کی مبسوط
شرح ہے، مصنف نے عام قارئین اور طلبہ حدیث کی سہولت کے لئے اسے علیحدہ رسالہ کی صورت میں
بھی شائع کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ دوسرے اڈیشن میں مزید وضاحت کے لئے مصطلحاتِ فن
کی مثالوں کا اضافہ بھی کریں گے، اصول و مصطلحاتِ حدیث پر متعدد رسالے لکھے گئے ہیں، یہ بنیادی رسالہ
ان میں ایک اچھا اضافہ ہے جو حدیث کے طلبہ کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے۔

میری سیاسی سرگذشت : مرتبہ جناب مظفر حسن صاحب، تقطیع متوسط،
کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۹ مجلد مع گرد پوش، قیمت پندرہ روپے، پتہ:
از مصنف، لال باغ، لکھنؤ

جناب مظفر حسن شروع ہی سے کانگریس سے وابستہ تھے، ایک زمانہ میں وہ صوبائی کانگریس
کے سرکردہ لیڈر اور اترپردیش حکومت کے اہم وزیر خیال کئے جاتے تھے، یہ کتاب ان کی گذشتہ سیاسی
سرگرمیوں کی داستان ہے، اسکی ابتدا ہوم رول لیگ سے ہوئی ہے، اسکے بعد خلافت، نان کوآپریشن اور
کانگریس کی ہنگامہ آرا اور انقلابی جد وجہد کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں جماعتی اور اسمبلی انتخابات،
مسلم لیگ اور خود کانگریس کے مختلف گروہوں کی باہمی کشمکش وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے، اس سرگذشت
کا خاتمہ کانگریس کے ۲ حصوں میں منقسم ہونے اور جنتا پارٹی کی تشکیل اور اسکے افسوسناک انتشار پر
ہوا ہے، مصنف کانگریس کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو نام و نمود اور عہدہ و منصب کے لئے بھاگ
دوڑ کرنے کے بجائے بے لوث خدمت اور ایثار و قربانی کو ہر چیز پر مقدم خیال کرتی تھی، اس لئے یہ سرگذشت
اصلیت اور واقعیت پر مبنی ہے، البتہ مصنف کا تعلق الہ آباد سے ہے، اس لئے انکی سرگذشت کا خاص
محور یہ اور اسکے متصل اضلاع ہی ہیں، تاہم اس میں صوبہ کانگریس کے اکثر مشہور قومی کارکنوں کا بھی

تذکرہ ہے، یہ اتفاق ہے کہ ہندوستان کے دو گذشتہ اور موجودہ وزیر اعظم اور کئی مرکزی وزراء کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے، مظفر صاحب نے ضلع اور صوبہ کی سطح پر ان سب سے اپنے تعلقات و ملاقاتوں کی تفصیل بھی کہیں کہیں دی ہے، وہ ایک پرانے اور تجربہ کار قومی کارکن ہیں، ان سے مختلف شخصیتوں اور مسائل کے بارہ میں ان کی رائے باوزن ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"لال بہادر جی کی عجب شخصیت تھی، ہم لوگوں سے پوری ہمدردی رکھتے اور ان لوگوں سے خفا، وہ لوگ بھی ہم سے کم ان سے برگشتہ نہ تھے، لیکن شاستری جی کی کیا مجال کہ پنڈت جی نے کبھی ہماری صفائی میں یا ان کے خلاف منہ سے کچھ نکالتے، ہمارے خلاف قدم اٹھانے میں بھی دریغ نہ کرتے وہ تو لیڈر کے چشم و ابرو کو دیکھ کر اسی کے مطابق قدم اٹھاتے تھے شاستری جی نے جو اتنی بڑی ترقی کی اس کا بس یہی راز تھا، یہاں سے اوپر تک جو جو بھی پارٹی بندی ہوئی دونوں طرف بڑے مٹھاس کا تعلق رکھتے اور کافی خاکساری دکھاتے، پھر پارٹی بندی کا پورا پورا فائدہ انھیں کو ملتا، (ص ۲۳)

جنتا پارٹی کے انتشار اور اس کے بعض لیڈروں کے خط و خال نمایاں کرتے ہوئے بھی بڑی بے لاگ رائے دی ہے، مصنف کی پوری زندگی سیاسی ہنگاموں میں گذری، تصنیف و تالیف ان کا مشغلہ نہ تھا، اس لئے چاہے یہ کتاب زیادہ مربوط نہ ہو مگر اس سے گذشتہ قومی جد و جہد اور سیاسی مد و جزر کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

زندہ کتبے: مرتبہ جناب عروج زیدی صاحب، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۳۶ مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت بیس روپے، پتے (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶ (۲) نصرت پبلی کیشنز امین الدولہ پارک، لکھنؤ (۳)

[illegible]

جناب عروج زیدی اردو کے محرمِ دشت کے شاعروں میں ہیں، اس کتاب سے اندازہ ہوا کہ انہیں نثر نگاری کا بھی اچھا سلیقہ ہے، اس میں انھوں نے اردو کے مندرجۂ ذیل چھ شاعروں کے بارے میں اپنے تاثرات و مشاہدات قلمبند کئے ہیں، (۱) شاد عارفی، (۲) جگر مرادآبادی، (۳) نوح ناروی، (۴) راز یزدانی، (۵) شفیق جونپوری، (۶) ماہر القادری، ایسے ممتاز اور مخصوص و دلکش طرز تغزل کے حامل شعرا کو موضوع بنانا بھی عروج صاحب کی خوش مذاقی کا ثبوت ہے، یہ کتاب محض ان کے دلچسپ تاثرات و مشاہدات ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں مذکورۃ الصدر شعرا کی سرگذشتِ حیات بھی قلمبند کی ہے، اور ان کی ادبی و فنی حیثیت و اہمیت بھی واضح کی ہے، لائق مصنف کے ہر شاعر کے بارہ میں مختصر مگر جچا تلا جو تبصرہ کیا ہے، اس سے ان کے اچھے ادبی ذوق اور ادب و زبان کی باریکیوں سے واقفیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، اس طرح یہ شعراء کا ایسا خاکہ ہے جو دلچسپ اور معلوماتی ہونے کی بنا پر اربابِ ذوق کے لئے خاصے کی چیز ہے، مصنف کی تحریر کی شگفتگی اور طریقہ ادا کی رعنائی بھی قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔

سطحِ آئینہ : مرتبہ جناب فیاض ہاشمی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۰۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲ روپیے، پتہ: مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۷ سندری موہن ایونیو، کلکتہ ۱۴۔

جناب سہیل واسطی مرحوم اچھے ادیب و شاعر تھے، ان کو غزل گوئی سے زیادہ مناسبت تھی مگر ان کی نظمیں بھی خاصے کی چیز ہیں، یہ مجموعہ نظموں ہی پر مشتمل ہے، اس سے ان کی حساس طبیعت دردمند دل، فکر و مشاہدہ کی قوت اور عہد و ماحول سے واقفیت کا پتہ چلتا ہے، یہ نظمیں ایک ایسا آئینہ ہے جس میں دورِ حاضر کے لوگوں کے اصلی خط و خال دکھائی دیتے ہیں، اس میں دراصل انسان کی ذہنی و خیالی اور فکر و رجحان کی موجودہ پستی، اخلاقی و معاشرتی انحطاط اور سماج کے مختلف طبقوں

کی زندگی کی ناہمواری اور کجی کی عکاسی مؤثر اور عبرتناک انداز میں کی گئی ہے [illegible]
کے قول و عمل میں تضاد، مکر و فریب، داؤں پیچ اور ریا و نمود کی نشاندہی بھی کی گئی ہے [illegible]
حالات کے گھناؤنے پن ہی کو دکھانے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کا انسانی ہمدردی سے معمور [illegible]
اپنے کرب کا اظہار بھی کرتا ہے، یہ مجموعہ مصنف کی نظرثانی کے بغیر شائع ہوا ہے اس لئے اس میں کہیں
کہیں زبان و طریقہ ادا کی خامیاں بھی ہیں، تاہم اس میں ظاہر کئے گئے خیالات و جذبات نیک ہیں،
مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی یہ ادب نوازی لائق تحسین ہے۔

جنوبی ہند کی اردو صحافت (۱۸۵۷ء سے پیشتر) مرتبہ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۳۶، قیمت غیر مجلد ۱۵ روپیے، لائبریری اڈیشن ۱۸ روپیے، پتے: (۱) بک ڈپو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی حیدرآباد دکن، (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اردو صحافت پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں انہیں جنوبی ہند کی قدیم صحافت پر کم لکھا گیا ہے اس کتاب میں
جہاں کی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی اردو صحافت کا ذکر ہے پہلے صحافت کی اہمیت، دنیا کی مختلف زبانوں میں اسکی ابتدا کا ذکر
اور ہندوستان و جنوبی ہند میں انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں میں صحافت کا آغاز اور ہندوستان کے فارسی
اخبارات کا تذکرہ ہے، اسکے بعد ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز، اس زمانہ کے اخبارات اور مختلف جگہوں میں
اردو صحافت کی روداد قلمبند کی ہے، پھر جنوبی ہند میں اردو صحافت کی ابتدا اور مدراس سے شائع ہونے والے چند
اردو اخباروں کے متعلق معلومات درج ہیں، اسمیں ۱۸۵۷ء کے بعد کے دو اخباروں کا ذکر بھی اس لئے آگیا
ہے کہ ان کے سنہ اشاعت کے بارہ میں غلط بیانی کی گئی تھی۔ مصنف نے ہر اخبار کی بابت ضروری معلومات
فراہم کی ہیں اور اڈیٹر کا مختصر تذکرہ بھی لکھا ہے، آخر میں جنوبی ہند کے ۱۸۵۷ء سے قبل کی مطابع اور ان کی
خدمات و مطبوعات کا تذکرہ ہے، مصنف نے منتشر مواد کو سلیقہ اور محنت سے جمع کر کے اس پر اضافہ بھی کیا ہے،
اور بعض غلطیوں کی تصحیح بھی کی ہے، مگر اجرا کے بجائے کئی جگہ اجرائی لکھا ہے جو کھٹکتا ہے، [illegible]

ہندستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت وشان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ان کی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی رہیں، خود ہندستان کے مختلف فرماں روا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار یا پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے، لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم ونسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا، جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کرکے پیش کردی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت ۲۲۔۱ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

"منیجر"

حجۃ الاسلام مولانا شبلی کی بعض اہم تصنیفات

سیرۃ النبی حصہ اول: اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات و غزوات کی تفصیل اور اس پر تبصرہ، قیمت: ۲۹ روپیہ،

سیرۃ النبی حصہ دوم: اقامت امن، تاسیس خلافت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و شمائل کا مفصل بیان قیمت: بیس روپیہ

الفاروق: حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانحعمری اور اُن کے مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل مولانا شبلی کے قلم کی شاہکار کتاب، جس پر مصنف کو بھی ناز تھا، قیمت: ۲۲ روپیہ

الغزالی: حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل، ان کی تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ، قیمت: ۱۱ روپیہ،

المامون: خلیفہ مامون الرشید کی سوانح حیات کے علاوہ اس کے عہد حکومت کے سیاسی علمی مذہبی اخلاقی تمدنی حالات، جن سے دولت عباسیہ بغداد کے عروج و کمال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے

قیمت: ۱۱ روپے،

سیرۃ النعمان: امام ابوحنیفہ کی سوانح عمری، ان کے اجتہادات اور استنباط مسائل اور فقہ حنفی کی خصوصیات (زیر طبع)

سوانح مولانا روم: مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانحعمری اور ان کی شاہکار تصنیف مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ، (زیر طبع)

موازنۂ انیس و دبیر: مشہور مرثیہ نگار میر انیس کی شاعری پر ریویو، اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ زیر طبع

کلیات فارسی: مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ قیمت: ۱۱ روپیہ،

کلیات اردو: مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جو انہوں نے مسجد کانپور، جنگ طرابلس، غزوۂ بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھیں، قیمت: ۶ روپیہ

مکاتیب شبلی: مولانا کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، حصہ اول، حصہ ... ۱۹ روپیہ ۱۲۴

رجسٹرڈ نمبر اے ایل ۱۳۰- اگست سنہ ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد (پن ۲۷۶۰۰۱)

مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ

۳۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۔ ۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک مبنی کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت :۔ ۸ روپے

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت :۔ ۱۰ روپے

جلد سوم

اس میں اورنگ زیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

......(مرتبہ)......

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۳۴ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۴ء عدد ۲

مضامین

Jamia ... L.M.I. New ...

شذرات

گذشتہ مہینے کے شذرات میں ہندوستان کے نامور مورخ جدوناتھ سرکار کی تاریخ نویسی کی نوعیت کا ذکر آیا تھا، ان کی مورخانہ حیثیت کا جائزہ کچھ اور زاویہ نگاہ سے لینے کی ضرورت ہے۔

وہ اس ملک کے مغل حکمرانوں کے عہد اور خصوصاً عالمگیریات کے بڑے مستند مورخ سمجھے جاتے ہیں، ان کی ہسٹری آف اورنگ زیب کی پانچ جلدوں، سیواجی پر ایک جلد اور فال آف دی مغل امپائر کی چار جلدوں کی بڑی شہرت ہوئی، ان کو ان تحقیقی خدمات کے صلہ میں بڑے اعزاز حاصل ہوئے، برطانوی حکومت کی طرف سے سر کا بھی خطاب ملا، ان کتابوں میں ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کو پڑھتے وقت یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس میں بڑی معروضیت اور حقیقت پسندی ہے جس کو تسلیم کئے بغیر کوئی اور چارہ نہیں، اس اثر کے پیدا کرنے میں ان کی تحریر کی روانی اور برجستگی اور پھر زور بیان کے ساتھ ان کے طرز استدلالات، مغالطہ آمیز معلومات اور تعبیرات بہت زیادہ معاون ہوئیں، لیکن ان دسوں جلدوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ یہ یا تو انگریزوں کے اشارے سے یا ان کی خوشنودی کی خاطر لکھی گئیں۔

انگریزوں نے مغلوں کی حکومت کو ختم کر کے اس ملک پر اپنا غاصبانہ تسلط قائم کیا تو اس پر پردہ ڈالنے کی خاطر ان کی خواہش ہوئی کہ مغلوں کی حکمرانی کی بہت ہی بھیانک تصویر پیش کی جائے، اس کے لئے ضروری تھا کہ نہ صرف ان کے حکمرانوں بلکہ ان کے مذہب کی بھی زیادہ سے زیادہ بڑی مرقع آرائی کی جائے، پھر انگریزوں کی دعا کو مسعود ثابت کرنے کے لئے اس زمانے کے ملک کی بدحالی، ابتری اور انتشار پسندی کا نقشہ بھی ایسا پیش کیا کہ برطانوی حکومت کو یہاں کے لوگ رحمت الٰہی سمجھنے پر مجبور کئے جائیں

مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں جو کام الیٹ اور ڈاؤسن نے اپنی تاریخ ہند کی دس جلدوں میں

انجام دیا ہے جو جدوناتھ سرکار نے دوسرے انداز میں اپنی ذکر شدہ پانچ جلدوں میں انجام دے کر انگریزوں سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے، انھوں نے اپنی ہسٹری آف اورنگ زیب کے ۳۸ ویں باب میں ایک عنوان اسلامک اسٹیٹ چرچ ان انڈیا کے نام سے قائم کیا جس میں لکھتے ہیں کہ کسی فرقہ کے ساتھ رواداری کا اظہار کرنا مسلم ریاست میں گناہ سمجھا جاتا ہے، مسلم ریاست کا یہ نصب العین رہا ہے کہ ساری آبادی سے اسلام قبول کرا لیا جائے، اور جو انکار کرے اس کو ختم کر دیا جائے، غیر مسلم اسلامی حکومت کے شہری نہیں سمجھے جاتے ہیں، وہ اچھا لباس نہیں پہن سکتے، نہ گھوڑے کی سواری کر سکتے، نہ اسلحہ رکھ سکتے، اس سلسلہ میں یہ بھی لکھ گئے ہیں، جیسا کہ گذشتہ ماہ کے شذرات میں ذکر آیا ہے کہ مسلمانوں کا ایک خاص ذہن بن گیا ہے، وہ لوٹ مار اور قتل کو خدا کی راہ میں انسانیت کا خالص ترین فعل سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں، ایک مذہب جو اپنے پیرووں کی ڈاکہ زنی اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو، وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کافر کشی ایک مسلمان کے لئے وصف کہا جاتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھے، برائیوں کو دور کرے، یہ بھی اس کے لئے ضروری نہیں کہ اپنے میں زیادہ سے زیادہ روحانیت پیدا کرے، وہ اپنے انسانی ساتھیوں کے ایک خاص فرقہ کے لوگوں کو قتل کر دے، ان کی دولت اور زمین کو لوٹ لے، تو بس اس کی روح بہشت کی مستحق ہو جائے گی، (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۲ ص ۲۵۹)

ایسی بے بنیاد اشتعال انگیز اور زہریلی تحریر اسلام کا انتہائی درجہ کا معاند ہی لکھ سکتا ہے، مسلمانوں یعنی مغلوں کی حکومت کی مذمت جس طرح کی ہے اس کا ذکر بھی گذشتہ مہینے کے شذرات میں آیا ہے، وہ مغلوں کے امپائر کو قزاقی کہتے ہیں، ان کو جابجا غیر ملکی، حملہ آور اور سامراجی قوت کہہ کر یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ ان کی نسل مفتوحین سے فیاضی اور صنف نازک سے فیاضانہ بہادری دکھانا نہیں جانتی تھی (اورنگ زیب ج ۱ ص ۲۷)

اور چونکہ مسلمان اورنگ زیب کو ایک اچھا حکمران سمجھتے ہیں اس لئے جدوناتھ سرکار نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ ایسا بدترین حکمران ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ کوئی اور بدتر تصور نہیں کیا جا سکتا

ہے (اسٹڈیز ان موغل انڈیا ص ۶۲-۷۰) اس کو راون (اورنگ زیب ج ۳ ص ۸۲) ظالم (ایضاً ج ۱ ص ۱۳۱) جھوٹا اور دغاباز (ایضاً ج ۲ ص ۹۲) سنگ دل اور ضمیر فروش (ایضاً ج ۱ ص ۱۰۰) ہر شرمناک واقعہ سے فائدہ اٹھانے والا (ایضاً ج ۱ ص ۶۵) اپنی جنسی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو جانے والا (ایضاً ص ۲) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور شروع سے آخر تک یہ اثر پیدا کیا ہے کہ اس نے پچاس برس تک اس لئے حکومت کی کہ وہ قرآنی سیاست کے مطابق ہندوؤں کی زندگی کو ناقابل برداشت بنا دے، ان کو نیچا دکھائے ان کو حکومتوں کی ملازمتوں سے محروم کر دے، وہ معاشرتی ارتباط سے ناآشنا ہو کر زندگی بسر کریں (ایضاً ج ۵ ص ۴۸۵) ان کے مندروں کو منہدم کرتا رہے، ان کے علوم و فنون کو برباد کر دے، راجپوتوں کی حب الوطنی کو کچل کر رکھ دے، فادر لینڈ کی محبت میں لڑنے اور ہندوئی سوراجیہ قائم کرنے والے مرہٹوں کو تہس نہس کر دے

اورنگ زیب پر جو پانچ جلدیں ہیں، ان میں تو جدوناتھ سرکار نے یہ دکھایا ہے کہ اس کے خلاف مرہٹوں کی جنگ نیشنلزم کی تھی، انھوں نے مغلوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکا، اور اپنے فادر لینڈ کو غیر ملکیوں کے استیلا سے محفوظ کیا (اورنگ زیب ج ۱ ص ۱۲) اور پھر یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ راجپوت حب الوطنی کے جذبے میں لڑتے رہے، تاکہ وہ غیر ملکیوں کی حکومت سے آزاد ہوں اور اپنے ہی راجاؤں کے ماتحت رہیں اپنی سرزمین کو گنگا کے پانی اور تلسی کی پتیوں سے دھوئیں (ج ۵ ص ۲۹۲) مگر فال آف دی موغل امپائر کی چاروں جلدوں میں یہی مرہٹے اور راجپوت کچھ اور نظر آتے ہیں،

ان چاروں جلدوں میں مرہٹوں کی سرگرمیاں جہاں بہت کچھ لکھی گئی ہیں، وہاں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ نواب علی وردی خاں کی جہاں حکومت باقی نہیں تھی وہاں مرہٹے غارت گروں نے سڑکوں اور گاؤں میں ناقابل برداشت مظالم کئے، اور ان کی سفاکی سے پورے بنگال میں بڑی مصیبت رہی، لوگوں سے چاندی اور سونا چھین کر ان کے ہاتھ، ناک اور کان کاٹ دیتے، عورتوں کے ساتھ ہر قسم کا جرم کرتے، مندروں میں آگ لگا دیتے، کچھ لوگوں کو پٹک کر جوتوں سے مارتے، ان کا نعرہ ہوتا روپیہ دو روپیہ دو، اگر روپے نہیں ملتے تو

لوگوں کی ناکوں میں پانی بھر دیتے یا جس دم کر کے مار ڈالتے (ذکا : ج ۴ ص ۰۵-۰۴۹)

فادر ہیٹا میں ہندو مئی سوراجیہ قائم کرنے والے مرہٹوں نے راجپوتانہ میں جو غارت گری کی، اس پر مختلف ابواب میں تبصرہ کرنے کے بعد جدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ راجپوتانہ میں مرہٹوں کی سرگرمیاں چالیس برس تک یعنی ۱۷۴۰ء سے ۱۷۹۵ء تک ایسی رہیں کہ راجپوتوں کے دلوں میں ان کے خلاف ایسی نفرت پیدا ہوئی جو اب تک ختم نہیں ہوئی ہے (ایضاً ج ۲ ص ۲۴۲) اسی نفرت کی بدولت پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کی شکست فاش پر راجپوت خوش تھے، جدوناتھ سرکار کا یہ بھی بیان ہے کہ اس شکست کے بعد دکنی تسلط کے خلاف ہر طرف بغاوت تھی، گنگا کے دوآب، بندھیل کھنڈ، راجپوتانہ اور مالوہ میں ان کے خلاف شورش تھی (ایضاً ج ۲ ص ۲۴۹) ہے پور کے مادھو سنگھ نے تو اس زمانہ کے مسلمان امراء نجف اور یعقوب علی اور بجرنگ، کوٹا اور بوندی کے راجپوت راجاؤں سے مل کر مرہٹوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی اور شاہ عالم کو ایک مضبوط حکمراں بنانا چاہا، لیکن یہ سعی زیادہ کارگر نہیں ہو سکی، خود جدوناتھ سرکار نے یہ لکھا ہے کہ ۱۷۸۵ء میں مہدجی سندھیا پہلی دفعہ شاہ عالم کے حضور میں حاضر ہوا تو تخت کے سامنے سجدہ میں گر پڑا اور اپنا سر شاہ عالم کے پاؤں پر رکھ دیا، یہ مغل بادشاہ مرہٹوں کی ساری غارت گری اور چیرہ دستی کو بھول گیا، اور اس کو اپنا فرزند بنا لیا (ذکا ج ۴ ص ۲۳۱)

مرہٹوں کی اس کردار نگاری کے ساتھ جدوناتھ سرکار نے راجپوتوں کے کیرکٹر کی یہ تصویر کھینچی کہ ایک راجپوت زمین کی خاطر ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کر لیتا، باپ بیٹے، اور بیٹا باپ کو قتل کر دیتا، شریف ترین خاندان کی عورتیں اپنے بہت ہی قابل اعتماد رشتہ داروں کو زہر دے دیتیں، راجہ اپنے وفادار وزیروں کی جانیں لے لیتے، اپنے خانگی جھگڑوں میں بیرونی ڈاکو کی بھی مدد حاصل کر لیتے (ذکا ج ۱ ص ۱۲۱)، وہ یہ بھی لکھتے ہیں، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے کہ اورنگ زیب نے سارے علاقے فتح کر لئے، ہر جگہ امن و امان قائم ہو گیا، کہیں لڑائی لڑنے کی ضرورت نہیں رہی، تو راجپوت بے روزگار

ہو گئے۔ پھر تو وہ اپنے رشتہ داروں ہی سے لڑنے لگے، یا ڈکیتی پر آمادہ ہو گئے، یا اورنگ زیب سے جاگیر پانے کی خاطر اپنا مذہب بھی تبدیل کرنے لگے (مہلی تھن اورنگ زیب ج ۵ ص ۵۵-۳۵۴) محمد شاہ کے زوال کے زمانے سے راجستھان میں انتشار، لوٹ مار، اقتصادی بربادی اور اخلاقی زبوں حالی انتہا درجہ کی رہی (ایضاً ج ۲ ص ۳۴۳) راجپوت راجا عیاشی میں مبتلا رہنے لگے، بکثرت بیویاں رکھنے کے باوجود داشتائیں بھی رکھنے کے عادی ہو گئے جو محل کی سازشوں میں شریک رہتیں، ان کی وجہ سے راجپوتوں میں تباہی اور بربادی آتی رہی، اور ان کا کیریکٹر برباد ہو کر رہ گیا (ایضاً ج ۲ ص ۷۲)

جدو ناتھ سرکار نے اس زمانے کے جاٹوں کی غارت گری کی بھی پوری تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح انھوں نے آگرہ اور دہلی کو لوٹا، لاکھوں کی رقم لے گئے، عورتوں کی بے حرمتی کی، مکانات منہدم کر دیئے وہ مرہٹوں اور راجپوتوں کے لئے بھی دردسر بن گئے، پھر ان سے عاجز آکر مرہٹے، راجپوت، روہیلے، اور اودھ کے لشکری آپس میں متحد ہو گئے، اور مغل بادشاہ شاہ عالم کی قوت کو مؤثر بنانے کی کوشش کی تاکہ جاٹوں کی نوزائیدہ حکومت کا خاتمہ ہو جائے، مگر یہ کوشش بھی بارآور نہیں ہوئی (فال ج ۲ ص ۱۵-۳۰۴)

اس زمانے کے سکھوں کے متعلق جدو ناتھ سرکار نے یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے علاقے سے باہر نکل کر مرہٹوں کی طرح بلیک میل کرتے، جس طرح مرہٹے ملک گیری یا چوتھ وصول کرتے، اسی طرح وہ راکھی حاصل کرتے اگر کوئی یہ راکھی دینے سے انکار کرتا تو اس کو موت کا منہ دیکھنا پڑتا۔

جدو ناتھ سرکار نے یہ ساری تفصیلات پھیلا کر فال آف دی مغل امپائر کی چار جلدوں میں لکھی ہیں جن میں اپنی محنت، معروضیت اور حقیقت پسندی کا اظہار صرف یہ دکھانے کے لئے کیا ہے کہ جب ملک میں ہر طرف پراگندگی، زبوں حالی، ابتری اور انارکی تھی تو انگریز نمودار ہوئے، اور صحیح وقت پر پہنچے، اور ملک کو اپنی تحریروں کے علمی پردے پر بڑی خوش اسلوبی سے لاتے ہیں، ان کے ہم صوبہ مورخ بی۔ ڈی۔ باسو نے

اب ہماری قوت وہی تھی تیار ہیں ان لڑائیوں میں اور ڈلہوزی کے سارے کرتوتوں کی تفصیل لکھ کر اس کو اپنے
انہ کا مسیحا دیا کہا ہے مگر جدوناتھ سرکار نے اس کی ایسی تعریف کی ہے جیسے مغلوں کے دربار کا کوئی مورخ
اپنے شاہی آقا کی کرتا ہے۔ اس کی حیرت انگیز ذکاوت اور کارکردگی اس کی مافوق الفطری بصیرت اس کی
علمی قوت اپنے مقصد اور کامیابی کی تکمیل میں غیر معمولی عجلت کے ساتھ اس کے عملی اقدام و تعاون ہو جانے
کی قوت ارادی کی مداحی دل کھول کر کی ہے، اس کی فوج کے جنرل لیک کی جنگی تیاری کی داد یہ لکھ کر دی ہے
ایسی ہی تیاری سے ایک معیار قائم ہوتا ہے (فال: ج ۲ ص ۲۶۴-۴۸)

وہ لکھتے ہیں کہ دریائے سندھ سے گنگا تک کے علاقے میں عظیم انارکی تھی، انیسویں صدی کے آغاز میں
برطانوی فتوحات کے بعد ہی ختم ہوئی۔ (فال: ج ۳ ص ۱۰۵) وہ خوش ہو کر یہ بھی لکھتے ہیں کہ مغلوں
کی حکومت قزاقی تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست اور یہاں کے لوگوں نے انگلستان کی حکومت
کو آسانی سے قبول کر لیا (فال ج ۱ ص ۲۵۱) انھوں نے اس پر بھی اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ برطانوی
حکومت مصیبت زدہ رعایا کے زخموں کا پھایا بن گئی (فال: ج ۱ ص ۱۳۱-۳۳)

اور پھر انگریزوں کی حکومت کی مداحی کرنے میں ان کا قلم بالکل نہیں تھکتا، لکھتے ہیں کہ برطانوی حکومت
کی وجہ سے ہندوستان میں جو نشاۃ ثانیہ ہوئی، وہ دنیا کی تاریخ میں کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی، ہماری
سوسائٹی مایوسی کی حد تک زوال پذیر ہو گئی تھی، لیکن اسی زمانے میں یورپ کی حکمیاتی ترقی پذیر اسپرٹ بڑی
قوت کے ساتھ آ پہنچی، سب سے پہلے ایک ایماندار اور کارگزار نظام سلطنت ملک میں قائم ہو گیا، جس سے امن
بحال ہوا، اقتصادی ترقی ہوئی اور ہماری سوسائٹی کی خشک ہڈیوں میں خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ساحروں
کی جڑی بوٹی سے حرکت پیدا ہونے لگی، پھر ایک ایسی نشاۃ ثانیہ ظہور میں آگئی جو قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد یورپ
کی نشاۃ ثانیہ سے گہری وسیع اور انقلابی تھی (فال: ج ۴ ص ۳۰۲)

جدوناتھ سرکار یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ برطانوی حکومت ڈیڑھ سو برس تک روشن خیالی کی حکومت رہی

ہو گئے، پھر تو وہ اپنے رشتہ داروں ہی سے لڑنے لگے، یا ڈکیتی پر آمادہ ہو گئے، یا اورنگ زیب سے جاگیر پانے کی خاطر اپنا مذہب بھی تبدیل کرنے لگے (دہلی سلطنت اورنگ زیب ج ۵ ص ۲۲-۲۱۸) محمد شاہ کے زوال کے زمانے سے راجپوتانہ میں انتشار، لوٹ مار، اقتصادی بربادی اور اخلاقی زبوں حالی انتہا درجہ کی رہی (زوال ج ۲ ص ۲۰۶) راجپوت راجا عیاشی میں مبتلا رہنے لگے، بکثرت بیویاں رکھنے کے باوجود داشتائیں بھی رکھنے کے عادی تھے جو محل کی سازشوں میں شریک رہتیں، ان کی وجہ سے راجپوتوں میں تباہی اور بربادی آتی رہی، اور ان کا کیرکیٹر برباد ہو کر رہ گیا (ایضاً ج ۲ ص ۶۲)

جدوناتھ سرکار نے اس زمانے کے جاٹوں کی غارت گری کی بھی پوری تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح انھوں نے آگرہ اور دہلی کو لوٹا، لاکھوں کی رقم لے گئے، عورتوں کی بے حرمتی کی، مکانات منہدم کر دیئے، مرہٹوں اور راجپوتوں کے لئے بھی دردِ سر بن گئے، پھر ان سے عاجز آکر مرہٹے، راجپوت، روہیلے اور اودھ کے لشکری آپس میں متحد ہو گئے، اور مغل بادشاہ شاہ عالم کی قوت کو مؤثر بنانے کی کوشش کی، تاکہ جاٹوں کی نوزائیدہ حکومت کا خاتمہ ہو جائے، مگر یہ کوشش بھی بارآور نہیں ہوئی (زوال ج ۲ ص ۵۱-۳۰۷)

اس زمانے کے سکھوں کے متعلق جدوناتھ سرکار نے یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے علاقے سے باہر نکل کر ڈاکو کی طرح بلیک میل کرتے، جس طرح مرہٹے ملک گیری یا چوتھ وصول کرتے، اسی طرح وہ راکھی حاصل کرتے، اگر کوئی یہ راکھی دینے سے انکار کرتا تو اس کو موت کا منہ دیکھنا پڑتا،

جدوناتھ سرکار نے یہ ساری تفصیلات پھیلا کر فال آف دی مغل ایمپائر کی چار جلدوں میں لکھی ہیں جن میں اپنی محنت، معروضیت اور حقیقت پسندی کا اظہار صرف یہ دکھانے کے لئے کیا ہے کہ جب ملک میں ہر طرف پراگندگی، زبوں حالی، ابتری اور افراتفری تھی تو انگریز نمودار ہوئے، اور صحیح وقت پر پہنچے، وہ ان کو اپنی تحریروں کے غلی پردے پر بڑی خوش اسلوبی سے لاتے ہیں، ان کے ہم صوبہ مورخ بی۔ ڈی۔ باسو

کتاب ملفوظات کی تیاری اور ان لڑائیوں میں لارڈ ولزلی کے سارے کرتوتوں کی تفصیل لکھ کر اس کو اپنے زمانہ کا سب سے کامیاب آدمی کہا ہے مگر جدوناتھ سرکار نے اس کی ایسی تعریف کی ہے جیسے مغلوں کے دربار کا کوئی مورخ اپنے شاہی آقا کی کرتا ہے اس کی حیرت انگیز ذکاوت اور کارکردگی اس کی مافوق الفطری جمعیت اس کی تنظیمی قوت اپنے مقاصد کی کامیابی کی تکمیل میں غیر معمولی عجلت کے ساتھ اس کے عمل اقدام اور ساری ہونے والی قوت ارادی کی مداحی دل کھول کر کی ہے، اس کی فوج کے جرنل لیک کی جنگی تیاری کی داد یہ لکھ کر دی کہ ایسی ہی تیاری سے ایک معیار قائم ہوتا ہے (قال: ج ۲ ص ۲۸-۲۶۲)

وہ لکھتے ہیں کہ دریائے سندھ سے گنگا تک کے علاقے میں عظیم انارکی تھی، انیسویں صدی کے آغاز برطانوی فتوحات کے بعد ہی ختم ہوئی۔ (قال: ج ۳ ص ۱۰۵) وہ خوش ہو کر یہ بھی لکھتے ہیں کہ مغلیہ کی حکومت قزاقی تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست اور یہاں کے لوگوں نے انگلستان کی حکومت کو آسانی سے قبول کر لیا (قال ج ۱ ص ۱۵۲) انھوں نے اس پر بھی اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ برطانوی حکومت مصیبت زدہ رعایا کے زخموں کا پھایا بن گئی (قال: ج ۱ ص ۳۲۲-۳۲۱)

اور پھر انگریزوں کی حکومت کی مداحی کرنے میں ان کا قلم بالکل نہیں تھکتا، لکھتے ہیں کہ برطانوی کی وجہ سے ہندوستان میں جو نشاۃ ثانیہ ہوئی، وہ دنیا کی تاریخ میں کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی، ہندوستانی سوسائٹی مایوسی کی حد تک زوال پذیر ہو گئی تھی لیکن اسی زمانے میں یورپ کی حکمرانی ترقی پذیر اسپرٹ قوت کے ساتھ آ پہنچی، سب سے پہلے ایک ایماندار اور کارگذار نظام سلطنت ملک میں قائم ہو گیا، جس سے بحال ہوا، اقتصادی ترقی ہوئی اور سوشل سوسائٹی کی خشک ہڈیوں میں خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے سا کی چھڑی سے حرکت پیدا ہونے لگی، پھر ایک ایسی نشاۃ ثانیہ ظہور میں آ گئی جو قسطنطنیہ کے سقوط کے کی نشاۃ ثانیہ سے گہری وسیع اور انقلابی تھی (قال: ج ۳ ص ۳۰۲)

جدوناتھ سرکار یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ برطانوی حکومت ڈیڑھ سو برس تک روشن خیالی کی حکومت

ہوگئے، پھر تو وہ اپنے رشتہ داروں ہی سے لڑنے لگے، یا ڈکیتی پر آمادہ ہوگئے، یا اورنگ زیب سے جاگیر پانے کی خاطر اپنا مذہب بھی تبدیل کرنے لگے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۵۵۵-۵۵۶) محمد شاہ کے زوال کے زمانے سے راجپوتانہ میں انتشار، لوٹ مار، اقتصادی بربادی اور اخلاقی زبوں حالی انتہا درجہ کی رہی (فال ج ۱ ص ۳ ۔) راجپوت راجا عیاشی میں مبتلا رہنے لگے، بکثرت بیویاں رکھنے کے باوجود داشتائیں بھی رکھنے کے عادی ہوگئے جو محل کی سازشوں میں شریک رہتیں، ان کی وجہ سے راجپوتوں میں تباہی اور بربادی آتی رہی، اور ان کا کیرکٹر برباد ہو کر رہ گیا (ایضاً ج ۲ ص ۸۲)

جدوناتھ سرکار نے اس زمانے کے جاٹوں کی غارت گری کی بھی پوری تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح انھوں نے آگرہ اور دہلی کو لوٹا، لاکھوں کی رقم لے گئے، عورتوں کی بے حرمتی کی، مکانات منہدم کر دیئے، وہ مرہٹوں اور راجپوتوں کے لئے بھی درد سر بن گئے، پھر ان سے عاجز آ کر مرہٹے، راجپوت، روہیلے اور اودھ کے لشکری آپس میں متحد ہو گئے، اور مغل بادشاہ شاہ عالم کی قوت کو مؤثر بنانے کی کوشش کی، تاکہ جاٹوں کی نوزائیدہ حکومت کا خاتمہ ہو جائے، مگر یہ کوشش بھی بارآور نہیں ہوئی (فال ج ۲ ص ۱۵-۳۰۴)

اس زمانے کے سکھوں کے متعلق جدوناتھ سرکار نے یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے علاقے سے باہر نکل کر غنڈوں کی طرح بلیک میل کرتے، جس طرح مرہٹے ملک گیری یا چوتھ وصول کرتے، اسی طرح وہ راکھی حاصل کرتے اگر کوئی یہ راکھی دینے سے انکار کرتا تو اس کو موت کا منہ دیکھنا پڑتا۔

جدوناتھ سرکار نے یہ ساری تفصیلات پھیلا کر فال آف دی مغل ایمپائر کی چار جلدوں میں لکھی ہیں جن میں اپنی محنت، معروضیت اور حقیقت پسندی کا اظہار صرف یہ دکھانے کے لئے کیا ہے کہ جب ملک میں ہر طرف پراگندگی، زبوں حالی، ابتری اور افراتفری تھی تو انگریز نمودار ہوئے، اور صحیح وقت پر پہنچے، اور مغلیہ سلطنت کو اپنی تحریروں کے غلط پردے پر بڑی خوش اسلوبی سے لاتے ہیں، ان کے ہم صوبہ مؤرخ بی۔ ڈی۔ باسو اپنی

کتاب ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا میں لارڈ ویول کے سارے کرتوتوں کی تفصیل لکھ کر اس کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا ولی کہا ہے مگر جدوناتھ سرکار نے اس کی ایسی تعریف کی ہے جیسے مغلوں کے دربار کا کوئی مورخ اپنے شاہی آقا کی کرتا ہے۔ اس کی حیرت انگیز کرامت اور کارکردگی اس کی مافوق الفطری بصیرت اس کی تنظیمی قوت اپنے مقاصد کی کامیابی کی تکمیل میں غیر معمولی عجلت کے ساتھ اس کے عملی اقدام اور مادی ہو جانے والی قوت ارادی کی مداحی دل کھول کر کی ہے، اس کی فوج کے جنرل لیک کی جنگی تیاری کی مدح یہ لکھ کر دی ہے کہ ایسی ہی تیاری سے ایک معیار قائم ہوتا ہے (قال: ج ۲ ص ۲۴۰-۲۶۲)

وہ لکھتے ہیں کہ دریائے سندھ سے گنگا تک کے علاقے میں ظلم زار کی تھی، انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی فتوحات کے بعد ہی ختم ہوئی، (قال: ج ۳ ص ۱۰۵) وہ خوش ہو کر یہ بھی لکھتے ہیں کہ مغلوں کی حکومت قزاقی تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے والیان ریاست اور یہاں کے لوگوں نے انگلستان کی حکومت کو آسانی سے قبول کر لیا (قال ج ۱ ص ۱۵۲) انھوں نے اس پر بھی اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے کہ برطانوی حکومت مصیبت زدہ رعایا کے زخموں کا پھایا بن گئی (قال: ج ۱ ص ۲۳۲-۲۳۱)

اور پھر انگریزوں کی حکومت کی مداحی کرنے میں ان کا قلم بالکل نہیں تھکتا، لکھتے ہیں کہ برطانوی حکومت کی وجہ سے ہندوستان میں جو نشاۃ ثانیہ ہوئی، وہ دنیا کی تاریخ میں کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی، ہماری سوسائٹی مایوسی کی حد تک زوال پذیر ہو گئی تھی، لیکن اسی زمانے میں یورپ کی حکیمانہ ترقی پذیر اسپرٹ پوری قوت کے ساتھ آ پہونچی، سب سے پہلے ایک ایماندار اور کارگزار نظام سلطنت ملک میں قائم ہو گیا، جس سے امن بحال ہوا، اقتصادی ترقی ہوئی اور ہماری سوسائٹی کی خشک ہڈیوں میں خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ساحروں کی چھڑی سے حرکت پیدا ہونے لگی، پھر ایک ایسی نشاۃ ثانیہ ظہور میں آگئی جو قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے گہری وسیع اور انقلابی تھی (قال: ج ۳ ص ۲۰۷، ۲۰۳)

جدوناتھ سرکار یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ برطانوی حکومت ڈیڑھ سو برس تک روشن خیالی کی حکومت رہی

(مقالہ ج ۳ ص ۲۴۳) ہندوستان کا سیاسی ارتقا برطانوی سامراجیت ہی کی بدولت ہوا (مقالہ ج ۳ ص ۳۵۰) اس ڈیڑھ سو برس میں سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کی بھی شہادت ہوئی، ۱۸۵۷ء کے رونگٹے کھڑے کرنے والے واقعات بھی پیش آئے، بہادر شاہ ظفر اور ان کے شہزادوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ان کی تفصیلات کو پڑھ کر آنکھوں سے خون کی بوندیں اب بھی ٹپک پڑتی ہیں، اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوی سوراجیہ قائم کرنے والے مرہٹوں اور حب الوطنی کے جذبے میں سرشار رہنے والے راجپوتوں کی گردنوں میں غلامی کے طوق ڈال دیئے گئے، ان سب کو جدوناتھ سرکار نظرانداز کر گئے۔

جدوناتھ سرکار کی زندگی ہی میں رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا جلیانوالہ باغ کی ہولناکیاں بھی پیش آئیں گاندھی جی نے برطانوی حکومت کو شیطانی حکومت کہا، اس کے خلاف آزادی کی جنگ شروع ہوگئی جس میں ہندو مسلمان دونوں نے پوری جانبازی اور سرفروشی سے کام لیا، وہ جیل گئے، ان کے پیچھے مجمع کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا ان سب کو پس پشت ڈال کر جدوناتھ سرکار مرہٹوں، راجپوتوں، جاٹوں، سکھوں، اور مغلوں کو انتشار پسند تخریب کار لٹیرے، بدکار، نالائق اور عیاش قرار دے کر انگریزوں کو ایک ایماندار اور کارگذار نظام سلطنت کا بانی اپنی قوت محرکہ سے ہندوستان کے اندر ایک نئی روح پھونکنے والے اور اپنی ساحرانہ چھڑیوں سے نشاۃ ثانیہ کا پیام لانے والے ثابت کرنے میں لگے ہوئے تھے، اس کے بعد وہ سر جدوناتھ سرکار کیوں نہیں ہوتے، مگر اب ہم کو آپ کو یہ غور کرنا ہے کہ انھوں نے محب وطن مورخ بن کر اپنے ملک کی تاریخ کو سنوارا ہے، یا خاص اغراض کی تکمیل کی خاطر اس کو بگاڑا ہے، کیا ان کا تاریخی لٹریچر ہندوستان کی موجودہ جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی میں معاون ہو سکتا ہے،

معارف کے آئندہ شذرات میں جدوناتھ سرکار کی تحقیقات کی تضاد بیانی اور ان کی تحریروں کی شترگربگی پر تبصرہ ہوگا۔

مقالات

مطالعۂ سیرت اور مستشرقین

از

ڈاکٹر نثار احمد اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی

(۳)

اعتراضات، الزامات، مفتریات و ہفوات | مستشرقین کی جانب سے اسلام کے لئے بالعموم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بالخصوص جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا، اس کا مختصر سا خاکہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے، اب جہاں تک سیرت رسول کے حوالے سے ان کے اعتراضات اور الزامات کا تعلق ہے، اس مختصر مقالہ میں ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، یہ اس لئے بھی ممکن نہیں کہ اعتراضات والزامات کی کوئی حد نہیں ہے اور وہ مستشرقین کی تحریروں میں، ان کے پیدا کردہ لٹریچر میں، اور اُن کے خرافات کے ذخیرہ میں بکثرت صدیوں سے پائے جاتے ہیں، ان کے ہاں الزامات واعتراضات کی بہتات اس لئے بھی قابل فہم ہے کہ الزامات واعتراضات قائم کرکے (خواہ وہ کتنے ہی بے بنیاد کیوں نہ ہوں) سیرت رسولؐ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا مستشرقین کی حکمت عملی کا مستقل لازمی حصہ رہا ہے، کیونکہ اس جہت سے یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ معصوم الذہن لوگ اور وہ افراد جن کا علم ومطالعہ راسخ نہیں ان کے پروپیگنڈے سے بآسانی منفعل ومتاثر ہو سکتے ہیں، حق تو یہ ہے کہ مستشرقین کے تمام اعتراضات والزامات کو مرتب کرکے اُن کا مفصل جواب دیا جائے، لیکن اس کی نہ فرصت ہے نہ موقع، تاہم ذیل میں ہم مختصراً سیرت رسولؐ

۔۔۔ ان مستشرقین کے اعتراضات والزامات بلکہ مفتریات کو نقل کر رہے ہیں تاکہ عام قارئین یہ اندازہ لگا سکیں کہ سیرت نبوی کے باب میں مستشرقین نے کیا کیا گل کھلائے ہیں اور کیسے کیسے الزامات واعتراضات عائد کئے ہیں، انہیں سے بیشتر اعتراضات ایسے ہیں جن کے بودے پن کو عام پڑھا لکھا مسلمان بھی محسوس کر سکتا ہے۔

نام، حسب نسب | (۱) یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر اسلام کا نام نامی اسم گرامی "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں تھا بلکہ ماہومٹ (Mahomet) تھا، بعض نے دل کی انتہائی کدورتوں کے ساتھ "ماہوند" (Mahound) یعنی بقول ان کے "شہزادہ تاریکی" کا نام تجویز کیا، اور بعض کے نزدیک بافومٹ (Baphomet) اور "بافسم" (Bafum) تھا، (۲) نیچ ذات (Low birth) تھے (العیاذ باللہ) اس الزام کو خاص طور پر مارگولیتھ نے بڑی شد ومد کے ساتھ اپنی کتاب "محمد اینڈ دی رائز آف اسلام" مطبوعہ لندن (۱۹۰۵ء) میں پیش کیا۔ اس الزام کو نہ صرف یہ کہ دوسرے مشہور برطانوی مستشرق سر ولیم میور نے (لائف آف محمدؐ ایڈنبرا ۱۹۲۳ء ص ۷، ۷، ۱۷، ۷) ہی مسترد کر دیا بلکہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی شریف النسب تھے، عرب کے شریف ترین گھرانے کے فرزند تھے آپ کے جد امجد ہاشم تھے جن کے ذمہ شہری مملکت مکہ میں افادہ کی ذمہ داری تھی، اور وہ اس پائے کے آدمی تھے کہ رومی امراء اور غسانی شہزادے اُن سے معاہدہ کیا کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو: صدیقی مظہر الدین، ص ۴۳

(۳) محمد دراصل خود ایک مسیحی پادری (Cardinal) تھے، خواہش تھی کہ پوپ منتخب ہو جائیں، یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو انتقاماً رومی کلیسا سے تعلق منقطع کر لیا اور عیسائیت کے بالمقابل ایک نئے مذہب "اسلام" کو ایجاد کر لیا، اور اپنے آپ کو مخالف پوپ قرار دے لیا۔ (۴) دنیائے مسیحیت میں نئے فرقے کے بانی تھے، (۵) مخالف مسیح (anti-christ) اور دشمن عیسائیت تھے (۶) ترکوں کے پیغمبر تھے، (۷) بت پرست تھے (نعوذ باللہ) (۸) خود اپنے آپ کو مرکز پرستش قرار دے لیا تھا، (۹) آپ بقول ایک مصنف معیوب منافق وناپاک تھے۔ (۱۰) جین بررڈ (Genebrard) کے نزدیک

جوان (Demon) تھے، اور صرف حیوانی زبان یعنی عربی جانتے تھے، ان کے حیوانی
سب تھی (۱۱) آپ حاشا اللہ) شہوت پرست Lascivious تھے۔ خود بھی لوٹتے
وبھی لوٹ گیا، (۱۲) دھوکہ باز، مکار، کاذب، جھوٹے، خوفناک حد تک بے شرم تھے،
۱۴) وہ ایک ہنرمند، مکمل سیاست داں تھے۔
نبوت نتیجہ تھی ان کی طویل خودخیالی (Auto Sug estion) یا خود الہام کی
کا، (۱۵) وہ خواب بہت دیکھا کرتے تھے، وحی بھی بطور خواب دیکھا کرتے تھے، (۱۶)
خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، حالانکہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا، بھولے
ین والے کے لیے کہ ان پر وحی اترتی ہے، محمد نے ایک سفید دودھیا رنگ کے کبوتر پا لا تھا
تھا، جو اُن کے کندھے پر بیٹھا رہتا اور وقفہ وقفہ سے چونچ مار مار کر ان کے کان میں سے دانے
اس طرح وہ دوسروں پر یہ تاثر قائم کرتے تھے کہ فرشتۂ ربانی (جبرئیل) ان پر وحی نازل کرتا
ارہا ہے، (۱۷) انھیں (نعوذ باللہ) اعصابی مرض لاحق تھا اور وہ توہمات، فریب حسی میں
۱) نزولِ وحی کے وقت مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ (۱۹) مرگی زدہ تو نہیں البتہ جنونی ضرور تھے
زن اعصابی مزاج والے آدمی تھے۔ (۲۰) اعصابی دورے پڑتے تھے، اور وہم ہو جاتا تھا کہ تابع
مدرکی کے ذہن کا اختراع اور بوالعجبی ہے؛ (۲۱) اپنے الہامی اور الٰہیاتی مشن کے بارے میں خود
ذب تھے۔ میور کے نزدیک ابتداً انھیں بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ خدا کی طرف سے فرستادہ
طویل عرصہ تک شک و تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر آمادہ تبلیغ ہوئے۔ (میور، لائف
محمد۔ ص ۴۶، ۴۷) یہ الزام سراسر واقعات کے خلاف ہے، اور تاریخی اعتبار سے گمراہ کن ہے، اگر
ہوتا تو اپنی زوجۂ محترمہ خدیجہ کو، اپنے بھائی علی کو اپنے جگری دوست ابوبکر کو کیونکر مطمئن کرتے،
ماورالٰہیات کی تشکیل میں شام کے مسیحی اثرات کو بڑا دخل تھا، (۲۳) ان کو بائبل کی تعلیمات

---

۲۶ ؎ ایضاً، عہد حاضر کا مستشرق، واٹ اس کی تردید کرتا ہے: ہر کتاب کہ یہ الزام صریحاً بے بنیاد

کا علم تھا، (۲۴) نبوت کا تسلسل برقرار نہیں رہا، یہ منٹگمری واٹ کا مفروضہ ہے، اس کی دلیل یہ دی ہے کہ مدنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں کچھ عرصہ یہود مدینہ سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کو نبی و رسول کی حیثیت سے تسلیم کریں (ملاحظہ ہو تفصیل جناب مظہر الدین صدیقی کا مضمون، اسلامک اسٹڈیز اسلام آباد، جلد ۹ نمبر ۳

(۲۵) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کے لغو خیال میں نبی کاذب تھے، (۲۶) وہ (نعوذ باللہ) مکار، دغاباز، مدعی کاذب تھے، (۲۷) شیطان کے آلۂ کار، اور ان کے توہین آمیز جاسوس تھے، (۲۸) ترویج و اشاعت مذہب کے لئے تشدد کا سہارا لیا، (۲۹) اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا، (۳۰) حتی Hitti کے خیال میں حضورؐ کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا، اور لامنس کے نزدیک ان کی مکی زندگی کے حالات محض افسانہ (fiction) ہیں، (۳۱) اصل استفادہ عیسائیت سے کیا، چنانچہ عیسی نسطوری راہب بحیرہ سے خاص ملاقات رہی، (۳۲) مستشرقین کے نزدیک ایک مقبول عام وزنی الزام یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی زندگی مکہ تک پیغمبرانہ رہی، لیکن مدینہ جاکر بادشاہی میں بدل گئی، اور وہاں لشکر کشی اور قتل و خونریزی کا بازار گرم کر دیا۔

کارہائے نبوت و رسالت، واقعات سیرت	(۳۳) دنیاداروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی اختیار کی، (۳۴) میور لکھتا ہے کہ کار نبوت کی ابتدا میں تو ایمانداری سے یہودی اور عیسائی طور طریقوں اور رسوم

کو اپنایا گیا اور اپنے مذہب کی انھیں بنیاد بنایا گیا، لیکن جب مطلب حاصل ہوگیا اور اقتدار حاصل ہوگیا تو ان سے برأت ظاہر کی اور پھر انھیں بالکل مردود قرار دے دیا" (۳۵) اسلام کو یہودیت سے بدلنے کی کوشش کی، واٹ لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ جاکر یہ کوشش کی کہ اسلام کو مذہب قدیم یہودیت سے بدل دیا جائے۔ (۳۶) تحویل قبلہ، (ایک خاص وقت کے بعد یہودیت و عیسائیت سے بیزاری کی کوشش

(حاشیہ ص ۸۸) ہے۔ (محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس مین، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۱ء ص ۹۰)۔ تفصیل کیلئے دیکھئے (صدیقی مظہر الدین ص ۱۲۲)۔ ایضاً حوالے ص ۲۴۔

(۳۷) شاید اسلام یہودیت کا ایک حصہ یا فرقہ بن جائے۔ (۳۸) محمدؐ نے مسلمانوں کو اپنے آپ کی پرستش کی دعوت دی۔ (۳۹) منشور مدینہ (Charter of Medina) میں حضورؐ کا مقام و مرتبہ غیر متعین تھا۔ (۴۰) حضورؐ کی ہجرت سے قریش مکہ بڑے خوش ہوئے، مارگولیتھ لکھتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ قریشی سردار (محمدؐ کی ہجرت کے بعد) آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہوں کہ وہ اپنے ایک تکلیف دہ ہموطن سے بغیر کسی خون خرابے کے نجات پا گئے۔" (صدیقی مظہرالدین۔ ص ۱۲۲) مارگولیتھ کی یہ خیال آفرینی بھی تاریخی واقعات کے بالکل خلاف اور لغو ہے۔ (۴۱) محمدؐ نے قریش مکہ کو (بلاوجہ) اپنے خلاف بھڑکایا۔[1] (۴۲) غزوات محض لوٹ مار کی مہمیں تھیں[2]، اور عربوں کی غربت و تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ۔ (۴۳) بعض یورپی مصنفین کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ کا لایا ہوا انقلاب اور مذہبی اصلاحات اس لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہاں کا ماحول دراصل ان کے موافق اور مناسب تھا، اور اہل عرب مذہبی معاشرتی تبدیلی کے متلاشی اور پیاسے تھے۔[3] (۴۴) جنگ موتہ اس جنگ کا مقصد متعین کرنا مشکل ہے۔

متفرقات | (۴۵) ٹائن بی کے خیال میں آنحضرتؐ محض قیصر عرب تھے، ایک سیاسی لیڈر تھے، (۴۶) جے سی آرچر کے نزدیک محمدؐ محض ایک صوفی اور مجذوب تھے، (۴۷) آپؐ (نعوذ باللہ) رہزنوں قزاقوں

---

[1] یہ مستشرقین کا عام الزام ہے، اور وہ اس بات کے شدت سے قائل ہیں کہ غزوات پاکیزہ جذبۂ اعلیٰ و ارفع مقاصد، اور شوق شہادت کا نتیجہ نہ تھے بلکہ غریب و مفلوک الحال عربوں کی تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ اور لوٹ مار کے تحت مال و دولت کے جمع کرنے کا شوق تھا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو (قریشی، پروفیسر ظفر علی، ماہنامہ اسلامک لٹریچر، ج ۱۷ × شمارہ ۵ مئی ۱۹۲۶ء ص ۷، ۸، نیز شمارہ ۹ ستمبر ۶۶ء، ص ۸۰

[2] دیکھئے صدیقی مظہرالدین، ص ۱۶۳، ۱۶۴

کے سردار Robber chief تھے، (۴۸) اسلام ایک بدقسمت تاریخی حادثہ تھا اور ... میں مبتلا ہو کر مر گئے جو شدت بھوک کا نتیجہ تھا، (۴۹) اسلام ایک اشتراکی رجحان تھا اور محمد صرف ایک معاشرتی سماجی مصلح تھے نہ کہ پیغمبر، (۵۰) وہ ایک موقع پرست، مفاد پرست تھے، (۵۱) کثرت ازدواج اور میل الی النساء[۵۱] عورتوں کے دوست، سنجیدگی اور معقولیت کے دشمن، بہت شادیاں کرنے والے[۵۲] (۵۲) آنحضرت اور قرآن، تہذیب، وتمدن، حریت وآزادی اور سچائی کے بدترین مخالف اور ضدی و سرکش دشمن تھے، کہ ان جیسا دشمن صفحۂ ہستی پر نمودار نہیں ہوا[۵۳]، (۵۳) لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور اس پر عمل بھی کیا[۵۴]، (۵۴) داستانِ غرانیق، شیطانی آیات[۵۵]، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ایک دفعہ حرم میں نماز ادا کی اور قرآن کی بھی تلاوت کی، اس وقت وہاں کفار بھی موجود تھے، جب آپ نے سورۂ نجم کی یہ آیت (۲۰) پڑھی ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ تو کہا جاتا ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے:- تلك الغرانيق العلیٰ وان شفاعتھن لترجیٰ، (یعنی یہ بت معظم و محترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے) اس شیطانی آیت کے بارے میں واقعہ کو مستشرقین بڑھا چڑھا کر کے پیش کرتے ہیں اور رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں (تفصیلات کے لئے دیکھئے سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۲۵-۲۲۷-۳۲۹)

(۵۵) واقعہ حضرت زیدؓ و زینبؓ، حضورؐ نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ حضرت زید بن حارثہؓ کا نکاح کر دیا تھا، لیکن پھر تعلقات قائم نہ رہ سکے اور شکر رنجی بڑھ گئی، آخر کار حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی، حضورؐ نے رسم جاہلیت مٹانے کے لئے اور حضرت زینبؓ کی دلجوئی کے لئے خود نکاح کر لیا، حضرت زینبؓ کا انتقال ۲۰ھ میں ہوا، مستشرقین کے نزدیک یہ صریحاً بوالہوسی تھی، (۵۶) ان کا آہنی تابعت خانہ کعبہ

---

[۵۱] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۱۴، [۵۲] صدیقی، مظہر الدین ص ۱۶۲ (حضورؐ کی شادیوں اور تعدد ازدواج کے بارے میں ذات رسالتؐ پر اعتراض مستشرقین کا محبوب ترین موضوع ہے، جس کے ذریعہ وہ (نعوذ باللہ) آپ کی بدمستی اور بوالہوسی ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان میں انھیں کوئی خیر، پاکیزگی، عفت اور حکمت نظر نہیں آتی)، [۵۳] حمادے (ص ۲۶) [۵۴] شبلی، ج ۱ ص ۱۱۴ -

میں دو متوازن کے درمیان فرق دیا۔ (۵۷) ابتداء میں اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کے لئے تمام انبیائے بنی اسرائیل کو تسلیم کیا۔ لیکن جب قوت و اقتدار مل گیا تو سب سے بڑے نبی خود بن بیٹھے اور سلسلۂ نبوت کو اپنی ذات پر ختم کر لیا، (۵۸) بانی اسلام سے معجزات کی نسبت محض انبیائے ماسبق کے ہم پلہ ثابت کرنے کے لئے قائم کی گئی، (۵۹) ایک نیا اور جھوٹا مذہب جاری کیا، حالانکہ یہ انکا خود ساختہ تھا،

اعترافات | اگرچہ گذشتہ فصل کی روشنی میں مستشرقین کا انتہائی بے باکانہ، گستاخانہ اور معاندانہ رویہ بڑی حد تک سامنے آجاتا ہے تاہم یہ اُن کے مطالعۂ سیرت کا صرف ایک رُخ ہے، جو اول تا آخر کذب و افترا سے عبارت ہے. ایک دوسرا رُخ وہ ہے جس میں مستشرقین کے بعض سرکردہ افراد اپنے تعصب و تنگ نظری کا برملا اعتراف کرتے ہیں، اور جب ذرا انصاف و اعتدال سے کام لیتے ہیں تو اقرار کرتے ہیں کہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہر عیب سے منزہ ہر الزام سے مبرا، خَلق و خُلق کی تمام خوبیوں سے مرصع دنیائے انسانیت کا حاصل تھی اور اُن کی کامیابیوں، کامرانیوں اور کارناموں کی بنا پر اُن کا کوئی مثیل نہیں ہے، اس موضوع پر اگرچہ دفتر کے دفتر نقل کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم یہاں صرف چند نمونوں پر اکتفا کر رہے ہیں

۱۔ اثر انگیز شخصیت | ۰۔ جسٹینین کی وفات کے چار سال بعد ۵۶۹ء میں، مکہ میں وہ آدمی پیدا ہوا، جس نے انسانیت پر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ اثر ڈالا" (ڈریپر[۶۰])

۲۔ ناقابل فراموش | ۰۔ اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی قلت اور حیرت انگیز نتائج! ان تین باتوں کو انسانی تعقل و تفکر کا معیار بلند مانا جائے، تو کون ہے جو تاریخ کی کسی قدیم یا جدید شخصیت کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے

اور ہارٹ کی کتاب :۔ (The 100 A Ranking of the most heflucut'al persons in History.) 1978 (P.33).

مقابل لانے کی ہمت کر سکے، لوگوں کی شہرت ہوئی کہ انھوں نے فوجیں بنا ڈالیں، قوانین وضع کر ڈالے اور سلطنتیں قائم کر ڈالیں، لیکن غور طلب یہ ہے کہ انھوں نے حاصل کیا کیا ؟ صرف مادی قوتوں کی جمع پونجی ؟ وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے لٹ گئی، بس صرف یہی ایک آدمی ایسا ہے جس نے فوجوں کو مرتب کیا، قوانین وضع کئے اور مملکتیں، سلطنتیں قائم کیں بلکہ اس کی نظر کیمیا اثر نے لاکھوں متنفس ایسے پیدا کر دیئے جو اس وقت کی معلوم دنیا کی ایک تہائی آبادی پر مشتمل تھے، اور اس سے بھی آگے بڑھکر انھوں نے قربان گاہوں کو، خداؤں کو، دین و مذہب کے پیروکاروں کو، خیالات وافکار کو، عقائد و نظریات کو، بلکہ روحوں تک کو بدل ڈالا، پھر صرف ایک کتاب کی بنیاد پر جس کا لکھا ہوا ہر لفظ قانون تھا، ایک ایسی روحانی امت کی تشکیل کر دی گئی جس میں ہر زمانے، وطن، قومیت کا حامل فرد موجود تھا، وہ ہمارے سامنے مسلم قومیت کی ایک ناقابل فراموش خصوصیت یہ چھوڑ گئے کہ صرف ایک ان دیکھے خدا سے محبت اور ہر معبود باطل سے نفرت" (لامارٹن) (Histoire deca Turqui) ج ۲ ص ۲۷۶-۷۷ پیرس ۱۸۵۴ء

۳- جامعیت کبریٰ | تمام الٰہیات، فصاحت و بلاغت میں یکتائے روزگار، رسول (بانیٔ مذہب) آئین و قانون ساز (شارع)، سپہ سالار، فاتح اصول و نظریات، معقول عقائد کو جلا بخشنے والے، بلا تصویر مذہب کے مبلغ، بیسیوں علاقائی سلطنتوں کے معمار، دینی روحانی حکومت کے مؤسس، یہ ہیں محمد رسول اللہؐ (جن کے سامنے پوری انسانیت کی عظمتیں ہیچ ہیں) اور انسانی عظمت کے ہر پیمانے کو سامنے رکھ کر ہم پوچھ سکتے ہیں، ہے کوئی جو ان سے زیادہ بڑا، ان سے بڑھ کر عظیم ہو ؟ (لامارٹن ایضاً)

۴- بے مثال کارنامہ | کسی انسان نے اتنے قلیل ترین وسائل کے ساتھ، اتنا جلیل ترین کارنامہ انجام نہیں دیا، جو انسانی ہمت و طاقت سے اس قدر ماوراء تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی فکر کے ہر دائرے اور اپنے عمل کے ہر نقشہ میں جس بڑے منصوبہ کو روبہ عمل لائے، اُس کی صورت گری بجز اُن کے

کسی کی مرہونِ منت نہ تھی، اور مٹھی بھر صحرائیوں کے سوا اُن کا کوئی معاون و مددگا
نہ تھا، اور آخر کار ایک اتنے بڑے گہرے دیرپا انقلاب کو برپا کر دیا، جو اس دنیا کے
کسی انسان سے ممکن نہ ہو سکا، کیونکہ اپنے ظہور سے لے کر اگلی دو صدیوں
سے بھی کم عرصہ میں اسلام، فکر و عقیدہ اور طاقت
اسلحہ دونوں اعتبار سے سارے عرب پر، اور پھر ایک اللہ کا پرچم بلند کرتے ہوئے فارس، خراسا
ماوراء النہر، مغربی ہند، شام، مصر، حبشہ، شمالی افریقہ کے تمام معلوم علاقوں پر، بحر متوسط کے جزیر
پر اور اندلس کے ایک حصہ پر بھی چھا گیا۔" (لامارٹن ایضاً)

۵۔ تاریخ کی پوری روشنی میں: "یہ صحیح ہے کہ تاریخ کی روشنی میں ہم حیاتِ مسیح کے کچھ واقعات دیک
سکتے ہیں، لیکن اُن تیس برسوں سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جو انھوں نے (نبوت سے پہلے) گذا
جو کچھ ہم جانتے ہیں اس نے اگرچہ دنیا کی معلومات میں کسی حد تک اضافہ کر دیا ہے اور آئندہ مزید ک
متوقع ہیں، تاہم ایک شانی زندگی، کون جانے، کتنی قریب ہے کتنی دور! کتنی ممکن ہے اور کتنی نا
ہم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے۔ ہم اُن کی ماں کے بارے میں، اُن کی گھریلو زندگی کے بارے میں، ان ک
ابتدائی دوست احباب اور ان کے تعلقات باہم کے بارے میں اور اس سلسلہ میں بھلا کیا جانتے ہ
کہ مسندِ نبوت پر وہ بتدریج فائز ہوئے یا وحی پا کر یکدم خدائی مشن کے حامل بن گئے؟ بہرحال ک
ہی سوال ایسے ہیں جو ہم میں سے اکثر کے ذہنوں سے ٹکراتے ہیں، مگر وہ بس سوالات ہیں، جواب کے ب
البتہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ میں صورت یکسر مختلف ہے، یہاں ہمارے پاس اندھیروں کے
بجائے تاریخ کی روشنی ہے، ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں جانتے ہیں جتنا کہ لوتھر اور
ملٹن کے بارے میں، یہاں واقعات کا دامن، خیال محض، قیاس تخمین وظن، ماورائے فطرت
روایات اور فسانہ وافسوں سے آلودہ ہونے کے بجائے حقائق سے آراستہ ہے، اور ہم یہ تمام

معلوم کر سکتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے ؟ یہاں کوئی شخص نہ خود اپنے آپ کو دجل و فریب میں مبتلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کو، یہاں ہر چیز دن کی روشنی میں جگمگا رہی ہے، اس میں شک نہیں کہ کسی شخصیت کے بہت سے پرت ہیں اور اُن میں سے ہر ایک تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے، تاہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے متعلق ہم ہر چیز جانتے ہیں، اُن کی جوانی، ان کی اٹھان، اُن کے تعلقات ان کی عادتیں، ابتدائی حالات اور پہلی وحی کے نازل ہونے تک کا ذہنی سفر اور ارتقاء وغیرہ، نیز ان کی داخلی یا باطنی زندگی کے متعلق بھی، اور یہ کہ جب اعلان نبوت کر چکے تو پھر ہم ایک ایسی مکمل کتاب پاتے ہیں جو اپنی ابتدا، اپنی حفاظت اور متن وغیرہ کے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے بالکل ممتاز و منفرد ہے، اور ابتک ایسی کوئی معقول و مستند وجہ سامنے نہیں آئی جس کی بنیاد پر اس کتاب کے خلاف کوئی شدید اعتراض کیا جا سکے۔" (باسورتھ اسمتھ محمد اینڈ محمڈزم، سندھ ساگر اکادمی لاہور ص ۱۲۔ ۱۱)

۶۔ انقلاب، انقلاب، انقلاب | بہر حال مختصر اُعرب کے یہ معاشرتی اور مذہبی حالات تھے، جن میں اگر ہمیں والٹیر کی زبان کے استعمال کی اجازت دی جائے، عرب کا رُخ بدل گیا، انقلاب آگیا، انقلاب بھی کیسا ؟ ایسا انقلاب کہ آج تک کسی سرزمین پر نہیں آیا، مکمل ترین، اچانک ترین اور سرتاسر غیر معمولی انقلاب! (باسورتھ اسمتھ ایضاً ص ۶۲)

۷۔ منفرد مقام | "۔ تاریخ مذاہب و ادیان میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک منفرد مقام حاصل ہے، وہ نہ ولی تھے نہ فرشتہ۔ اور خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی کر کے دکھایا، اس میں کوئی مافوق البشریت نہ تھی، اور اُن کی عظیم شخصیت میں انسانی عمل کے اعتبار سے کوئی ایسی چیز نہ تھی، جو عام حالات میں ان کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز و ممیز کر سکے۔" (بوڈلے دی میسنجر ۱۹۴۶ء ص ۳۳۸)

۸۔ سب سے بڑا انسان | "دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے، جس نے دس برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت، ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم

پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کردی، لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ امّی اور ناخواندہ تھا، وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر! اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا۔ اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جسکو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیّا کر دیئے" (مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۵۱ء، ج ۴ ص ۳۰۰) نیز بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک مسیحی عالم (داود مجاعص) نے یہ تبصرہ لکھا تھا۔

۹۔ عظیم و مخلص | عظیم۔ محض اس لئے نہیں کہ وہ ایک روحانی پیشوا تھے، انھوں نے ایک عظیم ملّت کو جنم دیا، اور ایک عظیم سلطنت قائم فرمائی۔ بلکہ ان سب سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک عظیم عقیدہ کا پرچار کیا۔ مزید برآں اس لئے بھی (عظیم تھے) کہ وہ اپنے آپ سے بھی مخلص و وفادار تھے، اپنے امتیوں سے بھی مخلص تھے، اور اپنے اللہ سے بھی مخلص و وفادار تھے، ان باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام ایک کامل سچا مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو انسانیت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر نور و صداقت کی رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے" (لیونارڈ اسلام ہر مورل اینڈ اسپریچوئل ویلو لندن ۱۹۲۷ء ص ۲۱، ۲۰)

۱۰۔ مقام و مرتبہ | "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک رسول تھے نہ کہ صوفی، یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ کوئی کہہ کر بھی شرمندہ ہو جائے۔ وہ لوگ جو اُن کے گرد جمع ہوئے اور جو ملّت اسلامیہ کے اوّلین ارکان تھے۔ وہ قانون کی اطاعت پر، توحید الٰہی پر راضی تھے، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اور اُن کے اُسوۂ حسنہ پر اکتفا کرنے والے تھے، وہ مطمئن تھے کہ وہ ایک سیدھے سادے اور مضبوط دین کے پیرو ہیں جو مختصر عبادات اور چند مراسم پر مشتمل تھا" (گاڈفرے ڈی مبائنز مسلم انسٹیٹیوشن، لندن ۱۹۵۰ء ص ۲۰)

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے از خود کبھی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ ایک موقع پر تو ایسی وحی

نازل ہوئی جس میں انھیں تنبیہ کی گئی کہ انھوں نے ایک باعزت شہری سے بات کرنے میں کیا منہ کیوں موڑا؟، پھر انھوں نے اس وحی کو شائع بھی کیا، یہ وہ آخری دلیل ہے جس کی روشنی بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) ایک مدعی کاذب (Impostor) تھے، مسیحی اس عظیم عرب کو الزام دیتے ہیں۔" (دیباچہ محمڈنزم، لاہور ۱۹۳۹ء، ص ۴)

• محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا جو مذہبی نظام قائم فرمایا وہ نہ صرف یہ کہ ان کے ا... کے فہم وادراک کے مطابق تھا، اور اس ملک میں پائے جانے والے رسوم ورواج اور ان کے جذبات سے ہم آہنگ تھا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ عام انسانی حالات ونظریات سے بھی وہم آہنگی رکھتا تھا کہ جس کے نتیجہ میں تمام انسانوں کی نصف سے زیادہ آبادی نے اسے قبول کیا چالیس سال سے بھی کم عرصہ میں ہوگیا، (کاونٹ ڈی بولین ویلر (Count de Boulainvilliers) ... ٹرڈم ۱۷۳۱ء، ص ۲۲۲-۱۴۳)

۱۱۔ روشنی: "پس وہ روشنی آگئی، عربوں کی تاریک روحوں کو منور کرنے کے لئے، ایک ایسی ... کی نقیب تھی، چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی، زندگی اور آسمانوں کا جاہ وجلال لئے ہوئے، "وحی" کہا، اور لانے والے فرشتہ کو جبرئیل۔ اور ہم ابھی تک سوچ رہے ہیں کہ اسے کیا نام دیں ذوالجلال کی طرف سے اشارہ ہے، ہمارے سمجھنے کے لئے کسی چیز کی سچائی اور حقیقت جاننے کی ایک روحانی عمل ہے، جس کے بارے میں ہر منطق اور قیاس ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے ایک خدا پر اعتقاد کا اعلان، کیا ایک معجزہ سے کم تھا؟ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود کامل حقیقت اور سچائی کے نور سے مستنیر تھا!" (کارلائل دی ہیرو ایز اے پرافٹ)

۱۲۔ نور ہی نور: عرب قوم کو یہی نور ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لایا، عرب کو اسی کے ذریعے ملی، بھیڑوں بکریوں کے چرانے والے لوگ، جو ازل سے صحراؤں میں بے کھٹکے، بے روک ٹوک

تھے کہ ایک ہیرو پیغمبر ان کی طرف بھیجا گیا، ایک پیغام کے ساتھ، جس پر وہ ایمان لا سکتے تھے،
اور پھر سب نے دیکھا کہ جو کسی کے نزدیک قابل اعتنا نہ تھے، دنیا بھر کے لئے قابل ذکر بن گئے۔" (کالائل)
۱۳۔ عظیم فاتح | فتح مکہ کے اس موقع پر یہ بات ان کے حق میں جائے گی اور وہ قابل تعریف ٹھہریں گے
کہ اس وقت جب کہ اہل مکہ کے ماضی کے انتہائی ظالمانہ سلوک پر انھیں جتنا بھی طیش آ جاتا کم تھا، اور
ان کے آتش انتقام کو بھڑکانے کے لئے کافی تھا، مگر انھوں نے اپنے لشکر و سپاہ کو ہر قسم کے خون خرابے
سے روکا، اور اپنے اللہ کے سامنے انتہائی بندگی و عبدیت کا مظاہرہ کیا اور شکرانہ بجا لائے، صرف
دس بارہ آدمی ایسے تھے جنھیں پہلے سے ہی ان کے وحشیانہ رویہ کی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا
اور ان میں سے بھی صرف چار کو قتل کیا گیا۔ لیکن دوسرے فاتحوں کے وحشیانہ افعال و حرکات کے
مقابلہ میں، اسے بہرحال انتہا درجہ کی شرافت و انسانیت سے تعبیر کیا جائے گا، (مثال کے طور پر صلیبیوں
کے مظالم، کہ ۱۰۹۹ء میں فتح یروشلم کے موقع پر انھوں نے ستر ہزار سے زائد مسلمان مرد، عورتوں و
بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا، یا وہ انگریز فوج جس نے صلیب کے زیر سایہ لڑتے ہوئے ۱۸۷۴ء میں
کے سنہری ساحل پر ایک شہر کو نذر آتش کر ڈالا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فتح درحقیقت دین کی فتح تھی
سیاست کی فتح تھی، انھوں نے ذاتی مفاد کی ہر علامت کو پس پشت ڈالا اور کروفر شاہی کے ہر نشان کو
مسترد کر دیا، اور جب قریش کے مغرور و متکبر سردار ان کے سامنے سرنگوں ہو کر آئے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
نے اُن سے پوچھا کہ "تمھیں مجھ سے کیا توقع ہے"؟ رحم! اے سخی و فیاض برادر، رحم! وہ بولے۔" جاؤ تم
آزاد ہو"۔۔۔ انھوں نے فرمایا۔" (ارتھر گلمین دی سراسینز لندن ۱۸۸۷ء ص ۸۵-۱۸۴)

۱۴۔ صاحب خلق عظیم | "اخلاق و عادات میں وہ حد درجہ سادہ تھے، البتہ اپنے معمولات میں وہ بہت
محتاط تھے، اُن کا کھانا، پینا، اُن کا لباس اور فرنیچر وغیرہ وہی معمولی درجہ کا تھا اور ہمیشہ
جبکہ وہ اپنی طاقت و حکومت کی معراج تک پہنچے، انھیں تخیل و تصور کی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں

ودیعت ہوئی تھیں، ان کا ذہن رسا تھا اور نازک سے نازک جذبات واحساسات کا پرتو قبول کر لیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے بھی ایک کنواری سے زیادہ باحیا، عفت مآب اور شرمیلے تھے، اپنے چھوٹوں سے انتہائی رعایت کرتے اور یہ پسند نہ کرتے کہ ان کی کمزوریوں کو تلاش کر کے مذاق اُڑایا جائے، اُن کے خادم انس رضؓ کہتے ہیں کہ میں دس سال تک اُن کی خدمت میں رہا لیکن انھوں نے کبھی اُف تک نہ کہا، انھیں بچوں سے بہت محبت تھی، وہ انھیں راستے میں روک لیتے اور اُن کے سروں پر ہاتھ پھیرتے، انھوں نے زندگی میں کسی کو نہیں مارا، اگر کسی کے بارے میں انتہائی برائی بیان کرتے تو بس اتنا کہتے کہ اُسے کیا ہو گیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلودہ ہو، جب اُن سے کسی کے بارے میں بددعا کرنے کی درخواست کی جاتی تو فرماتے "میں بددعا کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو انسانیت کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں"، وہ بیماروں کی عیادت کرتے، کوئی جنازہ ملتا تو پیچھے چلتے، غلام کی دعوت کو بھی قبول کر لیتے، اپنے کپڑوں کی مرمت خود کر لیتے، بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے اور دوسروں کا بھی اسی طرح انتظار کر لیتے، وہ اپنی ازواج کے ساتھ ایک قطار میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے تھے، وہ آگ خود جلا لیتے، فرش کی جھاڑو دے لیتے، تھوڑا بہت کھانا جو کچھ بھی گھر میں موجود ہوتا، اس میں وہ لوگ ہمیشہ شریک ہوتے جو وہاں موجود ہوتے، اُن کے گھر کے باہر ایک چھپر (صفہ) تھا، جہاں ایسے متعدد غریب افراد موجود رہتے، جن کی گذر بسر کا تمام تر انحصار اُنہی کی فیاضی پر منحصر تھا" (لین پول دی اسپیچز اینڈ ٹیبل ٹاک آف دی پرافٹ محمد، لندن ۱۸۸۲ء، ص ۲۹-۲۷)

۱۵۔ سنجیدگی، اخلاص، وفاداری: "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)" پر کارلائل کے خطبات کے بعد مغرب کو یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنجیدگی پر یقین کرنے کی معقول وجوہات موجود ہیں، اپنے ایمان وعقیدہ کی خاطر مظالم سہنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا، اُن پر اعتقاد رکھنے والوں کا اعلیٰ اخلاق وکردار، اور اُن کی طرف امام وپیشوا کی حیثیت سے دیکھنا، پھر آخر کار ان کی عظمتیں اور کامیابیاں

یہ سب دلیلیں ہیں اُن کے اخلاصِ کامل کی، اس لئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک مدعی کاذب (Impostor) قرار دینے سے مسائل حل نہیں ہوتے، بلکہ اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ مزید برآں تاریخ کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے مغرب میں اس قدر کم سراہا گیا ہو جتنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو۔ اس لئے اگر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کچھ بھی سمجھنے کی نیت رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے مشن میں دیانت دار قرار دیں اور مقصد سے ان کے خلوص اور وابستگی کے قائل ہو جائیں۔ اگر ہم اُن غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جو اپنے ماضی سے ہم نے ورثہ میں پائی ہیں تو ہمیں ہر معاملہ پر اُن کے خلوص اور دیانت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا، جب تک کہ کوئی الزام اُن کے خلاف پوری طرح ثابت نہ ہو جائے۔ (واٹ محمد ایٹ مکہ، آکسفورڈ، ۱۹۵۳ء، ص ۵۲)

● — "یہ بات ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے ثابت ہے کہ ان کی زندگی اغراض و مفاد پرستی سے کلیتہً خالی تھی، مزید یہ کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اپنی نگاہوں کے سامنے دین کے مکمل قیام و استحکام اور لامحدود اختیارات حاصل ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے اپنی ذات اور انا کی تسکین کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچایا، بلکہ آخر وقت تک اس سادہ طرز و انداز کو برقرار رکھا جو اول دن سے اُن کے بود و باش سے نمایاں تھا۔" (ڈیون پورٹ اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن لندن، ۱۸۶۹ء، جیز لا ہور ا ڈیشن ص ۳۴-۱۳۳)

۱۶- <u>مشن کی سچائی</u> "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلا شک و شبہ اپنے مشن کی سچائی پر یقین تھا، وہ اس پر مطمئن تھے کہ اللہ کے فرستادہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ملک کی تعمیر و اصلاح کی ہے، ان کا اپنا مشن نہ تو تھا، اور نہ فریب دہی، جھوٹ و افترا پر مبنی تھا، بلکہ اپنے مشن کی تعلیم و تبلیغ کرنے میں نہ کسی لالچ یا دھمکی کا قبول کیا اور نہ زخموں اور تکالیف کی شدتیں ان کے راہ کی رکاوٹیں بن سکیں، وہ سچائی کی تبلیغ سے کرتے رہے۔" (ڈیون پورٹ ایضاً)

۱۷۔ سچے رسول | "بہمالت! جس کا مظاہرہ اکثر و بیشتر مسیحیوں کی طرف سے مسلمانوں کے مذہب کے بارے میں ہوتا رہتا ہے، افسوسناک امر ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس وقت کی اقوام میں ایک خدا پر یقین رکھتے تھے، اور دوسرے خداؤں کی نفی کرتے تھے، انھوں نے بہ تاکید راست بازی اور دیانداری کو کردار کا سرچشمہ قرار دیا، اور بعد ازاں فرض متعدد نمازوں کی حق و قیوم خدا کے لئے ادائیگی، تمام انسانوں کی عزت و احترام، اور سب کے ساتھ رحم و شفقت برتنے پر زور دیا، ہر قسم کی نشہ آور چیزوں سے پرہیز، ہر معاملہ میں عدل و توازن، اور ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین ان کے دین و مذہب کا حصہ تھی، لہذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک نفس روحانی کے مالک اور ایک سچے رسول تھے، مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے وہ خدا سے ہمکلام ہوتے تھے اور اور سرچشمۂ روحانی سے ان پر وحی اترتی تھی۔" (لنڈ سے مضمون، مطبوعہ لو ورلڈ، مانچسٹر، اگست ۱۹۲۶ء)

۱۸۔ امتحان سخت سے گذرے | "ان سے پہلے کوئی پیغمبر اتنے سخت امتحان سے نہ گذرا تھا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، کیونکہ منصب نبوت پر سرفراز ہوتے ہی انھوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے اُن لوگوں کے سامنے پیش کیا جو انھیں سب سے زیادہ جانتے تھے اور جو ان کی بشری کمزوریوں سے بھی سب سے زیادہ واقف ہو سکتے تھے، لیکن دوسرے پیغمبروں کا معاملہ برعکس رہا کہ وہ سب جگہ، سب کے نزدیک معزز و محترم ٹھہرے الا یہ کہ جو انھیں اچھی طرح جانتے تھے۔" (گبن زوال سلطنت روم ص ۱۰۸)

۱۹۔ آسمانوں کی بادشاہت زمین پر | "اسلام کے ذریعہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دس سال کے اندر ہی عرب کی شدید ترین نفرتوں کو، انتقامی جذبات کو، مزاج و انتشار کو، رقابت و عداوت کو نکال پھینکا، لا قانونیت، عورتوں کی ذلت، سود خواری، شراب خوری، قتل و غارت گری، دختر کشی کی رسومات قبیحہ کا استیصال کیا، اور انسانی قربانیوں، سفیہانہ خیالات و توہمات اور مادیت و اشیا پرستی سے نجات دلائی، پھر اسی مذہب کے ذریعہ آسمانوں کی اُس بادشاہت کو انھوں نے عملاً اس زمین پر قائم کر دیا، جس کی بشارت بڑے ذوق و شوق سے جناب مسیح نے دی تھی۔" (گبن ایضاً ص ۶۹، ۷۰)

۱۰۔ ہمہ گیر اصلاح | ممکن ہے یہ سوچا جائے کہ وہ آدمی جس نے اتنی بہت سی اور تادیر قائم رہنے والی اصلاحات کیں، انواع و اقسام کی بت پرستی کے بدلے جس میں لوگ مدتوں سے مبتلا تھے، ایک خدا کی عبادت کا داعی بنا، جس نے دختر کشی کی رسم قبیح کو مٹایا، شراب اور دوسری نشہ آور اشیاء کو حرام ٹھہرایا، جوئے کی ممانعت کی نسبتاً ایک دائرہ میں رہتے ہوئے تعدد ازواج کو محدود کیا، وغیرہ وغیرہ۔ کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اُس کا خدائی مشن اس کے ذہن کی محض اختراع تھی؟ اور کیا وہ جھوٹ کو جانتے بوجھتے نبھاتا رہا؟ نہیں، ہرگز نہیں! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو درحقیقت سچے مذہبی ادراکات اور روحانی احساسات حاصل تھے، جن کے سبب انھوں نے اپنے مشن کو انتہائی مستقل مزاجی پامردی و استقلال سے آگے بڑھایا اور نہ اُس کے جھٹلائے جانے کی پرواہ کی، نہ اس کی راہ میں مصائب و مشکلات کی۔ یہ سچائی، یہ حق کی معرفت انھیں ابتدا سے انتہا تک حاصل رہی یعنی حضرت خدیجہؓ کے سامنے پہلی وحی کے نزول سے لے کر حضرت عائشہؓ کی باہوں میں آخری سانس لینے تک۔ (ڈیون پورٹ)

۱۱۔ عظمتوں کے نشان | حالات، مواقع، اور وقت سب نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دیا، اور مختلف عوامل نے مل کر ان کی زندگی میں کامیابیوں کی اور ان کے بعد اسلام کی توسیع و ترقی کی راہ ہموار کی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں صفات و کمالات کا جو حسین امتزاج موجود تھا، اُس کی تین جہتیں تھیں۔ ایک نبوت کا فیضان، دوسرے سیاست و حکمرانی میں اُن کی بصیرت، اور تیسرے ایک منتظم کی حیثیت سے ان کی مہارت و حذاقت اور تمام مناصب پر اہل ترین افراد کا انتخاب۔ جب کوئی اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جس حد تک نظر ڈالتا ہے وہ اُسی حد تک ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ حالات نے انھیں کس درجہ سازگاری عطا کی، اس طرح کے مواقع تو کسی کو شاذ و نادر حاصل ہوتے ہیں، بالکل وقت کی آواز بن کر ایک پیغمبر اور ایک منتظم کی حیثیتیں انھیں اگر حاصل نہ ہوتیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پیچھے ایک خدا پر انھیں غیر متزلزل اعتقاد نہ ہوتا

اور اگر وہ اس یقین محکم سے بہرہ ور نہ ہوتے کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں تو شاید تاریخ انسانیت کا ایک اہم اور قابل ذکر باب رقم ہونے سے رہ جاتا ۔" (واٹ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین، آکسفورڈ پریس ۱۹۶۱ء، ص ۲۳۶،۲۳۲)

۲۲۔ صدق وصفا | "یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صدق کی دلیل قاطع ہے کہ ان سے قربت رکھنے والے لوگ اُن پر ایمان لائے، حالانکہ وہ اُن کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف تھے، اور اگر انھیں اُن کی صداقت میں ذرہ برابر بھی شبہہ ہوتا تو ان پر وہ ہرگز ایمان نہ لاتے ۔" (ایچ، جی ویلز بحوالہ ذکریا ہاشم ذکریا، ص ۲۷۰)

۲۳۔ اتمام واکمال | "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا آپؐ ایک سلطنت کی، جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپؐ نے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپؐ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور اُن میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا، جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔" (مارگولیتھ بحوالہ سیرۃ النبی جلد چہارم از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۳۹۹)

مقالات شبلی جلد ششم

منجملہ ان افسوسناک غلطیوں کے جو یورپ میں اسلامی تاریخ کے متعلق پیدا ہوگئی تھیں، ان میں ایک واقعہ اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلائے جانے کا بھی ہے، اس واقعہ کو یورپ نے جس بلند آہنگی سے مشہور کیا ہے، وہ نہایت تعجب انگیز ہے، تاریخیں، ناولیں، حکایتیں، مثالیں، افسانے، قصے، قصہ طلب حوالے، روزمرہ کے محاورے ایک چیز بھی اس صدا سے خالی نہیں، مروایت ولٹریچر تو الگ رہے، منطق و فلسفہ تک اس کے اثر سے محروم نہ رہے، مولانا شبلی نے اس پر ایک مدلل مضمون لکھ کر ان کی غلط فہمی کو رفع کیا، اور لکھا کہ اسکندریہ کا یہ کتب خانہ مسلمانوں کے مصر میں فاتحانہ داخل ہونے سے بہت پہلے برباد ہو چکا تھا، مسلمان جب آئے تو اس کا نام و نشان تک نہ تھا، یہ مضمون اور اسی طرح کے دوسرے مضمون مقالات کی اس جلد میں ہیں۔

قیمت :- ۱۱ روپے

مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی

از

جناب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی، چیرمین اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

مفتی عدالت اودھ مفتی محمد اصغر کے اکلوتے بیٹے، محمد یوسف کی پیدائش ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں ہوئی، درسیات کی تکمیل والد ماجد نیز مفتی محمد ظہور اللہ فرنگی محلی اور ماہر ریاضی و ہیئت مولانا محمد نور اللہ فرنگی محلی کے ایسے ممتاز اساتذۂ خاندان سے کی۔ وسیع النظر فقیہ ممتاز ماہر معقولات، صاحب درس و تدریس اور صاحب تصانیف کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔

والد کی وفات (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء) کے بعد مفتی محمد یوسف جب کہ ان کی عمر اکتیس (۳۱) برس کی تھی، اُن کی جگہ حکومت اودھ میں مفتی عدالت لکھنؤ ہوئے۔ یہ محمد علی شاہ (اودھ کے تیسرے بادشاہ) کا زمانہ تھا، انتزاعِ سلطنت اودھ (۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء) تک، پھر مزید ایک سال ۱۸۵۷ء تک (لکھنؤ میں انگریزی راج کے زمانے میں) بھی مفتی عدالت رہے۔ اس طرح اٹھائیس (۲۸) سال تک انھوں نے اودھ کی سرکاری خدمات انجام دیں، ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں اُن کا گھر بار لٹا، اس بربادی میں ان کا ذاتی کتب خانہ بھی شامل تھا، بے روزگاری اور تنگدستی کا دور اس کے بعد شروع ہو گیا، مگر انگریزی حکومت کی ملازمت کو قبول نہیں کیا، حالانکہ ۱۸۵۸ء کے بعد انگریزی حکومت استحکام کے ساتھ اودھ میں قائم ہو گئی تھی، انگریزی ملازمت سے انکار کا سبب کیا ہوا؟

انگریزی ملازمت سے انکار | لکھنؤ میں ۱۸۵۸ء میں دوبارہ انگریزی راج قائم ہو جانے کے بعد انگریزی سرکار کو جو، نوابی دور کے شرعی نظامِ عدالت کو برقرار رکھنا چاہتی تھی، تجربہ کار ملازمینِ عدالت درکار تھے

اور مفتی صاحب کی شخصیت اس پہلو سے متعارف اور ممتاز تھی۔ ان پر سرکار کی نظریں پڑیں مگر جو ہوا وہ ایک واقعہ کے نتیجے میں برعکس ہوا۔ واقعہ کے راوی کا چشم دید بیان حسب ذیل ہے:-

"ایک انگریز فرنگی محل میں مفتی محمد یوسف کو پوچھتا ہوا آیا، میں اُن کے دروازے تک اُسے لے کر گیا اور مفتی صاحب کی خدمت میں عرض کیا "ایک انگریز ملنے آیا ہے" وہ بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے کچھ تحریر کر رہے تھے، اُسے اندر بُلالیا، ایک شکستہ مونڈھے پر بٹھایا، اُس نے نکاح طلاق سے متعلق بعض مسائل دریافت کرنے کے بعد مفتی صاحب سے استفسار کیا کہ "جناب کی بسر اوقات کی کیا صورت ہے؟" فرمایا "بظاہر اسباب کچھ باقی نہیں رہا ہے"۔ اُس نے سرکاری ملازمت کی پیش کش کی تو فرمایا "مدتوں شرع کے احکام جاری کر چکا ہوں، خدا سے شرم آتی ہے کہ اس عمر میں خلافِ شرع احکام دوں، اور انگریزی حکومت میں یہ ضروری ہوگا" انگریز نے جو اودھ کا فنانشل جوڈیشل کمشنر تھا قول دیا کہ ایسی ملازمت نہ ہوگی جس میں خلاف شرع حکم دینا پڑے، اور کہا کہ "آپ کے لئے رجسٹراری کا عہدہ تجویز کرتا ہوں، بس ایک کمرہ دیدیجئے، ایک منشی اس میں بیٹھ کر سب کام انجام دے لے گا۔ سہ پہر کو آپ صرف رجسٹر پر اور دستاویزوں پر دستخط کر دیا کریں گے، رجسٹری کا دفتر آپ ہی کے یہاں رہے گا"

مسلمان منشی نے جسے فنانشل اور جوڈیشل کمشنر دوسرے دن خود پہنچانے آیا تھا دن بھر کام کرنے کے بعد سہ پہر کو رجسٹر مع دستاویزات بغرض دستخط پیش کیا، مفتی صاحب نے پہلی دستاویز کو پڑھنا چاہا منشی نے کہا "اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے میں نے جانچ لیا ہے سب صحیح و مکمل ہے"، مفتی صاحب نے فرمایا "بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر پڑھے دستخط کر دوں دستخط تو بمنزلہ شہادت (گواہی) ہوتے ہیں"۔ رجسٹر کھولا پہلی ہی دستاویز سودی قرضے کی نکلی، چہرہ سُرخ ہوگیا، رجسٹر اٹھا کر پھینک دیا۔ منشی سے کہا "ابھی یہاں سے نکل جاؤ"۔

منشی نے کمشنر صاحب سے جا کر صورتِ حال بیان کی، وہ اس خیال سے دوسرے دن منشی کو لیکر
پھر فرنگی محل آیا کہ منشی کی کسی نالائقی پر مفتی صاحب برہم ہوگئے ہوں گے۔ جیسے ہی انگریز سامنے
آیا، اُس پر برس پڑے اور کہا "بے دین سے اس کے سوا توقع ہی کیا ہو سکتی تھی، میری ہی
غلطی تھی کہ ایسے کے کہنے میں آ گیا" اور زار و قطار رونا شروع کیا وہ چپ بیٹھا رہا، کچھ وقفے
کے بعد اس نے استدعا کی کہ "آخر ارشاد ہو منشی نے کیا غلطی کی" فرمایا "سودی قرضے کی دستاویز
پر میرے دستخط لینا چاہتا تھا جب کہ حدیث شریف میں سودی قرضے کی دستاویز لکھنے والے
اور اس پر گواہ بننے والے سب پر لعنت آئی ہے"

کمشنر نے بہت معافی چاہی اور کہا "اب ایسی صورت تجویز کروں گا کہ یہ زحمت
کبھی نہ ہو" مفتی صاحب نے بالکل نامنظور فرما دیا۔ اس کے بعد بھی یہ کمشنر کبھی کبھی مسائل
دریافت کرنے آیا کرتا تھا۔

چشم دید راوی "مصنفِ تذکرۂ علمائے فرنگی محل" کے والد تھے، واقعہ کے زمانے میں چشم دید
راوی کی عمر ۱۴ سال کی تھی (۲)

مدرسہ حنفیہ جونپور میں

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد، تقریباً پانچ برس، اسی عسرت اور خانہ نشینی میں
گذارے یہاں تک کہ مفتی صاحب کے عزیز اور شاگرد رشید مولانا محمد عبد الحلیم فرنگی محلی (حضرت مولانا عبد الحی
فرنگی محلی کے والد ماجد) نواب سالار جنگ کی طلبی پر جب حیدر آباد دکن ۱۲۷۷ھ م ۱۸۶۱ء کو جانے لگے تو انھوں
نے حاجی امام بخش رئیس جونپور (مدرسہ امامیہ حنفیہ جونپور کے بانی) سے اپنی جگہ اپنے اُستاد کو مامور کرا دیا۔ مولانا
عبد الحلیم فرنگی محلی تقریباً نو برس اس مدرسہ کے صدر مدرس رہے تھے، مگر مفتی صاحب کے درس کا فیض جونپور
میں اس قدر عام ہوا کہ تمام مشرقی اضلاع میں ان ہی کا سکہ چلنے لگا۔ یہاں ان کے حلقۂ درس سے ایسے
ایسے فضلائے روزگار نکلے جو خود نوادر العصر ثابت ہوئے۔

مفتی صاحب کے تلامذہ کسی کو بھی اپنے استاد کا مثیل ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے، اُن کے ایک مشہور تلمیذ مولانا محمد فاروق مرحوم چریاکوٹی[1] نے، جنھوں نے مدرسہ امامیہ حنفیہ جونپور ہی میں مفتی صاحب کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا، اپنے استاد کی شان میں جو فارسی مثنوی کہی تھی، وہ مبالغے اور غلو کی تمام مشرقی روایات کے باوجود اس گہرے تاثر کو بہرحال ظاہر کر رہی ہے جو مولانا چریاکوٹی کے ایسے فاضل پر اپنے استاد کا تھا، چند اشعار مثنوی کے یہ ہیں

چو بر اوجِ کمالِ خود رسیدم　　زسنگِ آستانے بوسہ چیدم

چہ سنگے ؟ سنگِ ایوانِ شہ دیں　　کہ دارد از شریعتِ ملک و آئیں

---

[1] مولانا محمد فاروق چریاکوٹی نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم اپنے بڑے بھائی (سرسید کے علمی رفیق) مولانا عنایت رسول چریاکوٹی (م ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) سے حاصل کی، ہیئت کا فن مولانا محمد رحمت اللہ فرنگی محلی (م ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء) بانی مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور سے، ہدایہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے، اور حاشیہ زاہدیہ بر ملا جلال مولوی ابوالحسن منطقی سے اور بعض علوم ملا محمد نعمت اللہ فرنگی محلی (م ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء) سے پڑھے، علوم معقول و منقول و ریاضی و ادبیات جملہ علوم پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، یہاں تک کہ موسیقی کے فن میں بھی انھیں دست رس حاصل تھی، مختلف مدرسوں میں وہ مدرس رہے، سب سے پہلے تو چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے، پھر اعظم گڑھ کے مدرسہ میں آئے، کانپور کسی مدرسہ میں بھی مدرسی کی، سہسرام کے مدرسہ خانقاہ میں کچھ دنوں رہے، الٰہ آباد کے مدرسہ احیاء العلوم میں بھی قیام رہا، ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں جب ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا دارالعلوم قائم کیا تو موصوف اس میں مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، جب مولانا شبلی نعمانی مرحوم (۱۳۲۳ھ میں) دارالعلوم کے معتمد مقرر ہوئے تو مولانا چریاکوٹی ترک ملازمت کر کے گیا میں وکالت کرنے لگے اور بعض انگریز حکام کو عربی پڑھانے لگے، آخر میں ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ میں مولانا شبلی مرحوم نے پھر ان کو دارالعلوم میں ادیب اول کے عہدہ پر بلا لیا، چند روز رہ کر غازی پور گئے تھے کہ اسباب سے سلسلہ یہاں سے آئیں کہ وہیں ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان ۱۳۲۷ھ کو وفات پائی (۳) لطیفہ: ضلع بستی میں ایک انگریز کلکٹر آر. بی. ڈیوہرسٹ تھا جو مولانا فاروق چریاکوٹی کا شاگرد تھا، وہ فارسی و عربی کا بڑا عالم ہوگیا تھا، وہ یہیں سے "الہلال" کا ترجمہ انگریزی میں کر کے گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجتا تھا، کسی وکیل کو انگریزی میں بحث کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، اردو میں بحث کرنے پر اصرار کرتا تھا، ایک صاحب سے اُن کا نام پوچھا انھوں

جنابِ اوستادِ کعبۂ جاہ | دلیلِ راہِ مردانِ حق آگاہ
سحابٌ ساکبٌ جود النوال | ھمامٌ صائدٌ طود الکمال
کمیٌ فی الوغالیثُ الاعادی | کریمٌ فی الندیٰ غیث الایادی
کہ یعنے یوسفِ مصرِ معانی | غزالے مرتعِ فضلش غزالی
چہ یوسف؟ مصرِ معنی را عزیزے | نیرزد ملکِ جم پیشش بہ چیزے
بصورت شمعِ بزمِ یوسف آمد | بمعنی غیرتِ بو یوسف آمد
بہ گیتی در کمالے ہم سرش نیست | ببینے خالی از خاکِ درش نیست
بشوقِ مکتبِ درسش فلاطوں | دلے دارد چو جامِ بادہ پُرخوں
ادب گیرد بہ بستانش ارسطو | بہ پیشش بوعلی تہ کرد زانو (۵)

مولانا فاروق چریاکوٹی کے شاگردِ رشید علامہ شبلی نعمانی بھی (جنھوں نے مفتی صاحب کا زمانہ پایا لیکن ملاقات کا ثبوت نہیں ملتا) اپنے استادِ محترم ہی کے زیرِ اثر مفتی صاحب کی جلالتِ علمی سے اس درجہ متاثر تھے کہ مفتی صاحب کی وفات کے دس بارہ سال بعد جب مدرسہ امامیہ حنفیہ جون پور میں مفتی صاحب کی مسندِ درس پر ایک اور فاضل درس و تدریس کے لئے بیٹھے تو علامہ شبلی نے اپنے ایک شاگرد سے جو اسی مدرسہ میں تکمیل درسیات کے لئے داخل تھا، اس صورتِ حال اور اس قحط الرجال پر اپنے صدمے کا اظہار ان الفاظ میں کیا :۔

آوخ از دستِ فلک کہ بہاں جائے افاداتِ مفتی محمد یوسف صاحب اکنوں ایں شعر بزبانِ حال دارد ؎

از ہجومِ چند، در دیرانۂ ما جا نماند | آں قدر آباد شد آخر کہ ما برخاستیم (۶)

بعض تلامذہ | مفتی صاحب کے مدرسہ امامیہ حنفیہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے مامور ہوتے ہی بقول مصنفِ

"حیات شبلی" — خود مدرسہ کی دھوم دھام دور دور پہنچی، اور لائق و مستعد طلبہ کا ہجوم ہو گیا"۔ لیکن مفتی صاحب کی شمع تدریس کے گرد علم کے پروانے بہت شروع ہی سے جمع ہونے لگے تھے، افتار سرکاری کا عہدہ ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء میں سنبھالنے سے پہلے ہی مفتی صاحب نے تدریس شروع کر دی تھی، اور اکتیس برس کی عمر میں جب حکومت اودھ میں عہدہ سنبھالا تب بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا شغل برقرار رکھا، ان کے ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ سے پہلے کے تلامذہ میں وہ حضرات ہیں جنھوں نے لکھنؤ میں اُن سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، اُن میں اُن کے خاندان کے افراد بھی شامل ہیں، جن میں مولانا عبدالحلیم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جن کے نامور اور مشہور عالم فرزند مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے شروع سے آخر تک اپنے والد ماجد ہی سے پڑھا تھا، اور مولانا عبدالحی کے وسیع ترین حلقۂ درس نے جو کمال حاصل کیا اس کے پیش نظر یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ مفتی صاحب سے تلمذ کا سلسلہ (بیک واسطہ) اطراف ہند و بیرون ہند کے گوشے گوشے تک پہنچ گیا، جس طرح مولانا فاروق چریا کوٹی کے واسطے سے نہ صرف اولین فضلائے ندوہ بلکہ مغربی اہل علم بھی اس سلسلۂ تلمذ سے منسلک ہوئے۔ دوسرے قابل ذکر فرنگی محلی تلمیذ، مولانا محمد عبدالرزاق (مشہور مرشد، عالم اور قومی و ملی رہنما مولانا محمد قیام الدین عبدالباری کے جدامجد) تھے، جنھوں نے فرائض، معقولات اور ہدایہ مفتی صاحب سے تحصیل کے اور فاتحۃ الفراغ بھی ان ہی سے پڑھا (۷) اگرچہ وہ شیخ طریقت کی حیثیت سے معروف ہیں لیکن ان کی زندگی کا آغاز صاحبِ درس، مفتی اور مصنف کی حیثیت سے ہوا تھا،

مفتی صاحب کے تلامذہ کی نام بنام فہرست تیار کرنا ممکن نہیں، تاہم ایک قلمی بیاض میں اُن کے بعض بیرونی شاگردوں کے نام بھی نظر آئے جنھوں نے ۱۸۵۷ء سے قبل اُن سے درسیات کی تکمیل کی تھی، ان میں قابل ذکر منشی امیر احمد مینائی امیر، ان کے بڑے بھائی منشی طالب حسین مینائی اور مولوی بندہ حسن لکھنوی امیر مینائی کے سوانح نگار ممتاز علی آہ نے بھی لکھا ہے :-

"اٹھارہویں، انیسویں برس مفتی (محمد) یوسف اور مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی سے فقہ اور

اصول پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے اور فضیلت کی پگڑی باندھی گئی۔

الہ آباد کے والہ شاہ رفیع الزماں کے سجادہ نشیں فاضل شیخ، ممتاز مدرس اور طبیب حکیم مولانا سید شاہ فخر الدین احمد عرف حکیم بادشاہ مرحوم کو بھی بعض تذکروں میں مفتی صاحب کا شاگرد لکھ دیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ دیگر حوالوں کی کتابوں سے مفتی محمد یوسف کے چند نامور طلبہ کے نام ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

(۱) شیخ محمود بن مولانا کرامت علی جون پوری (۲) مولانا سعادت حسین بہاری (۳) مولانا سلامت اللہ چیراج پوری (۴) مولانا شبلی بن سخاوت علی جون پوری (۵) مولانا شکر اللہ صبر ھدی (۶) مولانا عبداللہ غازی پوری (۷) مولانا عبداللہ چیراج پوری (۸) مولانا وکیل احمد سکندر پوری (۹) مولانا شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری۔

یہ تمام وہ حضرات ہیں جنھوں نے جون پور میں مفتی صاحب کے قیام کے زمانے میں ان سے پڑھا تھا۔ بعض تلامذہ کے تحت سطور بالا میں جو نام درج ہوئے تھے وہ (۱) مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی (۲) مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی (۳) امیر مینائی (۴) طالب حسین مینائی (۵) مولانا بندہ حسن لکھنوی۔ (۶) علامہ فاروق چریاکوٹی۔

علمی، ادبی اور تدریسی حیثیتوں سے یہ سب تلامذہ بجائے خود تاریخ کے مالک ہیں۔

مفتی صاحب کے بارے میں مولانا محمد عبدالباقی (فرنگی محلی مہاجر مدنی) نے لکھا ہے:۔

وکانت له فی الفقه واصوله	مفتی صاحب کو فقہ اور اصول فقہ
الید الطولی..... وکان	میں ید طولیٰ حاصل تھا، ان کی تصنیف
تقریرہ افضل من تحریرہ ۱۱	سے زیادہ بہتر ان کی تدریس تھی۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے جو بیک واسطہ مفتی صاحب کے شاگرد تھے اور معاصر بھی لکھا ہے:۔

(۱) تذکرۂ علمائے ہند (مصنفہ رحمان علی) میں مولانا شاہ فخر الدین احمد الہ آبادی کے ذکر میں لکھا ہے:۔

کان یوسف عصرہٖ فی الجمال — شکل و صورت اور فضل و کمال میں
والکمال جامعًا للفروع والاصول — اپنے عہد کے یوسف تھے، علوم میں فروع
حاویًا للمعقول والمنقول ذا — اور اصول کے جامع، معقول اور منقول
مجاھدۃ وریاضۃ وعبادۃ و — کے ماہر، عبادت ریاضت کشف و
مکاشفۃ متہجدًا متعبدًا[۱] — وجدان سے متصف تہجد گزار تمام شب بیدار رہنے والے

شب و روز کے معمولات | مفتی صاحب کے روز و شب کے احوال اُن کے ایک جون پوری مرید کی روایت کے مطابق اس طرح تھے۔

"مفتی صاحب کا معمول تھا کہ نصف شب کے بعد بیدار ہوتے، عبادت اور ذکر بالجہر فرماتے، نماز فجر کے بعد تلاوت، اس کے بعد ورزش اس کے بعد غذا نوش فرماتے اور شب و روز میں صرف اسی وقت غذا نوش فرماتے، اس کے بعد درس شروع ہوتا جو ۱۱ بجے دن تک

(بقیہ حاشیہ صہ۱۳۱) "بہ شہر لکھنؤ در خدمت علمائے عصر یعنی مفتی محمد یوسف و مولوی نعمت اللہ و مفتی محمد اصغر و مولوی حسین احمد لکھنوی فرنگی محلی و آخون شیر محمد ولایتی تحصیل علوم متعارفہ و متداولہ نمودہ[۱]"

شاہ صاحب کی خود نوشت سوانح عمری جو ابتک قلمی تھی اور فرنگی محل کے ذخیرۂ کتب میں راقم الحروف کو دستیاب ہوئی تھی، شاہ صاحب کے خاندان کے سید مظفر حسن (سابق وزیر نقل و حمل اتر پردیش) نے مع اُردو ترجمے کے شائع کردی ہے، اس میں شاہ صاحب نے فرنگی محل میں اپنے اساتذہ کا اس تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ کس سے کون کتابیں پڑھیں۔ ان میں مفتی محمد یوسف کا نام نہیں ہے، ان کے اساتذہ میں مولانا محمد برہان الحق فرنگی محلی مولانا محمد معین فرنگی محلی مفتی محمد اصغر فرنگی محلی مولوی محمد ولی اللہ فرنگی محلی، مولانا محمد نعمت اللہ فرنگی محلی، آخون شیر محمد ولایتی (شاگرد مفتی محمد ظہور اللہ فرنگی محلی) اور مولوی محمد اسمٰعیل لندنی (شاگرد علمائے فرنگی محل) ہیں[۱] شاہ صاحب کے ایک استاذ مولانا حسین احمد لکھنوی فرنگی محلی کے نام سے تذکرۂ علمائے ہند میں مذکور ہیں، یہ علمائے فرنگی محل کے شاگرد تھے، ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے حدیث کا درس دیتے تھے اس سے "محدث" نام کا جزو ہوگیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی سے حدیث پڑھی تھی اور بعض علمائے فرنگی محل نے ان سے حدیث پڑھی۔

ہوتا۔ اس کے بعد کچھ دیر تالیف و تصنیف فرما کر آرام فرماتے، پھر نماز ظہر پڑھتے، اس کے بعد پھر تدریس فرماتے، مغرب کے بعد پھر تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے، بعد عشاء آرام فرماتے۔"

طریقۂ درس سے متعلق واقعہ | مولانا محمد عنایت اللہ فرنگی محلی نے مفتی صاحب کے درس کے سلسلہ میں یکیا اس جماعت کو پڑھاتے ہوئے جس میں راقم بھی شامل تھا ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا (مولانا عنایت اللہ ۱۳۱۲ھ میں ایک سال کے لئے مدرسہ اسلامیہ حنفیہ (جونپور) میں صدر مدرس رہے تھے، اس زمانہ تک مفتی صاحب کے دیکھنے والے نیز مرید اور بعض بلا واسطہ شاگرد، جونپور اور اطراف میں موجود تھے)

"ایک طالب علم نے جو مفتی صاحب کے درس کی شہرت سنکر اپنی درسگاہ کی تعلیم ترک کر کے جونپور آیا تھا، کچھ دو دنوں درس میں شریک رہ کر محسوس کیا کہ اس درس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی جو باعث ترجیح ہو، اپنا یہ تاثر اس نے ہم درس طلبہ سے بیان بھی کر دیا، مفتی صاحب تک بھی یہ خبر پہنچی۔ اسے بلا کر فرمایا کہ کل سویرے ہی سبق پڑھنے آجانا، سویرے جن طلبہ کا درس مقرر تھا ان کی آمد پر ان سے کہدیا کہ آج ان طالب علم کا سبق ہوگا، اور صبح اس کا درس شروع کر دیا۔ زیر درس عبارت کی تشریح میں عبارت اور فن کے رموز و نکات بیان کرنا شروع کر دیئے، یہاں تک کہ دس بج گئے، بعد ظہر بھی پھر بعد عصر بھی یہی سلسلہ جاری رہا، دوسرے اسباق اس دن موقوف رہے، مغرب کے قریب طالب علم نے اُستا کے قدموں میں سر رکھ کر گستاخی کی معافی چاہی، مفتی صاحب نے درگذر کرتے ہوئے فرمایا "اگر اسی طرح پڑھانے سے اطمینان ہوتا ہے تو دوسرے تمام اسباق کے لئے وقت کہاں بچے گا؟"

شاگردوں کی تربیت | مفتی صاحب زیر درس طلبہ کی تربیت پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے، درس کو مقررہ وقت سے تاخیر پر، خواہ تاخیر کا سبب معقول ہی کیوں نہ ہو سخت سرزنش کرتے، اسی طرح لباس کا اہتمام

کرنے والے طلبہ سے بھی برہمی ظاہر فرماتے، اس سلسلہ میں مولانا عبد الرزاق فرنگی محلی کے دو واقعے ان کے تذکرے میں درج ہیں، اول یہ کہ مولانا کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی، مفتی صاحب سے درسیات کی آخری کتابیں پڑھ رہے تھے (اُس زمانہ میں مفتی صاحب اپنے پردادا کے ننھیالی مکان میں رہتے تھے جو فرنگی محل سے میل بھر کے فاصلہ پر سوت پٹی① میں تھا) فرنگی محل سے "سوت پٹی" جانے میں ایک نالہ پڑتا تھا، جہاں اکثر دن میں بھی بھیڑیا آجایا کرتا تھا، مولانا گھر سے جا رہے تھے کہ نالے کے قریب معلوم ہوا کہ بھیڑیا آگیا ہے اور ایک شخص کو زخمی کر چکا ہے لوگ بھاگ رہے تھے، مولانا بھی بھاگے اور گر پڑے، اس سے قدرے تاخیر ہو گئی، مفتی صاحب نے تاخیر پر بہت غصہ کیا اور سبق پڑھانا شروع کر دیا، سبق کے بعد فرمایا "ہاتھ منہ دھو لو" اور کپڑے منگا کر پہنوائے اور خود گھر پہنچا گئے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے مشروع کا پائجامہ اور ٹنک کا کرتا بنوایا اور اس کو پہن کر مفتی صاحب کے مکان پر پڑھنے گئے، مفتی صاحب نے ملاحظہ فرماتے ہی کتاب بند کر دی اور فرمایا "جب اس قدر جلد توڑ کا خیال ہے تو بس تحصیل علم ہو چکی" (مفتی صاحب مولانا کے حقیقی بڑے پھوپھی زاد بھائی تھے) مولانا نے فوراً

---

① سوت پٹی، آج کل وہ سڑک جسے جگت نرائن روڈ کہتے ہیں جو میڈیکل کالج سے شروع ہو کر رفاہ عام اور کرسچین کالج ہوتی ہوئی گول گنج سے آگے چلی جاتی ہے اس میں وہ بڑا علاقہ جہاں سٹی اسٹیشن رفاہ عام اور چھوٹی ریلوے لائن کے گزرنے کے لئے حصے بنے ہوئے ہیں، یہ پورا علاقہ ریزیڈنسی تک "سوت پٹی" کہلاتا تھا جہاں بڑے بڑے بازار اور محلات تھے، عام قبرستان بھی تھا (اس قبرستان میں مشہور اردو شاعر میر تقی میر کی بھی قبر ہے) ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں یہ بستی تہس نہس ہو گئی، بہت کچھ سڑکیں نکالنے میں کام آگئی، اور جگہ جگہ نئی تعمیریں ہو گئی ہیں، یہاں مفتی محمد مراد لکھنوی کا جو شہر کے ایک رئیس تھے، مکان تھا، مفتی مراد، مفتی محمد یوسف کے پردادا کے حقیقی نانا تھے، مفتی مراد کی ایک ہی بیٹی تھیں، اس حساب سے ان کی املاک ان کی بیٹی کی اولاد کے حصے میں آئی۔

ی طرح سے کالا سا سیا گیا اور اس کا کرتا پائجامہ بنوایا، جب کا کرتا گاڑھے کے پائجامے کے ساتھ اور گاڑھے
کا کرتا مشروع کے پائجامے کے ساتھ پہن کر جب کئی بار مفتی صاحب کے یہاں گئے اور انھوں نے دیکھ لیا تب
سبق پڑھنے کی اجازت دی[1]

بیعت | مفتی محمد یوسف نے چودہ برس کی عمر میں مولانا شاہ احمد انوار الحق فرنگی محلی (م ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء) سے
سلسلۂ قادریہ رزاقیہ میں بیعت کی تھی، ایک ہی سال کے اندر مرشد کا وصال ہو گیا، مرشد کے خلیفہ اپنے
والد ماجد کے حقیقی چچیرے بھائی) مولانا محمد عبد الوالی (م ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء) سے اوراد و اذکار حاصل کئے۔ . . .
اور ان کے خلیفۂ مجاز ہوئے، مفتی صاحب سے سلسلۂ قادریہ رزاقیہ کی اشاعت بھی ہوئی، ان کے مریدوں میں ایک
صاحب حافظ قدرت اللہ جون پوری بھی تھے جن سے مفتی صاحب کے معمولات روز و شب کی روایت مصنف
تذکرۂ علمائے فرنگی محل نے کی ہے۔

مسئلۂ جہاد پر فتویٰ | مفتی صاحب کی سرکاری ملازمت کے آخری سال میں اودھ میں ایک سانحہ پیش آیا،
وہ یہ کہ اجودھیا (فیض آباد) میں واقع ہنومان گڑھی[1] میں مغل دور کی ایک چھوٹی مسجد تھی جسے اودھ کی
حکومت کے ضعف کے زمانے میں شہید کر دیا گیا تھا، ایک صاحب شاہ غلام حسین نامی ایک جمعیت کے
ساتھ مسجد کی واگذاری کی کوشش میں اجودھیا پہونچ گئے اور بابری مسجد میں قیام کر کے اپنے مقصد کے حصول
کی سعی میں مصروف ہو گئے کہ اچانک ایک مسلح بڑی جمعیت نے بابری مسجد پر حملہ کر کے مسجد میں مقیم تمام
لوگوں کو قتل کر دیا، قرآن شریف کی بھی بے حرمتی کی، اس سانحے کے مشہور ہوتے ہی راجدھانی لکھنؤ میں
ہل چل مچ گئی۔ اودھ کے آخری حکمراں واجد علی شاہ کا دور تھا، اور وزیر اعظم نواب علی نقی خاں تھے، جنھیں

---

[1] کہا جاتا ہے کہ رام چندر جی نے لنکا کی فتح کے بعد اجودھیا کے اس ٹیلے پر ہنومان کو بٹھایا تھا اس بنا پر وہ
"ہنومان بیٹھک" کہلانے لگا تھا، مغلیہ دور میں اس بلند جگہ ایک چھوٹی سی مسجد بھی بن گئی تھی، شجاع الدولہ
(نواب وزیر اودھ) کے زمانے میں جب وہ بکسر کی مہم میں مصروف تھے، ایک بیراگی نے وہاں چھپر ڈال کر ہنومان
کی مورتی نصب کر دی، مسجد میں رہنے والے مؤذن نے اس موقع پر کوئی مزاحمت نہیں کی۔

بادشاہ سے زیادہ انگریزوں کا وفادار تاریخ میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

مسلم رعایا نے نواب علی نقی خاں سے دادرسی چاہی، انھوں نے ہنومان گڑھی میں مسجد ہونے کا ثبوت مل جانے پر مسجد بنوا دینے اور مجرموں کو سزا دینے کا یقین دلایا، پہلی جانچ رپورٹ ثبوتِ مسجد کی تائید جسے دربار کی بیرونی اور اندرونی ریشہ دوانیوں نے مسترد کرا دیا، دوسرا جانچ کمیشن مقرر ہوا جس نے مخالف رپورٹ دی، اس دوران میں مولانا سید امیر الدین علی امیٹھوی کی قیادت میں ایک نجی لشکر تیار ہو گیا جس نے سرکاری وعدوں میں لیت و لعل کا اندازہ کر کے خود ہنومان گڑھی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، اس پیش قدمی کو روکنے کی سرکاری تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ بھی اختیار کی گئی کہ علمائے فرنگی محل سے استفتاء کیا گیا کہ نجی لشکر کی پیش قدمی زمرۂ جہاد میں داخل ہے یا نہیں؟ مفتی محمد یوسف سے بھی استفتاء کیا گیا، انھوں نے جو جواب دیا اسے سرکار کی حمایت سے تعبیر کیا گیا اور مفتی صاحب سرکاری ملازم تھے ہی، اس صورتِ حال نے مفتی صاحب کو اچھا خاصا مطعونِ خلائق بنا دیا، فرنگی محل کے بیشتر علماء مولانا امیٹھوی کی علانیہ تائید کر رہے تھے، اور غیر سرکاری استفتاء جو تیار کیا گیا تھا اس کے جواب میں بعض علمائے فرنگی محل نے فرضیتِ جہاد کا حکم بھی دیا تھا، جن میں خود مفتی صاحب کے شاگرد مولانا شاہ محمد عبد الرزاق فرنگی محلی بھی شامل تھے، فتوں کو زیرِ بحث اگر نہ لایا جائے تو "نوازل و حوادث" میں فقہاء اور صاحبانِ افتاء کا اختلاف بہت عام بات ہے، زیرِ بحث معاملہ محض فقہی ہوتا تو اس اختلاف کی سنگینی اس قدر محسوس نہ کی جاتی، مگر اس معاملہ کا غالب پہلو جذباتی تھا۔

بہرحال مفتی صاحب کو اس دور میں اچھی خاصی رسوائی کا سامنا رہا، عبارتِ استفتاء مختصراً اور مفتی صاحب کا مکمل جواب ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

<u>عبارتِ استفتاء</u> | مولوی امیر الدین علی بانتقام بے ادبی کلام مجید و انہدام مسجد و کشتہ شدن شہیدان اودھ کمر ہمت برائے جہاد بستہ راہی ہنومان گڑھی می شوند در مقام دریاباد افواج شاہی سد راہ شدہ ممانعت کوچ می سازند، مولوی صاحب فسخ عزیمت نمی سازند بادشاہ

باعث نقصان مسلمانان حکم بالادست مجبور شدہ بمصلحت چند ایام منع روانگی می فرماید دریں حال اگر . . . مجادلہ ومقاتلہ از مجاہدان وافواج سلطان اسلام بوقوع آید پس مرگ مسلمانان طرفین چگونہ خواہد بود ؟

(مولوی امیر الدین علی کمربستہ جہاد ہیں، شاہی فوج کے روکنے سے رکتے نہیں ہیں، بادشاہ، بالادست حکام (مراد انگریز) کی ناراضگی کے اندیشے سے مجبور ہو کر مولوی صاحب کو مصلحتاً چند یوم کے لئے روانہ ہونے سے روک رہے ہیں، اس صورت حال میں اگر مجاہدین اور شاہی فوج میں تصادم ہو جاتا ہے اور اس میں لوگ کام آتے ہیں تو دونوں طرف کے مارے جانے والے مسلمانوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں علمائے دین ؟)

مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی نے تفصیلی جواب لکھا (وہ بھی عدالت اودھ میں مفتی تھے) اور فتویٰ صادر کیا کہ مجاہدین کو آگے جانے کے بجائے واپس آجانا چاہئے یہ جہاد نہیں ہے۔

مفتی سعد اللہ کی تصویب کرتے ہوئے مفتی محمد یوسف نے یہ جواب دیا :-

جواب | فی الواقع فسخ عزیمت می باید وو رشہادت دغدغہ است، واللہ اعلم کتبہ محمد یوسف۔

(واقعی آگے کا قصد ترک کر دینا چاہئے، شہادت کا مرتبہ پانا کھٹکے کی بات ہے)[۱۱۲]

سفر حج وزیارت | جب مفتی صاحب کی عمر عربی حساب سے ترسٹھ سال کے قریب پہنچی تو انھوں نے فریضہ حج ادا کرنے کا قصد کیا، اس سے قبل ایک دفعہ وہ سخت علیل ہو گئے تھے، حالت آخری ہو گئی تھی کہ خواب میں ان کو بشارت ملی کہ ان کی موت حالتِ سفر میں ہو گی[۱۱۳]

۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں وہ اپنی پوتی کے عقد میں جو مولانا عبد الحی کے ساتھ ہوا، فرنگی محل میں آخری بار آئے اور تقریباً چھ مہینے قیام کر کے جون پور واپس گئے[۱۱۴]۔

شعبان ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء کے آخر میں جون پور سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے اور پہلی رمضان کو بحری جہاز

سے بمبئی روانہ ہو کر آخر رمضان میں جدہ پہنچے، وہاں ایک مہینہ قیام کر کے آخر شوال میں مدینہ منورہ روانہ ہوئے، راستے میں علالت (اسہال کبدی) شروع ہو گئی، مدینہ منورہ میں حاضری نصیب ہو گئی اور جوار رسول (علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیم) میں ۱۹ر ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ کو وفات پائی اور جنت البقیع میں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔[۲۳]

بیان کرتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد مدینہ شریف کے ایک بزرگ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی کہ آپ فرما رہے ہیں کہ اس شخص (مرحوم مفتی صاحب) نے جوانی سے مرتے دم تک کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کیا۔[۲۴]

تصانیف | مفتی صاحب کی متعدد مفید اور مضامین انیقہ پر مشتمل تصانیف ہیں :-

(۱) شرح سلم ملا حسن پر حواشی (۲) شرح سلم قاضی مبارک پر حواشی (۳) شمس بازغہ پر حواشی، (۴) ملا حسن کے شمس بازغہ پر حواشی کا تکملہ (۵) ابن سینا کی تصنیف کتاب الشفاء کے طبعیات پر حواشی جو ناتمام رہے (۶) شرح وقایہ جلد اول کے ابتدائی حصے پر حواشی[۲۵] ..... (۷) تفسیر بیضاوی پر حواشی (۸) صحیح بخاری پر حواشی[۲۵]

اہل و عیال | مفتی صاحب کا عقد مولانا عبد الواحد (ملا بحر العلوم کے پوتے کی بیٹی سے ہوا، جن سے ایک بیٹے محمد مہدی اور دو بیٹیاں ہوئیں، بیٹیوں کا عقد خاندان ہی میں ہوا، ایک کا مولوی محمد فصیح اللہ وفا اور دوسری کا مولوی محمد انعام اللہ انعام و نجم کے ساتھ، بیٹے محمد مہدی نے جن کی کنیت ابو الجیش تھی درسیات کی تکمیل والد ماجد ہی سے کی، سلطنت اودھ میں مفتی عدالت کے منصب پر کچھ عرصے اپنے والد ماجد کی قائم مقامی کی، انگریزی حکومت کے زمانے میں رجسٹراری کے محکمے میں ملازم ہو گئے اور ان کا عقد مولانا عبد الحکیم (ملا بحر العلوم کے پوتے) کی بیٹی سے ہوا، جن سے دو بیٹیاں اور دو بیٹے محمد قاسم اور ابو محمد ہوئے ابو محمد کا انتقال شادی بیاہ سے پہلے ہی ہو گیا، بیٹیوں کا عقد خاندان ہی میں ہوا، ایک کا شوہر نامور

نام مولانا عبدالحی فرنگی محلی تھے، دوسری کے شوہر مولانا عبدالخالق فرنگی محلی۔

مولانا محمد مہدی کی وفات ۱۳۰۳ھ میں دریا میں ڈوب کر ہوئی، وہ فیض آباد گئے ہوئے تھے، وہاں ہی یہ حادثہ پیش آیا — ان کی تصنیف و تالیف، درس و تدریس نیز بیعت کے سلسلے میں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔

ان کے بیٹے مولوی محمد قاسم نے اپنے نامور جد مفتی محمد یوسف سے کتب درسیہ پڑھیں، وہ حافظ قرآن بھی تھے ۔ ان کے درسیات کی تکمیل اور بیعت وغیرہ سے متعلق کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ ان کا عقد خاندان میں عمدۃ العلماء مولانا محمد ظہور علی کی بیٹی کے ساتھ ہوا (خاندان کی یہ شاخ حیدر آباد دکن میں بودوباش رکھتی تھی) جن سے ایک بیٹے محمد یوسف بقید حیات رہے، جن کا عرف "مفتی میاں" رکھا گیا، خود مولوی محمد قاسم حیدر آباد دکن میں رہے، بیوی (بنت مولانا محمد ظہور علی) کے انتقال کے بعد حیدر آباد ہی میں انھوں نے دوسرا عقد خاندان سے باہر کیا جن سے اولادیں ہیں، مگر ان کے احوال معلوم نہیں ہوسکے ۲۹۔ مولوی قاسم کی وفات ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔

حوالہ جات

(۱) مقدمہ عمدۃ الرعایہ از مولانا عبدالحی فرنگی محلی (مطبوعہ عربی)، (۲) تذکرۂ علمائے فرنگی محل از مولانا محمد عنایت اللہ (اردو مطبوعہ صفحہ ۹-۱۰۷)۔ (۳) حیات شبلی از علامہ سید سلیمان ندوی (اردو مطبوعہ صفحہ ۴۳) (۴) تحریک خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی (اردو مطبوعہ صفحہ ۴۶-۴۵) (۵) تذکرۂ علمائے ہند از مولوی رحمان علی (فارسی مطبوعہ صفحہ ۲۱۸)، (۶) حیات شبلی مذکورہ صفحہ ۴۹، (۷) انوار رزاقیہ از شیخ محمد الطاف الرحمن قدوائی (اردو مطبوعہ صفحہ ۸)۔ (۸) قلمی بیاض از شمس العلماء مولانا محمد نعیم فرنگی محلی (م ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء) یہ بیاض مولانا نعیم کے پرپوتے اور جانشین مولوی محمد ناصر مرحوم (م ۱۳۹۸ھ ۱۹۷۸ء) کے

کے پاس تھی اس سے راقم الحروف نے کچھ چیزیں نقل کرلی تھیں اب یہ بیاض ان کے گھر سے لاپتہ ہو گئی ہے
(۹) مطالعۂ امیر از ڈاکٹر ابو محمد سحر (مطبوعہ اردو منٹ) (۱۰) تذکرۂ علمائے ہند مذکورہ ص۱۶۱ (۱۱) قطب دائرہ (ترجمہ مولانا شاہ شبیر عطا سلونوی (مطبوعہ) (۱۲) برکۃ العلم والعمل فی سکان فرنگی محل از مولانا محمد عبدالباقی فرنگی محلی مہاجر مدنی (عربی مخطوطہ) (۱۳) مقدمہ عمدۃ الرعایہ مذکورۂ بالا، (۱۴) تذکرۂ علمائے فرنگی محل مذکورۂ بالا (ص۲۰) (۱۵) انوار رزاقیہ مذکورہ ص۱۲ (۱۶) انوار رزاقیہ مذکورہ ص۱۱ (۱۷) خیر العمل از مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی (مخطوطہ عربی) (۱۸) حدیقۂ شہداء ہنومان گڑھی کی مسجد اور اس کے سلسلہ میں مولانا سید امیر الدین علی شہید امیٹھوی کے واقعہ کے موضوع پر حدیقۂ شہداء نہ صرف معاصر تصنیف ہے بلکہ ایسے مصنف کے قلم کی لکھی ہے جو مولانا امیٹھوی شہید سے قربت رکھتا تھا اور اسے مولانائے شہید نے لشکر میں شامل ہونے سے باز رکھتے ہوئے راجدھانی لکھنؤ میں بطور سفیرِ خاص مقیم رہنے کا حکم دیا تھا، اس کی یہ کتاب اس واقعہ کے سلسلے میں لکھنؤ میں درباری اور عوامی رجحانات کے مشاہدات اور لشکر مجاہدین کی بیرون لکھنؤ سرگرمیوں سے متعلق موصولہ اخبار (بعض تحریرات) پر مشتمل ہے، اس کا نقطۂ نظر ازروئے تاریخ غیر جانبدارانہ نہیں کہا جاسکتا ہے تاہم واقعات کے اعتبار سے یہ کتاب مستند ماخذ ہے، مصنف کا نام مرزا جان ہے جو قلمی نام معلوم ہوتا ہے، بچپن میں کانوں میں پڑا تھا کہ مصنف کا خاندانی تعلق شیخ زادگانِ لکھنؤ سے تھا، راقم کے سنِ شعور میں اس خاندان کے ممتاز فرد شیخ شوکت علی وکیل تھے جن کا احاطہ شیخ شوکت علی واقع رکاب گنج آج بھی معروف ہے کتاب اس سال چھپی جس سال مولانا امیر الدین علی شہید کا واقعہ پیش آیا۔

(۱۹-۲۰) حوالۂ بالا (۲۱) خیر العمل مذکورۂ بالا (۲۲) حوالۂ مذکورہ (۲۳) برکۃ العلم والعمل مذکورۂ بالا (۲۴) خیر العمل مذکورۂ بالا، (۲۵) مقدمہ عمدۃ الرعایہ مذکورۂ بالا، (۲۶) خیر العمل مذکورۂ بالا (۲۷) حوالۂ مذکورہ (۲۸) تذکرۂ علمائے فرنگی محل مذکورۂ بالا: (۲۹) برکۃ العلم والعمل مذکورۂ بالا (۳۰) تذکرۂ علمائے فرنگی محل مذکورۂ بالا

از

مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری، ناظم جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر، نیپال

(۲)

شاعر کی قدردانی انعام و اکرام

مروان بن ابوحفصہ نے معن بن زائدہ کی وفات پر مرثیہ کہا، حاتم وقت جعفر برمکی نے بلاکر پوچھا کہ معن کی اولاد نے تجھ کو اس مرثیہ خوانی پر کچھ دیا، شاعر نے کہا کچھ نہیں دیا، پھر پوچھا کہ اگر معن زندہ ہوتا تو تجھے ان شعروں پر کیا دیتا؟ اس نے کہا کہ تقریباً سو اشرفی، جعفر برمکی نے کہا کہ معن اور زیادہ دیتے، یہ کہہ کر حکم دیا کہ مکان روانہ ہونے سے پہلے ایک ہزار چھ سو اشرفی میرے خزانچی سے لے لینا، (مرأۃ الجنان ج ۱ ص ۳۳)

کیسے عجیب و غریب قسم کے سخی و فیاض تھے، آج چراغ رخ زیبا لے کر ڈھونڈو تو اس کی نظیر سے یہ تاریک دنیا خالی نظر آئے گی،

انعام کی مقدار عظیم

خلیفہ مہدی نے مروان بن ابوحفصہ شاعر کو ہر شعر پر ہزار درہم دیا، اس طرح ستر شعروں پر ستر ہزار درہم نقد حاصل ہوگیا، (مرأۃ الجنان ج اول ص ۳۹)

ایک اور عظیم القدر انعام

علامہ یافعی لکھتے ہیں کہ ایک عباسی خلیفہ نے صرف ایک بیت پر خوش ہو کر تین لاکھ کی ایک تھیلی شاعر زماں مروان بن ابوحفصہ کو دے ڈالا، (مرأۃ الجنان ص ۳۹)

ایک عجیب مدح سرائی پر ایک عظیم انعام

یزید بن حاتم (حاکم افریقہ) کی تعریف میں ایک شاعر نے

دو شعر پڑھے ؎

یا واحد العرب الذی | اضحی ولیس له نظیر
لو کان مثلک آخر | ما کان فی الدنیا فقیر

اے عرب کے واحد فرد اور بے مثال شخص، اگر تمہارے مانند کوئی اور بھی دوسرا شخص ہوتا تو دنیا میں کوئی فقیر و محتاج نہ رہ جاتا،

یزید نے اپنے خزانچی کو بلایا اور پوچھا کہ خزانہ میں کتنی رقم ہے، اس نے کہا، سونے اور چاندی کے سکے اور سلیں لاکر بیس ہزار اشرفی کی مالیت ہے، یہ سن کر خزانچی سے کہا کہ سب ان کو دے دو اور شاعر سے کہا:

یا اخی معذرۃ الی اللّٰہ تعالیٰ | اے بھائی: یہ میری معذرت قبول
ثم الیک واللّٰہ لو کان | کرو کہ اس سے زیادہ، میرے پاس
فی ملکی غیرھا لما اوخرتھا، | اس وقت کچھ نہیں ہے، ورنہ اگر کچھ
(مرأۃ الجنان ج ۱ ص ۳۹۹) | ہوتا وہ سب کچھ تمہارے حوالہ کر دیتا،

شاعر کی ادنیٰ تحریک پر بیش قرار عطیہ

فیاض زمانہ یحییٰ بن خالد برمکی کا قاعدہ تھا کہ سواری کے وقت جو بھی اس کے سامنے آتا، اس کو دو سو درہم دلواتا، ایک دن ایک شاعر سامنے آگیا، اس نے یہ دو شعر پڑھے ؎

کل من مر فی الطریق علیکم | فلہ من نوالکم ماتان
مأتا درھم لمثلی قلیل | ھی منکم للقابس العجلان

یعنی سرِ راہ چلتے چلتے مل جانے والوں کو آپ دو سو درہم دے ڈالتے ہیں، مگر مجھ جیسے فرد فرید کو یہ رقم کافی نہ ہوگی۔ اس پر دو سو کے بجائے بیس ہزار درہم منظور ہو گیا،

بچہ کی ولادت پر مبارکباد فضل ابن یحییٰ کا اکرام

فیاض وقت فضل بن یحییٰ برمکی کے یہاں ایک بچہ تولد ہوا، تو شعراء نے مبارکباد دی، اور اشرفیوں کا انعام حاصل کیا، ایک دمشقی شاعر نے یہ شعر پڑھا:

ویفرح بالمولود من آل برمک ولا سیما ان کان من ولد الفضل

آل برمک کے ہر نوزائیدہ بچے سے لوگ خوش ہوتے ہیں، خاص طور سے جب وہ بچہ فضل بر کا ہو، (مرآۃ الجنان صـ۴۳۴)

فضل بن یحییٰ برمکی نے خوش ہو کر اس شاعر کو دس ہزار اشرفی ایک شعر پر دے دیا،

اشعار سے عبرت پذیری اور قدر دانی

خلیفہ متوکل سے کسی شخص نے شکایت کی کہ امام ابوالحسن عسکری خلافت کی تمنا رکھتے ہیں، یہ سن کر خلیفہ متوکل نے فرمایا، خفیہ جا کر جس حالت میں ہوں، ان کو اسی حالت میں حاضر کر دو، وہ بال کا کرتہ پہنے ہوئے تھے، اور سوت کی چادر پہنے ہوئے تھے، اور قرآن پاک کی آیات کو ترنم سے پڑھ رہے تھے، اسی حال میں خلیفہ متوکل کے سامنے حاضر کیے گئے، خلیفہ نے ان سے کہا، انشدنی شعرا، مجھے کوئی شعر سناؤ، امام عسکری نے فرمایا کہ میں اشعار بہت کم جانتا ہوں، خلیفہ نے کہا، کچھ نہ کچھ ضرور سنانا ہوگا، تو ان اشعار کو سنایا:

نادا ھم صارخ من بعد ما قبروا این الاسرۃ والتیجان والحلل

این الوجوہ التی کانت منعمۃ من دونھا تضرب الاستار والکلل

فافصح القبر عنھم حین سائلھم تلک الوجوہ علیھا الدود یقتتل

یعنی کسی نے قبر میں جانے والوں سے پوچھا کہ تخت و تاج اور شاہی لباس کہاں گیا ہوئے، اور ناز و نعم میں پلے ہوئے چہرے جن کے سامنے پردے اور حجاب لگے رہتے تھے، کہاں گیے، تو قبر نے کہا کہ دیکھو یہ چہرے موجود ہیں، اور کیڑے مکوڑے ان پر دوڑ رہے ہیں،

متوکل ان اشعار سے متاثر ہو کر دیر تک روتا رہا، یہاں تک کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی، پھر پوچھا کہ تم پر کچھ قرض ہو تو ادا کر دیا جائے، انھوں نے کہا، چار ہزار اشرفی مجھ پر قرض ہے، متوکل نے چار ہزار اشرفی دے کر ان کو عزت سے رخصت کر دیا، (مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۱۶۱)

ایک شعر کے ذریعہ التماس فی الفور انتظام

سیف الدولہ کے پاس مقام "حلب" میں قاضی ابو نصر نیشاپوری آئے اور یہ شعر پڑھا:

جنابك معتاد و امرك نافذ و عبدك محتاج الی الف درهم

یعنی آپ کی خدمت میں سب کی حاضری ہوتی ہے، اور آپ کا حکم سب کے لیے جاری ہوتا ہے آپکا یہ خاکسار خادم ہزار درم کے لیے ضرورتمند ہے،

قاضی صاحب کے اس سادہ التماس پر سیف الدولہ ہنسنے لگا، اور ایک ہزار درم فی الفور مولانا کے حوالہ کیا، (مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۳۴۳)

نضر بن شمیل کے ایک لفظ کی اصلاح پر عظیم الشان انعام

نضر بن شمیل بصری حدیث، لغت اور نحو کا امام گذرا ہے، ایک بار خلیفہ مامون رشید نے لفظ سداد کو غلطی سے سَداد بالفتح پڑھا، تو نضر بن شمیل نے سِداد بالکسر بتا کر اصلاح کی، اور استدلال میں عرب جاہلیت کا ایک شعر پیش کیا، مامون نے اصلاح کو صحیح سمجھ کر بخوشی پچاس ہزار درم انعام دیا، (مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۱)

شعراء کی عجیب قدردانی

المرکشی نے معجب میں شعراء کی قدردانیوں کے سلسلہ میں ایک عجیب بات نقل کی ہے، کہ عربی زبان میں شعر کہنے والوں کو صلہ اور انعام دینے کے لیے اندلس کے بعض امیروں نے اپنی اپنی زمینیں وقف کر رکھی تھیں، مساجد و مدارس جیسے متبرک مقامات کے لیے اوقاف تو مسلمانوں کا عام معمول رہا ہے، لیکن شعراء کے مصارف و انعامات کے لیے اوقاف تو اندلس ہی کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے،

محدثین کی شعری واقفیت | امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا چرچا نہ پھیلتا، سفیان ثوریؒ نے شعبہ کی وفات کے موقع پر فرمایا مات الحدیث، یعنی آج علم حدیث کا انتقال ہو گیا ہے، وکان راساً فی العربیۃ والشعر، یعنی یہ محدث یگانہ شعر وادب میں بھی ممتاز تھے (مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۲۴۱)

علم فقہ وفن شعر | امام محمد بن حسن شیبانیؒ کا بیان ہے کہ میرے باپ نے تیس[۳۰] ہزار درہم چھوڑا تھا اس میں سے پندرہ[۱۵] ہزار درہم نحو اور شعر کی تحصیل پر میں نے صرف کیا، باقی علم فقہ پر (مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۲۴۲)

اس سے معلوم ہوا کہ محدثین وفقہا بھی شعر گوئی میں وقت صرف کیا کرتے تھے،

امام شافعیؒ کی شعری مہارت | علم حدیث وفقہ میں مہارت کے ساتھ ساتھ علم ادب وشعر میں امام شافعیؒ کو کمال حاصل تھا، ادب کے ماہرین آتے اور اشعار ان سے حل کراتے، ہذیل شاعر کے دس[۱۰] ہزار اشعار آپ کو زبانی یاد تھے، (مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۱۹)

اسی طرح جب خلیفہ ہارون رشید نے امام شافعیؒ سے قرآن وحدیث کے سوال وجواب کے بعد شعروں کے متعلق پوچھا کیف معرفتک بالشعر، تو جواب دیا کہ ہر نوع وہر بحر کے اشعار سے واقف ہوں، (مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۲۱)

کسی نے امام موصوف سے کہا کہ فقیہ مصر اشہب آپ کے لیے موت کی دعا کرتے ہیں، اس پر آپ نے بداہتہً یہ شعر پڑھا:

تمنی رجال ان اموت وان امت | فتلک سبیل لست فیها باوحد

(مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۱۴۴)

کچھ لوگ میری موت کی تمنا کر رہے ہیں، حالانکہ موت تو سب ہی کو آتی ہے، اگر میں بھی مر گیا تو میں اس راہ میں منفرد نہ ہوں گا،

تحصیل علم کے سلسلہ میں امام شافعیؒ کے حسب ذیل اشعار نہایت نصیحت آموز

ومن لم یذق ذل التعلیم ساعة — تجرع ذل الجھل طول ...

یعنی جو شخص علم سیکھنے کے لیے ایک گھڑی کی ذلت برداشت نہیں کرتا، وہ ...
کی رسوائی کے گھونٹ پیتا رہے گا۔

ومن فاته التعلیم وقت شبابه — فکبر علیه اربعًا لو...

یعنی جو شخص اپنی جوانی کے وقت علم حاصل نہ کر سکا تو اسے مردہ سمجھ کر اس پر ...

حیاة الفتی واللہ بالعلم والتقیٰ — اذا لم یکونا لا اعتبار لہ

یعنی قسم بخدا انسان کی زندگی قابل قدر علم و تقویٰ کے ساتھ ہے لیکن جب ...
اور تقویٰ نہ ہو تو اس کی ذات کی کوئی قدر و قیمت نہیں، (ملاحظہ ہو آداب المتـ...

امام شعبی کا حافظ القصائد ہونا، | امام شعبی فرماتے ہیں ما احفظ اقل من ا...
ان انشاک شعرا ولا اعیدہ بیتا لفعلت، یعنی میں تھوڑے ا...
ہوں، اگر میں چاہوں تو مسلسل ایک ماہ شعروں کو سناتا چلا جاؤں، او...
آنے پائے، (مرآة الجنان ج ۲ ص ۲۱۷)

ابوبکر ہذلیؒ سے امام شعبیؒ نے پوچھا کہ تمہیں شعروں کا ذوق ہے؟ ...
پر امام شعبیؒ نے فرمایا کہ اشعار کو علمائے فحول اور ہمارے اکابر پسند کرتے آ...
ج ۲ ص ۲۱۷)

امام شعبیؒ کو امرؤ القیس، زہیر، نابغہ، عدی بن زید، طرفہ بن عبید، ...

خواجہ جنیدؒ کے عارفانہ اشعار | حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ نے حضرت سری سقطیؒ ...
رقعہ بھیجا، اس میں لکھا ھذا ہ خیرلک من سید...

اشعار سات سو قصوں سے بہتر ہیں،

ولما ادعیت الحب قالت کذبتنی فمالی أری الاعضاء منک کواسیا

یعنی دعوائے محبت غلط ہے جب تک کہ اعضا گل نہ جائیں،

فما الحب حتی یلصق الظہر بالحشا وتذبل حتی لا تجیب المنادیا

یعنی محبت کی پہچان یہ ہے کہ پیٹھ پیٹ سے چپک جائے، اور اس قدر دبلا لاغر ہو جائے کہ کسی پکارنے والے کو جواب نہ دے سکے،

وتنحل حتی لیس یبقی لک الہوی سوی مقلۃ تبکی بہا وتناجیا

اور اس طرح گل جائے کہ محبت سوائے رونے والی آنکھ کے کسی چیز کو باقی نہ چھوڑے

سلطان محمود کے دربار کے شعراء و علماء

سلطان محمود اہل علم کا بڑا مربی تھا، وہ شعراء کے کلام اور علماء کی گفتگو کو بڑے شوق سے سنتا تھا، اور اس کی سرپرستی کی وجہ سے مشہور شاعروں اور ادیبوں کا ایک بڑا حلقہ اس کے گرد جمع ہو گیا تھا، ایشیا کے ہر حصے سے اہل علم اس کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے، شعراء اس کی مدح میں قصائد کہتے، اس کو خود بھی شعر و شاعری کا کچھ ایسا ذوق ہو گیا تھا کہ بڑی سی بڑی اہم میں بھی وہ تھوڑا سا وقت اچھی غزل اور اچھی رباعیات سننے کے لیے ضرور بچا لیتا تھا، اس زمانہ کے جتنے ممتاز اور جید اہل علم تھے، سب اس کے گرد جمع ہو گئے تھے، ان میں البیرونی جیسا مشہور ریاضی داں اور ماہر ہیئت اور سنسکرت کا عالم بھی تھا، عتبی اور بیہقی جیسے مورخ بھی تھے، اور فارابی جیسا فلسفی بھی تھا، یہ شعر و شاعری کا دور تھا، اور محمود کے دربار کے شعراء کی شہرت تمام ایشیا میں پھیلی ہوئی تھی، ان شعراء میں غضاری کو سلطان محمود نے ایک چھوٹے سے قصیدہ کے صلہ میں چودہ[14] ہزار درم دیئے تھے، اور عنصری اس عہد کے سب سے باکمال شاعر تھا، تاریخ فرشتہ کا بیان ہے کہ چار سو شعراء و علماء، نیز غزنین کے جامعہ کے طلبہ عنصری کی

شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ اسدی، طوسی، عسجدی اور فرخی بھی محمود کی فیاضیوں سے سیراب ہورہے تھے۔ (بحوالہ مڈیول انڈیا مؤلفہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد معارف اعظم گڈھ دسمبر ۱۹۳۵ء)

تیموری بادشاہوں اور شاہزادوں کا علمی ذوق، ان کے دربار کے فضلاء و شعراء کی قدردانیوں کا مفصل حال بزم تیموریہ مؤلفہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن میں پڑھیے،

ریاست حیدرآباد کی قدردانی شعر حیدرآباد کے قطب شاہی عہد میں تلنگی شعراء انعام واکرام اور اشرفیوں اور دوشالوں سے نوازے جاتے تھے، چنانچہ ایک شاعر لکھتا ہے کہ میرے جسم کو معطر کیا گیا، اور ایک نہایت عمدہ کیسری رنگ کی شال میرے کاندھوں پر ڈال دی گئی اور لعل سے بھرا ہوا جواہرات کا ایک ڈبہ مجھے دیا گیا، اس کے بعد نظم سنانے کی فرمائش کی گئی،

(۲) مرزا لطف علی دہلوی اسی دور میں حیدرآباد آیا تھا، ارسطو جاہ نے اسے تعظیم و توقیر کے ساتھ اپنا مصاحب بنالیا، اور دربار شاہی میں پیش کرکے چارسو ماہوار اور پالکی سے سرفراز کیا، علی لطف نے آصف جاہ ثانی اور ارسطو جاہ کی مدح میں قصیدے لکھے، اور انعام واکرام سے نوازا گیا،

(۳) مرزا علی لطف دہلوی کی طرح مرزا قمرالدین منت بھی حیدرآباد آئے تھے، اور آصف جاہ ثانی کی مدح میں ایک قصیدہ پیش کیا، جس پر دس ہزار نقد اور دوسو روپے ماہانہ کا منصب ان کو عطا کیا گیا،

(۴) دلی کے ایک جگت استاد شاہ نصیرالدین نصیر کو چندو لال نے چوتھی بار ۱۲۵۴ھ میں سات ہزار روپے سفرخرچ بھیجکر طلب کیا، اور پچیس روپیے یومیہ مقرر کردیا، انعام واکرام اس کے علاوہ تھا، شاہ نصیر آخرکار حیدرآباد ہی میں رہ گیے،

(۵) شیخ حفیظ جونپوری جب حیدرآباد پہنچے اور مہاراجہ کی بارگاہ میں قصیدہ پیش کیا، تو انہوں نے ان کو خلعت اور ہزار روپیے ماہوار سے سرفراز کیا، انہوں نے اپنی خوش کلامی اور جادو بیانی سے خواص و عوام کو مسخر کر لیا، وہ ملک الشعراء سمجھے جاتے تھے، نازک دماغ اور خوش مذاق اس قدر تھے کہ ہر روز ایک نیا لباس پہن کر دربار میں حاضر ہوتے، سکندر جاہ کے دربار میں باریاب ہونے پر یہ رباعی نذر گذاری ؎

کوئی نام خدا لیکے حرم تک پہونچا — کوئی پوجتے ہوئے دیر صنم تک پہونچا
خوش طالعی میری کہ لے کر میں نذر — تجھ جیسے سکندر کے قدم تک پہونچا

مہاراجہ کشن پرشاد کی قدردانی کی تعریف

بہ می پرسی مہاراجہ جہاں داشت ٭ نشانِ مجد آثار و علاء داشت
بایں دریا دلی بذل و سخاوت ٭ ز دستِ کوتہ خود نالہا داشت

علامہ اقبال نے ان کی تعریف میں لکھا ہے:

آستانے پہ وزارت کے ہوا میرا گذر — بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعزاز
کی وزیر شاہ نے وہ عزت افزائی مری — چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار
اس کے فیضِ پاکی منت خواہ کانِ لعل و گہر — بحر گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

نواب والا جاہ نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم و مغفور کے دربار میں شکیل، جلیل دو نامی گرامی شاعر تھے، نواب صاحب ان کی بڑی قدردانی فرماتے، نواب صاحب کی کتابوں پر اکثر ان کی تقریظات ہیں انکے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

ٹوٹ پڑتا نہیں کس واسطے یارب یہ فلک — کیوں زمیں شق نہیں ہوتی یہ تماشہ کیا ہے؟
حائلِ منزلِ مقصود ہیں قطاعِ طریق — نقد ایماں کے تحفظ کا طریقہ کیا ہے؟
فکر ہے دینوں کو بس یہ ہی کہ ہر پیچ سے — مالِ دنیا کا ملے دولتِ عقبیٰ کیا ہے؟

دل اب اس عہدِ پُر آشوب میں ایمان قائم — تو ہی رکھ تو رکھ ورنہ بھروسہ کیا ہے
کس لیے مہدیِ موعود کو ظاہر نہیں کرتا — دیرِ عیسیٰؑ کے اترنے میں خدایا کیا ہے؟

قادیانیوں کا جب اول اول فتنہ اٹھا ہے، تو اس وقت یہ اشعار کہے گئے تھے، جو خاصے طویل ہیں،

علمائے اسلام کی اشعار سے دلچسپی

علمائے دین، صوفیائے کرام، مشائخ زمانہ ہر دور میں شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والے ملیں گے، جو منتخب اشعار کو پسند فرماتے، اور موقع موقع سے ترنم فرماتے، اس قسم کے واقعات کو جمع کرنا مشکل اور طول کلام کا باعث ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اپنی بیش قیمت تصنیف دررِ کامنہ میں اور علامہ ابن الجوزیؒ نے صفوۃ الصفوۃ میں اور علامہ یافعیؒ نے مرأۃ الجنان میں بزرگانِ دین و شیوخِ اسلام کے حالات کے سلسلہ میں ان کی تصانیف اور ان کے منتخب اشعار سے اپنی کتابوں کو مزین کیا ہے، دورِ آخر کے علمائے محدثین میں شاہ ولی اللہؒ و شاہ عبدالعزیزؒ ادب و شعر پر عبور رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے مولانا فضل حق خیرآبادی کے عربی اشعار و قصائد پر بارہا اصلاح دی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ کی "اطیب النغم" ان کے شعری ذوق پر خود شاہدِ عدل ہے، شیخ سعدیؒ کی گلستاں و بوستاں کے اشعار و قطعات و رباعیات، اور مولانا رومی کی مثنوی اور خواجہ حافظ کے دیوانِ حافظ سے اہلِ علم و فضل ہمیشہ سے صحیح ذوق اور وابستگی رکھتے رہے ہیں، ہمارے دورِ آخر میں ہندوستان میں ایک بڑی نامی گرامی ہستی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیِ دیوبند کی ہے، آپ کو بھی شعر و شاعری سے اچھا خاصا لگاؤ تھا اوبائے دارالعلوم دیوبند کے عنوان سے رسالہ دارالعلوم میں جو مضمون شائع ہوتا تھا، اس میں مولانا نانوتویؒ کے اشعار بہت نقل ہوتے رہے ہیں، دو شعر پیشِ ناظرین ہیں:

وہ پیار کی باتوں میں خفا ہوگیا یارب — امیدِ کرم ہم کو تھی کچھ اور زیادہ

کچھ ناز کا دعویٰ ہے اگر اپنا ہی سمجھ کر تو ان تمہیں اپنی ہی قسم ادہ زیادہ

معارف میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی شارح مسلم کی وفات حسرت آیات
سید سلیمان ندوی نے وفیات کے ذیل میں جب ان کا ذکر جمیل کیا، تو اس میں ان کی
خطابت اور زورِ تقریر سے متعلق یہ تحریر کیا تھا کہ وہ اسلام کے مسائل، عقل و حکمت کے
کو بیان کرتے کرتے اکثر شاعر ملت اکبر الٰہ آبادی کے اشعار کو اس طرح موزوں اور حسب
پڑھ دیتے کہ پوری تقریر میں ایک جان سی پڑ جاتی گویا یہ شعر شاعر نے اسی موقع
کہے تھے۔

ان کے تفسیری حاشیہ میں جا بجا ایسے اشعار موجود ہیں جو آیات و احکام کے
متعلقہ پر روشنی ڈالتے ہیں،

ہمارے دورِ آخر کے بزرگ علماء میں سید الطائفہ حضرت مولانا سید احمد شہید
اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کی عظیم ہستیاں ہیں، ان کے مخلص رفقاء جب
انڈمان میں قید تھے، تو یہ رفقاء ان حضرات کی یاد میں یہ شعر بڑے درد و سوز سے پڑ

اتنا پیغام درد کا کہنا جب صبا کوئے یار سے گذرے
کون سی رات آپ آئیں گے دن بہت انتظار میں گذرے

شیخ العرب والعجم محدث یگانہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ کا حفظ اشعار | استاد الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا
کے مضامین و معارف کی تلقین کرتے ہوئے درس حدیث کے درمیان موزوں شعر پڑھا کر
حضرت عائشہؓ سے ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خفا ہو گئے، تو حضرت عائشہؓ
مضمون ادا کیا جو ایک شاعر نے باندھا ہے، یہ کہہ کر مولانا سید نذیر حسینؒ نے وہ شعر سنایا،

آخر اے آہوئے مشکیں کہ رسیدی از ما　　چہ خطا رفت وچہ کردیم چہ دیدی از ما

حضرت مولانا سید عبد الحی صاحب (سابق ناظم ندوۃ العلماء) نے اپنے ایک سفرنامہ میں شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی سے اپنی ملاقات اور ان کے درس حدیث کی مجلس میں شرکت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ شرح حدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور بے تکلف ظرافت طبعی سے درس دیا کرتے تھے، اور ساتھ ہی کثرت سے موقعہ بموقعہ اشعار پڑھتے جاتے تھے،

علمائے ہند میں ایک بزرگ عالم مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری صاحب بذل المجہود شرح جب مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی کی زیارت کو حاضر ہوئے، وہاں کے پاک مناظر نے ان کے دل پر ایک گہرا اثر کیا، چنانچہ ایک پاکیزہ شعر کے ذریعہ اپنی عقیدت مندی وتاثر کو ظاہر کیا ہے:

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل　　نسیم صبح تیری مہربانی

(فضائل حج مولانا محمد زکریا صاحب)

مظاہر قدرت ومناظر فطرت کی دلکش مصوری اور لطیف احساسات ونازک جذبات کے اظہار ہی کا نام شعر وشاعری کا ہے، محدث یگانہ، فاضل اجل مولانا عبد العزیز صاحب رحیم آبادی اور علامہ شبلی نعمانی اور قاضی سلیمان پٹیالوی کی شعر وادب سے مکمل واقفیت اور ان کے ذوق صحیح سے کون انکار کرسکتا ہے، حمد ونعت، مدح وغیرہ پر ان کے اشعار وقصائد ان کی کتابوں میں موجود ہیں،

ہمارے بزرگ پیر ومرشد، محدث یگانہ حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی جیسے فاضل بے بدل اور عالم بے مثال تھے، وہ ایک دنیا کو معلوم ہے، وعظ کم فرماتے لیکن جب وعظ فرماتے تو موقع بہ موقع اشعار پڑھ کر وعظ کو بہت موثر دلنشیں کر دیتے،

شاہ محب اللہ الہ آبادی

از

جناب مسعود انور علوی کاکوروی ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شاہ محب اللہ الہ آبادی عہد شاہجہانی کے ایک مشہور عالم مذہبی مفکر اور صاحبِ نسبت وحال بزرگ تھے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کے مؤید اور شیخ اکبر محی الدین بن عربی (۵۶۰/۱۱۶۵ء تا ۶۳۸/۱۲۴۰) اور ان کی تصانیف کے پرزور حامی و ہمنوا تھے۔ ان کی شخصیت بڑی مختلف فیہ رہی ہے، علمائے ظاہر کا ایک بڑا گروہ ان کو ملحد و گمراہ قرار دیتا رہا ہے جس کی وجہ غالباً یہی رہی کہ ان کی تصانیف ان کے عقائد سے مختلف فیہ تھیں۔ لیکن اس کے برعکس بیشتر صوفیائے کرام نے ان کو عارف باللہ اور اسرار و معارف کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔

ولادت و نسب | ۲ صفر بروز دوشنبہ ۹۹۶/۱۵۸۷ء کو صدر پور ضلع خیر آباد میں پیدا ہوئے سلسلۂ نسب حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر تک اس طرح پہنچتا ہے۔ شاہ محب اللہ (۱) بن مبارز (۲)، بن پیر (۳)، بن بڈھی (۴)، بن مٹھی (۵)، بن قاضی رضی الدین (۶)، بن داود الدین (۷)، بن مجد الدین (۸)، بن جمیل الدین (۹)، بن رفیع الدین (۱۰)، بن محب اللہ (۱۱)، بن رسم اللہ (۱۲)، بن حبیب اللہ (۱۳)، بن ابراہیم (۱۴)، بن علاؤ الدین (۱۵)، بن قاسم (۱۶)، بن عبد الرزاق (۱۷)، بن عبد القادر (۱۸)، بن ابو الفتح (۱۹)، بن عبد السلام (۲۰)، بن جعفر (۲۱)، بن شہاب الدین (۲۲)، بن حضرت فرید الدین مسعود شکر گنج[1]،

تعلیم و تربیت | ابتدائی تعلیم صدر پور میں حاصل کی، پھر مزید تعلیم کے واسطے لاہور گئے وہاں

---

[1] نزہتہ الخواطر۔ علامہ سید عبد الحی الحسنی، ۵ : ۳۲۳

میر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد مفتی عبدالسلام لاہوری (۱۰۳۶/۲۸–۱۶۲۷ء) سے جو علوم کا اکتساب کیا۔ مفتی عبدالسلام دیوی، شیخ محمد میر سائیں سیوستانی اور سعد اللہ خان تمیمی چنیوٹی بھی ان کے ہم سبق رہے، جب سعد اللہ خان (۱۰۶۶/۵۶–۱۶۵۵ء) کو حکومت کی جانب سے دہلی میں وزارت کا عہدہ تفویض ہوا تو انھوں نے اپنی سابقہ دوستی کی بنا پر شاہ صاحب موصوف اور شیخ محمد میر کو دہلی بلایا۔ شیخ محمد میر نے تو گوشۂ عافیت و تنہائی کو ترجیح دی اور انکار کر دیا لیکن شاہ صاحب دوست کی طلبی پر دہلی آ گئے۔

مؤلف بحر زخار لکھتے ہیں۔

"اندوقت حضرت گنج شکن او کسے از اجداد اوش میل و رغبت بدنیا نکردہ ودنیا نہائے خود سوائے از تحصیل علوم صوری و معنوی کار نداشتہ اندو بعنوان جوانی شیخ از وطن خود قصبہ صدر پور کہ تواابع خیرآباد از مضافات اودھ است باکتساب صوری دانش بلاہور رفت وبپایۂ تکمیل رسانیدہ بدہلی رفت سعد اللہ خاں وزیر از وقت طالب علمی آشنائے آنحضرت بود خواست کا او را از منصب مناسب سلطان بہرہ ور گرداند[1]"

سعد اللہ خان کی طلبی پر دہلی آئے تو ضرور مگر دل میں طلب حق کی امنگ تھی صاحب مرآۃ الاسرار لکھتے ہیں۔

"چوں از تحصیل علم عقلی و نقلی فارغ شد او را درد طلب حق پدید آمد و اکثر بزرگان وقت را دریافت لا حال اخلاص درست نگشت از غایت سوز طلب در دہلی رفت[2]"

بہت سے صاحبان حال کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر کسی نے کشود کار نہ ہوا، ایک روز حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر مراقب ہوئے وہاں سے حکم ہوا کہ گنگوہ جاؤ اور مخدوم علاؤ الدین صابر کلیری کے سلسلۂ طریقت کے مشہور بزرگ شیخ ابو سعید گنگوہی (۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء) سے (جو شیخ جلال تھانیسری

---

[1] بحر زخار (قلمی)، شیخ وجیہ الدین اشرف لکھنوی، مخزونہ کتب خانہ اندریہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری، ج ۲، صفحہ ۵۲۸

...محب اللہ ... کہتے ہیں) بیعت کرو۔

...کا شرف رقم فرماتے ہیں۔

"آنحضرت از روح پرفتوح حضرت قطب الاسلام بختیار اوشی ایما شد که درین وقت سلسلهٔ شیخ علی صابر گرم است به گنگوه بعد از شرف بیعت و اجازت پیش گیرد ... روانهٔ زیارت پاروه به گنگوه رفت۔ شب مرشدش از کشف آمدنش دریافته بود به خادم حکم نمود که برائے وضو و نماز صبح ... آب گرم حاضر کن و طعامے معمولی که برائے درویشان پخته می شد از خوان خاص مہیا ساخته اند که در شب باقی مانده بود که آنحضرت رسیده در مرشد آکیده۔ شیخ ابو سعید قدس ... دیدار ملاقات کرده و وضو کنانیده در میان سنت و فرض فجر به شرف بیعت و اجازت ساخت و طعام را تقسیم حضار ساخت و به اذکار و شغل خاندان تلقین نمود"[۵]

مرشد برحق کی خدمت میں رہ کر ایک عرصہ تک ریاضات و مجاہدات کئے اجازت خلافت اور ...بھی حاصل کیا۔ اس کے بعد اپنے وطن صدر پور واپس آئے کچھ عرصہ صدر پور میں رہے پھر شیخ احمد عبد الحق ردولوی (م ۸۳۷ھ/۱۴۳۴ء) کے مزار پر انوار کی زیارت کے لئے ردولی (ضلع بارہ بنکی) گئے۔ صاحب مرآۃ الاسرار اس سفر سے واپسی پر ان کے ہمراہ تھے چنانچہ لکھتے ہیں۔

"بعد از چند مدت به قدم توکل و تجرید از خانه برآمده بجهت دریافت سعادت زیارت مرقد منور قبله گاہی شیخ احمد عبد الحق قدس سره در قصبهٔ متبرکه ردولی رسید اتفاقاً این فقیر نیز آنجا بود از راه دوستی او در منزل فقیر فرود آمد و صحبت گرم و مصفا واقع شد و اطوار پسندیده او را مشاهده نموده بسیار محظوظ شدم پس بعد از چند روز جانب حضرت مخدومی قبله گاہی قدس سره نوازش و بشارت رخصت یافت و باتفاق یکدیگر از ردولی روانه شده بخانه رسید۔ چند روز بسبب الفت و محبت یگانگی در فقیر خانه توقف واقع شد"[۶]

۵۔ بحر زخار ص ۵۲۸ ۶۔ مرآۃ الاسرار۔ مخطوطہ

میر سید عبدالحکیم بہتی سے ان کے بہت [illegible] مراسم تھے چنانچہ ان کی خدمت میں رہ کر ظاہری و باطنی فیوض حاصل کئے۔ بہت عرصہ ہیں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد پیر و مرشد کے حکم سے الٰہ آباد روانہ ہوگئے۔ راہ میں مخدوم شیخ حسام الدین مانکپوری کے مزار پر حاضر ہوئے، وہاں کے صاحب سجادہ شاہ جلال الدین نے مخدوم صاحب کے حکم باطنی کے بموجب ایک دستار اور ڈیڑھ روپے نذر کئے۔

مولف بحر زخار نے مرشد حقانی کی بارگاہ میں ان کی مقبولیت، ردولی سے روانگی اور الہ آباد کے سفر کا حال اس طرح درج کیا ہے۔

"چہار اربعین شاہ چلہ تمام نشدہ بود روزے شیخ بر در چلہ آمدہ آواز دادے محب اللہ آنحضرت جواب داد کہ محب اللہ بہ کجاست فرمود کارت تمام شد از حجرہ بیروں شو احتیاج اتمام چلہ نیست پس او از حجرہ برآمد چندے در خدمت پیر ماند اکثر از زبان شیخ برآمدے محب اللہ الٰہ آبادی پس با ماد خرقۂ خلافت و نعمت علامات و عصائے دل پسند کردہ رخصت وطن داد او بصدرپور رسید و چندے عازم الٰہ آباد شد چوں بمانکپور رسید بشرف زیارت شیخ حسام الدین مانکپوری مشرف شد بموجب امر باطن شیخ حسام الدین شاہ جلال الدین سجادہ نشین دستار سرو دو روپیہ نقد بآنحضرت پیش آورد از آں دستار سر افتخار بفلک رسانید و نقد بہ کیسہ کردہ الٰہ آباد رفت[1]۔

الٰہ آباد میں قیام کرنے کے بعد شروع میں بڑی تنگدستی اور فاقہ کی صورت رہی لیکن ان کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ولایت کی شہرت شروع ہوئی لوگ جوق در جوق اکتساب فیض کے لئے آنے لگے۔ دار اشکوہ خاص طور سے معتقدوں میں ہوا۔ حقائق و معارف کے بیانات میں ید طولیٰ تھا تقریباً ایسی موثر و دلنشین ہوتی تھیں کہ وحدت الوجود کے مخالف اور منکر علماء میں سے اکثر ان کے فیض صحبت کے قائل ہوگئے اور یہی مسلک اختیار کیا۔

---

[1] بحر زخار ۵۲۸

"مدتی یاں شاغل و معاملت و مشاہدہ تمام بہم رسانید و تحقیق او را نقش گردید و اکثر علمائے فحول کالانز

مشرب معاصرین حضرات اکابر داشتند بفیض صحبت او تربیت یافتہ بایں مشرب خاص اختیار نمودند"[1]

تقریباً بیس سال الہ آباد میں مقیم رہے ہزاروں کو فیض پہونچایا۔ بالآخر ۸ رجب المرجب ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء

و وصال فرمایا اور الہ آباد میں مدفون ہوئے۔

"قریب بیست سال در شہر الہ آباد بر مسند ارشاد مستقیم بود بتاریخ نہم ماہ رجب روز پنجشنبہ برابر غروب آفتاب۔

در سنہ یکہزار و پنجاہ و ہشت ہجری بعالم بقا خرامید و در شہر مذکور مدفون گشت"[1]

ان کے کافی خلفاء تھے۔ ان میں شیخ قاضی گھاسی (سب سے پہلے مرید) شیخ محمد مولانا قاضی یوسف

قاضی عبدالرشید، میر سید محمد قنوجی اور شیخ احمد وغیرہ مشہور ہوئے۔ اخلاف میں صرف ایک بیٹے کا پتہ چلتا ہے جن کا

نام شیخ تاج الدین تھا۔

"یک پسر خود مسمی شیخ تاج الدین نام عقب گذاشت"[2]

تصانیف شاہ محب اللہ صاحبؒ نے اپنے مکتوبات کے علاوہ فارسی و عربی تصانیف کی ایک بڑی تعداد چھوڑی

جو مسلک وحدت الوجود کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں حقائق و معارف کے دقیق سے دقیق مسئلے بھی موجود ہیں۔

بحر زخار کے مؤلف رقم طراز ہیں۔

"او را تصانیف حقائق و توحید بسیار است کہ خزینہ معارف و گنجینہ حقائق اسرار الہیت انا و ناک حالا

و مقامات آں کتب صریح اجتہادش بر مشرب صوفیہ و اہل صفا مشرف است لہٰذا شیخ محی الدین ابن

عربی را شیخ اکبر می گویند و وے را شیخ کبیر لقب می کنند"[3]

شیخ اکبر کی عظمت و رفعت اور ان کی تصانیف کی منزلت سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ رسالہ "غایت الغایات"

میں اس کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

"... و فقیر کتب اہل اللہ ندارد و میل بمطالعہ آن نیارد مگر کتب شیخ مشارالیہ قدس سرہ العالی کہ آن کتب

[1] مراۃ الاسرار (اردو) تالیف ۲۵ ... ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء ... بحر زخار ۵۲۷

گویا لوح محفوظ اند منظور نظر و ملحوظ نظر آں قدس اشد اعظم۔

تذکرہ علمائے ہند کے مولف نے شاہ صاحب کی عظمت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"دانش مند متبحر از مشاہیر علمائے صوفیہ در علم ظاہر و باطن سرخیل امثال و اقران خود بود"

مخزن خاص کے مولف تو آپ کی شان میں یوں رقم طراز ہیں۔

"آں فرماں فرمائے اقلیم طریقت، آں مجتہد کلمات تصوف و حقیقت، آں مرشد نگار وادی

قطب جہانیاں حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادی از مشاہیر متصوفان ذوی مناقب عالم متبحر تصانیفش در

علم تصوف لاتعد و لاتحصیٰ اند"۔

ان کی اکثر تصنیفات شیخ اکبر کی کتابوں کی شرحیں ہیں ذیل میں چند دستیاب شدہ تصانیف کا

ایک اجمالی تعارف درج ہے جس سے ان موصوف کے افکار کا اندازہ ہوگا۔

(۱) ان کے مکتوبات کا ایک نادر نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری (سبحان اللہ ف ۲۹۷/۱) میں موجود ہے

متوسط تقطیع میں چار سو تینتیس[۴۳۳] صفحات پر مشتمل ہے اس میں اٹھارہ[۱۸] مکتوبات درج ذیل مختلف شخصیتوں کے نام

ہیں جن میں شیخ اکبر اور فلسفۂ وحدت الوجود کی پرزور تائید کی ہے۔ یہ مکتوبات اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہیں

کہ ان کے ذریعہ شاہ صاحب کے نظریات و افکار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اس نسخہ کے آخر میں درج ذیل عبارت ہے

"بتاریخ بست و ششم محرم الحرام سنہ محمد اکبر بادشاہ جہاہ غازی اتمام گرفت بید احقر طالب علم

شیخ عظیم اللہ بموجب فرمائش مشفق قدرداں خواجہ غلام نقشبند صاحب"۔

ابتدا میں فہرست نہیں ہے۔ مکتوبات درج ذیل ترتیب سے لکھے ہوئے ہیں۔

ملا محمود جونپوری صفحہ ۱ ۔ ۲۲ (۲) ملا محمود جونپوری صفحہ ۲۲ ۔ ۴۰ (ملا محمود جونپوری (۱۶۵۲/۱۰۶۲ء) صاحب

شمس بازغہ ہی ہیں جنہوں نے رسالۂ تسویہ رد میں حرز الایمان لکھی تھی) (۳) شیخ عبدالرشید جونپوری صفحہ ۴۰ ۔ ..

(۴) شیخ عطاء اللہ جونپوری صفحہ ۱۰۶ ۔ ۱۳۲ (۵) میر محمد قنوجی صفحہ ۱۳۲ ۔ ۱۳۹ (۶) میر سید عبدالحکیم صفحہ ۳۹

لے رسالہ انتخابات مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری (سبحان اللہ کلکشن ف ۲۹۷/۱) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۷۹ تجلی ۱۰ ص ۱۷۹ مخزن اعراس

شیخ عبدالرحیم صفحہ ۲۰۶-۲۴۲(۳)، شیخ عبدالرحیم ۲۸۶-۲۸۷(۱۹)، شیخ محمد صفت ۲۰۹-۲۸۶، شیخ عبدالرحیم صفت ۲۱۲-۲۳۷(۱)، شیخ
عبدالرحمٰن ۲۱۳-۲۲۵(۱)، شیخ عبدالرحمٰن ۲۲۵-۲۳۵(۱۳)، میاں شیخ عبدالرحمٰن رضی ۲۳۶-۲۳۷(۱۳)
شیخ عبدالرشید جونپوری صفت ۲۲۷-۲۳۹(۱۲)، شیخ عبدالرحمٰن صفت ۲۳۹-۲۶۱(۱۵)، شیخ عبدالرحمٰن صفت
۲۶۱-۲۷۷(۱۶)، شیخ عبدالرحیم صفت ۲۷۷-۲۸۴(۱)، شاہزادہ داراشکوہ صفت ۲۸۶-۲۹۸(۱)، شاہزادہ
داراشکوہ صفت ۴۲۶-۴۳۳-

داراشکوہ کے نام مکتوبات سے باہمی روابط کا پتہ بھی چلتا ہے۔ شاہ صاحب سے اس کی عقیدت اور ارادتمندی سے ان کی قدر و منزلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جب الٰہ آباد کا صوبہ اس کے ذمہ ہوا تو شاہ صاحب کو خط لکھا کہ یہاں آنے کی خوشی صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ جناب والا کا مسکن ہے۔ شاہ صاحب نے جواب میں لکھا کہ

"قطع نظر صورت بودہ انکہ از گرفتن صوبہ الٰہ آباد بیشتر خوش حالی ہم دیم و دست بر صاحب عالم دوشن آنست کہ چوں فقیر دریں ہمہ اخلاق حمیدہ والطاف کہ صاحب درطینت و عین ثابت آں عزیز بودہ و از فقرا بعید عنایت رحمانی یا فتہ نظری کنند گوید کہ ہیچ شاہ و شاہزادہ بہ کمالات صاحب عالم مشرف شدہ باشد پس از رحمت و سعادت اہل ایں زمانہ کہ مثل آں شاہزادہ دلربائی جنیدہ صفات پسندیدہ آں حیا می خوبند"[1]

داراشکوہ کے نام اپنے ایک مکتوب کی ابتداء یوں کرتے ہیں۔

"بندگان ملاذ عارفاں و معاذ جہانیاں عرش پناہ حقائق آگاہ ضابط احکام دینی جادی مراتب کشفی و یقینی عین الانسان و انسان العین سلطان عالم صوری و معنوی بر سریر سلطانی و منصہ شہود حقائق جلوہ گر باشد بعد از طے منازل نیاز مندی و اخلاص و قطع مراحل محبت و اختصاص آنکہ فقیر درویش از ہیں بہ کمالات انسانی و مراتب عرفانی آں ملاذ عارفاں محظوظ و خورسند بود و رطب اللسان کہ الحمدللہ کہ شاہ و شاہزادہ ایں نا مصالح و عاقبت ربانی اند چوں ایں صوبہ بنام بندگان آنجناب عالی شد نشاط و شکر سابق مضاعف گشت کہ الحمد للہ کہ با محکوم عارف اللہ ..."[2]

---

[1] مکتوبات: ۲۸۸ [2] مکتوبات ۲۸۶

ہندوؤں کے سلوک پڑھنے کے سلسلہ میں شیخ عبدالرحمٰن صاحب کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں ۔

"حمد للہ کہ تصانیف عرفان پناہ شیخ محی الدین بایام سلوک پیش ہندواں می خوانند و ترجمہ آں می پرسند
خود ہماں ہندواں در ہیچ شک ۔ستاں می یابند و کافراں ہندواں مجہر ایں می شوند اعتقاد درست بکلمہ
ایشاں پیدا می کنند و عقیدہ اوشاں قوی کفر و شرک بیزاری می شوند و بکلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
ایمان می آرند و معرفت و جمال محمدی ﷺ شنیدہ تعجب تمام می کنند۔[1]

ایک صوفی صافی کی طرح ان کے یہاں بھی کسی قسم کا تعصب یا قومی و نسلی امتیاز نہ تھا۔ دارا شکوہ کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"فقیر کجا و نصیحت کجا و حق آنست کہ اندیشہ رعایت خلق دامن گیر خاطر کلام باشد چہ مومن چہ کافر کہ خلق خدا پیدائش خداست و مہد این مقام کہ صاحب آں مقام بہر کسے از صالح و فاجر و مومن و کافر رحم کند۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم چناں کہ بیان یافتہ در فتوحات و وارد است در قرآن وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ بر سبیل عموم است شامل و باطنین۔ فاما افاضہ رحمت بر کسے بحسب مرتبہ آں باشد۔"[2]

۱۰۔ بیان علمیت ثلاثات ۔ غایت اختصاص (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری سبحان اللہ کلکشن ن ۲۹۷/۴۴) متوسط تقطیع اندر تحریر آئی ۱۰ ورق پر مشتمل ہے۔ ابتدا یوں ہے۔

"بعد از تحمید و توحید ذاتی کہ وصول ہر نعمت با نعام اوست و قائمی ہر کار بدار بتقدیم نام اوست و صلوٰۃ و تسلیم بر حبیب خاص و بر آل و اصحاب اہل اختصاص می گوید فقیر محب اللہ بہاری چوں بعضے از اخوان اہل صفا و وفا بہم آمدند کہ بعضے مطالب اہل اللہ خاص ہر عالم و سبب ایجاد عالم کہ در تصانیف عارف کامل عشق کامل اند جدا جدا ہر یک شیخ محی الدین عربی ثبت یافتہ اند فقیر آں را جدا ساختہ در چند اوراق ثبت نمایاں خواہد قبول نمود کہ مقدمہ جملہ رسالہ نمود۔

[1] مکتوبات : ۲۲۵ [2] مکتوبات : ۳۸۸ - ۳۸۹

اس رسالہ کو پانچ ابواب پر منقسم کیا۔

"بنا بر ایں ترتیب ایں رسالہ بر پنج باب (اول در بیان آں کہ نماز ایں شہ معنی فی قبر قضایا بالکلام وعلامہ علامات، باب دوم در بیان آں کہ مہ در عمال نقص است و کمال، باب سوم در بیان فکر حق و اسماء و صفات، باب چہارم در بیان سبب بہ عمل، باب پنجم در بیان نہ خلق روحانی و جسمانی۔

(۳) عبادات الخواص مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (فارسیہ مذہب ۱۹۲) مجری تقطیع میں تیرہ سو ستہتر صفحات پر مشتمل ہے۔

پسندیدہ تنبیہات، نو ابواب پانچ سو چھتیس فصلوں اور ایک خاتمہ پر مبنی ہے۔ فصلوں میں جملہ تمام مسائل کا بیان شرح و بسط سے ہے۔

"پہلا باب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بیان میں، دوسرا جہنم، تیسرا جنت، چوتھا اول نفس، پانچواں طہارت، چھٹا نماز، ساتواں زکوٰۃ، آٹھواں روزہ اور نواں حج کے بیان میں ہے۔ خاتمہ میں نوافل، سنتوں اور فرضوں کا بیان ہے۔

کتاب کے اختتام پر لکھتے ہیں۔

"بداں کہ افتتاح و بدایت املاء ایں تالیف در بست و ہفتم شہر رمضان سنہ یکہزار و پنجاہ و یک واقع شدہ بود و در ہشتم ماہ محرم سنہ یکہزار و پنجاہ و دو فقیر بیمار شدہ و در املاء ایں کتاب تعطل و تخلل واقع شدہ در ہشتم ماہ شوال سنہ مذکورہ بر ایں آمد کہ تالیف را بہر تقدیر با تمام برسانم اگر مشیت الٰہی تو شیخ حرکت کند بقلم پس شروع نمود و در اتمام ایں تالیف در پانزدہم ماہ ربیع الاول سنہ ہزار و پنجاہ و سہ بعنایت ربانی و معونت سبحانی با تمام رسید، والحمد للہ اولاً و آخراً۔"

آخر نسخہ میں کاتب نے لکھا ہے۔

"تم الکتاب المستطاب المسمی بعبادات الخواص من موعظات القطب الربانی الغوث الصمدانی نادر العصر والزمان خاتم البیان والتبیان سیدی وسندی و شیخی شیخ محب اللہ حضرت شیخ محب اللہ

[illegible]

(۴) شرح فصوص الحکم فارسی۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مشہور و معروف کتاب کی شرح ہے شاہ صاحب کی
بتالیف ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔ مکمل نسخہ حبیب گنج
کلکشن (ف ۲۱/۱۴۴) میں موجود ہے جو بڑی تقطیع میں سات سو ساٹھ (۷۶۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا نسخہ فصوص العارفین
نسخہ ذخیرہ شیفتہ (۵۵/۵) میں موجود ہے۔ یہ شرح بہت جامع اور اپنی نظیر آپ ہے۔
شاہ غلام مصطفےٰ مہر و شمسی اور محمد باقر الہ آبادی کے اردو ترجمہ معہ فارسی متن کے ادارہ انیس اردو الہ آباد
سے ۱۹۷۰ء میں شائع بھی ہو چکی ہے۔

(۵) مغالطۂ عامہ۔ مسلم یونیورسٹی (یونیورسٹی عربیہ علوم ۱۳) میں اس کا ایک نادر نسخہ موجود ہے، اس کے اول و آخر میں
شاہ محمد افضل الہ آبادی کی مہریں ہیں۔ ابتدا میں مہر کے اوپر شاہ صاحب موصوف کی یہ تحریر ہے۔

هٰذا الکتاب من متملکات احقر الانام اضعف العباد ابو الفضل ناصر
الدین محمد المشتهر بہ اجمل الہ آبادی عفا اللہ تعالیٰ عنہ۔

متوسط تقطیع میں ۴۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا یوں ہے۔

الحمد للہ الذی هو الرحمٰن الذی علم اهله القرآن خلق الانسان علمه البیان

مختلف مسائل کا بیان ہے۔ عوام میں پھیلے ہوئے غلط عقائد اور رجحانات کا تذکرہ ہے۔ حق تعالیٰ کی
رویت کا جواز، ولایت، نبوت، رسالت، اس طرح ایک سو ستر (۱۷۰) مغالطوں کا بیان ہے۔ درمیان میں مختلف
فصلیں بھی ہیں۔ ہر جگہ شیخ اکبر کے اقوال بطور استناد درج کئے ہیں۔

(۶) رسالہ ہفت احکام۔ مسلم یونیورسٹی (ف ۳۱/۵۹ فارسیہ تصوف) میں اس کا موجود نسخہ تیس صفحات پر
مشتمل ہے۔ حمد و صلوٰۃ کے بعد لکھتے ہیں۔

می گوید فقیر حقیر محب اللہ مہاجر چوں [illegible] ملاحظہ نماید کہ ...

ششم دوکہ رسالہ مجمل دوبی ہستہ ...وضوح العلم یعنی است بر معرفت ہفت مسائل ... ہفتم اہل علم بہ حقائق است ، دوم علم تجلی حق تعالی در اشیاء ، ثالث علم بخطاب حق تعالی مرتجا ومابا سطہ شرع، پنجم کمال وتقص ... علم الساعة ، ششم وجہت حقائق آں ، ہفتم سادس علم بخیال و عالم آں رابع علم بر عمل وادوعمۂ آں ،

احکام کے بیان سے پہلے حقائق و معارف پر مشتمل ایک مقدمہ بھی ہے۔

انفاس الخواص فصوص الحکم کی عربی شرح ہے۔ اسی انفاس پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک قدیم نسخہ کتب خانہ انوریہ کاکوری میں موجود ہے جو ۱۰۰۰ھ کا لکھا ہوا اور اصل نسخہ سے مقابلہ کیا ہوا ہے۔ رضا لائبریری رامپور (۲۹) انڈیا آفس لائبریری (۱۲۷۹) خدا بخش پٹنہ (۳۰۸) میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ ابتدا یوں ہے۔

الحمد للہ الذی لا احد لما سواہ ولیس المختار الا ایاہ۔

اختتام پر یہ عبارت ہے۔

فمن لا یراہ لا یراہ لفقد عینہا القلب فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور وھذا اخر الکتاب وانہ لتذکرۃ للمتقین وانا لنعلم ان منکم مکذبین وانہ لحسرۃ علی الکافرین وانہ لحق الیقین فسبح باسم ربک العظیم قد وقع الفراغ من کتابہ ھذا الکتاب۔

(۸) مناظر اخص الخواص، بہ متوسط تقطیع میں تقریباً ۔۔ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جمادی الآخر ۱۳۱۲ھ کا لکھا ہوا کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ میں موجود ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ (ف ۵۵/۲۹۷) شیفتہ کلکشن میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے لیکن ناقص الطرفین ہے،

(۹) التسویہ بین الافادہ والقبول ، یہ شاہ صاحب کا سب سے مشہور و معروف رسالہ ہے حقائق و معارف کے ایسے بیانات درج ہیں کہ بقول صاحب تصفیہ شرح تسویہ۔

"تو ہمی قرأت الفصام مرقومات و آثار غرابت کہ بہار سے وسبب اطلاق اوقات بہ شیخ تقسیم یافتہ۔

جب یہ رسالہ مشہور ہوا اور اورنگ زیب عالمگیر کی نظر سے گذرا تو بہت غصہ ہوا اور حکم دیا کہ شیخ کو حاضر کرو لوگوں نے کہا کہ ان کی وفات ہو گئی البتہ ان کے مریدوں میں دو آدمی باقی ہیں ایک شاہ محمدی دوسرے ملا محمد قنوجی کہنے لگا کہ اگر ان میں سے کوئی اس رسالے کے مضامین کی مطابقت شرع سے کر دے تو خیر ورنہ رسالہ جلا دیا جائے اور جس قدر ان کے مرید ہوں وہ بیعت توڑ دیں کیونکہ اس کے مطالب نہایت واہیات ہیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جبرئیل الٰہی کے ساتھ تھے یا ہو بہو کے جبرئیل نے ان سے اپنی زبان میں باتیں کیں۔ ملا محمد قنوجی منصب دار شاہی نے تو بیعت توڑ دی مگر شاہ محمدی نے جواب میں لکھا کہ بیعت اسلام سے استفادہ ممکن نہیں اور شیخ نے جس مقام سے گفتگو کی میری ابھی وہاں رسائی نہیں بوقت عروج ان مطالب کی مطابقت آیات و احادیث سے کر دی جائے گی اور اگر اس رسالہ کو جلا دینے کا مصمم ارادہ ہے تو جس قدر اس کی نقلیں ہیں جلا دیں شاہی باورچی خانہ میں فقراء متوکل کے یہاں سے زیادہ آگ ہے۔ عالمگیر خاموش ہو رہا۔

"مآثر الکرام کے مؤلف نے ایک واقعہ درج کیا ہے کہ

"در آں وقت کہ ظاہر شد رسالۂ تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہ ہنگامہ برپا کردند سلطان اورنگ زیب انار اللہ برہانہ را رسانیدند کہ ایں رسالہ مخالف ظاہر شرع شریف است و سلطان حکم فرمودند کہ درویشان قلمرو پادشاہی مانند عسکر سلطانی حاضر نمایند و از مقالہ برکلام استعلام نمایند شیخ محمد افضل الہ آبادی قدس سرہ (و ۳۰،۵۰/ ۱۶۲۸، م ۱۱۲۴ھ/ ۱۲، ۱۷ء) الہ رسالہ را ملاحظہ اندیشیدند کہ مبادا فتنہ حالات زمانہ کہ ملک افشا گردد ہر چند دل شیخ قدس سرہ نمی خواست کہ بسوزند لکن در آں ایام کہ آتش فتنہ سخت مشتعل بود نگاہ داشتن ہم مصلحت نمی دیدند لاجرم آب سفرۂ کہ ...

چوں دیدم کہ دقائق رسالہ بجا بعضی را در یافتند کہ چوں کاغذ انی صد آب زدہ تلاشی می کردند خود بخود محو
خواہند شد۔ غرض شیخ ایں کہ بدست محققان از انحطاط کی کردہ باشند تمام شب صد آب بارد و قطرے
محو نشدہ و ہم ایں حال مشاہدہ خود بخاطر آوردند کہ مرتبی حضرت سید قدس سرہ آں است کہ ایں رسالہ
باشد خشک کردہ اند و دانستند شیخ محمد یحییٰ الٰہ آبادی قدس سرہ در کتاب سلام الاتام می گوید من آں رسالہ
را بعینہا با رسائل دیگر از تصانیف حضرت سید قدس سرہ یک جا جلد کردہ معہ ز جان و ایمان خود دارم۔

راقم السطور کے علم میں رسالہ کے اختلاف کے باوجود ہندوستان میں اس کی درج ذیل شرحیں لکھی گئیں۔

(۱) شرح تسویہ مصنفہ محمدی فیاض زینبی گجراتی شاگرد شاہ محب اللہ الٰہ آبادی (۲) شرح تسویہ مصنفہ شیخ امان اللہ جلی
(۳) شرح تسویہ مؤلفہ شیخ عبداللہ بن عبدالباقی نقشبندی دہلوی (۴) شرح تسویہ شیخ محمد افضل بن عبدالرحمن عباسی
الٰہ آبادی (۵) تعلیقہ شرح تسویہ بزبان عربی، مولانا عبدالحلیم فرنگی بن مولانا امین اللہ انصاری والد بزرگوار مولانا عبدالحی
فرنگی محلی (۶) شرح تسویہ سید علی اکبر دہلوی خیر آبادی (۷) تصفیہ شرح تسویہ شرح فارسی مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر کاکوروی۔

موخر الذکر شرح تسویہ راقم سطور کے پیش نظر ہے اور حق یہ ہے کہ شاہ موصوف نے رسالۂ وہبیہ کی شرح و وضاحت کا
حق ادا کر دیا۔ یہ شرح معہ فارسی متن اور اردو ترجمۂ مولانا شاہ تقی حیدر قلندر کاکوروی (خلف اوسط شارح) کے خانقاہ
کاظمیہ سے شائع ہوئی ہے راقم الحروف کو خوب یاد ہے کہ مشہور محقق و دانشور مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی
جب خانقاہ کاظمیہ میں آئے تو دوسرے مخطوطات دیکھنے کے علاوہ اس شرح کے بارے میں استفسار کیا جس پر حضرت
سجادۂ حال کے فاضل و محقق برادر گرامی شاہ حافظ مجتبیٰ حیدر صاحب مدظلہٗ نے تصفیہ کا ایک نسخہ ہدیۃً پیش کیا جسے
عرشی صاحب مرحوم نے بڑی مسرت اور شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے قبول کیا کہ شاہ صاحب میں نے ایسی عمدہ شرح
تسویہ کی نہ دیکھی تھی۔ اس کا وہ نادر و نایاب نسخہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ میں موجود ہے جو ۵ ذی قعدہ ۱۲۰۳ھ
کا لکھا مؤلف ہے۔ گویا شاہ صاحب نے اپنی وفات سے بیس سال قبل لکھا تھا۔ اس کی ابتدا یوں ہے۔

اَلحَمدُ لِمَن وَجَدَ بِکُلِّ مَا وُجِدَ شُہِدَ بِکُلِّ مَا شُہِدَ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلامُ عَلیٰ خَیرِ

من اطلق به و اصطفاه و اتی لتبعیه تعالی اینما تولوا فثم وجه الله واجتباه

والله خیر الاول و احسن الآل ۔۔۔

پانچ اوراق پر مشتمل اس نسخہ میں اٹھارہ سطریں فی ورق ہیں۔ ہر سطر میں سات آٹھ الفاظ ہیں۔

آخر میں یہ عبارت ہے۔

قال الله تعالیٰ وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتبعهم فرعون وجنوده

بغیا وعدوا ۔۔۔

اس نسخہ میں دو ایک مقامات پر شاہ صاحب نے کچھ الفاظ قلم زد بھی کئے ہیں۔ رسالہ تسویہ کا ایک دوسرا نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری (عبدالحی فرنگی محلی کلکشن $\frac{1098}{48}$ عربیہ متفرقات) میں محفوظ ہے جو مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کا نقل کردہ ہے۔ اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے۔

تمت رسالة التسوية بين الافادة والقبول من الشيخ محب الله الآبادی افاض الله علینا ایادیه بید الفقیر الی رحمة العلی الکریم محمد عبد الحلیم بن المرحوم الملا محمد امین الله الانصاری نسباً اللکهنوی وطناً والحنفی مذهباً والقادری مشرباً فی بلدة بمبئی حین رجوعه من الحرمین الشریفین زادهما الله شرفاً فی شهر المولد من ۱۲۸۲ھ

اس نسخہ میں کل سات اوراق ہیں، ہر صفحہ میں کل گیارہ سطریں ہیں۔ رسالہ تسویہ کا ایک فارسی ترجمہ مسلم یونیورسٹی (فارسیہ مذہب $\frac{43}{142}$) میں موجود ہے جو چھوٹی تقطیع میں ۴۳ اوراق پر مشتمل ہے اور ۱۱۰۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد اس کی ابتدا یوں ہے۔

بدانکہ فقیر محب اللہ بعضے اخوان با صفا خلیلان با وفا کہ در حل عبارت عربی محتاج بودند بوجہ ترجمہ فارسی خود را احد قید آورد کہ "رسالہ تسویہ" را ترجمہ فارسی بنویسد۔

———✻———

باب التقریظ والانتقاد

اردو رسالوں کے خاص نمبر

روزنامہ قومی آواز اردو بک سیلرز اور پبلشرز نمبر | مرتبہ جناب ظفر عزیز صاحب/ عظیم سالن، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۴، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: قومی آواز، ہیرالڈ ہاؤس، بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی

اب چند برس سے اردو کا مشہور قدیم روزنامہ قومی آواز لکھنؤ کے علاوہ دہلی اور بعض شہروں سے بھی شائع ہو رہا ہے، یہ خاص نمبر نئی دہلی سے نکلنے والے قومی آواز نے شائع کیا ہے جو اردو کے اشاعتی اداروں اور طبع و اشاعت کے مسائل کے علاوہ اردو سے متعلق متنوع مضامین کا ذخیرہ اور کئی حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں اردو نشر و اشاعت سے متعلق تقریباً دو درجن مضامین درج ہیں، ان میں بہار، لکھنؤ، بمبئی، الہ آباد، علی گڑھ، حیدر آباد، کلکتہ، دہلی اور دیوبند میں اردو کتابوں کی طبع و اشاعت کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک مضمون میں اردو میں جین، بدھ، سکھ اور ہندو مذہب کی کتابوں کا اور ایک میں اسلامی کتابوں کا تذکرہ ہے، آزادی کے بعد کے اردو کے علمی و ادبی رسائل اور ان کے اہم خاص نمبروں کے بارے میں بھی مضامین دیئے گئے ہیں، بچوں سے متعلق اردو لٹریچر کا ذکر بھی ایک مضمون میں ہے، اردو طباعت و صحافت، اردو کے ناشروں اور اردو کتابوں کی طبع و فروخت کے مسائل سے متعلق بھی اچھے مضامین درج ہیں، منظومات کا حصہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے، غزلوں میں میر و سودا سے اب تک کے غزل گو شعرا کا کلام پیش کیا گیا ہے، اور نظموں میں جوش اور ان کے بعد کے ترقی پسند شعرا کا کلام درج ہے، تیسرا حصہ وزن دار مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں موجودہ ادبی مسائل، نئی شاعری کے تقاضے، ادبی ڈرامے، اردو میں طنز و مزاح اور اردو کے نصابی مسائل وغیرہ کے زیر عنوان نامور اصحاب قلم کی نگارشات پیش کی گئی ہیں، اسی حصہ میں گوپی چند نارنگ نے اردو رسم خط کے بدیسی ہونے کی تردید کی:

اور جگن ناتھ آزاد نے جعفر علی کے ادبی درجہ پر بحث کی ہے، ایک مضمون میں اردو کے محسن منشی نول کشور کا تذکرہ ہے، اور ایک مضمون میں انجمن ترقی اردو کی مختصر سرگذشت تحریر کی گئی ہے، اس کے بعد افسانوں کا حصہ ہے، آخر میں اردو کے موجودہ مختلف اشاعتی اداروں اور مکتبوں کا مختصر تعارف، ان کی خصوصیات اور اہم خدمات بیان کی گئی ہیں، شروع میں بعض اداروں کے علاوہ مشاہیر شعر و ادب کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں اور جا بجا مختلف اداروں کی مطبوعات کی فہرستیں بھی درج ہیں، گو اس نمبر کے اکثر مضامین ماخوذ ہیں تاہم اس سے اردو کے موجودہ اہم اشاعتی اداروں کے متعلق مفید معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں اور یہ آزادی کے بعد اردو کی اشاعتی اور ادبی سرگرمیوں کی داستان بھی ہے۔

رفیق علمائے بہار نمبر: مرتبہ جناب محمود عالم صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۶۰، قیمت سات روپے، سالانہ چندہ ۲۵ روپے، پتہ: دفتر رفیق سلطان گنج پٹنہ

ماہنامہ "رفیق" نیا مگر ہونہار رسالہ ہے، اس کے اس خاص نمبر میں بہار کے تقریباً پچاس متوفی علماء کا تذکرہ ہے، جو مختلف طبقہ و مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں اصحاب سلوک و عرفان بھی ہیں اور معقول و منقول کے جامع علماء بھی، مدرسین اور مصنفین بھی ہیں، اور فقہاء و محدثین بھی، اہل حدیث اور حنفی بھی ہیں، اور جماعت اسلامی اور بریلوی بھی، اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے مریدین و خلفا بھی۔ حضرت شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، مولانا شہباد، ملا محب اللہ، مولانا غلام یحییٰ، مولانا سید ولایت علی صادق پوری، مولانا ابو محمد ابراہیم آروی، مولانا سید میاں نذیر حسین، مولانا شوق نیموی، مولانا شمس الحق ڈیانوی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر حسن گیلانی جیسے ہندوستان بلکہ عالمگیر شہرت کے مالک، ناموں سے اس نمبر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، گو اکثر مضامین ماخوذ یا ملخص ہیں، تاہم اتنے سب علما کا یکجا تذکرہ شائع کرنا بھی کم اہم نہیں ہے۔

ض

ادبیات

غزل

ازجناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

ا بزم کہاں لٹ گئی خدا جانے ــ سحر ہوئی تو نہ پھر شمع تھی نہ پروانے
ہ شوق کیا کہ جو شرح و بیاں کا ہو محتاج ــ وہ عشق کیا جسے تری نظر نہ پہچانے
ر سُنے تو اجل کا بھی رُخ بدل جائے ــ ابھی حیات نے چھیڑے نہیں وہ افسانے
ر ایک چیز ہے منسوب اپنی فطرت سے ــ لباسِ شمع میں خود جل رہے ہیں پروانے
ے سلوک سے طے ہو رہی ہے راہِ جنوں ــ یہ کون راہبرِ عشق ہے خدا جانے
ہ نامراد جہاں ہوں کہ ڈوبنے جو گیا ــ تو ڈال لی شکن اپنی جبیں پہ دریا نے
ضائے دوست میں گم ہو کے رہ گیا ہوں میں ــ وصال و ہجر کی شرطیں مری بلا جانے
دب کی راہ میں ابھرا ہوں نقش کی صورت ــ یہ اور بات ہے دنیا ابھی نہ پہچانے
ہ ایسے اب بھی ہیں رندانِ تشنہ لب جوہر ــ جدھر نگاہ اٹھا دیں ہزار میخانے

غزل

ازجناب محمد حسین فطرت بھٹکلی، بھٹکل

ا عندلیب یا زمزمۂ صبا نہیں ــ ذوقِ لطیف ہو اگر صحنِ چمن میں کیا نہیں
ر سے جمودِ روح کی آج تو انتہا نہیں ــ قلب ہے اور خلش نہیں لب ہیں مگر نوا نہیں
چشم بصیر بند ہے، دیدۂ شوق وا نہیں ــ کونسی چیز میں بھلا جلوۂ کبریا نہیں

نقشِ جمالِ زندگی آج کہیں مِلا نہیں
عشق میں وہ تڑپ نہیں حسن میں وہ ادا نہیں

غازۂ روئے ناز سے جلوۂ خوشنما نہیں
حسنِ لباس ہے عبث قلب جو پارسا نہیں

درد جو مستقل نہیں، درد جو لا دوا نہیں
مایۂ ناز ہو تو ہو مایۂ جانفزا نہیں

مطربِ نغمہ خواں نہ جا میرے لبِ خموش پہ
جوشِ فغاں ہے قلب میں سازیہ بے صدا نہیں

شائقِ حسنِ مادّی فرق ہے اصل و نقل میں
ذوقِ نظر سے کام لے، رنگِ ہوس حنا نہیں

میری صدائے خونچکاں نوحۂ عرش گیر ہے
حرفِ فغانِ نیم شب، نالۂ نارسا نہیں

کاوشِ اندمالِ دل سعیٔ عبث ہے عشق میں
شائقِ عافیت، ترے درد کی کچھ دوا نہیں

باغ میں میرے سامنے زخمِ دلِ بہار ہے
دیدۂ اشتیاق میں غنچۂ نیم وا نہیں

نقش و نگارِ رنگ و بو کا ہے عبث حریص تو
شائقِ فصلِ نو بہار، عہدِ خزاں میں کیا نہیں

ایک درِ الٰہ سے مجھکو سدا ہے واسطہ
فطرتِ بے نیاز کو خلق سے کچھ گلا نہیں

غزل

از ڈاکٹر طفیل احمد مدنی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

کسی کا غم بٹانے کی کسی کی جاں بچانے کی
خدا توفیق دے مجھ کو کسی کے کام آنے کی

وفورِ غم سے اپنا حال دل تو کہہ نہیں پاتا
کہاں سے لاؤں ہمت دوستو نغمے سُنانے کی

اسے گلشن سمجھنا دوستو توہینِ گلشن ہے
اجازت خاص پھولوں کو جہاں ہو مُسکرانے کی

جہاں اہلِ چمن پیروں سے اسکو روند دیتے ہیں
اگر سبزے نے کوشش کی ذرا بھی لہلہانے کی

جہاں پابندیاں عائد ہیں پھلنے پھولنے پر بھی
درختوں کو اجازت تک نہیں ہے سر اٹھانے کی

رہیں کیسے بھلا سرو و صنوبر مطمئن ہو کر
کہ ہوتی رہتی ہیں جب سازشیں ان کو جلانے کی

کوئی شے بھی نہیں محفوظ گلچینوں کے ہاتھوں سے
نہ عزت لالہ و گل کی نہ عظمت آشیانے کی

[illegible]

مطبوعات جدیدہ

خلافت عباسیہ اور ہندوستان۔ مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۵۸، قیمت مجلد ۲۸ روپے، غیر مجلد ۲۳ روپے، پتہ۔ ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، ۶۔

اسلام کے ابتدائی دور میں عرب و ہند کے تعلقات مصنف کا خاص موضوع ہے، اور اس پر ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور (۱۳۲ھ تا ۲۴۷ھ) کے دونوں ملکوں کے تعلقات پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، جو پہلے عباسی خلیفہ سفاح سے متوکل کے زمانہ کو محیط ہے، اس دور میں سندھ اور اس کے گرد و نواح کے علاقے خلفائے عباسیہ کے زیر نگیں تھے، اور انہی کی جانب سے یہاں امرا مقرر ہوتے تھے، جو ان کی نیابت کرتے تھے، اس کے بعد یہاں خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں جو عباسی خلافت کے ماتحت نہ تھیں، مصنف نے اسی ابتدائی اور زریں دور کے جو تقریباً ۱۱۵ برس پر مشتمل ہے، دونوں ملکوں کے تعلقات کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، سندھ اور اس کے نواح کے علاوہ جن علاقوں میں ہندوستانی راجا حکومت کرتے تھے، ان سے بھی خلافت عباسیہ کے یک گونہ تعلقات دکھائے گئے ہیں، اموی دور میں ہندوستان کے جو علاقے فتح ہو چکے تھے، عباسی دور میں ان پر کوئی اضافہ نہیں ہوا، بلکہ ساری قوت ان علاقوں میں بغاوت و سرکشی ختم کرنے اور خود عربوں کی قبائلی عصبیت فرو کرنے میں صرف ہوئی، گویا عباسی حکومت کا زریں دور مدافعت میں گزرا، اور بعد میں جب وہ اضمحلال و انتشار سے دوچار ہوئی تو عرب امرا نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں اور عملاً یہاں سے عباسی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، مصنف نے اس کتاب میں پہلے یہاں کے سیاسی حالات اور ان فوجی اقدامات کی تفصیل قلمبند کی ہے جو سرکشی و سرتابی کرنے والوں کے ساتھ کی گئی، اس سلسلہ میں ان امرا کی امارت اور ان کی خدمات کا ذکر بھی ہے، جن کو عباسی خلفاء نے مقرر کیا تھا، اسی ضمن میں عباسی خلفاء اور ہندوستان

کے درمیان خط وکتابت اور ہدایا وتحائف کے مبادلہ کا تذکرہ بھی ہے، ایک علٰحدہ باب میں عباسی خلافت کی امارت بحر بصرہ پر بحث کی ہے، جو عباسی حکومت کی خاص ایجاد ہے، اور جس کا مقصد ہندوستان کے سرحدی اور سمندری علاقوں کی غارت گری وغیرہ کا استیصال تھا، اس باب میں اس امارت پر جو لوگ فائز ہوئے ان کا اور ان کی جنگی مہم کا حال بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد مختلف خلفاء کے عہد میں ان علاقوں میں جو امرا مقرر کئے گئے، ان کا نام تحریر کرکے ان کے قبائل کے متعلق معلومات پیش کئے گئے ہیں، پھر ان کے نظم ونسق، علم وادب نوازی، محاصل وآمدنی، مذہبی آزادی ورواداری، غیر مسلموں سے اچھے برتاؤ، عدل وانصاف اور تعمیری کاموں کا ذکر ہے، ایک باب میں اس دور میں عرب وہند کے تعلقات دکھائے ہیں، اس سلسلہ میں مسلمانوں سے ہندوؤں کی عقیدت ومحبت اور مسلمانوں کے ان کے بارہ میں اچھے تاثرات وخیالات کے علاوہ ان کے علوم وفنون سے دلچسپی ان کے معاملہ میں امن وانصاف پسندی، ان کے حسن وجمال کی تعریف اور ان سے شادی بیاہ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، ایک باب دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات کے لئے مخصوص ہے، اس میں ہندوستان میں درآمد ہونے والی اور یہاں سے برآمد کی جانے والی چیزوں کا ذکر ہے، نیز مسلمان تاجروں کی ایمانداری اور سچائی اور اسکے اچھے اثرات اور ہندوستان کے لوگوں کی تجارت میں مہارت دکھائی ہے، اس کے بعد کے باب میں ہندوستانی علوم وفنون، حساب، ہندسہ، نجوم وفلکیات، طب، قصص، اساطیر، نغمہ، موسیقی، جنگ اور جنگی آلات سے مسلمانوں کی دلچسپی کا حال اور ہندوستانی کتابوں کے عربی ترجمہ واشاعت کا ذکر کیا ہے، پھر اس دور کے علماء اور اسلامی فنون کے ان ماہرین کا تذکرہ ہے، جو سندھ اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، یا جنھوں نے باہر سے آکر یہیں بود وباش اختیار کرلی تھی، لائق مصنف نے ان حضرات کے تعلیمی سفر، درس وافادہ، روایت حدیث، تصنیف وتالیف اور ان کے متعلق اس زمانہ کی اسلامی دنیا کے اہل علم کی رائیں بھی نقل کی ہیں نیز حدیث، فقہ، تفسیر، قرأت، قضا اور زہد وتصوف وغیرہ میں ان کے امتیازات بھی دکھائے ہیں، آخر میں ہند سے تعلق رکھنے والے اصحاب علم موالی ومالیک کی علمی خدمات اور مختلف فنون میں ان کی جامعیت کا تذکرہ کیا ہے، پوری کتاب

ڑی تحقیق و محنت سے لکھی گئی ہے، مصنف نے دیدہ ریزی کر کے یہ علمی خزانہ تیار کیا ہے، ان کے خیال میں عہدِ فاروقی سے عہد عباسی یعنی تقریباً چار سو برس تک ہندوستان کے اسلامی مقبوضہ پر جو نظام جاری رہا وہ مجموعی طور سے خالص اسلامی نظام حکومت تھا، اس کتاب میں اسی نظام حکومت کی کیفیت اور اس دور کے خیر و برکت اور اس کی آبانی و درخشانی کی داستان سنائی گئی ہے، اور بنو عباس کے سیاسی، فوجی، علمی، تمدنی اور انتظامی کارناموں کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، اور دونوں ملکوں اور ان کی تہذیبوں کے امتزاج سے جو اسلامی ہندی تہذیب وجود میں آئی اور مختلف شعبوں میں جو ترقی و وسعت ہوئی اور جو خوشگوار تعلقات اور باہمی اعتماد و محبت کی فضا رونما ہوئی، ان سب کے متعلق مستند معلومات جمع کئے گئے ہیں، البتہ کتاب میں کہیں کہیں تکرار اور کتابت و طباعت کی غلطیاں ہیں، ایک جگہ بعض صفحے غلط لگ گئے ہیں، بعض جگہ عربی کے نامانوس اور اردو میں کم استعمال ہونے والے الفاظ اور جمع لکھے گئے ہیں

قانون کا حقیقی تصور اور انسانی آزادی: از مولانا جمیل الدین احمد مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۴۰، قیمت بارہ روپے، پتے: (۱) سید اصغر علی کاظمی، بازار روپ لال شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد (۲) مینار بک ڈپو گلزار حوض، حیدرآباد دکن۔

اس کتاب میں قانون اور انسانی آزادی کے تصور پر بحث کی گئی ہے اور ازدواج کے بارہ میں اسلامی قانون کی موزونیت اور جہاد فی سبیل اللہ کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے، پہلے قانون کا مفہوم واضح کیا ہے اور اس کی تردید کی ہے کہ اسلامی قانون رومن لا سے ماخوذ ہے، مصنف نے اس پر خصوصیت سے زور دیا ہے کہ قانون سازی صرف خدا کا حق ہے، پھر مختلف حیثیتوں سے الٰہی و انسانی قانون کا مقابلہ کر کے اول الذکر کی بالاتری اور مناسبت دکھائی ہے، اور موخر الذکر کا غیر مناسب اور فساد فی الارض کا موجب ہونا ثابت کیا ہے، انھوں نے بقائے حیات کے قانون، لباس، طعام اور ازدواج کے متعلق ہدایات الٰہی

کو انسانی فطرت کا عین اقتضا بتاتے ہوئے اس بارہ میں انسانی قانون خصوصاً یورپ کی بے راہ روی ثابت کی ہے، اور صالح تمدن و معاشرت کے لئے خدا کی بندگی اور غیروں کی محکومی سے آزادی کو بھی انسان کا فطری جذبہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس بارہ میں بے اعتدالی تمدن میں فساد اور انسانی زندگی میں تباہی کا باعث ہوتی ہے جس کے انسداد اور نوع انسانی کی خدمت و فلاح کے لئے اسلام نے جنگ کا حکم دیا ہے، انھوں نے جہاد اور اسلامی حدود و تعزیرات کو وحشیانہ قانون بتانے والوں کی مدلل تردید کی ہے، آگے چل کر آزادی کا مفہوم واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ بے قیدی کے بجائے انسان کی پیدائش کے اصلی مقصد خدا کی عبادت اور خلق کی خدمت کی تکمیل کرتی ہے، اس سلسلہ میں مساوات کے اسلامی تصور اور مختلف مذاہب خصوصاً ہندو مذہب میں اس کے یکسر مفقود ہونے کا ذکر کیا ہے اور اسلام نے غلامی کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں اور غلاموں سے حسن سلوک کی جو تعلیم دی ہے اسے پیش کیا ہے، کتاب مفید مباحث پر مشتمل ہے، اور مصنف کا نقطۂ نظر بھی درست ہے، مگر ترتیب کی خامی کی بنا پر مختلف مباحث ایک دوسرے سے مخلوط ہو گئے ہیں اور جا بجا بے ربطی اور کہیں کہیں اطناب اور زبان و بیان کی غلطیاں بھی ہیں، شروع میں کتاب اور مصنف کے تعارف کے تعلق سے جو تحریریں درج ہیں، ان میں بھی جگہ جگہ ناہمواری اور زبان و بیان کی غلطیاں ہیں۔

ردالاشراک: تالیف مولانا محمد اسماعیل دہلویؒ، تعقیب مولوی محمد عزیز شمس صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۲، قیمت درج نہیں، پتہ :۔ المکتبۃ السلفیۃ، شیش محل روڈ، لاہور، پاکستان۔

یہ مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلویؒ کی عربی تصنیف ہے جو ایک مقدمہ اور دو ابواب پر مشتمل ہے، اس کے پہلے باب کا خود مولانا نے اردو ترجمہ مزید وضاحت و تشریح کے ساتھ تقویۃ الایمان کے نام سے کیا تھا اور دوسرے باب کا ترجمہ ان کے انتقال کے بعد ان کے تلمیذ مولانا محمد سلطان نے تذکیر الاخوان کے نام سے

کیا تھا، یہ دونوں کتابیں خصوصاً اول الذکر بہت مقبول ہوئی، اور اس کے متعدد ایڈیشن نکلے، مگر اب کتاب ناپید تھی، جامعہ سلفیہ بنارس کے نوجوان فاضل مولوی محمد عزیر شمس علم و مطالعہ کے حریص ہیں، اور نادر و نایاب کتابوں کی تلاش و جستجو ان کا محبوب مشغلہ ہے، اب انھوں نے اس کتاب کے کئی مخطوطات کا پتہ لگا کر ان کی مدد سے اس کا محقق متن اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، پہلے باب میں شرک کی مختلف قسموں جیسے علم، تصرف، عبادت اور عادات و اطوار وغیرہ میں خدا کا شریک بنانے کی تردید ہے، دوسرے باب میں پہلے اتباعِ سنت و اجتنابِ بدعت کے وجوب، ایمان کی حقیقت اور صحابہ کرام کے فضائل کا ذکر ہے، پھر قبروں پر کی جانے والی اور تقلیداً رواج پانے والی بدعات کی تردید کی ہے اور آخر میں مختلف رسموں گانا، بجانا، حسب و نسب پر فخر، تعظیم میں حد اعتدال سے تجاوز، شادی بیاہ میں فضول خرچی، مہر کی کثرت، نکاحِ بیوگان سے پرہیز، نوحہ، سوگ، زیب و زینت میں افراط، کفار کی مشابہت، مردوں کا عورتوں کا اور عورتوں کا مردوں کا لباس اختیار کرنا، ممنوع لباس استعمال کرنا، تصویر سازی اور گودنا وغیرہ کا ذکر ہے، مولانا نے ان امور کے متعلق محض آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ جمع کر دینے پر اکتفا کیا ہے، اور ان کی کوئی تشریح و توضیح نہیں کی ہے، مرتب نے بھی صرف متن شائع کیا ہے اور حاشیے میں آیتوں اور حدیثوں کی تخریج کر دی ہے، شروع میں مصنف کے مختصر حالات بھی دیئے ہیں، اور مقدمہ میں اس کتاب کی اہمیت اور ان مخطوطات کے بارہ میں معلومات دیئے ہیں جن کا انھیں علم ہو سکا ہے، اس نایاب کتاب کی اشاعت قابلِ تحسین ہے۔

سبزہ و گل : مرتبہ جناب رئیس الدین فریدی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۶۰، مجلد مع رنگین گردپوش، قیمت ۱۶ روپے، ناشر مغربی بنگال اردو اکیڈمی ۱۷، مندری موہن ایونیو، کلکتہ۔

جناب رئیس الدین فریدی مدیر روزنامہ ہند کلکتہ مشاق اور تجربہ کار صحافی ہیں، وہ کلکتہ کے علاوہ

بمبئی، حیدرآباد اور دہلی کے مختلف اخباروں سے بھی وابستہ رہے، انھیں صحافت اور نثر نگاری کے علاوہ شعر و سخن کا اچھا ذوق بھی ہے، سبزہ و گل ان کی ادبی و شعری زندگی کی سرگذشت اور ان کے کلام کا انتخاب ہے، اس کے پہلے حصہ میں انھوں نے اپنی شاعری کی داستان بیان کی ہے اور مختلف جگہوں کے حالات و مشاہدات تحریر کئے ہیں، ان کا وطن امروہہ ہے، مگر ان کی زندگی کا زیادہ حصہ بمبئی اور کلکتہ میں بسر ہوا، اور انھوں نے دہلی، حیدرآباد اور جبلپور میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا، اس کتاب میں ان سب جگہوں کی ادبی شخصیتوں اور انجمنوں کا بہت دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا ہے، شروع میں نظم و نثر کا موازنہ اس طرح کیا ہے کہ دونوں ہی کی اہمیت و ضرورت تسلیم کی ہے، اس ضمن میں موسیقی اور رقص و مصوری سے اپنی دلچسپی کا ذکر بھی انشراح کے ساتھ کیا ہے، پھر اپنی شاعری میں موروثی اور ماحول کے اثرات اور امروہہ کی ادبی اہمیت دکھائی ہے، اور جبلپور میں ابتدائی تعلیم، وہاں کے شاعرانہ ماحول اور اپنی شعر گوئی کی ابتدا کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد بمبئی جانے اور صحافت کے پیشہ سے وابستگی اور وہاں کی ادبی و شعری مجلسوں اور ان میں شریک مقامی و بیرونی اصحاب ذوق کا مزہ لیکر تذکرہ کیا ہے اور ان سے اپنے روابط کا ... بھی بیان کیا ہے، پھر حیدرآباد کی ادبی سرگرمیوں اور وہاں کے شعرا و احباب کا تذکرہ ہے، دلی میں ... سمیع اللہ مرحوم کے کتب خانہ عزیزیہ اور وہاں حاضر ہونے والے شاعروں اور ادیبوں کا بھی دلچسپ ذکر ہے، آخر میں کلکتہ کے مختلف مشاعروں اور اہم شخصیتوں کے بارہ میں تاثرات قلمبند کئے گئے ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب مصنف کی سرگذشت بھی ہے، اور اس سے مختلف ارباب شعر و سخن کے بارہ میں دلچسپ معلومات بھی حاصل ہوتے ہیں، دوسرے حصہ میں نظموں اور غزلوں کا سنہ وار انتخاب دیا ہے، اس سے ان دونوں اصناف پر ان کی قدرت ظاہر ہوتی ہے، لائق مصنف نے اپنے مشاہدات و تجربات بیان کرتے ہوئے کہیں کہیں اپنی بے لاگ رائے بھی تحریر کی ہے، مثلاً غزل کو وہ لاجواب صنف سمجھتے ہیں (ص ۲۷) مگر جدیدیت کو اپنی سمجھ سے بالاتر بتاتے ہیں (ص ۱۲۵) دہلی کی شاعری کے وہ

بڑے مداح ہیں، اور لکھنؤ میں آتش کے سوا کسی کو چوٹی کا شاعر نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ان کا رنگ بھی خالص دہلوی ہے اور یہی حال حسرت کا بھی ہے (ص۱۰۱) جگر کے وہ پرستار ہیں (ص۱۱۶) مگر جوش کو اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں (ص۲۱) غالب کی عظمت بے پایاں کا دعوی کرنے کے باوجود ذوق کو ان پر ترجیح دیتے ہیں (ص۵۸) مصحفی کو قدرت زبان اور صفائی محاورہ و بیان اور لطافت و نفاستِ مضامین کے اعتبار سے میر و سودا سے بھی ممتاز قرار دیتے ہیں (ص۳۰) ان کی یہ آرائیں دوسروں کے لئے موضوع بحث ہو سکتی ہیں، خصوصاً اقبال کے متعلق جو یہ تحریر کیا ہے کہ..... انسانوں میں عقائد کی بنا پر تفریق پیدا کی اور عظمت انسان کو اپنے ذاتی خیالات میں محدود کر کے ڈال دیا" (ص۹۵) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کا دقت نظر سے مطالعہ نہیں کیا ہے، ایک جگہ انھوں نے مشاعروں میں سامعین کی ہڑبونگ کا ذکر کر کے اس کی ملک گیر پیمانہ پر اصلاح کی ضرورت ظاہر کی ہے مگر شعرا کی بے راہ روی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، ان کی تحریر میں بڑی شگفتگی ہے مگر مندرجہ ذیل جملوں میں خط کشیدہ الفاظ قابل اصلاح ہیں "اپنے احساسات سے دوسروں کو اطلاع دے سکتا ہے" (ص۱) "مگر اقبال کے متعلق میرا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ انھوں نے رومی کا چیلا ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود... (ص۵۶) ایک مصرعہ میں نوم کو مذکر باندھا ہے (ص۱۸۹) جو غلط ہے ذیل کے مصرعہ میں ؎ "جس میں ہمسوں کو میسر نہ غذا ہے نہ دوا" (ص۱۹۰) ہمسوں کھٹکتا ہے،

سمندر پھر بلاتا ہے : از جناب عرفی آفاقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۹۲، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت: ۲۰ روپے پتے (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، (۲) یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱،

یہ جناب عرفی آفاقی کا پہلا شعری مجموعہ ہے، اس میں ۵۹ء سے ۸۱ء تک کا منتخب کلام شامل ہے، انھوں نے اسے دلکش پیرایہ میں اہل زمانہ کے نام منسوب کیا ہے، اس کے بعد خدا کے حضور میں دو شعر

دلکے ہیں، پھر اپنا ایک خاص انداز میں تعارف کرایا ہے، انتساب کے شعروں کے لئے اقبال اور غالب کے لئے غالب کی زمینیں منتخب کی ہیں جو ان کی خوش مذاقی کا ثبوت ہے، یہ مجموعہ نظموں، غزلوں، قطعات، متفرق اشعار، دوہے اور ڈوئٹ، گیت، متنوع اصناف سخن پر مشتمل ہے، غزلوں کا حصہ زیادہ جاندار ہے، ان میں جا بجا جدت و تازگی کے نمونے ملتے ہیں، مصنف نے عموماً نئی اور مشکل زمینوں میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے، ان کی جدید شاعری پر بھی نظر ہے اور انھوں نے اردو کی کلاسیکل شاعری کا بھی مطالعہ کیا ہے، اس لئے ان کے کلام میں دونوں کا حسین امتزاج ہے اور وہ موجودہ دور کا عکاس بھی ہے، ان کے یہاں نئے الفاظ و استعاروں، نئی ترکیبوں و تشبیہوں اور جدید علامتوں اور دوہوں کے ساتھ ہندی زبان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں، کلام کے دوسرے حصے بھی قابل توجہ ہیں، نظموں سے ان کی قدرت کلام، احساسات کی شدت اور مشاہدے کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، ان میں طویل، مختصر، آزاد اور پابند ہر طرح کی نظمیں ہیں، اردو میں اب دوہے کہنے کا رواج بڑھ رہا ہے، عرفی صاحب نے اس میں بھی نیا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی شاعری فکری گہرائی و معنویت کی حامل ہے جس میں لب و لہجہ کی جدت نے ایک مخصوص کیف پیدا کر دیا ہے، کتاب ظاہری حیثیت سے بھی دیدہ زیب ہے۔

فیوضات وزیریہ : مرتبہ مولانا وجیہ الدین احمد خاں قادری، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۳۰۴، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ وزیریہ، محلہ انگوری باغ رامپور۔ یوپی۔

رامپور کے صوفی مولانا وجیہ الدین احمد خاں کے ملفوظات کو ان کے نواسے مولوی وجاہت اللہ خاں صاحب نے قلمبند کیا ہے اور مصنف کے مرشد مولانا وزیر محمد خاں مرحوم کے نام پر اس کا نام فیوضات وزیریہ رکھا ہے، اس میں تصوف کے اشغال و اعمال اور اوراد و وظائف کے علاوہ سلسلہ قادریہ مجددیہ جمالیہ کے ختمہائے معمولہ اور اس سلسلہ کے منظوم و منثور شجرے بیان کئے ہیں، شروع میں مصنف کے اور آخر میں ان کے شیخ کے حالات درج ہیں، اس میں اسلامی تصوف کے ساتھ مروجہ تصوف کی بھی بہت سی باتوں کا ذکر اور دیوبندیت و وہابیت پر چھینٹے بھی ہیں، اس سے مصنف کے خیال و مسلک کا پتہ چلتا ہے، یہ کتاب غیر مستند واقعات اور صوفیانہ شطحیات سے بھی خالی نہیں ہے، مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا جو الہام نقل کیا ہے وہ اشارۃ الاخبار شیخ کے تذکرہ میں نہیں ملا۔

ہندستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ
ان کی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی رہیں
ہندستان کے مختلف فرماں روا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں اور ان میں ان
کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار یا پانچ سو برس اس
ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے
ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن
اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے کس قسم
کے آلات استعمال ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، ان کی مختلف ٹکڑیوں کے
کیا نام ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمن
گر دار المصنفین کی رفاقت میں آئے اور ان کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی
سخت موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے
دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے
عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً
آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدانِ جنگ، قلعے، چھاؤنیاں
کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز
میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت: ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

"منیجر"

No. 133 MAARIF AUGUST 198[illegible] (8)

حجۃ الاسلام مولانا شبلی کی بعض اہم تصنیفات

سیرۃ النبی حصہ اول: اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات وغزوات کی تفصیل اور اس پر تبصرہ۔ قیمت: ۲۹ روپیہ،

سیرۃ النبی حصہ دوم: اقامت امن تاسیس خلافت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و شمائل کا مفصل بیان قیمت: بیس روپیہ

الفاروق: حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانحعمری اور ان کے مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل مولانا شبلی کے قلم کی شاہکار کتاب، جس پر مصنف کو بھی ناز تھا، قیمت: ۲۲ روپیہ

الغزالی: حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل اور ان کی تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ، قیمت ۱۱ روپیہ،

المامون: خلیفہ مامون الرشید کی سوانح وحالات کے علاوہ اس کے عہد حکومت کے سیاسی علمی مذہبی اخلاقی تمدنی حالات، جن سے دولت عباسیہ بغداد کے عروج و کمال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے قیمت: ۱۱ روپیے،

سیرۃ النعمان: امام ابو حنیفہؒ کی سوانح عمری ان کے اجتہاد و فقہ و استنباط مسائل اور فقہ حنفی کی خصوصیات (زیر طبع)

سوانح مولانا روم: مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانحعمری، اور ان کی شاہکار تصنیف مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ، (زیر طبع)

موازنہ انیس و دبیر: مشہور مرثیہ نگار میر انیس کی شاعری پر ریویو، اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ زیر طبع

کلیات فارسی: مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ قیمت: ۱۱ روپیہ،

کلیات اردو: مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جو انھوں نے مسجد کانپور، جنگ طرابلس، غزوۂ بلقان، مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھیں، قیمت: ۶ روپیہ،

مکاتیب شبلی: مولانا کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ حصہ اول، حصہ دوم ۱۶ روپیہ، ۱۲ روپیہ

[illegible] ستمبر سنہ ۱۹۸۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد (پن ۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ
۳۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک بیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:۔ ۸ روپے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:۔ ۱۰ روپے،

جلد سوم

اس میں اورنگ زیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

......«مرتبہ»......

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۳۲ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۳ء عدد ۳

مضامین

ایک ضروری اطلاع

کاغذ کی ہوش رُبا گرانی کی وجہ سے دارالمصنفین کی مطبوعات کی قیمت میں یکم اکتوبر ۱۹۸۳ء سے بیس فی صدی کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور معارف کا سالانہ چندہ بھی جنوری ۱۹۸۴ء سے ہندوستان کے لئے تیس روپیہ اور بیرون ہند کے لئے ساٹھ روپیہ کر دیا گیا ہے، امید ہے کہ دارالمصنفین اور معارف کے قدردان اس معمولی اضافہ کو بطیبِ خاطر گوارا کریں گے۔

منیجر

شذرات

گذشتہ مہینہ کے شذرات میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے نامور مورخ سر جدوناتھ سرکار نے اپنی ساری تصانیف یا تو انگریزوں کے اشارہ سے یا ان کی خوشنودی کی خاطر لکھیں۔

ان کی تاریخ نویسی کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اپنے زور بیان میں ایک جگہ جو کچھ کہہ جاتے ہیں، دوسری جگہ ان کی تحریر کی روانی سے اس کی تردید بھی ہو جاتی ہے، جس کا احساس ان کو نہیں رہا، ان کی تضاد بیانیوں کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں سے کچھ کی طرف توجہ ان سطروں میں دلائی جا رہی ہے، وہ بہت ہی پرزور طریقہ پر لکھ گئے ہیں کہ ایک مذہب (یعنی اسلام) جو اپنے پیرووں کو ڈاکہ زنی اور قتل کو مذہبی فریضہ سمجھنے کی تلقین کرتا ہو، وہ انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۳، ص ۲۴۷-۲۴۸)

یہ کیسی اشتعال انگیز تحریر ہے، مگر آگے چل کر ہندوستان ریویو کے اپریل ۱۹۲۹ء کے ایک مضمون "اسلام ان انڈیا" میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کو مسلمانوں نے یہ چیزیں دیں (۱) اپنی حکومت کے زمانے میں انھوں نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے (۲) ان کی وجہ سے ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں امن و سکون قائم ہوا (۳) ایک نئی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک میں یکسانیت پیدا ہوئی (۴) مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود لوگوں کے معاشرتی امور میں یک رنگی پیدا ہوئی (۵) تعمیرات میں ہندی اور اسلامی طرز کا ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، عمدہ قسم کی صنعتوں کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین اور مرصع کاری ان ہی کے زمانے کی یادگاریں ہیں (۶) ایک مشترکہ زبان پیدا ہوئی، جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی (۷) ملکی لٹریچر میں ترقی ہوئی (۸) مذہب میں توحید کے تصور کی تجدید ہوئی

اور تصوف پھیلا (۹) تاریخی لٹریچر پیدا ہوا (۱۰) فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبوں کو فروغ ہوا، یہ فیض اسلام کے پیرؤوں ہی نے ہندوستان کو دیں جن کے بارہ میں جدوناتھ سرکار یہ لکھ گئے ہیں کہ اسلام انسانیت کی ترقی اور دنیا کے امن کا ساتھ نہیں دے سکتا،

وہ مغلوں کی حکومت کو قزاقی قرار دیتے ہیں (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۱ ص ۲۷) مگر ان کے قلم کی یہ تحریر بھی نکلی ہے کہ ہندوؤں کی حکومت کے زمانے میں صوبے آزاد تھے، ان میں یکسانیت نہ تھی، سیاسی اتحاد نہ تھا، قومیت کا خیال بھی نہ تھا، اس کے مقابلہ میں مغلوں کی دو سو سالہ حکومت میں یعنی اکبر سے محمد شاہ کے عہد تک شمالی ہندوستان اور دکن کے بڑے حصے میں سرکاری زبان، ملکی نظام اور سکہ جات میں بڑی یکسانیت اور یگانگت پائی گئی، جو علاقے مغلوں کے زیر نگیں نہیں رہے ان میں ہندو راجاؤں نے ان سے نظم و نسق کے طریقے اور درباری آداب سیکھے مغلوں کے زمانے میں پینتیس صوبے تھے، مگر ایک صوبہ کے آدمی کو دوسرے صوبہ میں گھر ہی کی راحت ملتی، تاجر اور سیاح ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ تک تمام سہولتوں کے ساتھ سفر کرتے، اور اس پورے وسیع ملک کو ایک پاتے، اور تمام لوگ اپنے کو ایک ہی امپائر کی برابر کی رعایا تصور کرتے (مو غل ایڈ منسٹریشن باب ۱۳، ص ۳۹-۲۳۸) کیا یہ کارنامہ قزاقوں کے ذریعہ سے عمل میں آیا؟

ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ یہاں کے طویل قیام سے مسلمانوں کا بیرونی کیرکٹر زائل ہو گیا، ان پر خاص ہندوستانی چھاپ پڑ گئی، یہاں تک کہ سترہویں صدی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ مشکل مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ بخارا، ایران اور عرب سے جو مسلمان یہاں آئے، ان کو اپنے میں کیسے ضم کریں ہندوستانی آب و ہوا کی وجہ سے ان کی جسمانی ساخت بدل گئی، ان کے رنگ روپ میں بھی تغیر آ گیا، انھوں نے ہندوستان کے بہت سے مراسم، اعتقادات، غذائیں، لباس اور حتی کہ ہندوستانی زبان الموسوم بہ ہندوستانی (زبان ہندوی) کو اپنا لیا، صدیاں گزرنے کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنے ایشیائی ملکوں کے بھائیوں سے بالکل دور ہو گئے، ان کے

...مسلمان ہندوستان آئے وہ دو تین نسلوں کے بعد نمایاں طور پر ہندوستانی بن گئے اور ان کی بیرونی خصوصیات جاتی رہیں (مغل ایڈمنسٹریشن ص ۲۲۶-۲۷، ۱۹۲۰ء ایڈیشن)

لیکن جب انھوں نے ہندوستان ریویو میں اسلام ان انڈیا کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تو اس میں رقمطراز ہیں: ہندو اور مسلمان ایک ہی سرزمین میں رہے، مگر دونوں میں آمیزش نہ ہو سکی، ان میں جو خلیج ہے اس کو کوئی جیز پاٹ نہ سکی، ہندوستان کے مسلمانوں کا رجحان ہندوستان کے بجائے باہر کی سمت رہا، آج بھی وہ نمازوں میں کھڑے ہوتے ہیں تو ان کا منہ مکہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر زمانہ میں اپنے مذہبی شعائر قوانین کی تدوین ملک کے انتظامی معاملات اور نوشت و خواند کے معیار کے سلسلہ میں کوئی نمونہ تلاش کرتے تو وہ ہندوستان سے باہر عرب، شام، ایران اور مصر کا ہوتا، مسلمان باشندے اس ملک میں رہنے کے باوجود اکبر کے عہد تک اس کا جز بن کر نہیں رہے، اوپر کے دونوں اقتباسات میں کس بات کو صحیح سمجھا جائے۔

انھوں نے یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اورنگ زیب ایسا بدترین حکمراں ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ کوئی اور بدتر تصور نہیں کیا جا سکتا (اسٹڈیز ان مغل انڈیا ص ۶۲-۴۰) مگر وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ وہ اپنی ذہانت، سیرت اور کارناموں کی وجہ سے ایشیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں سے ہے، وہ غیر معمولی درجہ کا محنتی متحرک اور با اخلاق تھا، اس کو اپنے فرائض کا احساس برابر رہا، اس کے لئے عیش و راحت ممنوع تھی، وہ نفسانی خواہشات کے سخت خلاف رہا، انسانی کمزوریوں سے وہ متاثر نہیں ہوتا، اس لئے اپنے زمانہ اور اپنے مذہبی عقائد کے بہترین روایات اور تخیلات کے مطابق اپنے لوگوں پر حکومت کی (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۱)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کی حکومت کے ابتدائی ۲۳ سال میں امن وامان رہا خوشحالی رہی، اس کے راستے سے تمام دشمن ہٹ گئے، پوری سلطنت اس کی اطاعت گذار ہو گئی، ملک میں اس کی مضبوط اور بیدار حکومت کی وجہ سے جو امن وامان قائم ہوا تو دولت اور کلچر دونوں میں اضافہ ہوتا رہا، وہ انسانی خوشی اور شوکت کے انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچ گیا، یہ اس کی زندگی کا تیسرا دور تھا (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۲)

وہ اورنگ زیب کو ریا دن (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۲ ص ۸۳) ظالم (ایضاً ص ۱۳۶)، جھوٹا اور دغاباز (ایضاً ج ۲ ص ۴۹) سنگ دل اور ضمیر سے خالی (ایضاً ج ۱ ص ۱۰۰) ہر شرمناک واقعہ سے فائدہ اٹھانے والا (ایضاً ج ۱ ص ۱۹۵) اور اپنی جنسی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہو جانے والا (ایضاً ص ۹۶) لکھتے ہیں۔

مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کی دانشمندی اور خاکساری سے متاثر ہو کر درباری امراء اس کے دوست بنے رہے، جو زیرکی اس نے اپنی شہزادگی کے زمانے میں دکھائی، وہی بادشاہت کے دور میں بھی دکھاتا رہا، وہ جلباب بادشاہی میں درویشی کرتا، اپنی نجی زندگی، لباس، غذا اور تفریحات میں بہت سادہ تھا، وہ گناہوں سے پاک تھا، قرآن نے چار بیویوں کی اجازت دی ہے، اگر وہ اس سے بھی کم رکھتا، وہ اپنی بیویوں کا وفادار رہا، حکومت کے نظام کی دیکھ بھال میں اس کی محنت ومشقت حیرت انگیز حد تک تھی، وہ روزانہ دربار کرتا، عدالت کے منتظم اور دارو غہ دادخواہوں کو لاتے اور اس کے سرچشمۂ عدل سے سیراب ہوتے، بعض ایسے دادخواہوں اور مظلوموں کی التماس کو بھی سن لیتا، جن کی دادرسی امراء کی مداخلت کی وجہ سے صحیح طور پر نہیں ہوتی، حرم کے اندر جاتا تو غریب عورتوں، بیواؤں اور یتیموں کی فریاد سنتا، ان کو روپے جاگیریں اور زیورات دے کر مطمئن کرتا، وہ چوبیس گھنٹے میں صرف تین گھنٹے سوتا، بڑی محنت ومشقت کی زندگی بسر کرتا، اس کے دربار میں کام ہی کام ہوتا، کوئی تفریح نہ ہوتی (اسٹڈیز ان مغل انڈیا ص ۱۱-۴۲) ایک جگہ تو جدوناتھ سرکار نے اس کو مافوق البشر اور آئیڈیل کیرکٹر والا بھی کہا ہے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۴ ص ۲۳۵، ج ۵ ص ۲۷۹)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی زندگی ایک طویل المیہ کی داستان ہے، وہ اپنی ناقابل تسخیر اور پوشیدہ صلاحیت کے خلاف بے قاعدہ جنگ کرتا رہا، انسان کی طاقت ور ترین کوششوں کو بروئے کار لاتا رہا، لیکن زمانہ کی طاقتوں سے وہ دب کر رہا، اس طرح پچاس برس کی اس کی حکومت ایک بہت بڑی ناکامی میں ختم ہو گئی (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۱) اس کی زندگی میں اس کی سلطنت کے زوال کی

شانیاں شروع ہو گئی تھیں، اس کے آخری اٹھارہ سال میں اس کی قسمت نے اس کے ساتھ بے رحمانہ سلوک

کیا اس کے آخری زمانہ میں اس کی پوری سلطنت میں نادارگی اور بدامنی رہی (ج ۵ ص ۲۵۰)

مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی تسخیر، ساگر کا براہ راست اس کا الحاق کیا،

ہوا، جھگڑالو مرہٹہ راجہ پکڑ لیا گیا، اور اس کا پورا خاندان دارالسلطنت میں لایا گیا، اس طرح اورنگ زیب

کی فتح و کامرانی میں کسی چیز کی کسر باقی نہیں رہی (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۳) اس کی حکومت میں

مغلوں کا ہلال بدر کامل ہو گیا (ایضاً ج ۱ ص ۱۱۱) غزنی سے چاٹگام، کشمیر سے کرناٹک تک اس برصغیر میں اسی

کا حکم چلتا، صوبہ کا کوئی حاکم اس کی نہ عدول حکمی کرتا اور نہ خراج روکتا، یہاں وہاں کچھ بغاوتیں ہو جاتیں

لیکن کسی نے اپنے سر پر تاج رکھ کر اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی (ایضاً ج ۱، تمہید) اس نے اپنی حیرت انگیز

صلاحیت، سیرت کی قوت اور فرائض کی انجام دہی کی سرگرمیوں سے ایسی طاقت پیدا کر دی تھی کہ دہلی کی حکومت

کا ڈھانچہ متحد رہا، اور اس کی وفات کے بیس برس تک کوئی تبدیلی نہیں آئی (فال آف دی مغل امپائر ص ۱)

نادر شاہ کے حملہ تک مغلوں کا امپائر ایشیا کا متمول ترین امپائر تھا (ایضاً ج ۱ ص ۲)

انھوں نے اپنی ہسٹری آف اورنگ زیب کی پانچوں جلدوں میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے

کہ اورنگ زیب نے راجپوتوں کی دل آزاری کی، ان کو تکلیفیں پہونچائیں، ان کے مذہبی جذبات و احساسات

کو مجروح کیا، اس لئے وہ اس سے دور ہوتے گئے، مگر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ راجپوت اورنگ زیب کے دکن

کی مہم میں آخر وقت تک ساتھ دیتے رہے، ان کی ایک پوری نسل دکن میں رہی، اس نے نہ شہر دیکھا اور

نہ اینٹ پتھر کے مکانات دیکھے، ان کی زندگی خیموں میں گذری، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے، وہ

شکایت کرتے کہ ان کی آئندہ نسل امپائر کی خدمت کرنے کے لائق نہ ہوگی، کیونکہ ان کی زندگی دکن میں گذر رہی

ہے، وہ نہ اپنے گھروں کو گئے ہیں اور نہ اپنے بچوں کی پرورش کی ہے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۵ ص ۱۵۱)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب اورنگ زیب نے ہندوستان کے سارے علاقے فتح کر لئے اور تسخیر کے لئے

خاص علاقے باقی نہیں رہ گئے، تو راجپوت بے روزگار ہو گئے، کیونکہ جنگ و جدل ہی ان کا پیشہ تھا، اپنی بدحالی
میں راجپوت گھرانوں کے حوصلہ مند افراد اپنے ہی رشتہ داروں سے اپنے گھروں میں لڑنے لگے، یا ڈکیتی پر آمادہ
ہو گئے، یا پھر اورنگ زیب سے جاگیر پانے کی خاطر اپنا مذہب چھوڑنے لگے (ج ۵ ص ۵۵-۲-۵۰۲) پھر
فال آف دی مغل امپائر میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ راجپوت اتنے عیاش، راحت پسند
جھگڑالو، اور لاچار دوست ہو گئے تھے کہ وہ کسی مصرف کے نہیں رہ گئے تھے،

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ آخری دور کے مغل فرمانروا بھاری لشکر رکھنے سے غافل ہو گئے
تو راجپوتوں کی زندگی، مردانگی، بے روزگاری، کاہلی اور معصیت کی شکار ہو گئی، ان کے لئے کوئی باعزت
اور خاطر خواہ پیشہ باقی نہیں رہ گیا، وہ اپنے بنجر وطن کے علاقوں میں محدود ہو کر رہ گئے جس کے بعد
ان کی تلواریں اس میں چلنے لگیں، راجستھان میں تشدد، لوٹ مار، اقتصادی، بربادی اور اخلاقی زبوں حالی
انتہا درجہ کی رہی، جدوناتھ سرکار اپنی بے خبری میں یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ ہندو کیریکٹر کے بہترین نمائندے
راجپوت تھے، لیکن میری رائے میں دہلی امپائر کے زوال کا سب سے غمناک پہلو یہ ہوا کہ یہ بہادر
نسل انتہائی مذلت میں مبتلا ہو گئی، اور راجاؤں کا یہ استھان مایوس کن مصیبت میں گرفتار
ہو گیا (فال آف دی آف مغل امپائر ج ۴ ص ۶۸)

جدوناتھ سرکار کی تضاد بیانی ع اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا، اس کی محض
تھوڑی سی جھلکیاں اوپر دکھائی گئی ہیں، ان کی مورخانہ تحقیق میں ان کی تحریر کی حیثیت محض ایک ایسی
چنگاری ہے کہ ع ادھر چمکی، ادھر سلگی، یہاں پھونکا وہاں پھونکا

انھوں نے اپنی ہسٹری آف اورنگ زیب کی تیسری جلد کے ضمیمہ ۵ میں اورنگ زیب کا انہدام مندر
کے عنوان سے ان مندروں کی تفصیلات لکھی ہیں جو اس شہنشاہ کے زمانے میں منہدم کئے گئے، مگر ان کو یہ بھی دکھانا
کہ ان کے انہدام پر راجپوت راجا برہم نہیں ہوتے تھے، مثلاً اورنگ زیب نے اودے پور کے مندر کو منہدم

کیا، تو مہاراجہ دیوی سنگھ کو وہ اشتعال پیدا نہیں ہوا، جو وہ ظاہر کرتے ہیں کہ جدوناتھ سرکار کو ہوا، اور یہ لکھا ہے کہ اس مندر کے انہدام پر اور چچا کے تئیں راجہ دیوی سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس کے دیوتاؤں کی مورتیوں کی بے حرمتی کی جائے، اس کے آباد اور مغرور قبیلے کے لوگ ذبح کئے جائیں، بدتمیز غیر ملکی اس کے باپ کی سرزمین کو اپنے گھوڑوں سے کچل رکھیں، اس کے گھر کی راجکماریاں موت سے زیادہ بدتر شرمناک زندگی بسر کرنے پر مجبور کی جائیں، لیکن اس کو ان چیزوں کی پرواہ بھی نہ ہو، محض اس لئے کہ اس کا علاقہ سلامت ہے، اور اور چچا کے سنگھ اس پر بیٹھ کر راجہ کہلائے (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۳ ص)

یہ کوئی مؤرخانہ تبصرہ نہیں ہے، بلکہ فرقہ وارانہ تعصب میں فرقہ وارانہ نفرت پھیلانا ہے۔

اب تو ڈاکٹر راجندر پرشاد (سابق صدر جمہوریہ ہند) جن چندر بمبئی اور پروفیسر بی۔ ان۔ پانڈے کے ذریعہ سے یہ انکشاف ہوگیا ہے کہ اورنگ زیب نے بے شمار مندروں کی سرپرستی کرکے ان کو مالی امداد دیا تھا، ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب انڈیا ڈیوائڈڈ میں لکھا ہے کہ الہ آباد کے مشہور مندر سومیشور ناتھ کے پجاری کے نام اورنگ زیب کے دو فرامین ہیں، اس نے جنگ جیون کی لڑکے گردھر ساکن موضع بسی ضلع بنارس، جدھر ساکن میش پور پرگنہ حویلی اور پنڈت بلبھدر رام مسرا کو بھی جاگیریں مندروں کے لئے دیں، اس نے ملتان کے مندر توت لا مائی کی لئے مشرا چکیان داس کو نو سو روپے کا وظیفہ عطا کیا (ص ۴۰۔ ۴۴۲) بمبئی کو جن چندر نے اکتوبر ۱۹۵۸ء، جنوری، اپریل ۱۹۵۸ء، اور اپریل ۱۹۵۹ء کی جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی میں تقریباً تیس ایسے فرمانوں، سندوں اور پروانوں کے متن نقل کئے ہیں، جو اورنگ زیب نے ہندوؤں اور جینیوں وغیرہ کو ان کے مندروں کے لئے دیا تھا، اسی طرح پروفیسر بی۔ ان۔ پانڈے نے ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء کو راجیہ سبھا میں اپنی ایک تقریر میں بتایا کہ مہاکالیشور اجین، بالاجی مندر چترکوٹ، امانند، گوہاٹی، شترونجے کے مندروں اور شمالی ہند کے دوسرے مندروں اور گورداروں کی مالی امداد کے لئے اورنگ زیب نے خود فرامین جاری کئے، ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ان کے پاس موجود ہیں، انہوں نے اپنی اس تقریر میں یہ بھی بتایا کہ اورنگ زیب نے بنارس کے وشوناتھ مندر کو منہدم کرنے کا اس لئے حکم دیا کہ وہاں ان کے مہنت نے اس کے ایک ہندو منصبدار کچھ کے مہاراجہ کی مہارانی کی زبردستی آبروریزی کرکے اس پوتر استھان کو ناپاک کردیا تھا،

اگر جدوناتھ سرکار زندہ رہتے، تو ان تمام انکشافات کے بعد وہ اپنی تحریروں کو پڑھتے، پھر اورنگ زیب کو یاد کرکے کہتے:

اس کی تو دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو کچھ ہم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

مقالات

حضرت ابراہیمؑ اور مستشرقین

از

جناب مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم (سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند)

کلام پاک میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر جس طرح آیا ہے، اس پر بعض مستشرقین نے اپنے خیالات کا اظہار کرکے آپ کی ذات مقدس سے متعلق شک و شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس پر مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے اپنی مشہور کتاب قصص القرآن ج ۱ (ص ۱۰۶ تا ۱۶۰) میں بڑی اچھی بحث کی ہے۔ (ص ع)

مستشرقین یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں یدطولیٰ رکھتی ہے۔ اور بغض و عناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآن عزیز کے خلاف بے دلیل ان کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے، ایک موقع حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا بھی ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ[1] نے ونسنک کے حوالہ سے نقل کیا ہے .... کہ سب سے پہلے اسپرنگر نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دین حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی البتہ عرصۂ دراز کے بعد ان کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے اور ان کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے، چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنۂ تکمیل تھا اس لئے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپرنگر کے اس دعوے کو سنوک ہیکرونییہ نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا، اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اس کو خاص آب و رنگ سے رنگین بنایا۔ اس نے کہا:

"قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں ان میں کسی ایک مقام پر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا، اور نہ ان کو اول مسلمین بتایا گیا ہے، بلکہ "

---

[1] جلد ا ص ۲۶-۲۸، بحوالہ Sprenger ص ۲۷۶ Wensinck ص ۲

ہونے کی حیثیت سے پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں، ان کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں تھی جو ان کو موسس کعبہ اسمعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر و ہادی اور ملت حنیفی کا داعی ظاہر کرتی ہو، سورۂ الذاریات، الحجر، الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت جو سب کی سورتیں ہیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے سرزمین عرب میں کوئی نبی نہیں آیا، اور یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

البتہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے تھے اور انہی کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے لہٰذا اس وقت تک ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو بھی انھوں نے اسی نظر سے دیکھا، جس نظر سے یہود دیکھتے تھے، لیکن جب مدینہ پہنچ کر انھوں نے یہود کو اپنے مشن "اسلام" کی دعوت دی تو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور وہ آپ کے دشمن ہو گئے، اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فکر و تامل کیا اور خوب سوچا، آخر ان کی ذکاوت اور جودت طبع نے رہنمائی کی اور انھوں نے عرب کے لئے یہودی یہودیت سے جدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیت ابراہیمی کہنا چاہئے، لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملت حنیفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسمٰعیلؑ کے والد، کعبہ کے موسس نظر آنے لگے ہیں[۵]"

---

۵ Het Meh hes nooh Feest ص ۲۰۔

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور وینسنک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب سے محض اس لئے اختراع کئے گئے ہیں کہ اس قسم کی پھر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہوسکے، اور نیز یہ کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ ان کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی، لیکن جب ایک مورخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعوے اور دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی کرکے محض عداوت اور بغض وعناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے، اس لئے کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مکی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سرتاسر غلط بلکہ قصد وارادہ کے ساتھ علمی بددیانتی ہے کہ کئی سورتوں میں سے صرف انہی کا حوالہ دیا گیا ہے، جنہیں حضرت ابراہیمؑ کو فقط ایک پیغمبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے، لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیمؑ کی شخصیت کو ہمہ حیثیت سے نمایاں کرنے کے لئے ان کے نام ہی سے مُعنوَن کرکے نازل کی گئی یعنی سورۂ ابراہیمؑ، اس کو نظر انداز کردیا گیا، تاکہ قرآن عزیز سے براہ راست فائدہ نہ اٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے، اور کورانہ تقلید میں وہ ان کے غلط دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں۔

سورۂ ابراہیمؑ مکی ہے، اس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے، اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے۔

(۱) حضرت ابراہیمؑ عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں، اور خدا کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اس مقام کو امن عالم کا مرکز بنانے کی دعا کررہے ہیں:-

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ	اے پروردگار اس شہر (مکہ) کو تو امن کا
وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ	مرکز بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی

اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ	پرستش سے دور رکھ، اے پروردگار بلاشبہ
فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ	ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا
عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○	پس جو شخص میری پیروی کرے وہ میری جماعت
(ابراہیم ع ۶)	میں سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے پس بلاشبہ

(۲) حضرت ابراہیمؑ اقرار کرتے ہیں کہ سرزمین حجاز (جو عرب کا قلب ہے) ان ہی کی اولاد سے آباد ہوئی اور انھوں نے ہی اس کو بسایا ہے، اور وہی اس چٹیل میدان میں بیت الحرام (کعبہ) کے مؤسس ہیں۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ	اے ہمارے پروردگار بیشک میں نے اپنی بعض
غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ	ذریت کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے
رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً	گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے، اے ہمارے
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ	پروردگار یہ اسلئے تاکہ وہ نماز قائم کریں پس
مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ	تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس طرف پھیر دے کہ
(ابراہیم ع ۶)	وہ اس کعبہ کی بدولت ان کی جانب مائل ہوں
	اور ان کو پھلوں سے رزق عطا کر تاکہ یہ شکر گذار بنیں۔

(۳) حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحٰق (علیہم السلام) کے والد ہیں، اور یہی اسمٰعیلؑ ہیں جو عرب کے باپ ہیں، اور حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ملت حنیفی کے شعار صلوٰۃ کی اقامت کی دعا کر رہے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى	سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے
الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ	میں اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ بخشے، بلاشبہ میرا
لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ○ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ	پروردگار ضرور دعا کا سننے والا ہے۔ اے پروردگار
الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَ	مجھکو اور میری اولاد کو نماز قائم کرنیوالا بنا دے

تَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ (۳۹-۴۰-۴۱) (ابراہیم ع)

اے ہمارے پروردگار ہماری دعا سن، اے ہمارے پروردگار تو مجھکو اور میرے والدین کو اور کل مومنوں کو قیام حساب (قیامت) کے روز بخش دے۔

ان آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان لغو اور بے سروپا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقین یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے، کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں، اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے۔

(۴) اسی طرح سورۂ ابراہیمؑ کے علاوہ سورۂ انعام اور سورۂ النحل بھی مکی سورتیں ہیں، ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ شرک کے مقابلے میں ملت حنیفی کے داعی ہیں اور ان کی شخصیت اس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الانعام)

بلاشبہ میں اپنے چہرہ کو اسی ذات کی طرف جھکاتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور میں شرک کرنیوالوں میں سے ہرگز نہیں

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

(الانعام، ۱۶۱، ع ۲۰)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دو بلاشبہ مجھ کو میرے رب نے سیدھی راہ کی ہدایت کی ہے، جو کج راہ سے الگ صاف اور سیدھا دین ہے ملت ہے ابراہیم کی، جو تو ایک خدا کی طرف جھکنے والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے۔

إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

پرستش سے دور رکھ اسے پروردگار بلاشبہ
ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا
پس جو شخص میری پیروی کرے وہ میری جماعت
میں سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے پس بلاشبہ

(۲) حضرت ابراہیم اقرار کرتے ہیں کہ سرزمین حجاز (جو عرب کا قلب ہے) ان ہی کی اولاد سے آباد ہوئی اور انھوں نے ہی اس کو بسایا ہے، اور وہی اس چٹیل میدان میں بیت الحرام (کعبہ) کے مؤسس ہیں۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ

(ابراہیم ع ۶)

اے ہمارے پروردگار بیشک میں نے اپنی بعض
ذریت کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے
گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے، اے ہمارے
پروردگار یہ اسلئے تاکہ وہ نماز قائم کریں پس
تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس طرف پھیر دے کہ
وہ (اس کعبہ کی بدولت) ان کی جانب مائل ہوں
اور ان کو پھلوں سے رزق عطا کر تاکہ یہ شکرگزار بنیں۔

(۳) حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحٰق (علیہم السلام) کے والد ہیں، اور یہی اسمٰعیل اہل عرب کے باپ ہیں، اور حضرت ابراہیم اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ملت حنیفی کے شعار صلوٰۃ کی اقامت کی دعا کر رہے ہیں۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَ

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے مجھکو بڑھاپے
میں اسمٰعیل اور اسحٰق بخشے، بلاشبہ میرا
پروردگار ضرور دعا کا سننے والا ہے، اے پروردگار
مجھکو اور میری اولاد کو نماز قائم کرنیوالا بنادے

تَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ (۳۹-۴۰-۴۱) (ابراہیم ع)

اے ہمارے پروردگار ہماری دعا سن، اے ہمارے پروردگار تو مجھکو اور میرے والدین کو اور کل مومنوں کو قیام حساب (قیامت) کے روز بخش دے۔

ان آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان لغو اور بے سروپا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقین یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے، کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں، اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے۔

(۴) اسی طرح سورۂ ابراہیم کے علاوہ سورۂ انعام اور سورۂ النحل بھی مکی سورتیں ہیں، ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیم شرک کے مقابلے میں ملت حنیفی کے داعی ہیں اور ان کی شخصیت اس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (الانعام)

بلاشبہ میں اپنے چہرہ کو اسی ذات کی طرف جھکاتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (انعام، ۱۶۱ ع ۲۰)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دو بلاشبہ مجھ کو میرے رب نے سیدھی راہ کی ہدایت کی ہے، جو کج راہ سے الگ صاف اور سیدھا دین ہے، ملت ہے ابراہیم کی، جو تھے ایک خدا کی طرف جھکنے والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (النحل ـ ۱۵)

بیشک ابراہیمؑ تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار صرف ایک خدا کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں سے۔

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (النحل ـ ۱۵)

پھر وحی کی ہم نے تیری جانب (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کی، تو پیروی کر ابراہیمؑ کی ملت کی جو صرف خدائے واحد کی جانب جھکنے والا ہے، اور نہیں ہے مشرکوں میں سے،

تو کیا ان واضح آیات کے بعد بھی ان دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے، جو اس سلسلہ میں سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے بیان کئے ہیں؟ مکی سورتیں ہوں یا مدنی دونوں جگہ ابراہیمؑ کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ دونوں حالتوں میں ملت حنیفی کے داعی، حضرت اسمٰعیلؑ اور عرب کے باپ کعبہ کے مؤسس و بانی اور عرب کے ہادی ہیں، اور اس لئے مستشرقین یورپ کا یہ کہنا، کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن عزیز کی مکی اور مدنی آیات میں دو جدا جدا صورتوں میں نظر آتی ہے، کذب اور صریح بہتان ہے، نیز یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ عرب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت سے قبل کوئی بھی پیغمبر نہیں گذرا، اس لئے کہ ابراہیم و اسمٰعیل اور ہود و صالح علیہم السلام اسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں۔

ان مدعیان علم کو تعصب نے ایسا نادان بنا دیا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس قسم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (تورات) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں، اس لئے کہ تورات میں تصریح ہے کہ اسمٰعیلؑ، ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں، اور اسمٰعیلؑ ہی عرب کے باپ ہیں' اور ابراہیمؑ کی اسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی، اور یہ دونوں باپ بیٹے عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ مکہ کی زندگی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور ان کے مذہبی امور کی تقلید کی، اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور ان کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی، اور اس کو ملت ابراہیمی کا لقب دیا، اس لئے کہ مکہ کی زندگی میں تو یہود سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو پھر مخالفت و موافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا، البتہ مدینہ میں آکر آپؐ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی اور یہ اس لئے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کے مطابق دین موسوی کے پیرو تھے اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی، مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے، اور ان کی محرّف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے جملے ایسے موجود تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں اور ان سے آپؐ کے حق میں بشارات نکلتی ہیں، نیز بہت سے وہ احکام بھی موجود تھے جو صحیح معنی میں وحیِ الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں، اور دین موسوی کی اساس و بنیاد رہے ہیں، اس لئے آپ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملت ابراہیمی یعنی اسلام قبول کرلیں گے، لیکن جب آپؐ نے ان کے انکار، بغض و حسد کا تجربہ کرلیا تو پھر ان کے ساتھ بھی آپ کا معاملہ وہی ہوگیا، جو مشرکین کے ساتھ تھا، اور بمصداق "الکفر ملۃ واحدۃ" (کفر سب ایک ملت ہے) آپؐ نے ان سب کو ایک ہی حیثیت میں رکھا۔

اسپرنگر، سنوک اور ان کے ہمنوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں، یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کے دادا تھے اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرت اسرائیل علیہ السلام کی جانب کرتے اور بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے تو ان کا یہ کہنا کہ ابراہیمؑ بھی یہودی تھے، کس قدر مضحکہ خیز تھا، کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہوسکتا ہے کہ عرصۂ دراز کے گذرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا۔

پس اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے قرآن عزیز نے یہ اعلان کیا:۔

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی، البتہ

نَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ۝ وہ تھے ایک خدا کی جانب جھکنے والے مسلم

مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تو یہود کے دین پر تھے لیکن مدینہ جاکر جب یہود نے ان کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوت طبع سے یہودیت ابراہیمی ایجاد کر لی، سُبْحَانَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ

سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے اس دعوے کی دلیل میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گذرا، قرآن عزیز کی اس آیت کو بھی پیش کیا ہے:۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰھُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِکَ۔ تاکہ تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ڈرائے ایسی قوم کو کہ نہیں آیا ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم و اسمٰعیل عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآن عزیز امت عربیہ کے متعلق اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہ کرتا۔

مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآن عزیز کے طرز خطابت، اسلوب بیان، اور باطل پرستوں کی باطل پرستی کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوا ہے، یا گذشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض و عناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ عرب کا بہت بڑا حصہ بت پرستی میں مبتلا تھا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے عقائد اور دین کے نام سے کچھ احکام مرتب کر رکھے تھے، مثلاً دیوتاؤں کی نذر اور قربانی کے لئے سائبہ، بحیرہ اور وصیلہ کی ایجاد، اور مختلف بتوں کی پرستش کے مختلف قواعد و ضوابط وغیرہ، اس لئے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی اور شرک اور بت پرستی سے روکا تو وہ کہنے لگے کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم بد دین ہیں اور ہمارا کوئی الہامی دین نہیں ہے، غلط ہے، ہم تو خود مستقل دین رکھتے ہیں، اور وہ ہمارے

باپ دادا کا قدیمی دین ہے۔

قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَ اللّٰهُ أَمَرَنَا بِهَا۔	مشرکین نے کہا ہم نے اسی (بت پرستی) پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔

تب قرآن عزیز نے ان کے باطل عقائد کی حقیقت کو ان پر واضح کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو بتایا جائے کہ کسی دین کے خدائی دین ہونے کے لئے دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں یا حسی اور عقلی راہ سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ خدا کا دین اور اس کا مرغوب مذہب ہے، اور یا نقلی روایات اس کا قطعی یقینی اور ناقابل انکار ثبوت پیش کرتی ہوں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت ہے۔ اور اگر یہ دونوں راہیں کسی دعوے کے لئے بند ہیں تو وہ دعویٰ باطل اور اس کا مدعی کاذب ہے۔

لہذا قرآن عزیز نے مشرکین کے اس دعوے کی تردید کے لئے آیات قرآنی کے تین حصے کر دیئے ایک حصہ میں اس کے اس دعوے کا انکار اور دعوے کی غیر معقولیت کا اظہار کیا اور بتایا کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ "اَللّٰهُ أَمَرَنَا بِهَا" (ہم کو خدا نے ایسا (شرک) کرنے ہی کا حکم دیا ہے) بالکل غلط اور سرتاپا باطل ہے اس لئے کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (الاعراف)	بلا شبہ اللہ تعالیٰ بیہودہ خرافات کا حکم نہیں دیا کرتا (اے مشرکین) کیا تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

اور دوسرا حصہ ان کے باطل دعوے پر حسی اور عقلی سند کے مطالبہ سے متعلق کیا اور بتایا کہ وہ عقل سے یہ فتویٰ صادر کریں کہ جو کچھ خدا کے ساتھ انھوں نے غلط نسبتیں قائم کر رکھی ہیں اور جن پر ان کے مزعومہ دین کی بنیاد قائم ہے، وہ کس طرح صحیح اور اہل عقل کے نزدیک قابل تسلیم ہیں؟ وہ کہتا ہے:

فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ	پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان سے دریافت

الْبَنُوْنَ ۵ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا
وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ۵ اَلَآ اِنَّهُمْ
مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۵ وَلَدَ اللّٰهُ
وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۵ اَصْطَفَى
الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۵ مَا لَكُمْ
كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۵ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ
(الصافات ع ۵)

کرو کیا تمہارے پروردگار کے لئے بیٹیاں
ہیں اور ان کے لئے لڑکے، کیا ہم نے فرشتوں
کو لڑکیاں بنایا، اور وہ اس وقت موجود
تھے، خبردار بلاشبہ یہ سب ان کی بہتان طرازی
ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے بلاشبہ
یہ قطعاً جھوٹے ہیں (یہ کہتے ہیں کہ خدا نے)
اپنے لئے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند

[illegible]

اور تیسرا حصہ ان کے باطل عقیدوں کے متعلق نقلی سند کے مطالبہ سے وابستہ کیا، قرآن عزیز ان سے سوال کرتا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور اس کو خدا کا دین بتا رہے ہو تو کیا تمہارے پاس اس کے لئے خدا کی جانب سے کوئی حجت اور دلیل نازل ہوئی ہے یا اس کے پاس سے ان عقائد کی صداقت کے لئے کوئی کتاب بھیجی گئی ہے اگر ایسا ہے تو پیش کرو؟

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۵ فَاْتُوْا
بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۵
(الصافات ع ۵)

کیا تمہارے پاس کوئی ظاہر حجت اور صاف
دلیل ہے پس تم اپنی (خدا کی جانب سے نازل شدہ)
وہ کتاب لاؤ، اگر تم سچے ہو۔

اب اگر ان کے اپنے دعوے کی صداقت کے لئے ان کے پاس نہ کوئی حسی و عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی سند کے طور پر کوئی حجت و کتاب، تو پھر ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سے خدا کا دین موجود ہے اور اس کی منضبط شریعت بھی! بالکل غلط اور باطل دعویٰ ہے۔

اسی طرح مشرکین پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ تمہارے پاس اپنے دعوائے باطل کے سلسلہ میں نہ عقلی سند ہے نہ نقلی، اور ان کو لاجواب بنانے کے لئے سورۂ احقاف میں بھی یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ	تم بھلا بتاؤ کہ اللہ کے سوا جن کو تم پوجتے ہو
اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ	مجھے دکھلاؤ کہ انہوں نے زمین سے کیا بنایا
الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي	یا ان کی آسمانوں میں (اللہ کے ساتھ) کوئی
السَّمَاوَاتِ ائْتُونِي بِكِتَابٍ	شرکت ہے، اس سے پہلے کوئی کتاب اگر تمہارے
مِّن قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ	پاس ہے (جو اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہو)
(احقاف ع ۱)	تو وہ لے آؤ یا علم (اولین) میں سے کوئی بقیہ علم؟

یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک دوسرے پیرایہ میں قرآن عزیز کی ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا، ان آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمین عرب (حجاز) ہمیشہ سے خدا کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے، اور اس ملک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سب سے پہلی آواز ہے، قرآن عزیز ایسی خلاف حقیقت بات کس طرح کہہ سکتا تھا جب کہ سورۂ ابراہیم، الانعام اور النحل کی آیات میں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے عربی نبی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جو ابھی نقل کی جا چکی ہیں، بلاشبہ قرآن عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے، کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اسی بات کا اقرار، اس لئے کہ وہ خدائے عالم الغیب والشہادۃ کا کلام ہے نہ کہ بھول چوک کرنے والے انسان کا کلام

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ	کیا انہوں نے قرآن پر غور نہیں کیا اور اگر وہ
كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا	ہوتا اللہ کے سوا کسی اور کا کلام تو ضرور پاتے
فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا.	اس میں بہت سا اختلاف۔

لہٰذا قرآن عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور ونسنک کے یہ تمام دعاوی اور ان کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور افترا ہیں، اور ان کے طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ

اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآن عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ اس کی فہم و بصیرت کا [illegible]
بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اگلتے، غلط الزام قائم کرتے اور صریح
اور واضح مسائل میں اپنے پیش نظر مقاصد کے مطابق تشکیک پیدا کر کے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں،
بلکہ اس قسم کے الزامات سے ان کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے جس کو قرآن عزیز نے اس قسم کے معاندین
کے لئے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کر دیا ہے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاءً — یہ (منکرین قرآن و اسلام) یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش تم بھی ان کی طرح منکر ہو جاؤ

اس لئے ان منکرین (کافروں) کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا۔ — اے پروردگار ہمارے دلوں کو ہدایت یافتہ اور راہیاب کر دینے کے بعد کجی کی جانب مت مائل کر

بہرحال قرآن حکیم کی مسطورہ بالا زیر بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اس کے درمیان
اور الانعام، النحل اور ابراہیم جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے پیغمبر عرب ہونے کے درمیان قطعاً
کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔

اس پیش کردہ تفصیل و تشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے
کہ یہ خطاب صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں موجود تھے ان کے
گذشتہ آباء و اجداد اور گذشتہ تاریخ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مقالات شبلی جلد ششم (معترضین اسلام کے جوابات) قیمت ۱۱ روپیے

اردو زبان و ادب
میں
قرآنی الفاظ کا استعمال

از

جناب ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ اسلام آباد پاکستان

یہ مقالہ ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے سیمینار منعقدہ ۳ / جون ۸۲ء میں پڑھا گیا

اس عنوان میں دو لفظ مرکزی اور بنیادی اہمیت کے حامل ہیں، ایک اردو، دوسرا قرآن۔ میرے لئے یہ کتنا مشکل ہے کہ اردو میری مادری زبان ہے، لیکن اگر مادری زبان سے مراد وہ زبان لی جائے جو انسان آغوشِ مادر میں یا گہوارۂ طفلی میں سیکھتا اور بولتا ہے، تو اس لحاظ سے یہ میری مادری زبان ضرور ہے اس کے علاوہ لکھنے پڑھنے کی میری زبان شروع سے اردو ہی رہی ہے، علم اکتسابی اور مطالعہ کی حد تک ہی اردو کے ساتھ میرا تعلق تسلیم کیا جا سکتا ہے، پھر بھی خود کو اس باب میں اس بات کا حقدار نہیں سمجھتا کہ یہ کہہ سکوں کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ اس لئے میں نے اردو لغات سے تصدیق کرنے کے بعد ہی کوئی بات کہی ہے۔ بہرحال تو عربی اور دینی تعلیم کے طفیل، نیز مسلمان ہونے کے ناطے تلاوت اور مطالعۂ قرآن کے تصدق اتنی شد بد تو ہو گئی ہے کہ لغات القرآن، مفتاح یا کلید کی طرف رجوع کئے بغیر کسی لفظ کے بارے میں بلا تامل یہ فیصلہ کر سکوں کہ یہ لفظ قرآن میں آیا ہے یا نہیں۔ یہاں حوالوں کے لئے کہیں کہیں مجھے ان کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

جیسا کہ عنوان کے الفاظ سے ظاہر ہے، یہ موضوع بیک وقت لسانی، ادبی، دینی، تہذیبی اور ثقافتی ہے، اور جس کو آج کل کی ایک جاذب اصطلاح عمرانیات سے احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ موضوع کے یہ مختلف پہلو آپس میں اس طرح خلط ملط ہیں کہ ان کے مابین حد فاصل قائم کرنا ممکن نہیں، اور یہ سب ایک دوسرے پر

اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے اثر پذیر بھی، میرا یہ پختہ یقین ہے اور اس کے شواہد ہمیں تاریخی
لسانیات، توضیحی لسانیات، اور تقابلی لسانیات کے تحت مختلف زبانوں کے مطالعے سے بافراط اور بخوبی
مل سکتے ہیں کہ دین، دینی کتب اور دینی ادب کسی زبان کا ہیولیٰ تیار کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں یہ کوئی
نظریہ یا مفروضہ نہیں، بلکہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس کی تصدیق کسی بھی زبان کے تاریخی مطالعے سے کی جا سکتی
ہے۔ ہم اس سے ایک درجہ نیچے اتر کر بھی کم سے کم اس قدر تو ضرور ہی کہہ سکتے ہیں کہ کسی زبان پر اس زبان کے
بولنے والوں کے دینی افکار و تصورات اور متعلقہ الفاظ کی گہری چھاپ ہوتی ہے، میری اس گفتگو سے یہ نتیجہ
اخذ نہ کیا جائے کہ میں زبان کی تشکیل میں دوسرے عوامل و محرکات کی کار فرمائی کا منکر ہوں۔ زبان چونکہ
زندگی کی عکاس ہوتی ہے اور اس کا ادب زندگی کا ترجمان اس لئے دین و مذہب اور اخلاقی اقدار کے
علاوہ بھی انسانی زندگی کے مختلف النوع مظاہر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے اثرات اسی تناسب
سے ہمیں زبان و ادب میں نظر آتے ہیں جس تناسب سے انسانی زندگی میں ان کا عمل دخل ہوتا ہے، خود مختلف
ادیان و مذاہب کے باہمی اختلافات کا پرتو بھی ہمیں زبان و ادب میں نمایاں نظر آ سکتا ہے، علیٰ ہذا القیاس
ایک ہی زبان کے دائرے میں ایک فرد کے دوسرے فرد کے ساتھ یا ایک گروہ کے دوسرے گروہ کے ساتھ
اختلاف کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ایک زبان کے بولنے والے ایک ہی دین کے مختلف مذہبی
فرقوں کی لفظیات کا امتیازی فرق بھی اپنی طرف توجہ کو مبذول کئے بغیر نہیں رہتا، ایک سنی شیعہ یا اہلِ
حق کی گفتگو بھی بادہ و ساغر کے بغیر نہیں کہتا جب کہ ایک دیندار مسلمان، نقلِ کفر کفر نباشد کی رخصت کے
باوجود کوئی گندی بات بھی کہتا ہے تو استعارے کی زبان استعمال کر کے اشارے کنایے میں کہتا ہے، کہ ادب کا
یہ پہلا قرینہ اور ادبی زبان کا ایک بنیادی تقاضا ہے، میرا دائرۂ کار چونکہ بحیثیت مجموعی پوری اردو زبان
ہے، اس لئے اس قسم کے جزئی اختلافات کو زیر بحث لا کر اعتراض کرنا درست نہ ہوگا۔

موضوع کی مناسبت سے اگرچہ میرا دائرۂ کار اردو میں قرآنی الفاظ کے استعمال کا فقط جائزہ لینا ہے،

مگر اس کے لئے صرف اتنا کافی نہیں کہ اردو اور قرآن کے ایسے مشترک الفاظ کی ایک فہرست پیش کر دی جائے جو قرآن میں بھی آئے ہیں اور اردو تحریر و تقریر میں بھی استعمال ہوتے ہیں، ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس کے اسباب اصل کیا ہیں، اور تاریخی اعتبار سے تاثیر و تاثر کے اس عمل کی نوعیت کیا ہے کہ اردو دنیا کی کسی زبان میں قرآن کے کچھ خاص یا عام الفاظ پائے جاتے ہیں جو محض اتفاقی نہیں ہیں اور جنہیں ہم اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

قرآن کی انقلاب آفرینی کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے، مدت ہوئی کہ یہ انقلاب گذر چکا ہے اور اس وقت ہمیں اس کے باقیات میں سے صرف برصغیر پاک و ہند کی ایک زبان اردو پر اس کے چھوڑے ہوئے اثرات کا ایک جائزہ پیش کرنا ہے جس طرح سیلاب آتا ہے تو جہاں اپنے ساتھ خس و خاشاک کو بہا کرلے جاتا ہے وہاں اپنی گذرگاہ کو زرخیزی اور شادابی کی دولت سے مالا مال بھی کر جاتا ہے۔ قرآن کی انقلابی تحریک کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے معانی اور مطالب ہی کے نہیں، الفاظ اور اسالیب کے جواہر پارے بھی دنیا کو عطا کئے، کسی زبان میں الفاظ کی درآمد و برآمد کا عمل موقوف ہوتا ہے اس کے بولنے والوں کی متشکر اضطراب و جمود وغیرہ کے ارتقا اور تغیر و تبدل پر اس قاعدہ کلیہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں ماضی سے مثالیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، ہم اپنے حال سے اس کے شواہد حاصل کر سکتے ہیں، روئے زمین کے جس جس حصے پر قرآن کی انقلابی تحریک کی علمداری قائم ہوئی وہاں وہاں اس کی زبان کے اثرات کا پہنچنا لازمی تھا، عربی کو لغت القرآن کہتے ہیں کہ وہ اسی زبان میں نازل ہوا۔ لیکن قرآن نے عربی کو من و عن قبول کرنے کی بجائے اپنے تحریکی تقاضوں کے مطابق اس کے طریق اظہار اور اسلوب بیان میں ہی نہیں، ذخیرۂ الفاظ میں بھی بہت سے تصرفات کئے، یہ فرق نزول قرآن سے پہلے کی عربی اور نزول قرآن کے بعد کی عربی کے تقابلی مطالعہ سے بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے، اس کی وجہ وہ افکار و عقائد اور زندگی کی وہ قدریں ہیں جن سے قرآن نے روشناس کرایا اور جو اس کی انقلابی تحریک کے اجزائے ترکیبی اور لازمی حصے تھے۔ اردو جو اس وقت ہماری بحث کا موضوع ہے اسے عربی کی طرح لغت القرآن

[illegible] حاصل نہیں، لیکن اگر میں یہ کہوں کہ عربی کے بعد قرآنی تحریک کی سب سے بڑی علمبردار [illegible]
رہی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے وسیع دینی لٹریچر اور لسانی سرمایہ میں قرآنی الفاظ کے تناسب کو دیکھتے ہوئے
میرے اس دعوے میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے، اردو میں قرآنی الفاظ کے تناسب کا عالم یہ ہے کہ آپ [illegible]
صفحات کی اس کتاب میں سے کہیں سے ایک ٹکڑا لے لیجئے اور اندازہ لگائیے کہ کتنے فیصد الفاظ بعینہ اردو میں
موجود ہیں اور کتنے فیصد قدرے تغیر کے ساتھ موجود ہیں اور کتنے فیصد وہ الفاظ نکلتے ہیں جو اردو میں موجود
نہیں ہیں، ایک اندازے کے مطابق اردو میں عربی الفاظ کا تناسب ۲۳ فیصدی ہے جب کہ قرآنی الفاظ کا تناسب
۵۷ فیصدی ہے یعنی قرآن میں کل جتنے الفاظ آئے ہیں ان میں سے ۵۷ فیصدی الفاظ بعینہ یا ادنیٰ تغیر سے
میں مستعمل ہیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، سورۂ فاتحہ کو سامنے رکھ لیجئے اور خود پرکھ کر دیکھ لیجئے، الحمد للہ مرکب
صورت میں بھی ہم بولتے اور لکھتے ہیں اور حمد اور اللہ تو الگ بھی، رب، عالم، رحمٰن، رحیم، مالک، یوم
دین یہ بعینہ اردو کے الفاظ ہیں، نعبد کی اصل عبد اور عبادت، اسی طرح نستعین کے مصدر استعانت اور
اسی اصل کے دوسرے الفاظ اعانت معین، تعاون اور معاونت وغیرہ اردو کے عام الفاظ ہیں، اہدنا کے
مادے سے ہدیٰ، ہدایت، ہادی، ہدی سے اہل اردو نا آشنا نہیں، صراط مستقیم سے کون ناواقف ہے، نعمت
کی اصل سے انعام منعم نعمت وغیرہ اردو کے معروف الفاظ ہیں، غیر، مغضوب اور ضال بھی ہمارے لئے اجنبی
نہیں، یہ تو وہ الفاظ ہیں جو اردو کے ذخیرہ الفاظ کا حصہ ہیں، اب ان کے مقابل اس سورہ کے باقی ماندہ
الفاظ دیکھئے جو ایک اردو داں شخص اپنی اردو دانی کی وجہ سے نہیں جان سکتا، ایاک، ضمیر منصوب
الذین اسم موصول، علیہم مرکب جار مجرور اور لائے نافیہ وہ الفاظ ہیں جنہیں ہم اردو کے الفاظ میں محسوب نہیں
کرسکتے، اس سورہ کے ۲۵ الفاظ ہیں سے ۲۰ ایسے ہیں جنہیں کلاً یا جزاً ایک اردو داں شخص جانتا ہے، صرف
پانچ الفاظ ایسے ہیں جنہیں ہم اس فہرست سے خارج کرسکتے ہیں، لیکن مرکب فقروں کی صورت میں ان سے
بھی کہیں نہ کہیں اردو میں ملاقات ہو ہی جاتی ہے، جیسے علیٰ حرف جر بمعنی پر، علی الترتیب علیٰ ہذا القیاس [illegible]

میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ثانی الذکر میں موجود ہے مثلاً حاصل، اور لاریب وغیرہ میں موجود ہے۔ اس سورہ
میں اردو کے ماخذ الفاظ کا تناسب ۵۰ فیصدی بنتا ہے، قرآن کے بعض مقامات ایسے بھی ہوں گے جہاں
یہ تناسب بہت ہی کم ہوگا۔ اس لئے جن اہل الرائے نے بحیثیت مجموعی ۵۰ فیصدی کا تناسب نکالا ہے،
ان کی رائے کو درست تسلیم کر لینا چاہئے، ہمیں ایسی اردو کے نمونے بھی مل سکتے ہیں، جن میں قرآن کا
ایک لفظ قسم کھانے کو بھی نہیں نکالا جا سکتا، لیکن ایسی مثالیں شاذ کے حکم میں آتی ہیں، اور آپ کو معلوم
ہے کہ الشاذ کالمعدوم۔ میری گفتگو اردو بولنے یا لکھنے والے کسی خاص فرد یا گروہ کو سامنے رکھ کر
نہیں ہے، بلکہ بحیثیت مجموعی پوری اردو زبان ہے۔

قرآن کے جو الفاظ اردو میں مستعمل ہیں، ان کی فہرست اتنی طویل ہے کہ کسی مقالے یا مضمون میں ان کا
احاطہ ممکن نہیں، اور بات حوالوں اور مثالوں کے ساتھ کی جائے تو نمونے کے چند الفاظ پر ہی اکتفا کرنا ہوگا
ان الفاظ کی مختلف جہات سے تقسیم اور درجہ بندی بھی کی جا سکتی ہے مگر اس کے لئے تنگنائے مقالہ کی بجائے
کتاب کی وسعت درکار ہوگی۔ تقریر یا تحریر کی زبان میں بالعموم جو فرق ہوتا ہے اس کا اثر قرآن کے ان الفاظ
میں بھی نظر آئے گا۔ کچھ الفاظ صرف بول چال میں استعمال ہوتے ہیں تو کچھ صرف لکھنے پڑھنے کی زبان میں نظر
آتے ہیں، کچھ تحریر و تقریر دونوں میں یکساں جگہ پاتے ہیں، کچھ صرف دینی بحثوں میں آتے ہیں تو کچھ صرف
علمی ادبی بحثوں میں بار پاتے ہیں۔ صوری اعتبار سے ان الفاظ میں کسی تغیر کی نشاندہی مشکل ہے البتہ معنوی
اعتبار سے انھیں چند خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک قسم ان الفاظ کی ہے جو بالکل انہی معنوں میں اردو میں
بھی مستعمل ہیں جن معنوں میں انھیں قرآن نے استعمال کیا ہے، دوسری قسم میں وہ الفاظ آتے ہیں جو اردو میں
قرآن کے معنی سے ہٹ کر مختلف معنی میں استعمال ہوتے ہیں، کچھ الفاظ ایسے ہیں کہ قرآن میں ان کے معنی میں
وسعت اور تنوع ہے جب کہ اردو میں نہیں ہے، اسی طرح اس کے برعکس صورت بھی ہو سکتی ہے، لیکن یہ بحثیں
طویل ہیں اور اس میں پڑنا باعثِ طوالت ہے، اس لئے اس سے صرفِ نظر ہی اولیٰ ہے۔

ردو میں ... قرآنی الفاظ کی فہرست یا ان کے اعداد و شمار پیش کرنے کا یہ محل نہیں، مثال کے
بطور حروف تہجی کی ترتیب سے کچھ ایسے الفاظ درج کرتا ہوں جو قرآن کے الفاظ ہیں اور اہل اردو
... اور بولتے ہیں:

...ار | واحد جمع دونوں صورتوں میں یہ لفظ قرآن مجید میں ایک نہیں متعدد جگہ وارد ہوا ہے، اور اردو میں
...سے استعمال ہوتا ہے، ملاحظہ ہو سورہ طٰہٰ کی آیت ۹۶، سورہ فتح کی آیت ۲۹، سورہ روم کی آیت
...رہ مؤمن کی آیات ۲۱ اور ۸۲، قرآن مجید میں اس کا معنی محدود اور محل استعمال خاص ہے جب کہ
...اس کے معانی میں بڑا تنوع اور وسعت ہے، اور محل استعمال میں گوناگونی ہے۔

...| اثم اور آثم بمعنی گناہ اور گنہ گار قرآن ہی کی دین ہے، لیکن اس کا استعمال اردو میں بہت محدود ہے،
...ساتھ ساتھ آثم بعض لوگ لکھتے ہیں، سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۳ میں ہے، فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (سو اس کا
...سے آلودہ ہے) یہ لفظ اس کے علاوہ بھی کئی جگہ آیا ہے۔

...رت | آخر اور آخرت کے الفاظ اردو میں کثرت سے مستعمل ہیں، یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں اس کثرت
...ہیں کہ اگر ان کا احاطہ کیا جائے تو ایک رسالہ تیار ہو جائے، صرف سورتوں کے نام اور آیتوں کے نمبر درج
...لیے بھی کئی صفحے درکار ہوں گے۔

...آدم جس کے دم سے ہم آدمی ہیں اور دنیا میں آدمیت قائم ہے، قرآن کا خاص لفظ ہے اور ہماری اردو
...یہ قرآن ہی کی رہین منت ہے، قرآن اور اردو دونوں میں اس لفظ نے لفظی ہی نہیں معنوی اور فکری اعتبا
...نقلابی کردار ادا کیا ہے، اور دونوں میں اتنی کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ حوالہ اور مثال کی ضرورت نہیں۔

...اق | افق اور اس کی جمع آفاق دونوں قرآن میں آئے ہیں، اور دونوں اردو کی زینت ہیں۔ غالب
...رہے

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت　　　اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

سودا لکھتے ہیں :

ٹکڑے ہوئے جگر کے آسودہ پہلے کو   خوناب دل سے دستا قاقبہ گیا تھا

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ سورہ حٰم السجدہ کی مشہور آیت ہے۔

ابد | ابد جس کی ضد ازل ہے، اردو کا لفظ ہے اور قرآن سے ماخوذ ہے اور بیسیوں جگہ آیا ہے۔

ابلیس | ابلیس اور اسی طرح شیطان کا لفظ اور مفہوم بھی ہمیں قرآن ہی نے سمجھایا ہے۔

اتباع | اتباع بمعنی پیروی کرنا بھی قرآن کا لفظ ہے، سورہ بقرہ (۱۷۸) اور سورہ نساء (۱۵۶) میں بالکل اسی طرح مصدری حالت میں آیا ہے، باقی اس کے مادہ کے مشتقات اور صیغوں کا شمار نہیں۔

اجر | اجر بمعنی بدلہ، قرآن اور اردو میں اس قدر عام ہے کہ کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔

اجل | اجل بھی قرآن اور اردو کا معروف مشترک لفظ ہے۔

اللہ - الٰہ | اللہ اور الٰہ تو خالصۃً قرآن کی دین ہے

باطل، باطن، باقی، باقیات اور بقیہ، بر، بحر، برارت، برج کی جمع بروج، برق، برکات وغیرہ ان سب کی شہادتیں قرآن میں موجود ہیں اور یہ سب اردو کے الفاظ ہیں۔

تابوت | تابوت اردو زبان اور مسلم معاشرت کا ایک عام معروف لفظ ہے، اردو میں جنازے یا اس صندوق کے لئے بولا جاتا ہے جس میں میت رکھی جاتی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لفظ اردو نے قرآن سے نہیں لیا ہے قرآن میں یہ لفظ دو جگہ تقریباً انہی معنوں میں آیا ہے، ایک جگہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۸ میں طالوت کے قصے میں اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ الیٰ آخرہ اس کی حکومت کی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا، اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے طمانیت کا سامان ہوگا۔ اس کے بعد سورہ طٰہٰ کی آیت ۳۹ میں حضرت موسیٰؑ کے دریا میں ڈالے جانے کے واقعہ میں آتا ہے،

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ الآیۃ کہ ان کو اس صندوق میں اور صندوق کو دریا میں ڈال دو گیا ہے۔

اردو میں اس کا استعمال اتنا عام ہے کہ مثال کی ضرورت نہیں، تعمیر و تکمیل کی طرح ہی اس کا
چلن اگر ہے جیسے تابوت لفظ جنازہ اٹھنا، دونوں کے معنی ایک ہیں، ہندو اردو میں اس کے لیے ارتھی
اور ارتھی اٹھنا بولتے ہیں، اس موقع پر ہندو کبھی تابوت کا لفظ نہیں استعمال کرے گا جب کہ مسلمان کبھی
ارتھی کا لفظ استعمال نہیں کرے گا،

تاخیر | تاخیر اردو کا ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے، عربی قواعد کی رو سے باب تفعیل کا مصدر ہے، یہ لفظ
حالت مصدر میں کہیں نہیں آیا ہے مگر فعل کی صورت میں ایک نہیں متعدد جگہ استعمال ہوا ہے

تارک | تارک بمعنی چھوڑنے والا اردو میں تارک الدنیا اور تارک الصلاۃ بولتے ہیں۔ سورۂ ہود کی آیت
۱۲ میں ہے فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ.

تاسیس | تاسیس بمعنی اساس رکھنا، بنیاد ڈالنا، قرآن میں بحالت مصدر تو نہیں ہے لیکن بصورت فعل
متعدد جگہ آیا ہے۔

تالیف | تالیف بصورت فعل ماضی و مضارع قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اور اکثر قلب کے ساتھ آیا ہے، جیسے
فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ۔ اردو میں تالیف قلب کی ترکیب استعمال ہوتی ہے جو ظاہر ہے قرآن ہی سے ماخوذ
ہے، غالب نے اس لفظ کو ایک جگہ یوں استعمال کیا ہے

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

تالیف و تصنیف کے علاوہ مؤلف اور مؤلفۂ فلاں میں بھی یہ لفظ جلوہ گر نظر آتا ہے۔

ت سے شروع ہونے والے بے شمار ایسے الفاظ ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں
جیسے تاویل، تائید، تبدیل، تبسم، تبلیغ، تجسس، تجہیز، تحت، تحریر، تحریض، تحریف، تحریم، تحصیل، تحویل، تحریر
تخفیف، تخییل، تدبر، تدبیر، تذکرہ، تراضی، ترتیل، تردید، تزئین، تسبیح، تسلیم، تسمیہ، تسنیم، تسویہ، تشبیہ،
تصدیق، تصویر، تضییع، تطہیر، تعارف، تعاون، تعذیب، تعلیم، تعلم، تغیر، تغییر، تفریط، تفریق، تفصیل، تفضیل

تقدم تقدیم تقرب تقریب

یہ اور اس قسم کے بے شمار الفاظ باب تفعیل اور تفعل کے مصدر یا فعل کی صورت میں بکثرت قرآن میں آئے ہیں

اسی سے اردو میں رائج ہیں۔

شراب طہور: جنت کے مشروب کے لئے شراب طہور کی اصطلاح بلا شرکت غیرے قرآن کی اختراع ہے۔ اس کا ذکر سورۂ دہر کی آیت ۲۱ میں آتا ہے: وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا، ایک جگہ مَاءً طَهُورًا بھی آیا ہے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ادبی ذوق رکھنے والے اسے اپنی گفتگوؤں میں استعمال کرتے ہیں۔ غالب نے اسے اور انداز سے برتا ہے جس میں شوخی بھی ہے اور واعظ سے چھیڑ بھی۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو ۔۔۔ کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

اردو میں لفظ شراب نشہ آور مشروب کے لئے بولا جاتا ہے جو شرعاً حرام ہے، لیکن قرآن میں یہ محض پینے کی چیز کے لئے آیا ہے۔ اردو کی شراب کے لئے قرآن میں خمر کا لفظ آتا ہے۔

سراب: سراب اردو کا ایک علم لفظ ہے۔ صحرا میں پانی کا دھوکا یا مطلقاً دھوکا کو کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ دو جگہ آیا ہے، سورہ نور کی آیت ۳۹ میں ہے: أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے صحرا میں سراب جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔ سورۂ نبأ کی آیت ۲۰ میں ہے وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا پہاڑ چلا دیئے جائیں گے پس ریزہ ریزہ ہو کر ریت بن جائیں گے۔ اردو میں منیر کا شعر ہے:

دھوکا ہے سارے خشک و تر روزگار میں ۔۔۔ دریا اگر حباب ہے صحرا سراب ہے

غالب کہتے ہیں:۔

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال ۔۔۔ ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

کفر۔ ایمان: غالب کا ایک مشہور شعر ہے جس میں کفر ایمان اور کعبہ قرآن کے یہ تینوں لفظ یکجا نظم ہوئے ہیں

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ۔ کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

مائدہ | مائدہ بمعنی دستر خوان، قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ قرآن کی ایک سورہ کا نام ہی مائدہ ہے۔ اردو بول چال یا عام تحریروں میں استعمال نہیں ہوتا۔ البتہ غالب نے اسے ایک آدھ جگہ استعمال کیا ہے:

دلِ حسرت زدہ تھا، مائدۂ لذّتِ درد ۔ کام یاروں کا بقدرِ لب و دندان نکلا

لیکن یہ ایسی اردو ہے جو غالب ہی کے یہاں ملتی ہے، اور جسے بمشکل ہی اردو کہہ سکتے ہیں۔

تقویٰ | تقویٰ قرآن کی خاص اصطلاح ہے، غالب کے ایک شعر میں اس کا استعمال ملاحظہ ہو:

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی ۔ گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

اب سلسلۂ گفتگو کو ختم کرنا چاہیے، مقصد استقصاء یا احاطہ نہیں، بلکہ چند مثالوں سے یہ واضح کرنا ہے کہ اردو میں قرآن کے الفاظ کس طرح در آئے ہیں، یہ اثر کتنا وسیع اور یہ سلسلہ کتنا طویل ہے۔

(مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شاہکار کتاب)

ارض القرآن حصۂ اوّل

قرآن مجید کی تاریخی آیات کی تفسیر سرزمین قرآن، عرب کا جغرافیہ اور قرآن میں جن عرب اقوام یعنی ثمود و عاد و قوم لوط و قوم نوح و قبائل و شعوب کی سرگذشت اور ان کے ہر قسم کے حالات کا ذکر ہے، ان کی تاریخی اور اثری تحقیق

قیمت:- ۱۵ روپے

ارض القرآن حصۂ دوم

اس میں بنو ابراہیم کی تاریخ اور عربوں کی قبل از اسلام تجارت، زبان اور مذہب پر حسب بیان قرآن مجید و تطبیق آثار و تاریخ یونان و روم و کتب آسمانی توریت و انجیل تحقیقات و مباحث ہیں۔

قیمت:- ۱۱ روپے

کتاب سازی، وراقت

از

جناب محمد عبدالحلیم چشتی صاحب، کانو، نائجیریا

اسلامی قلمرو میں ہر نوع کے کتب خانوں کی کثرت حکم اقرار کے نور کا فیضان و عوامل و محرکات کتب خانہ اور عباسی خلفاء کی عالمگیر تحریک کتب خانہ کا اثر تھا، اس سے ہر طرف علم کی روشنی پھیلتی رہی، ہر شہر و بستی میں علمی و تحقیقاتی سرگرمیاں پروان چڑھتی رہیں، ہر موضوع پر نت نئی کتابیں بازار میں آتی اور کتب خانوں میں پہنچتی تھیں، کتب و کتب خانہ ہر پڑھے لکھے کا ایسا ہردلعزیز مشغلہ بن گیا تھا کہ اس کے بنانے رکھنے اور دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچانے کے لئے وہ اپنی عمر عزیز کا معتدبہ حصہ کتابوں کی نقل، تصحیح و مقابلہ میں صرف کرتا، پھر اسے کتب خانوں میں وقف کرتا تھا، ان کتب خانوں کی طلب و رسد جن ذرائع سے پوری ہوتی، اور کتاب جن منازل سے گزر کر کتب خانوں میں پہنچنے کے لائق ہوتی تھی، اس مقالہ میں اس کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی، اسی لئے اس کا عنوان کتاب سازی، وراقت رکھا گیا، پہلے کاغذ سازی، اس کے اقسام، صنعت کاغذ سازی کے مراکز، کاغذکی مقامی نسبتوں سے شہرت، بہترین کاغذ کی پہچان، سامان کتابت، قلم، دوات، سیاہی، نقل و ضبط کا اہتمام، کتابت و خوشنویسی، اقسام خط، تحریر و کتب شناسی، شعبہ و مدرسۂ خوشنویسی کا قیام، کتابوں میں اعراب کا اہتمام، مقابلہ کتابت تخریج والحاق نقص، عبارت قلم زد کرنا، مٹانا، قواعد صحت کتاب و احتیاطی پہلو، تصحیح میں احتیاط و اصطلاحات، کاتبوں کا ضابطۂ اخلاق، ناقل و کاتب کی شرطوں سے بحث کی گئی ہے، آئندہ کسی شمارے میں صنعت وراقت، سوق الوراقین کی نوعیت، کثرت، مراکز، ان کی علمی و ثقافتی حیثیت، تجارت کتب، کتب فروشوں کی خصوصیات فروغ تجارت کتب کے عوامل، معیاری و مستند ناشرین، گراں و ارزاں قیمت، انتخاب کتب کے اصول و مبادی اور تبصرۂ کتب پر روشنی ڈالیں گے، اس لئے کہ عہد عباسی میں کتابوں کا ان تمام پہلوؤں سے

جائزہ لیا جاتا تھا۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد کتاب کتب خانہ میں جگہ پاتی اور اہل علم کے استفادہ کے لئے
بھی جاتی تھی، اس سے عہد عباسی کے اس علمی و ثقافتی ورثہ کی قدر و قیمت اور استنادی حیثیت کی وضاحت
ہوتی ہے جو کتب خانوں میں طلبہ، اساتذہ، محققین و شائقین کتب کے استفادہ کے لئے رکھا جاتا تھا۔ عہد عباسی
کی یہ وہی تحقیقات اور جدتیں تھیں جنھیں یورپ کی ترقی اور موجودہ تحقیقات کی اساس بننے کا فخر حاصل ہے۔

کاغذ | روئی سے کاغذ کی ایجاد اور اس کی صنعت کے اولین خد و خال سے بحث ہمارے مقالہ کا موضوع نہیں
ہے، اس لئے ہم عہد عباسی میں مواد کتب سے روشناس کرانے کے لئے اس کا سرسری جائزہ پیش کرنے پر اکتفا
کرتے ہیں، کاغذ کی صنعت نے سلطنتوں کو چاندی اور سونے کے سکوں کے بوجھ سے ہلکا کرنے کے لئے زر کاغذی
مہیا کیا، اور علمی و ادبی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا۔ یہ کہنا بجا ہے کہ کاغذ ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس نے قدیم
و جدید علمی سرمایہ کو منتقل کرنے، محفوظ رکھنے، اسے آئندہ نسلوں تک پہنچانے، پروان چڑھانے میں ناقابل فراموش
کردار ادا کیا ہے، مسلمانوں نے جب اس صنعت سے دنیا کو روشناس کرایا، علمی و ثقافتی ورثہ اسی کاغذ پر منتقل
ہوتا رہا، اور ہوتا رہے گا۔ پیپائرس کا آج تاریخوں میں نام ضرور روشن ہے لیکن ہماری لائبریریاں اس سے
خالی ہیں، بابل و نینوا کی کھدائی سے جو الواح دریافت ہوئی ہیں، وہ اگر کاغذ کے ساتھ منتقل ہوتی رہتیں تو بھی
یہ نئی دریافت بنی نوع انسان کے لئے ناگزیر تھی، اس اعتبار سے کاغذ ہی وہ مواد کتابت ہے جس نے ناپائیداری
کے باوجود اپنی ارزانی، فراوانی کے سبب ہر نوع کے قدیم و جدید علمی سرمائے کو ہم تک بآسانی منتقل کیا، تحریک
احیائے علوم و فنون و تحریک کتب خانہ سازی کو حیات جاوید عطا کی اور گھر گھر کتب خانہ قائم کیا۔

عہد قدیم سے جن متمدن اقوام میں نوشت و خواند کا آغاز ہوا اور تحریرات چھوڑا جاتا تھا ان میں مصری
رومی، فارسی، ہندی، چینی، یونانی، عرب سب ہی شامل تھے، انھوں نے جو مواد لکھنے کے لئے انتخاب کیا تھا
اس کا تذکرہ ابن الندیم نے الفہرست میں کیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدیم اقوام لکھنے
کے لئے مٹی، پتھر، لکڑی، تانبا، درخت کے پتے، چھال، گھاس، چمڑا، ہڈی، کپڑا اور اوراق بردی (Papyrus)

اور چین کاغذ سے بھی کچھ استعمال کیا تھا، چنانچہ اشور بانی پال کا پورا کتب خانہ گلی تختیوں (Clay Tablets) پر مشتمل تھا[۱]. یونانی چمڑے[۲] پر، رومی سفید ریشم، نرم کھال اور اوراق بردی پر، جنگلی گدھے کے چمڑے پر، اہل فارس بھینس، گائے اور بکری کی کھال پر، عرب اونٹ کے شانہ کی ہڈی، سنگ سفید کے ٹکڑوں، کھجور کی چوڑی چکنی ٹہنیوں[۳] اور چمڑے پر بھی لکھتے تھے[۴]، چینی گھاس سے تیار کردہ کاغذ پر لکھتے تھے[۵]، اہل ہند تانبے، پتھر اور سفید ریشم پر لکھا کرتے تھے[۶]، فوری ضرورت کے لئے لوگ لکڑی اور درخت کی چھال کو تحریر کے لئے استعمال کرتے اور تحریر کو تادیر رکھنے کے لئے توز کے پتوں پر لکھتے تھے[۷].

مذکورہ بالا اشیاء میں کچھ اپنی ناپائیداری، ناہمواری، کمیابی، سختی، گرانی نقل و حمل کی دقت، ذخیرے کے لئے زیادہ جگہ کی احتیاج و غیر معمولی محنت کے بعد کارآمد بننے کی وجہ سے زیادہ استعمال میں نہیں آسکی تھیں اس لئے ان متمدن اقوام میں نوشت و خواند کا سلسلہ ہمیشہ نہایت مختصر و محدود طبقہ میں دائر و سائر تھا، اور کتب خانوں کی تعداد دہائیوں سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی، اہل مصر لکھنے کے لئے پیاپرس (Papyrus) جو گھاس سے تیار کیا جاتا تھا، استعمال کرتے تھے[۸]، عربی میں قرطاس اور اوراق بردی سے بھی معروف ہے۔

قرطاس (مفرد) بکسر قاف بمعنی پیاپرس بردی اور قراطیس (جمع) بفتح قاف قرآن میں آیا ہے (الانعام

---

[۱] دی انسائیکلوپیڈیا امریکنا، ۱۹۸۰ء ایڈیشن جلد ۲ ص ۲۵۸ [۲] کتاب البیرونی فی تحقیق ما للهند من مقولة فی العقل او مرذولة، حیدرآباد الدکن، مطبعة دائرة المعارف العثمانیة، ۱۳۷۷ھ، ص ۱۳۳، [۳] الفہرست لابن الندیم ص ۳۱، صبح الاعشیٰ للقلقشندی، ج ۲ ص ۴۸۸، [۴] کتاب البیرونی فی تحقیق ما للهند، ص ۱۳۳، [۵] الفہرست لابن الندیم ص ۳۱ کتاب البیرونی فی تحقیق ما للهند ص ۱۳۳، صبح الاعشیٰ للقلقشندی ج ۲ ص ۴۸۵-۴۸۶، [۶] کاغذ سازی اور اس کی صنعت ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، اعظم گڑھ، دارالمصنفین ۱۳۸۳ھ ص ۲۲۱-۲۲۲، کتاب الفہرست لابن الندیم، ص ۳۱ و ۳۳۲، [۷] کتاب البیرونی فی تحقیق ما للهند، ص ۱۳۳، [۸] الفہرست لابن الندیم ص ۳۱ -

* * * * * * * * * * * * * * * *

(۹۱۰ء) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل عرب قرطاس سے آشنا تھے یہ کارٹس (Chartes) کا معرب ہے پہلی اور دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کاغذ کی نشر و اشاعت سے قبل مسلمانوں میں قرطاس کا استعمال رہا اور کاغذ کے رواج پذیر ہونے کے بعد بھی قرطاس و قراطیس مصر کی نسبت کی صورت میں بلا شبہ اس کاغذ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن مصر کی نسبت کے بغیر بلا قرینہ ہمیشہ کاغذ کے معنی میں آیا ہے، چنانچہ بغداد کا محلہ درب القراطیس کاغذ سازی کی وجہ سے مشہور تھا[۱]، اسلامی قلمرو میں کاغذ و محلہ کاغذ سازاں دونوں کی اسی معنی و نسبت سے شہرت ہے، اور یہی وہ مقامات تھے جہاں کاغذ ساز رہتے اور کاغذ بنتا تھا، اسی لئے زمخشری نے مقدمۃ الادب[۲] میں اور میدانی نے السامی[۳] میں قرطاس کا ترجمہ لفظ کاغذ سے کیا ہے، کاغذ یا کاغذ جس کی جمع کواغذ[۴] اور کواغیذ[۵] آتی ہے، امام لغت صغانی لاہوری نے تصریح کی ہے کہ یہ لفظ عربی میں فارسی زبان سے آیا ہے[۶] لیکن دراصل یہ چینی زبان کا لفظ ہے، بقول لوفر (Laufer) یہ (Ku-Chih) اور قدیم چینی زبان میں (Kokoz-Kokoz) سے کاغذ بنا ہے، اور فراء کی رائے یہ ہے کہ ممکن ہے یہ لفظ ترکی ہو[۷]، یہ چونکہ چینی ترکستان کا علاقہ تھا اس لئے اسے ترکی الاصل کہنا بھی درست ہے، قراطیس اور کاغذ کی طرف نسبت کی وجہ عہد عباسی میں کاغذ سازی کی صنعت میں مہارت و کاغذ فروشی میں شہرت کی بنا پر اہل علم کو قراطیسی[۸] کاغذی[۹] اور وراق[۱۰] کی نسبتوں سے شہرت حاصل ہے، دمشق میں آج بھی ایک خانوادہ قراطیسی کی نسبت سے مشہور ہے

Dozy, Supplement anx Dictionnaires arobes leide et

OI-dement E.J.Brill Vol.2.P331

[۱] تاریخ بغداد للخطیب ج ۲ ص ۱۹، [۲] مقدمۃ الادب للزمخشری گردآوردہ محمد کاظم امام، تہران، چاپخانہ دانشگاہ ۱۳۴۲ ص ۲۹۵، [۳] السامی فی الاسامی للمیدانی تحقیق محمد موسیٰ ہنداوی، بیروت، محمد موسیٰ ہنداوی ۱۹۶۷ ص ۲۹، [۴] تکملۃ المعارف الثعالبی نقل کتاب البیرونی فی تحقیق ما للہند، ص ۱۳۳، [۵] لطائف المعارف الثعالبی ص ۲۱۸ (ل) ثمار القلوب فی المضاف والمنسوب تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم الابیاری، القاہرۃ، مطبعۃ المدنی، ۱۹۶۵ ص ۵۴۲، [۶] تاج العروس للمرتضی الزبیدی ج ۶ ص ۲۸۶، [۷] لغت نامہ دہخدا، شمارہ مسلسل ۱۰۷، شمارہ حرف کاف ۳ ص ۱۱۲، [۸] الانساب للسمعانی، ورق ۴۴۵، [۹] ایضاً، [۱۰] ایضاً ورق ۵۷۹ ب،

ہے، اس زمانہ میں کے افراد و کاغذ کی تجارت کرتے تھے[1] عہد عباسی میں کتب فروشی پر قرطاسیہ کی طرح کراریس کا لفظ بھی بولا جاتا تھا، لیکن جلد ہی لفظ "وراق" نے ان کی جگہ لے لی تھی، اس سے بعض اہل لغت کی رائے ہے کہ وراقت کا دائرہ تجارت کتب تک محدود نہیں تھا، بلکہ کتاب و سامان کتابت، ورق، کتابت نقل، کتابوں کی سلائی، جلد سازی ہر چیز پر اس کا اطلاق ہوتا تھا،[2]

دنیا میں سب سے پہلے ۱۰۵ عیسوی میں ایک چینی سائی لون[3] (زائی لون) (Tsai-Lun) نے نگاس سے کاغذ تیار کیا تھا[4]، ابن الندیم نے چینی کاغذ ابن ابی بعرہ کے خزانۃ الکتب میں دیکھا تھا[5]، مسلمانوں نے اس صنعت کو ان سے سیکھا اور کتان (السی) اور قطن (روئی) سے کاغذ تیار کیا[6]۔

کاغذ سازی کا آغاز دور اموی میں ہو چکا تھا[7]، اس امر کا اعتراف اس عصر کے نامور محقق کرد علی کو بھی ہے[8]، علامہ شہاب الدین ہارون بن بہاء الدین مرجانی المتوفی ۱۳۰۶ھ نے وفیات الاسلاف میں تصریح کی ہے کہ یوسف بن عمر مکی نے قتیبہ بن مسلم کی فتح سمرقند ۹۳ھ[9] کے بعد [illegible] کے حدود میں حجاز میں روئی سے کاغذ بنایا تھا[10]، اسی کاغذ کو ابن الندیم نے "ورق تہامی" کے نام سے ذکر کیا ہے، جو اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ ابن ابی بعرہ کے خزانۃ الکتب میں دیکھا تھا[11]، ہمارے علم میں نہیں کہ ابن الندیم کے علاوہ کسی مورخ نے تہامی کاغذ کا تذکرہ کیا ہو، اگر ابن الندیم نے ورق تہامی کو نہ دیکھا ہوتا تو علمی دنیا کو اس کا نام بھی معلوم نہ ہوتا۔

---

[1] الکتاب فی الاسلام، الفکر الاسلامی، شمارہ ۱۲، ۱۹۷۱ء/۱۲، [2] صبح الاعشی، ج ۲ ص ۴۸۸-۴۸۹، [3] کاغذ چینی، چینیوں کے تعلقات اور ان کے نتائج، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء ص ۳۶۲، [4] خطط الشام محمد کرد علی ج ۴

The Encyclopaedia Americana, 1968 ed, vol. 21, P. 256، ص ۲۴۳

Encyclopaedia of Library and Informations Science

New York Marcel Dikker, Inc., 1977 Vol. 2, P. 45. 46, 285

[5] الفہرست لابن الندیم، ص ۲۱، [6] ایضاً ص ۱۳۱، الورق والوراقۃ فی الحضارۃ الاسلامیۃ محمد طہ الحاجری مجلۃ المجمع العلمی العراقی شمارہ ۱۲ (۱۳۸۴ھ) ص ۱۳۵، [7] ایضاً، [8] خطط الشام ج ۴ ص ۲۴۳، [9] فتوح البلدان للبلاذری تحقیق عبد اللہ انیس الطباع، عمر انیس الطباع، بیروت، دار النشر للجامعیین ۱۳۷۷ھ ص ۴۹۲، [10] معجم البلدان یاقوت ج ۳ ص ۲۲۳

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف بن عمرو مکی کے کاغذسازی کا دائرہ محدود تھا اس سے آگے نہیں بڑھا، اس لئے اس کی جیسی شہرت چاہئے تھی نہ ہو سکی، اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاغذ سب سے پہلے حجاز کی سرزمین میں تیار کیا گیا ہو تو کچھ مستبعد نہیں۔ بلاد مغرب میں موسیٰ بن نصیر المتوفی ۹۷ھ نے قنب (سن) اور کتان سے کاغذ بنانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا[۱]، اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ برِ اعظم ایشیا اور یورپ میں مسلمانوں نے کاغذسازی کا سلسلہ شروع کیا تھا، ۱۳۴ھ میں جنگ اطلخ میں امیر زیاد بن صالح حارثی المقتول ۱۳۵ھ کچھ چینی کاغذسازوں کو اسیر بنا کر سمرقند لے آئے، چینی کاغذ گھاس سے بناتے تھے، مسلمانوں نے کاغذ قطن (Cotton) سے بنایا[۲]، جو قطنی کاغذ کہا جاتا تھا، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ پرانی رسیوں کے فرسودہ ٹکڑوں سے بنایا جاتا تھا[۳]، آدم متز کی تحقیق یہ ہے کہ برگ توت اور قناب ہندی سے بنایا جاتا تھا[۴]،

اہل سمرقند نے چینی کاغذساز اسیروں سے کاغذ بنانا سیکھا، پھر بلاد مشرقی میں اس صنعت کو بہت فروغ حاصل ہوا، اس لئے اس کا انتساب چینی کاغذسازوں کی اسیری کے واقعہ سے ہو کر رہ گیا[۵]، اور کاغذسازی کی صنعت کو عہد عباسی کی اولیات سے شمار کیا جانے لگا، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس واقعہ کے بعد کاغذ سازی کی صنعت کو بتدریج پورے اسلامی قلمرو میں کاشغر سے غرناطہ تک ترقی کرنے کی سہولتیں حاصل ہوتی رہیں، اس صنعت میں مسابقت کا جذبہ ابھرا، مشرق و مغرب کے کم و بیش ہر بڑے شہر میں کاغذسازوں کے کوچے محلے اور بازار آباد ہو گئے تھے، ۱۹۴ھ میں بغداد میں بازار الکتب کے قیام سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی

(بقیہ حاشیہ ص۱۹۵) نظام الحکومۃ النبویہ المسمی التراتیب الاداریہ والعمالات والصناعات والمتاجر والحالۃ العلمیۃ التی کانت علی عہد تاسیس المدنیۃ الاسلامیۃ فی المدینۃ المنورۃ العلیۃ لعبد الحی الکتانی، بیروت، احیاء التراث العربی ب ت، ج ۲ ص ۲۳۰، الفہرست لابن الندیم ص ۲۱[۱] التراتیب الاداریہ، ج ۲ ص ۲۴۲، [۲] بلاد فلسطین و شام انلی استرنج ترجمہ سید ہاشمی فریدآبادی، حیدرآباد دکن، مطبع سرکار عالی، ۱۳۵۴ھ، ص۱۲، خطط الشام ج ۴ ص ۲۴۳، [۳] بلاد فلسطین و شام ص۱۲، [۴] الحضارۃ الاسلامیہ لآدم متز، ج ۲ ص ۳۶۹، عنایت اللہ، کاغذ کا رواج، تاریخ کی روشنی میں، مجلہ جامعہ عباسیہ بہاولپور، شمارہ ۱، ۱۳۸۱ھ، ص۹۵، [۵] ثمار القلوب ص ۵۴۳ (لہ) لطائف المعارف ص ۲۱۸، کتاب البیرونی ص ۱۳۳، آثار البلاد و اخبار العباد زکریا بن محمد القزوینی، بیروت، دار صادر ۱۳۸۰ھ، ص ۵۳۶، الحضارۃ الاسلامیہ لآدم متز، ج ۲ ص ۲۶۹، لغت کبیر جلد ۱

شہروں میں اس صنعت کا نہایت تیزی سے رواج ہو چکا تھا[۹]

کاغذ کی تین نسبتوں سے شہرت | عہد عباسی میں کاغذ کو اسلامی قلمرو میں تین نسبتوں سے شہرت حاصل تھی۔

(۱) بلاد کی نسبت سے، جیسے ورق سمرقندی (۲) کاغذ کے کارخانہ سازوں کی نسبت سے، جیسے ورق طلحی

(۳) کاغذ سازوں کی نسبت سے، جیسے ورق منصوری۔

عہد عباسی میں جو ممالک و بلاد کاغذ کی صنعت کا مرکز رہے ہیں وہ حسب ذیل تھے:

(۱) ماوراء النہر، چنانچہ ابراہیم اصطخری کا بیان ہے کہ بلادِ اسلام میں نوشادر اور کاغذ میں ماوراء النہر کے کاغذ کا جواب نہیں[۱]، اس[۲] سے ثابت ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں کاغذ کی صنعت پورے اسلامی قلمرو میں پھیل گئی تھی (۲) خراسان[۳]، خراسانی کاغذ کی شہرت اندلس تک پہنچی ہوئی تھی[۴]، نیشاپور میں سکۃ الوراقین تھا[۵] (۳) بلخ بلخی کاغذ اندلس تک مشہور تھا[۶] (۴) عراق بغداد میں دوسری صدی ہجری کے ربع آخر میں فضل بن یحییٰ برمکی نے یہاں کاغذ سازی کا کارخانہ قائم کیا تھا[۷]، محلہ کرخ بغداد اور محلہ دار القز بغداد میں کاغذ تیار کیا جاتا تھا[۸]، سامرا میں خلیفہ معتصم نے مصری کاغذ سازوں کو آباد کیا تھا، انھوں نے کاغذ بنایا لیکن وہ پائیدار

(حاشیہ ص ۱۹۶) شمارہ حرف ک ص ۱۰۲، تحفۃ الالباب و نخبۃ الاعجاب ابوحامد الغرناطی پیرس نیشنل پریس ۱۹۲۵ء ص ۲۰۲، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ج ۱۲، ص ۱۳۷، [۱] ایضاً، [۲] رسالۃ الجدۃ الرجل الجاحظ تحقیق عبد السلام محمد ہارون، القاہرہ الخانجی ۱۳۸۴ھ ص ۲۵۳ و ۲۵۴، [۳] المسالک الممالک ابو اسحاق ابراہیم الاصطخری تحقیق محمد جابر عبد العالی الحسینی القاہرہ، وزارۃ الثقافۃ الارشاد القومی، ۱۳۸۱ھ، ص ۱۶۲، [۴] مسلمانوں کی صنعت و حرفت، زراعت، تجارت المترجمہ محمد جمیل الرحمٰن، الہ آباد پاکستان، ۱۹۴۳ء ص ۱۷، یہ قرآن کریم کی کتاب کا ترجمہ ہے [۵] تحفۃ الالباب الغرناطی ص ۱۰۳، [۶] تاریخ نیشاپور الحاکم النیشاپوری تلخیص احمد بن محمد المعروف بالخلیفۃ النیشاپوری، تہران کتابخانہ ابن سینا ۱۳۳۹ ف، [۷] تحفۃ الالباب ص ۲۰۲، [۸] المقدمہ لابن خلدون ص ۵۵۷، لغت نامہ دہخدا، شمارہ مسلسل ۱۰۳، شمارہ ک ۳۴ ص ۳۱۲، صبح الاعشیٰ ج ۲، ص ۴۷۵ - ۴۷۶۔

تھا[۱] تیسری صدی کے وقت بغداد میں کاغذ بہت اچھا بنتا اور نہایت سستا ملتا تھا چنانچہ محمد بن عبد الباقی ثم بغدادی المعروف بقاضی المارستان المتوفی ۵۳۵ھ کے پاس چند طلبہ حدیث لکھنے کے لئے آئے اور انہوں نے بوسیدہ کاغذ سامنے رکھے، وہ پرانے کاغذ پر لکھنے لگے، خفا ہوئے، یا بنی الکاغذ خیص ببغداد، فلو کتبتم فی کاغذ اجود من ھذہ[۲] بیٹے، بغداد میں کاغذ سستا ہے کاش تم اس سے بہتر کاغذ پر لکھتے، پانچویں صدی ہجری میں کاغذ کی صنعت بغداد میں بہت عروج پر تھی[۳]، واسط میں بھی درب القراطیس تھا[۴] (۵) شام۔ یہاں اچھا کاغذ بنتا اور مصر بھیجا جاتا تھا[۵]، شام کے حسب ذیل شہروں میں کاغذ بنایا جاتا تھا[۶]، دمشق[۷] طرابلس[۸] فلسطین[۹]، اور اس عہد عباسی میں لکھنے کے لئے چمڑا بھی استعمال میں آتا تھا لیکن چمڑے کی بہ نسبت کاغذ پر تحریری مواد زیادہ آتا ہے، یہ سستا اور بروقت بآسانی میسر، سبک، نقل و حمل میں آسان، ان وجوہ سے مسلم معاشرے میں اسے قبول عام حاصل ہوا اور چمڑے کا چلن جاتا رہا، کاغذ کی موجودگی میں اگر کوئی چمڑا استعمال کرتا، معاشرہ میں حیرت سے تعجب سے دیکھا جاتا۔ اس سے سوالات کئے جاتے، چنانچہ جاحظ سے بھی سوال کیا گیا، اس نے مناقبیہ انداز میں چمڑے کی خوبیوں اور خرابیوں کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے :-

---

[۹] اخبار الراضی باللہ والمتقی للہ للصولی، القاہرہ طبع ح بیروت، د ن، ۱۳۵۴ھ، ص ۲۶۰، [۱۰] معجم البلدان لیاقوت، ج ۲ ص ۲۲۴، مراصد الاطلاع علی الامکنۃ والبقاع لعبد المومن ابن عبد الحق البغدادی تحقیق علی محمد بجاوی، القاہرہ: عیسی البابی والحلبی ۱۳۷۳ھ، ج ۱ ص ۵۰۰، [۱۱] مسلمانوں کی صنعت، ص ۷۶، [۱۲] تاریخ بغداد للخطیب ج ۳ ص ۲۶، [۱۳] العامۃ ببغداد فی القرن الخامس الہجری، بحث تاریخی فی الحیاۃ الاجتماعیۃ لجماہیر تالیف محمد عبد اللطیف البدری، بغداد، مطبعۃ الارشاد، ۱۳۸۷ھ، ص ۲۵، [۱۴] مصطفی جواد المواد المستخرج من معجم الادباء ص ۲۲۲، [۱۵] خطط الشام لکرد علی، ج ۴ ص ۲۴۳، صبح الاعشی ج ۲ ص ۲۸۸، نزہۃ الانام فی محاسن الشام عبد اللہ بن محمد البدری الدمشقی، مصر المطبعۃ السلفیہ، ۱۳۴۱ھ ص ۲۶۴، [۱۶] بلاد فلسطین و شام ص ۲۰، الحضارۃ الاسلامیۃ لآدم متز، ج ۲ ص ۲۶۹، [۱۷] احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم للمقدسی لندن مطبعۃ بریل، ۱۹۰۶ء، [۱۸] الحضارۃ الاسلامیہ لآدم متز، ج ۲ ص ۲۶۹ و علی ساقی اختراع کاغذ" ہنر و مردم شمارہ ۱۱۵ (۱۳۵۱ ف) ص ۲۵ - ۲۶، [۱۹] خطط الشام، ج ۴ ص ۲۴۲،

تم کہتے ہو کہ تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم نے اپنی تمام کتابیں چینی و خراسانی کاغذ پر تیار نہیں کرائیں، تم پوچھتے
ہو کہ تم نے چمڑے پر کیوں لکھوایا، تم کیوں اس کی ترغیب دیتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ اس کا جسم خشک
ہو کر دکھتر ہو جاتا ہے) وزن ثقیل ہے، اگر پانی پہنچ جائے تو خراب ہو جائے، اور نمی کے دن ہوں تو ڈھیلا
ہو جائے، ڈھیلا بھی نہ ہو تو چمڑے والے فرولِ باباں کو پسند نہیں کرتے، وہ بارش سے خوش نہیں ہوتے
تمہیں معلوم ہے وراق ان ایام میں ایک سطر بھی نہیں لکھتا، یہ چمڑا گلتا ہے جب وہ تر ہو پھر بارش
بھی ہو جائے بھیگ بھی جائے، ڈھیلا ہو کر دراز ہو جائے، یہ جب خشک ہو جائے پھر کھنچ تان کے بعد اپنی
حالت پر لوٹتا ہے، زیادہ بدبودار، زیادہ گراں قیمت ہو جاتا ہے، وہ دھوکے کا زیادہ متحمل ہوتا ہے، اس لئے
کوفی کو واسطی اور واسطی کو بصری بنایا جا سکتا ہے، اسے پرانا کیا جا سکتا ہے تاکہ اس کی بو دور ہو جائے،
اس کے بال صاف ہو جائیں، اس میں گرہ زیادہ ہوتی ہیں، یہ زیادہ تر غبار آلود ہوتے ہیں اور بیشتر ناکارہ
سیاہی اس پر جلد پھیلتی ہے، اس میں تحریر کا زیادہ جلدی مٹ جانا زیادہ عام ہے، صاحب کتب خانہ یہ
چاہے کہ بقدر حاجت کتابیں سفر میں ساتھ رکھے تو اس کے لئے بار شتر بھی کافی نہیں، قطنی کاغذ کی کتابیں بار
شتر بھی سفر میں ساتھ لے جانا چاہے تو یہ بھی اسے کفایت کرتا ہے۔

تم نے مجھے بتایا ہے کہ یہ تغیر و تبدل کو زیادہ برداشت کرتی ہیں، زمانہ دراز تک عاریۃً لیتے دیتے اور
ہاتھوں میں گھومتے پھرتے رہنے سے ان میں کوئی فرق نہیں آتا، اس کی پھر بھی قیمت اٹھتی ہے اور پھٹا ہوا بھی
کام آتا ہے، اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، اسے پھر زندہ کیا جاتا ہے، وہ پھرنے کی نیابت کرتا ہے، قطنی کاغذ کی
بازار میں قیمت نہیں ہے (بہت سستا ہے) تم اگر بازار والوں کو وہ قیمتی چمڑا پیش کرو جس پر جال لگے
ہوں اور بیکار رباعیں بھی لکھی ہوں تو بھی زیادہ قیمت اٹھے گی اور لوگ خریداری میں جلدی کریں گے،

میں کہتا ہوں حساب کتاب چمڑوں پر لکھا جاتا ہے، دفتروں میں چمڑوں پر لکھی ہوئی تحریروں پر اعتماد کیا جاتا
ہے، عہد و پیمان، شرائط، بیع و شرا کے معاملات، زمینوں کی خرید و فروخت سے متعلق امور چمڑوں پر لکھے جاتے

ہیں، نقطے انہی پر بتائے جاتے ہیں، پھر دبیک کاغذ کو جلد کھا جاتی ہے[1]،

حماۃ، حلب منبج، طرابلس الشام یہاں کا کاغذ سمرقندی کاغذ کی طرح تھا[2] (۶) مصر یہاں کے کاغذ سازوں کی بھی شہرت تھی، اسی لیے معتصم نے یہاں کے کاغذ سازوں کو سامرا میں آباد کیا تھا[3]، فسطاط یہاں خط (بین) جزیرہ میں باب القنطرہ کے قریب مقریزی المتوفی ۸۴۵ھ کے زمانے تک کاغذ بنایا جاتا تھا[4]، قاہرہ حارہ بہاء الدین اور سویقہ امیر الجیوش کے درمیان خط خان وراقہ میں کاغذ تیار کیا جاتا تھا[5] (۷) ایران۔ خوتا میں جس کا تذکرہ کتابوں میں توج کے نام سے کیا جاتا ہے، کاغذ کا کارخانہ تھا[6] (۸) ہندوستان میں بھی کاغذ تیار کیا جاتا تھا، اس کاغذ کی صدائے بازگشت اندلس تک سنائی دیتی ہے، ابو حامد غرناطی نے ہندوستان کے ساختہ کاغذ کو بلخ و خراسان کے ہم پایہ کاغذ قرار دیا ہے[7]، ممکن ہے یہ کاغذ کشمیر، سیالکوٹ اور لاہور میں کسی جگہ بنتا ہو (۹) مغرب، اندلس، مشرق (ایشیا) سے کاغذ کی صنعت مسلمانوں کے ذریعہ مغرب میں پہنچی، چنانچہ قرطبہ میں بے نظیر، شاطبہ میں نہایت عمدہ اور صقلیہ (سسلی) میں بھی کاغذ بنایا جاتا تھا[8]، سولہویں صدی عیسوی میں یہاں سے کاغذ سازی کی صنعت یورپ کے مغربی ممالک میں پہنچی تھی[9]،

ابن الندیم نے چوتھی صدی ہجری تک اسلامی دنیا میں حسب ذیل چھ قسم کے کاغذوں کی نشاندہی کی ہے:

(۱) سلیمانی (۲) طلحی (۳) نوحی (۴) فرعونی (۵) جعفری (۶) طاہری[10]

---

[1] رسالۃ الجد والہزل للجاحظ تحقیق عبد السلام محمد ہارون، القاہرہ: مکتبۃ الخانجی، ۱۳۸۴ھ، ص ۲۵۲-۲۵۳ [2] خطط الشام از کرد علی ج ۴، ص ۲۴۲، [3] ایضاً ص ۲۴۲، [4] سفرنامہ ناصر خسرو تحقیق محمد دبیر سیاقی، تہران کتاب فروشی زوار، ۱۳۵۴ ف، ص ۱۸، مز ج ۲ ص ۲۶۹، [5] البلدان لاحمد بن واضح الیعقوبی ط ۳، النجف، المطبعۃ الحیدریہ، ۱۳۷۷ھ ص ۲۹، [6] الخطط المقریزیہ، ج ۱ ص ۲۰۷، [7] ایضاً ج ۲ ص ۲۳۲، [8] معجم البلدان یاقوت ج ۲ ص ۴۸۸، مراصد الاطلاع لابن عبد الحق ج ۱ ص ۲۰۴، [9] تحفۃ الالباب للغرناطی، ص ۲۰۲ [10] لغت نامہ دہخدا، شمارہ حرف ک، ۳، ص ۲۱۵، [11] معجم البلدان، ج ۲ ص ۹۰۴، الحضارۃ الاسلامیہ آدم متز ج ۲ ص ۳۴۹، [12] مسلمانوں کی صنعت و حرفت، ص ۴۳، [13] الحضارۃ الاسلامیہ ج ۱ ص ۲۲۷، لغت نامہ دہخدا شمارہ حرف ک ۳، ص ۲۱۵، [14] الفہرست لابن الندیم، ص ۳۲،

بہترین کاغذ کی پہچان | علامہ ثعالبی (۳۵۰ - ۴۲۹ھ) نے عہد عباسی میں اسلامی قلمرو میں کاغذوں میں سمرقندی کاغذ کو سب سے زیادہ بہتر، سب سے زیادہ نرم، سب سے زیادہ لطیف اور سب سے زیادہ پائیدار قرار دیا ہے[1]، موصوف نے جن خوبیوں کی بنا پر اس کو سب سے بہتر واعلیٰ معیار کا کاغذ قرار دیا ہے، اسی معیار پر نویں صدی ہجری میں ابوالعباس احمد القلقشندی المتوفی ۸۲۱ھ = ۱۴۱۸ء نے بغداد کے کاغذ کو سب سے بہتر اور فرنگی کاغذ کو سب سے بدتر قرار دیا[2]۔ بغداد کے بہترین کاغذ کی تصدیق گیارہویں صدی ہجری میں رضی الدین محمد بن حسن قزوینی المتوفی ۱۰۹۶ھ کے بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ کہتا ہے:

"ہم نے تمام شہروں کے کاغذ کا تجربہ کیا ہے مگر سب سے زیادہ عمدہ دیرپا مضبوط کاغذ بغداد، دمشق آمل اور سمرقند کا پایا جو لکھنے کے لائق ہیں، دوسرے شہروں کے کاغذ ناپائیدار ہیں، وہ ایک زمانے کے بعد ترخ جاتے ہیں[3]۔

روئی سے کاغذ کی ایجاد اور اس کی فروغ تجارت نے معاشی اعتبار سے مسلمانوں کو خوشحال بنا... ان کے علمی ورثے سے دوسروں کو بہرہ مند کیا، ذہنی تنویر بخشی، چنانچہ پاپائیت جس نے علم کو ایک مخصوص طبقہ تک محدود کر دیا تھا، اور عیسائی حکمرانوں کی رعایا اوہام پرستی و تعصب میں مبتلا تھی، مسلمانوں کی کاغذ تجارت نے توہم پرستی اور تعصب سے کسی حد تک دور رکھا، چنانچہ کاغذ جوں جوں پھیلتا گیا کتابیں وجود میں آتی گئیں، علم کی روشنی سے لوگوں کے دماغ روشن ہوتے رہے اور کاغذ کی ارزانی اور فراوانی کی وجہ سے طبقہ کے لوگوں کو کاغذ اور کتاب کی خریداری میں کوئی تامل نہیں رہا، ہر شخص آسانی سے کاغذ و کتاب خرید... پڑھتا اور علمی دولت سے مالامال ہوتا تھا، معاشرہ میں روز افزوں شرح خواندگی میں اضافہ کی وجہ سے جہل، تنگ نظری اور اوہام پرستی کا خاتمہ ہونے لگا تھا۔ ان حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ

---

[1] لطائف المعارف الثعالبی ص۲۱۸، [2] صبح الاعشیٰ للقلقشندی، ج ۲ ص۴۷۶، [3] رسالہ خط از رضی الدین محمد پرویز از کابل ہنر و مردم، شمارہ ۸۵ (اماں ماہ ۱۳۴۸ ف) ص ۵۱،

دنیا سے تعصب، توہم اور جہل کے پردوں کو چاک کرنے میں مسلمانوں کی کاغذسازی کی صنعت کا بڑا ہاتھ ہے، چنانچہ اس حقیقت کا اعتراف دان کریمر کو بھی ہے، وہ لکھتا ہے کہ یوں علم و فن کی عام اشاعت اور اس کی ترویج کا سہرا عربوں ہی کے سر ہے، علوم کی اشاعت برابر بڑھتی گئی اور عربوں کا لگایا ہوا پودا اس قدر بارآور ہوا کہ اس کی بدولت مذہبی تعصب، واہمہ پرستی اور بے جا تحکم کا بالکل خاتمہ ہو گیا، مختصر یہ ہے کہ اس وقت سے تمدن کا ایک نیا دور شروع ہوا۔[1]

بریفالٹ نے کاغذ کی ایجاد و ترویج کی دادِ تحقیق حسب ذیل الفاظ میں دی ہے،

"یہ قابل غور اور حیرت انگیز حقیقت ہے کہ یونان اور روما جنھوں نے دنیا کی ہیئت کا ملاً بدل کر رکھ دی اور تہذیب کی ایک نئی کائنات ایجاد کر دی، ایک بھی اہم علمی ایجاد یا صنعتی انکشاف نہ کر سکے . . . بابل و مصر کے اولین ایام سے لے کر کسی اہم اور نئے مادی انکشاف کا سراغ نہیں ملتا تا آنکہ عربوں نے یورپ میں کاغذسازی، بارود سازی اور ناخداؤں کے قطب نما کو رواج دیا، جس دانش و بصیرت نے فکر و ذہن کی ایک ایسی نئی دنیا پیدا کر دی جو مشرق کے مقابلے میں ایسی ہی تھی جیسے آدھی رات کے مقابلے میں دوپہر۔[2]

بریفالٹ ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے "عربوں نے یورپ میں اپنی تین ایسی ایجادیں رائج کیں جن میں سے ہر ایک نے دنیا میں عجیب انقلاب پیدا کر دیا، اول ناخداؤں کی قطب نما جس کی برکت سے یورپ دنیا کے کناروں تک پھیل گیا، دوم بارود جس نے زرہ بکتر پہننے والے نائٹوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا، سوم کاغذ جس سے اشاعت و طباعت کا رستہ صاف ہوا، کاغذ کے رواج نے جو انقلاب پیدا کیا وہ اہمیت میں طباعت کی ترویج سے کم نہ تھا۔[3]

---

[1] مسلمانوں کی صنعت از دان کریمر، ص ۴۴، [2] تشکیل انسانیت، بریفالٹ، ترجمہ عبدالمجید سالک، بار دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء ص ۲۳۰-۲۳۱،

[3] تشکیل انسانیت ص ۳۳۳، عربوں کا تمدن، [illegible]

اسلام نے تجارت و دستکاری پر زور دے کر ان کو بھی عبادت بنا دیا تھا، اس لئے مسلمان ہر نئی صنعت سیکھتے، اسے اپناتے، اس میں جدت پیدا کرتے اور خوب ترقی دیتے تھے۔ جوزف ہیل لکھتا ہے :

"اسلام نے دستکاری کے فوائد اور خوبیوں پر زور دے کر دستکاری اور تجارت کو ایک مذہبی شکل دے دی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں کہیں مسلمانوں کو کوئی نئی چیز ملتی تھی، وہ فوراً اسے اپناتے اور اس میں مزید وسعت و نشو و نما پیدا کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے جب سنا کہ اسلامی قلمرو کے کسی دور دراز حصے غالباً چین میں کاغذ تیار کیا جاتا ہے تو انھوں نے فوراً اس کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانے میں سمرقند کے اندر کاغذ سازی کا ایک کارخانہ جس میں غالباً چینی کام کرتے تھے قائم ہو گیا، انہیں ابھی کاغذ بناتے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ انھوں نے اس کے لئے چیتھڑوں اور کپڑوں کا تجربہ شروع کیا، ۷۹۴ء میں بغداد میں کاغذ سازی کا سب سے پہلا کارخانہ قائم ہوا اور حکومت کے دفاتر میں کاغذ کا استعمال شروع ہوا، رفتہ رفتہ تمام سلطنت میں کاغذ سازی کے کارخانے جاری ہو گئے، جہاں نت نئے قسم کا کاغذ تیار ہوتا تھا، ریشم کا کاغذ، روئی کا کاغذ موٹے اور باریک، صاف کھردرا، سفید اور رنگدار کاغذ بنانا شروع ہوا، بانس کے کاغذ اور چمڑے کا زمانہ ختم ہوا اور اب لکھنے کے لئے اس سے کہیں سستا سامان میسر آتا تھا، یہ علوم و فنون اور ادب کے فروغ کے لئے ایک اچھا شگون تھا"[۵]

مشرق و مغرب (ایشیا اور یورپ) میں علوم و فنون کے فروغ، کتابوں کی اشاعت اور کتب خانوں کے ترقی پذیر سلسلہ کے احیا کی خاطر اسلامی قلمرو میں کہیں بھی کاغذ کی صنعت و تجارت پر کسی قسم کا ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی نہیں لگائی گئی، اس سے کاغذ کی صنعت و تجارت کو ہر چھوٹے بڑے شہر میں فروغ حاصل ہوا اور علمی دنیا کو اس سے ترقی کرنے کا موقعہ ملا، چنانچہ وان کریمر لکھتا ہے "عہد عباسی میں کاغذ کی تجارت سے چونکہ کسی قسم کا ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی نہیں تھی، اس لئے بھی کاغذ کی تجارت کو بہت فروغ حاصل تھا"[۶]

---

[۵] عربوں کا تمدن، جوزف ہیل، ترجمہ نذیر نیازی، دہلی مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۷۷ء، ص ۲۱-۲۰۱، [۶] مسلمانوں کی صنعت و حرفت، ص ۶۳، ۶۵۔

وہ [illegible] دوسرے مقام پر لکھتا ہے "کاغذ سازی سے صنعت علوم وفنون کی اشاعت کو فروغ حاصل ہوا۔ اقتصادی صنعت کی وجہ سے مسلمانوں نے یورپ کے بازاروں میں اپنا سکہ بٹھایا، عربوں نے کاغذ سازی [51] کی صنعت کو جلد ہی ترقی دی، کافی سستا اور اچھا کاغذ بنا کر ایشیا کے بازاروں سے گزر کر یورپ کے بازاروں کو بھی یہ کاغذ مہیا کرنے لگے، اس لئے علم وفن کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا" [52]

مسلمانوں نے علم جیسی بیش بہا چیز کو بلا امتیاز عام کیا، بلا اجرت ومعاوضہ معاشرہ میں پھیلا کر عوام میں علمی بیداری پیدا کی اور ان کا کتابوں سے رشتہ استوار سے استوار تر کر دیا، مسلمان حکمرانوں نے کاغذ سازی کی صنعت پر کہیں اور کبھی کسی قسم کا ٹیکس عائد نہیں کیا، اس سے صنعت کاغذ سازی کی اسلامی قلمرو میں ہر جگہ فروغ حاصل ہوتا رہا، کاغذ کی فراوانی رہی، ذخائر علوم کی سرعت سے تدوین ہوتی گئی، آسانی سے اور ہر موضوع پر فراوانی سے بازار میں کتابیں آتی رہیں، عام طور پر ارزاں قیمت ومناسب داموں میں ملتی رہی تھیں، کتب خانے بنتے رہے، اور ان کی طلب ورسد پوری ہوتی رہی تھی،

کاغذ سازی کا ضابطۂ اخلاق | عہد عباسی میں کاغذ سازی کا بھی ضابطۂ اخلاق تھا، جس کی کاغذ ساز پابندی کرتے تھے، چنانچہ ابن امیر الحاج کا بیان ہے:

کاغذ ساز کو جو کام سپرد کیا جائے اسے دیانتدارانہ طور پر انجام دینا چاہئے مثلاً کاغذ کا دستہ تین درہم میں فروخت ہوتا ہو تو وہ خریدار کو چار درہم میں نہ بیچے، ہر نوع کے کاغذ کی جداگانہ قیمت ہوتی ہے، ہر نوع کے کاغذ کے دام میں فرق ہوتا ہے، چنانچہ سفید، کم سفید، صیقل کیا ہوا اور کم صیقل کیا ہوا مانجھا ہوا اور کم مانجھا ہوا، ایک دام کا نہیں ہوتا، پھر کاغذ کی ساخت کے اعتبار سے بھی قیمت میں تفاوت ہوتا رہتا ہے، گرم و سرد موسم کے اعتبار سے بھی قیمت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اس لئے کاغذ فروش پر لازم ہے کہ ہر کاغذ کی صنعت خریدار کو بتائے، تاکہ اس کو کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے، ایسا نہ کرنا خریدار کو دھوکا دینا ہے، جس کے متعلق حدیث

---

[51] مسلمانوں کی صنعت، حرفت، ص ۶۳ و ۶۵، [52] ایضاً،

میں وارد ہے مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا جس نے ہم کو دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

خریدار کو کارخانہ میں جا کر کاغذ دیکھنے کا حق ہے، لیکن کارخانہ میں کاریگر عموماً چھوٹا اور تنگ سا کپڑا باندھے رہتے ہیں اس لئے ایسے وقت جانا چاہئے جب کپڑے پہنے ہوئے ہوں یا کارخانہ میں کام ختم ہو چکا ہو۔

کاغذ فروش پر لازم ہے کہ خریدار کو جس کام کے لئے کاغذ درکار ہے اسی مقصد کا کاغذ اس کو دینا چاہئے مثلاً نقل کرنے کے لئے نقل کے مطلب کا کاغذ دینا چاہئے اور حقیقت حال بھی بتا دینی چاہئے، کاغذ سازوں پر ایسے کاغذ کو جن پر شرعی امور تحریر ہوں احترام لازم ہے، انھیں پیروں تلے نہیں روندنا چاہئے، اور جن پر شرعی امور تحریر نہ ہوں انھیں از سرِ نو درست کرنے کی اجازت ہے[۵۱]

سامانِ کتابت: قلم، دوات اور سیاہی | قلم کے معنی سخت چیز کو کاٹنے کے ہیں، قلم سخت قسم کے نرکل کو تراش کر بنایا جاتا تھا، اس لئے اس کو قلم کہتے اور بعض تراشے ہوئے نرکل کو انبوبہ بولتے ہیں[۵۲]۔ عہد عباسی میں قلم نرم سبک، تیز چلنے والا اور پائیدار پسند کیا جاتا تھا، سخت، ڈھیلا، دھیرے چلنے والا اور زیادہ گھسنے والا پسند نہیں کیا جاتا تھا[۵۳]، قلمدان کو مقلمہ کہتے تھے[۵۴]، بہترین قلم جس قلم کے پوست کا رنگ صاف و سرخ ہوتا اور وزن دار، لمبا سیدھا اور اندر کا حصہ سفید ہوتا وہ قلموں میں سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا[۵۵]، عہد عباسی میں قلم کی بڑی حفاظت کی جاتی تھی، اسے پیتل کے خول میں رکھا جاتا تھا[۵۶]، دھاتوں کے قلم کا استعمال گرانی کے باعث وزراء و امراء تک محدود تھا، پھر گوند والی روشنائی روانی سے نہیں چلتی تھی، اس بنا پر خوشنویسوں نے اسکے

[۵۱] المدخل لمحمد بن محمد العبدری الفاسی ابن الحاج مصر مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۹۶۰ء، ج ۴ ص ۸۷-۸۸، [۵۲] فرائد اللغۃ فی الفروق، مصر یکوس لامنس، بیروت، المطبعۃ الکاثولیکیۃ از آباء الیسوعین ۱۸۸۹ء، المفردات فی غریب القرآن للراغب ص ۴۱۱، القاموس فیروز آبادی ج ۴ ص ۲۹۴، ۲۹۵ (قلم) [۵۳] ادب الاملاء والاستملاء للسمعانی تحقیق مکس ویسویلر لیڈن مطبعہ بریل ۱۹۵۲ء ص ۱۵۰ و ۱۶۳، ادب الکتاب للصولی تحقیق محمد بہجۃ الاثری بغداد المکتبۃ السلفیۃ ۱۳۴۱ھ جلد ۱ ص ۹۹، [۵۴] ایضاً، [۵۵] رسالۃ خط از رضی الدین قزوینی ص ۷۰، العمدۃ لعبد اللہ بن علی الہیثم تحقیق ہلال ناجی بغداد مطبعۃ المعارف ۱۹۷۰ء ص ۶۳، تحفۃ اولی الالباب فی صناعۃ الخط والکتاب تالیف عبد الرحمٰن بن یوسف الصائغ تحقیق ہلال ناجی تونس دار بوسلامہ للنشر والتوزیع ۱۹۶۷ء ص ۵۴، ۵۷، [۵۶] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰

[illegible] حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں نے اس کو بڑی ترقی دی [illegible]
وشاعر زعیم [illegible] احمد بن الحسن زبیل دمشقی المتوفی ۳۴۲ھ نے ایک قلم بنایا تھا جس میں ایک
ماہ کی سیاہی سماتی تھی، اس کا نام القلم المداد رکھا تھا، یہ لوہے کا قلم تھا اور ایک ماہ تک خشک نہیں ہوتا تھا[1]
عہد عباسی میں سیاہی کے لئے تین لفظ نقس، مداد، حبر استعمال کئے جاتے تھے[2]، نقس مطلق سیال مادہ
جس سے لکھا جائے، مداد سیاہی کے ذریعہ حروف کو پھیلایا اور کھینچا جاتا ہے، اس لئے اس کو مداد کہتے تھے پھر
اس کا استعمال دوات کی سیاہی کے لئے مخصوص ہو گیا تھا[3]، یہ کاجل وغیرہ سے تیار کی جاتی تھی[4]، چنانچہ نرم و
سیاہ تر رواں سیاہی کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا[5]، حبر کے اصل معنی خالص رنگ کے ہیں اس لئے رنگ دار
(سرخ وغیرہ) سیاہی کو حبر کہا جاتا تھا، وزیر حسن بن سہل کا قول ہے کہ جب کوئی فصیح و بلیغ آدمی اپنے الفاظ
کو اچھی صورت میں پیش کرتا اور اپنے بیان کو حسن کلام سے آراستہ کرنا چاہتا ہے تو حکمت سے معمور معانی کا اس
کے سامنے ہجوم ہو جاتا ہے جو کپڑے کی آرائش اور ان پر بیل بوٹے سے زیادہ پر رونق ہوتا ہے[6]، عالم بھی کلام کو
آراستہ کر کے پیش کرتا ہے اس لئے اس کو بھی حبر کہتے ہیں، حبر بحر کا مقلوب ہے، بحر اور سمندر منبع آب ہیں، عالم
بھی علم کا منبع ہوتا ہے، علم پانی کی طرح ہے، پانی مادی حیات کا، علم ابدی و روحانی حیات کا سبب ہے، اس لئے
جو علمی کارناموں کی وجہ سے زندہ رہتا ہے وہ کبھی مرتا نہیں ہے[7]، اسی لئے کہا جاتا تھا

---

[1] تاریخ الکبیر لابن عساکر ترتیب تہذیب عبد القادر آفندی بدران، دمشق طبعہ روضۃ الشام ۱۳۵۱ھ، ج ۱ ص ۳۴۹،
[2] ادب الکتاب للصولی، ج ۲ ص ۱۰۱، [3] ایضاً، [4] صبح الاعشیٰ، ج ۲ ص ۴۶۵ و ۴۷۲، لغت نامہ دہخدا
شمارہ مسلسل ۳۴ و شمارہ حرف ح، ج ۳ ص ۲۰۳، [5] ایضاً، [6] ادب الکتاب للصولی، ج ۲ ص ۶۵،
ادب الاملاء للسمعانی ص ۱۶۳،
[7] جامع العلوم الملقب بدستور العلماء تالیف عبد النبی احمد نگری حیدرآباد دکن، مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیہ
۱۳۲۹ھ ج ۲ ص ۹،

اسما المجالس وصاب الخلقان والمحابر[50] — مجالس پھٹے پرانے کپڑے پہننے والوں (صوفیہ) اور دواتوں سے لکھنے والوں (محدثین و علماء) کی ہوتی ہیں،

ان کو حیات جاوید ملتی ہے، حبر اور مداد کے فرق کو ابن الندیم نے بھی ملحوظ رکھا ہے، حبر اور مداد سے لکھنے والوں میں امتیاز کیا ہے[51]، عہد عباسی میں کتابوں میں ایسی پختہ سیاہی استعمال کی جاتی تھی کہ کپڑوں پر اس کے دھبوں کو ترشی سے دور کیا جاتا تھا[52]، ان باتوں کا لحاظ انتخاب کتب میں بھی رکھا جاتا تھا، قلم اور سیاہی کو دیکھا جاتا تھا، یہ کتابوں کی قیمت پر اثر انداز ہوتی تھیں، اس لئے اس کا تذکرہ کیا جاتا تھا، عربی میں دوات کو مجبرہ[53] اور دوات رکھنے کے برتن کو دستیج کہا جاتا ہے[54]، علوم و کتب میں اضافہ کی خاطر بعض علماء جب گھر سے نکلتے تو دوات و قلمدان اور کاپی اپنی پنڈلی میں جوتے کے ساتھ باندھ کر نکلتے تھے[55]، عہد عباسی میں اشاعت کتب کا اندازہ بھی مجبرہ کے شمار سے کیا جاتا تھا، مجلس املا میں طلبہ اور نسخوں کی تعداد کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ مجبرہ کی گنتی تھی، انھیں گن کر صحیح تعداد معلوم کی جاتی تھی[56]،

عہد عباسی میں سیاہی سازی ایک فن کی حیثیت سے ممتاز تھی، سیاہی ساز اور سیاہی فروش کو حبری[58]، اور حبار کہا جاتا تھا[59]، عہد عباسی میں بعض اہل علم اپنی زمین و جائداد فروخت کر کے اس کی قیمت سے طلبہ کی سیاہی

---

[50] الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ لعبد القادر التیمی تحقیق عبد الفتاح محمد الحلو القاہرہ: المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ ۱۳۹۰ھ، ج ۱ ص ۳۲۷، [51] ج ۱ ص ۸۶، [52] الفہرست لابن الندیم، ص ۱۲، [53] ادب الاملاء للسمعانی، ص ۱۵۱، [54] معجم الادباء، ج ۳، ص ۱۳۶، [55] تذکار الادب عن ذکر علماء النحو والادب از ذوالفقار علی نقوی، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۳۱۶ھ ص ۳۹، [56] الانساب للسمعانی، ورق ۵۰۰ ب، [57] تاریخ بغداد، ج ۲، ص ۳۵۳، [58] ایضاً، کتاب الانساب للسمعانی، ج ۴، ص ۱۱۲، اللباب لابن الاثیر ج ۱، ص ۲۳۶، تبصیر المنتبہ بتحریر المشتبہ لابن حجر تحقیق علی محمد البجاوی، مصر الدار المصریہ للتالیف والترجمہ، ۱۳۸۳ھ، ج ۱، ص ۳۹۳ و ۳۹۴ و ۳۹۵، [59] کتاب الانساب، ج ۴ ص ۲۶، اللباب، ج ۱، ص ۲۳۴،

اور دولت وغیرہ کی ضرورت پوری کرتے تھے،[1]

کتابت وخوشنویسی: زبان وبیان اور کتابت وتحریر اللہ تعالیٰ کا بنی نوع انسان پر خاص فیضان ہے، اس لئے[2] قرآن نے اس کا ذکر بطور احسان کیا ہے، فرمایا گیا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (الرحمن - ۴) اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" العلق - ۳ - ۵) اس (اللہ) نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا،

اس فضیلت وشرف میں جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا، لفظ وخط میں بھی ایک نوع کا شرف آگیا ہے خط کے ذریعہ نوع انسانی کا خاصہ قوت سے فعل کی طرف آیا،[2] اور عقل ونطق اور خط کی وجہ سے انسان کو حیوانات پر فضیلت حاصل ہوئی ہے،[3] خط الفاظ پر اور الفاظ معانی پر دلالت کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ لفظ متحرک ہے،[4] وہ بنی نوع انسان میں ایک گونہ حرکت پیدا کرتا ہے، خط ساکن ہے، یہ ذوق جمال کی تسکین کا موجب ہے،

قرآن کی پہلی وحی " اقراء " پڑھ، اور سورہ القلم ن و القلم وما یسطرون (نون اور قسم ہے قلم کی اور جو وہ لکھتے ہیں) ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات "اکتب"[5] "اکتبوا ذالک لابی شاہ"[6] (میری باتیں) لکھو کوئی حرج نہیں، "قیدوا العلم

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ج ۳، ص ۹۸۶، ۹۴۹ ۔ [2] ارشاد القاصد الی اسنی المقاصد تالیف محمد بن ابراہیم بن سعد مصر، مطبعۃ الموسوعات، ۱۳۱۸ھ ص ۳۰، [3] روح المعانی للآلوسی، ج ۱۵، ص ۱۱۱، [4] تحفۃ اولی الالباب للصائغ، ص ۲۶ - ۲۷، [5] سنن الدارمی تالیف عبد اللہ بن عبد الرحمن الدارمی، دمشق، مطبعۃ الاعتدال ۱۳۴۹ھ ج ۱ ص ۱۲۵، المستدرک علی الصحیحین للحاکم، الریاض، مکتبۃ النصر الحدیثۃ ب، ت، ج ۱ ص ۱۰۵ - ۱۰۶، جامع بیان العلم وفضلہ لابن عبد البر ج ۱ ص ۷۱، تقیید العلم، ص ۷۴، تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبۃ، ص ۳۶۵، الالماع للقاضی عیاض ص ۱۴۷، فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۵، [6] المحدث الفاصل بین الراوی والواعی تالیف الحسن بن عبد الرحمن الرامہرمزی تحقیق محمد عجاج الخطیب بیروت، دار الفکر، ۱۳۹۱ھ، ص ۳۶۹ (حدیث نمبر ۳۲۳) تقیید العلم للخطیب ص ۳۶۹، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد بتحریر الحافظین العراقی وابن حجر تالیف نور الدین علی بن ابی بکر، القاہرۃ مکتبۃ القدسی ۱۳۵۳ھ ج ۱ ص ۱۵۱ منتخب کنز العمال للعلی المتقی، ج ۲، ص ۵۸۔

کتاب[51] علم کو قیدِ تحریر میں لاؤ، نے عربوں کے فکر و نظر کو بدلا، آپ کی پیہم سعی اور تاکیدی امر نے انہیں قوت
کتابت کا خوگر بنایا، اس سے عربی رسم خط کی عجب نشر و اشاعت ہوئی۔ آپ نے وحی الٰہی کو عربی رسم خط میں قلمبند
کرایا، صلح نامے، امان نامے، جاگیر نامے، معاہدے، بادشاہوں، امیروں کے نام سیاسی، تاریخی، مذہبی، تبلیغی خطوط،
حکام و عمال کے نام فرامین سب اسی خط میں تحریر کرائے، جن کے لیے بھی کاتب کا لفظ استعمال کیا[52]۔ سب سے پہلے سرکاری
حیثیت میں عربی رسم الخط کا پہلا مدرسہ مدینہ میں مسجد نبوی میں قائم کیا[53]، اس میں نوشت و خواند ا کی تعلیم پر کوئی معاوضہ
نہیں لیا جاتا تھا، ہر ایک کو اس فن کی مفت تعلیم دی جاتی تھی، اس سے عربوں میں خصوصاً انصاریوں میں عموماً عربی
رسم خط کی نشر و اشاعت ہوئی، بدر کے جنگی قیدیوں کا فدیہ دس مدنی بچوں کو کتابت سکھانا مقرر کر کے سرکاری
حیثیت سے اس کی ترویج و اشاعت کی اور ۲ سنہ ھ کے بعد مدینہ میں کتابت کے فن کی ایسی اشاعت ہوئی کہ پھر
صحابہؓ کی غالب اکثریت نوشت و خواند سے بہرہ ور ہوئی، ان میں کاتبانِ قرآن، مراسلہ نگار اور کاتب پیدا ہوئے،
خط و کتابت کی ترقی، معاشرتی زندگی میں اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ جو تیر اندازی، شناوری کے ساتھ لکھنا پڑھنا جانتا
اسی کو مردِ کامل کہا جاتا تھا اس کے بغیر مرد ناقص سمجھا جاتا تھا[54]،

عہدِ رسالت میں سب سے زیادہ قرآن و حدیث کو لکھا جاتا تھا، کثرتِ کتابت کی وجہ سے کوفی رسم خط سے پہلے مدینہ

---

[51] المحدث الفاصل ص ۳۶۵ (حدیث نمبر ۳۱۸ و ۳۲۰) تاریخ بغداد للخطیب ج ۱۰ ص ۴۶ (ل) تقیید العلم ص ۶۹،
منتخب کنز العمال، ج ۴ ص ۶۹، الفتح الکبیر فی ضم الزیادۃ الی الجامع الصغیر تالیف یوسف النبہانی، مصر، مصطفی البابی الحلبی
۱۳۵۱ھ، ج ۲ ص ۳۰۶، [52] لسان العرب لابن منظور، ج ۲ ص ۱۹۳ (مادہ کتب) [53] سنن ابی داؤد، ج ۲،
ص ۱۲۹، انتشار الخط العربی فی العالم الشرقی والغربی تالیف عبد الفتاح عبادہ، مصر، مطبعۃ ہندیہ ۱۹۱۵ء، ص ۱۲
[54] الفہرست لابن الندیم ص ۹ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم خط سریانی رسم خط کے انداز پر ترقی کرتے رہے، چنانچہ سریانی
رسم خط میں ایک قسم التحریر المخفف تھی، جسے لیٹا خط مدور کہتے تھے، الفہرست
لابن الندیم ص ۱۰

مکہ میں عربی رسم خط کو فروغ حاصل ہوا، مدنی اور کی خط میں امتیاز شان کی وجہ سے مدینہ کا رسم خط مدنی اور
ہ کا کی رسم خط کہلایا، پھر اس کے دائرۂ اثر میں وسعت ہوئی اور بصری، کوفی کی نسبت سے بھی مشہور ہوا۔

قرآن مجید کا رسم الخط ان تینوں خطوں سے جدا تھا، اسے الجزم کہتے تھے، جزم کے معنی کاٹنا ہیں، یہ خط
یری (مسندی) سے ماخوذ ہے (کاٹ کر بنایا گیا) نقطے اور اعراب سے خالی تھا اس لئے اس کا نام جزم رکھا گیا تھا[1]
ی خط میں مصاحف عثمانی لکھے گئے تھے اور عہد عثمانی میں ان کی نقلیں مختلف مرکزی شہروں کو بھیجی گئی تھیں،
ں سے عربی رسم الخط کو سرکاری حیثیت میں فروغ حاصل ہوا، صحابہ و تابعین نے اسی طرز تحریر میں اس کو نقل
ا، یہ رسم خط پورے اسلامی قلمرو میں پھلا پھولا۔

قرآن مجید قرأت، کتابت، تجلید ہر چیز میں دوسری کتابوں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اس کے اصولِ
رأت جدا، اصول کتابت جدا ہیں، یہ مروجہ اصولِ کتابت کی پابندیوں سے بالاتر ہے، اس کے اصولِ کتابت
قرا نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، ان ہی وجوہ سے ابن درستویہ المتوفی ۳۴۷ھ نے کتاب الکتاب میں تصریح
ہے کہ مصحف کے رسم الخط میں بعض باتیں اصولِ ہجا کے سراسر خلاف ہیں اُسے ہجا پر قیاس کرنا درست نہیں اور نہ
ہ کے رسم خط کی مخالفت درست ہے، کیونکہ جو کچھ مصحف میں مسطور ہے اس کو امت نے قبول کیا ہے[2]، قرآنی
خط کوفہ میں کوفی علماء کا اور بصرہ میں بصری علماء کا مرکز توجہ بنا اور انھوں نے اسی رسم خط کی روشنی میں اصول
بت وضع کئے تھے،[3]

(باقی)

---

[1] مناہل العرفان فی علوم القرآن للزرقانی، ج ۱، ص ۳۵۶، [2] کتاب الکتاب تالیف عبداللہ بن درستویہ تحقیق ویوس
بیروت: المطبعۃ الکاثولیکیۃ، ۱۹۲۷ء، ص ۷، مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ تالیف احمد طاش کبری زادہ،
ق کامل کامل بکری، عبدالوہاب ابوالنور، القاہرہ، دار الکتب الحدیث، ۱۹۶۸ء، ج ۱ ص ۹۴، [3] السبیل الی ضوابط
ابۃ تالیف ابراہیم عبداللطیف القاہرہ، شرکۃ مرکز کتب الشرق الاوسط، ۱۹۶۲ء، ص ۱۱ و ۱۲،

اشعار وقصائد کی دینی حیثیت

از

مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری

(۳)

مولانا ثناء اللہؒ اور شعری واقفیت | مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ کو شعر فہمی کا بہت اچھا ذوق تھا، آپ اپنی تصنیفات ومضامین میں موقع ومحل کے لحاظ سے سعدی وغالب وحالی وغیرہ جیسے شعراء کو اشعار بے تکلف استعمال کرتے تھے، اس موقع پر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ایک شعری لطیفہ | دہلی میں مولانا امرتسریؒ کا ایک مشہور آریہ سے مباحثہ ہو رہا تھا، اس نے کہا کہ شیطان وغیرہ کا سارا قصہ فضول ہے، اگر شیطان ہو تو بتلایئے کہ اس کی صورت کیسی تھی؟ حضرت مولانا امرتسری مرحوم نے اس کے جواب میں بس ایک شعر پڑھا جس سے جلسہ کا رنگ بدل گیا اور فتح وکامیابی سے ہمکنار ہوئے، معترض آریہ کو مخاطب کیا اور یہ شعر پڑھ کر اسے سنایا:

رات شیطاں کو خواب میں دیکھا ساری صورت جناب کی سی تھی

لیجئے مولانا نے شیطان کا حلیہ بیان فرمادیا، اور اس سوال کا ترکی بہ ترکی جواب بھی ہوگیا، اگر یہی مضمون نثر میں پیش ہوتا تو اس لطافت سے خالی ہوتا، قادیانی، مولانا امرتسری مرحوم کی موت کے انتظار میں بے چین ہوکر جب کچھ لکھتے تو مولانا غالب کا یہ شعر پیش کردیتے:

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کیوں جیتا ہے غالبؔ قسمت میں ہے اعداء کا جلانا کوئی دن اور

ایک بار مولانا امرتسری مرحوم بنارس تشریف لائے، سارے شہر میں آپکے وعظ کا اعلان ہوا، اس زمانہ میں ہم بنارس تعلیم حاصل کر رہے تھے، ہم بھی جلسہ میں شریک تھے، بنارس کے گاؤں میں حضرت مولانا صاحب تقریر کر رہے تھے کہ کوئی مناظرہ کی بات آئی، ایک آریہ مناظر نے

کہا کہ ہم طلبہ آدمی سے کیا مناظرہ کریں، تو مولانا نے برجستہ شیخ سعدیؒ کا یہ شعر پڑھا،

بیا اے جہاں دیدگان کار کن   کہ صید آزمودہ است گرگ کہن

(بوستاں)

یعنی بوڑھا آدمی تجربہ کار ہوتا ہے، جس طرح پرانا بھیڑیا شکار میں ماہر ہوتا ہے،

حضرت مولانا علی میاں صاحب کی شعری واقفیت

اس بیسویں صدی میں علم و فضل میں ممتاز، تقریر و تحریر کے شہسوار، عرب و عجم کے خطیب شہیر، ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی، اردو، عربی، فارسی اشعار کے معدن و مخزن ہیں، بے شمار اشعار آپ کو حفظ ہیں، اور اپنی مؤلفات و مصنفات میں اور اپنے خطبات و تقریروں میں برمحل اور موزوں اشعار کو اس طرح فٹ کرتے ہیں کہ پورے مضمون کی ایک شعر میں ترجمانی ہو جاتی ہے، دو تین واقعات ملاحظہ ہوں،

(۱) ایک زمانہ میں ندوۃ العلماء کے طلبہ نے کچھ شورش پسندوں کی تحریک پر اسٹرائک کی، دار العلوم کے مہتمم کا گھیراؤ کیا، کچھ باغیانہ مطالبات رکھے، مولانا علی میاں نے منتظمہ کی میٹنگ میں صورت حال کا مکمل نقشہ رکھا، اور حسب دستور اپنے خیالات کو ایک مقالہ کی شکل میں پیش فرمایا، اس مقالہ کے آخری صفحات میں طلبہ کی اصلاح حال کے جذبہ کے تحت چند بند شون اور قیود دیسارہ باب انتظام کو سختی سے کاربند رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے ڈاکٹر اقبال کے مندرجہ ذیل شعر پر اپنے مقالہ کو ختم فرمایا تھا:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے   اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

دیکھئے یہ شعر کس قدر برمحل ہے، مولانا کے ذوق لطیف و استحضار اشعار کی جس قدر بھی داد دیجئے کم ہے،

(۲) ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ تعلیمی جشن از ۳۱؍اکتوبر تا ۳؍نومبر ۱۹۷۵ء کو منعقد کیا گیا، اس میں حضرت مولانا نے خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا۔ اسمیں ایک موقع پر لکھا تھا کہ ہم کو اپنے مقاصد عزیز ہیں، ہم اسلام کے معاملہ میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اسی اصول پر عمل پیرا ہونے کے سبب بہت سے ان منافع و مواقع سے آنکھیں بند کرنی پڑیں گی، جو ہوا کے رخ پر چلنے والے ملتوں اور فرقوں کو حاصل ہوتے ہیں لیکن ہمارا یقین ہے کہ ہمارا خدا اگر ہم سے راضی ہے اور ہم خلوص و صبر کے ساتھ اپنی حق پسندی پر قائم ہیں، تو ہمارے لیے کوئی تنگی اور ہماری قسمت میں کوئی محرومی نہ ہوگی، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ساری کائنات ارادۂ الٰہی کے تابع ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، اس لیے ہم کو ذرا بھی پریشانی نہیں ہے یہ سب لکھ کر ایک شعر لکھتے ہیں، جس میں پورے مضمون کو سمو دیا گیا ہے،

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے نگاہ یار سلامت ہزار میخانے

اب ذرا دیکھیے کہ مولانا نے کس قدر برمحل و موزوں شعر آخر میں لکھدیا، جو انگشتری میں نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے، اور سارے مضمون کا ترجمان ہے، فللّٰہ درّہ،

(۳) ایک موقع پر مولانا سے شکوہ ہوا کہ مولانا علی میاں نے بہوگنا سے عرض حال کر کے اپنا مطلب نکال لیا، اور ندوہ کے لیے زمین حاصل کر لی، لیکن علیگڑھ پر کیا کیا ستم توڑا جا رہا ہے، اس جارحیت کے لیے ان کے دل میں ذرا بھی ٹیس نہیں اٹھتی، یہ شکوہ کرنے والے ایک دردمند ملت عالی دماغ ایک مشہور و معروف وکیل صاحب ہیں، جو جماعتی و ملّی دینی کونسل کے مشترک کاموں کے سبب مولانا کے مخلصین و محبّین میں شمار کیے جاتے ہیں، جب یہ شکوہ ان کی جانب منسوب ہو کر مولانا تک پہونچا تو حضرت مولانا نے برمحل یہ شعر پڑھا:

ان کان منزلتی فی الحب عندکم ما قد لقیت فقد ضیعت ایامی

مگر میری محبت کا مقام آپ کے نزدیک یہ ہے جس سے میں دوچار ہوا ہوں، تو میں نے اپنی عمر عزیز کو آپ کے ساتھ رہ کر ضایع کر دیا،

کس قدر برمحل و برجستہ شعر ہے، نکتہ چین دوست کی آنکھیں کھل سکتی ہیں، مولانا کی تحریر میں ہمیشہ برمحل اشعار اس قدر آتے ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے،

موجودہ دور کے شعراء

مفکر ملت ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم اور لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی کے اشعار میرے لیے تو غذائے روح کا درجہ رکھتے ہیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں، ہندوستان کی موجودہ صورت حال پر جگر مراد آبادی فرماتے ہیں:

اس فتح و ظفر کی دنیا سے ہمیں یہ لیا ہی دل میں جنوں — خود اپنا زیاں تسلیم مگر اوروں کا زیاں تسلیم نہیں

ارباب ستم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے میری — دنیا سے قیامت دور سہی دنیا کی قیامت دور نہیں

حضرت اکبر الٰہ آبادی انگریزی عہد کے حالات پر تنقید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں،

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے — ناز اتنا نہ کرائے ہم کو مٹانے والے

قدم شوق بڑھے انکی طرف کیا اے اکبر — دل سے ملتے ہی نہیں یہ ہاتھ مٹانیوالے

مسلمان دوسری قوموں سے صلح و محبت کا عہد و پیمان کر سکتے ہیں، مگر اپنی مستقل ہستی کو فنا نہیں کر سکتے، اکبر الٰہ آبادی اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی — لطف دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی

بے وفا سمجھیں تمھیں اہل حرم اس سے بچو — دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

مشینی ایجادات و ترقیات سے مرعوب یورپ زدہ حضرات پر اکبر مرحوم نے جا بجا تنقید کی ہے، تمثیلاً بھی نقل کیے جائیں، تو کافی صفحات خرچ ہو جائیں، سر دست دو تین اشعار ملاحظہ ہوں، لکھتے ہیں:

پر چلئے تو ایسا کہ ہم ہی ہم ہیں خدا نہیں ہے ۔۔۔ ایرشپ پہ کرے تو ایسا لاش تک کا پتہ نہیں ہے

ایک جگہ کہتے ہیں :

سائنس کے ان دیوتاؤں سے کبھی پوچھو ۔۔۔ یہ مشت خاک کیونکر جان کے سانچے میں ڈھلتی ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں ،

سائنس سے زیادہ ہی مذہب کی جڑ پڑی ۔۔۔ توپوں کی مار سے بھی خدا کی پکڑ بڑی

ان کے ظریفانہ و طنزیہ اشعار بھی کثیر اور بے حد لطیف ہیں :

کہا آدم نے آدمی ہوں میں ۔۔۔ ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے میرے ایک دوست ۔۔۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

زائر حرم حمید صدیقی نے حرمین شریفین کے متعلق تمام پاک جذبات و لطیف احساسات

س طرح اظہار کیا ہے ، وہ دفتر کے دفتر ہیں ، اور سب کے سب کارآمد اور قابل قدر ہیں ، ڈ

ملاحظہ ہوں :

قابل نظارہ ہے کعبہ کے پردہ کی بہار ۔۔۔ ہر طرف سے جھومتی کالی گھٹا آنے لگی

بھینی بھینی پھر شمیم جاں فزا آنے لگی ۔۔۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پھر مدینے کی ہوا آنے لگی

ایک موقع پر نقشہ یوں کھینچتے ہیں :

ربی کے جلوؤں کی وہ بارش پیہم کیا کہیے ۔۔۔ وہ صبح کا منظر کیا کہیے وہ شام کا عالم کیا کہیے

جنت روح و خلد نظر وہ سوز و گداز قلب و جگر ۔۔۔ کیا کہیے گا آرام گہ سرکار دو عالم کیا کہیے

ڈاکٹر اقبال کے فلسفیانہ اشعار حکیم ملت کے تمام کے تمام اشعار گراں قیمت ہیں ، ان میں انتخاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ، چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ، وہ

ان حکیم کے متعلق کہتے ہیں ،

ز شام ما برون آور سحر را | بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرأت تو | دگرگوں کرد تقدیر عمر را

خدا کی توحید فی العبادت سے متعلق لکھتے ہیں:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے | ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اختیار کرنے سے متعلق لکھتے ہیں:

در جہاں زی چوں رسولِ انس و جاں | تا چو او باشی قبولِ انس و جاں

دین و دنیا کے تعلق پر ایک جگہ انتباہ کرتے ہیں:

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت | ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

دین اسلام کی ہمہ گیری اور وحدت ملی پر لکھتے ہیں:

دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم | زیں جہت با یکدگر پیوستہ ایم
ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات | شرع او تفسیر آئینِ حیات

تقدیر اور تعمیل احکام الٰہیہ کی گتھی کو اس طرح سلجھاتے ہیں:

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام | یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خردمند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات | مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

دین سے بیگانہ کرنے والی تعلیم و تہذیب کے متعلق لکھتے ہیں:

ہم نے سمجھا تھا کہ لائے گی فراغت تعلیم | کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اس سے بھی واضح طور پر ایک جگہ لکھتے ہیں:

بایں مکتب بایں دانش چہ نازی | کہ ناں در کف نداد و جاں زتن برد

ملت اسلام کے درد میں لکھتے ہیں:

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق ہسپانیہ پہ کیوں نہیں حق اہلِ عرب کا

جمہوریت کے موجودہ ووٹنگ سسٹم اعداد کے طریقہ کار پر لکھتے ہیں:

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

نظامِ برتھ کنٹرول سے متعلق لکھتے ہیں:

دیدہا بے نم ز حبِ سیم و زر مادراں را بارِ دوش آمد پسر
وائے بر قومے کہ از بیمِ ثمر می برد نم را ز اندامِ شجر

سرمایہ دارانہ تمدن سے متعلق لکھتے ہیں:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

سینما کی مضرت پر لکھتے ہیں:

سینما ہے یا صنعتِ آزری ہے وہی بت فروشی وہی بت گری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہدِ کہن کا یہ تہذیبِ حاضر کی سوداگری ہے

غناء و موسیقی کو فنونِ لطیفۂ غلامان کا لقب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

نغمۂ او خالی از نارِ حیات ہمچو سیل افتد بدیوارِ حیات
از نے او آشکارا رازِ او مرگ یک شہر است اندر سازِ او
ناتوان و زار می سازد ترا از جہاں بیزار می سازد ترا
الحذر ایں نغمۂ موت است و بس نیستی در کسوتِ صوت است و بس

اشعار کے قدیمہ اصلاح اخلاق اعمال | اشعار خواہ عربی کے ہوں یا فارسی کے، ہندی کے ہوں یا اردو، کسی زبان میں شعر گوئی کی جائے ان اشعار سے ملک وملت کی

ادبی، روحانی، اخلاقی خدمت ہی مدنظر ہونی چاہیے، قابل قدر اشعار وہی ہیں جن میں ا
اخلاق واعمال اور عزم وعمل کے لیے انقلاب آمیز دعوت وتحریک پوشیدہ ہو، حکیم مد
اقبال اپنے شعروں کے اندر سوز وشعلہ افگنی کو جس قدر ضروری سمجھتے ہیں۔ اسکا اندازہ ان
چند اشعار سے ناظرین کو ہوسکیگا، لکھتے ہیں:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو | جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں | جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اگر اشعار میں گرمی وتیزی نہ ہو اور شعور کو بیدار و ہوشیار
کرسکتے ہوں تو وہ شعر کی فہرست سے خارج کر دینے کے قابل ہیں وہ لکھتے ہیں:

نہ ہو جلال تو حسن وجمال بے تاثیر | نرا نفس ہے اگر نغمہ نہ ہو آتشناک
مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ | کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بے باک

وہ شعر کی تیزی وشعلہ ریزی سے متعلق لکھتے ہیں:

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر | کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی
عزیز تر ہے متاع امیر وسلطاں سے | وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز براقی

ایک جگہ شعر کے داعیانہ پہلو سے متعلق لکھتے ہیں:

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے | یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ اسرافیل

واقعی اگر شعر دل کی آتش افشانی کے ذریعہ قلب کے گداز اور جگر کے سوز کو صدق ا
کے جوہر کے ساتھ عیاں کر دیا جائے، تو ایسے اشعار دلوں میں آگ لگا کر ان کے غلط جذبات

یالات کو خاکستر بنا کر دل کو بجلی و صفا کر کے ہم آہنگ عزم و عمل بنا سکتے ہیں، بلاشبہ ایسے
شعار کی قیمت ہمیشہ کی طرح آج بھی ہے، اور ملت اسلام کو ایسے پاکیزہ بیان شاعروں کا ضرورت
آج بھی ہمیشہ سے زیادہ ہے، اقبال مرحوم کیا خوب لکھتے ہیں؛

شعر را مقصود گر آدم گری است   شاعری ہم وارث پیغمبری است

اصغر گونڈوی مرحوم شعروں کے خواص و تاثیرات سے متعلق لکھتے ہیں؛

اصغر غزل میں چاہیے وہ موج زندگی   جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

حالی بھی اپنی شاعری کے اثرات کے متعلق لکھتے ہیں؛

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار   شب انجمن میں حالی جادو بیان نہ تھا

انیس بھی اصناف شاعری پر اپنے عبور و دسترس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں؛

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر   مگر میں نے پلہ گراں کر دیا

شاد عظیم آبادی اپنے شاعرانہ کمال پر لکھتے ہیں؛

شعر کہتے ہیں کسے بزم میں کھل جائیگا   شاد آیا نہ کہو حافظ شیراز آیا

اکبر الہ آبادی مرحوم لکھتے ہیں؛

شعر غیروں کے انہیں مطلق نہیں آتے پسند   حضرت اکبر کو بالآخر طلب کرنا پڑا

بہرحال عرض مدعا یہ ہے کہ ایسے اشعار جن میں زندگی کا پیغام داعیانہ انداز میں پیش
کیا گیا ہو، اور جس میں گداز جگر اور نورانیت قلب کا سامان بالقصد بہم کیا گیا ہو، اور جن کے ذریعہ
دلوں اور ارمانوں میں تحریک اور عمل انقلاب کی طلب و تپش اور سوزش پیدا کرنے کا نظم و اہتمام
ہو، اور ہمت و عزم کی جولانیاں اور طوفاں خیزیاں اس کا ایک نمایاں عنصر ہو، ایسے پاکیزہ
و حکیمانہ اشعار اور ایسے محسنین اسلام و شعرائے کرام کی آج بھی ضرورت ہے، اقبال مرحوم بھی

دیں شعلہ نوائی کا شعار اس طرح فرماتے ہیں،

بضمیرم آں چناں کن کہ ز شعلۂ نوائے   دل خاکیاں فروزم دل نوریاں گدازم

(زبور عجم)

بے شک ایسے اشعار جو درد انگیز و دلگیر ہوں، ہر ذی شعور و صاحبِ احساس انسان کو پیارے ہوں گے، ہزاروں باذوق حضرات ڈاکٹر اقبال کے اشعار کے قدرداں اور اس کی زلف دراز کے حلقہ ہائے پیچاں کے آج تک اسیر ہیں، وہ شعروں کے متعلق خود لکھتے ہیں:

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو   مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

اقبال مرحوم نے زبورِ عجم میں اچھے اشعار کی نایابی کے متعلق ایک سچی بات لکھ دی ہے، اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃً کے مصداقات آج عالم میں بہت کم پاؤ گے، یعنی شعراء تو آج بھی ہیں، مگر دانائے راز نہیں ملیں گے، میکدے تو نظر آئیں گے، مگر ان کے جام دے میں حجازی خوشبو اور اسلامی رنگ و بو نہ ہوگی، چنانچہ لکھتے ہیں:

در دمن گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست   پیر مردے کہ مئے تند و جوانے دارد

الحاصل اصلاحی و اخلاقی اشعار، علمی و ادبی منظومات و غزلیات جن سے کسی درجہ میں دین، علم زبان و ادب کی خدمت ہو رہی ہو، اُن سے استفادہ اور ان کا ذوق ہر زمانہ کے اہلِ علم کو رہا ہے، اور آج مزاجِ شرع کو ایسے لطیف اشعار کے ذوق سے کوئی انکار و تنافر نہیں ہے، خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول پر شعر و شاعری، ادب اور زبان کی واقفیت و مہارت دینی و تبلیغی مقاصد کے پیشِ نظر میرے نزدیک ایک صحیح دینی تقاضا کی خانہ پری اور ایک درجہ میں اسلامی خدمت ہے،

ان تمام معروضات و تفصیلات کے بعد بھی اثنائے وعظ میں اگر مناسب موقع اشعار پڑھنے کو معیوب سمجھا جائے تو صاحبِ ذوق لطیف مذاق کے رکھنے والے ہر رنگ کی روح کو مقام شعر پر سپرد کر کے رخصت ہو رہا ہوں، میرے حسبِ حال اقبال نے کیا خوب لکھا ہے

کس از حرمِ نگیں شناساں نگذشت بر نگینم   بتو می سپارم او را کہ جہاں نظر ندارد

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ مقالہ دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی حکومتیں صدیوں رہیں، سندھ میں عربوں اور اور دوسرے مسلمان خاندانوں نے چھ سو برس تک حکومت کی، غزنوی شمالی ہند کے ایک بڑے حصہ پر تقریباً ڈیڑھ سو برس تک قابض رہے، ان کو غوریوں نے ختم کیا تو پھر سلاطین دہلی کی حکومت ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک رہی، اس کے بعد مغلوں کا اقتدار ۱۸۵۷ء تک قائم رہا وقتاً فوقتاً مالوہ، گجرات، جونپور، خاندیش، دولت آباد، برار، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور بنگال میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، انھوں نے جہاں ان علاقوں میں سیاسی، زراعتی، صنعتی معاشی اور تمدنی فروغ کے لئے ہر قسم کی کوششیں کیں، وہاں تعلیم کی ترویج کے لیے بڑے بڑے مدارس بھی قائم کئے، جید عالموں اور مدرسوں کو بلا کر درس و تدریس کا پورا انتظام کیا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں جو اہم مدارس قائم ہوئے، ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں، مگر

صرف دہلی میں جو شاندار مدارس قائم کئے گئے تھے، ان کی تھوڑی سی جھلکیاں اس اجتماع میں دکھانے
اجازت کا خواہاں ہوں۔ پہلے خلجیوں کے عہد کا ذکر سماعت فرمائیے، مولانا ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی
رقمطراز ہیں کہ اس زمانہ میں یہاں کے جیسے علماء بخارا، سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، اصفہان،
رے اور روم میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں کہیں بھی نہ تھے، وہ منقولات، معقولات، تفسیر، فقہ،
اصول فقہ، معقولات، اصول دین، نحو، لغت، معانی، بدیع، بیان، کلام، منطق اور ہر قسم کے
علوم میں موشگافیاں کرتے تھے، ہر سال بہت سے طلبہ ان سے درس لے کر درس دینے اور
فتوے کے جوابات دینے کے مستحق ہو جاتے تھے، ان میں سے بعض تو علوم و فنون میں کمال حاصل کرکے
غزالی اور رازی کے مرتبے پر پہونچ گئے تھے" مولانا ضیاء الدین برنی نے ان میں سے
بہت سے علماء اور اساتذہ کے نام لکھ کر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے
علمی کمالات لکھے جائیں، تو علحدہ علحدہ ایک کتاب ہو جائے، وہ یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ ان میں
سے ہر ایک اپنے وقت کا امام ابو یوسف قاضی اور امام محمد شیبانی تھا، وہ برابر درس دیتے رہتے تھے۔
کوئی مفتی یا مدرس اپنی استادی کی شان دکھلاتا ہوا خراسان، ماوراء النہر، خوارزم، یا کسی اور
شہر سے دہلی میں آجاتا اور یہاں کے ان اساتذہ کے کمالات دیکھتا تو ان کے سامنے
زانوئے ادب تہہ کرتا، اور اپنے علم کی کمی کو پورا کرتا، اگر ان اساتذہ کی زندگی میں کوئی
نئی تصنیف بخارا، سمرقند، خوارزم یا عراق سے اس شہر میں لاتا، اور یہاں کے اساتذہ اس کی
تعریف کر دیتے تو وہ معتبر سمجھی جاتی، ورنہ بے کار خیال کی جاتی۔ (تاریخ فیروز شاہی ص ۵۴-۵۵)

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس وقت دہلی میں بڑے بڑے مدارس تھے، جن کے نام تو مولانا
ضیاء الدین برنی نے نہیں لکھے ہیں، مگر تاریخوں میں مسجد قوت الاسلام، مقبرہ علائی اور حوض خاص کے
مدرسوں کا ذکر آتا ہے، ظاہر ہے کہ خلجیوں کے عہد میں ان مدرسوں ہی میں دینی تعلیم ہوتی رہی ہوگی۔

ضیاء الدین برنی نے فیروز شاہ تغلق کے عہد کے مدرسہ فیروز شاہی کا ذکر کیا ہے تو اس کی خوبیاں
کرنے میں ان کا قلم بے قابو ہو گیا ہے، لہٰذا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں، پہلے اس کی جائے وقوع اور
ن کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"مدرسۂ فیروز شاہی کی عمارت حوض علائی کے کنارے تعمیر کی گئی ہے، اپنے گنبدوں
کی بلندی، تعمیرات کی خوبی، صحنوں کے تناسب، نشست گاہوں کی لطافت اپنے روزانہ
استعمال کے کمروں اور ستونوں کی دل آویز قطاروں کی وجہ سے دنیا کی مشہور عمارتوں
سے بھی سبقت لے گئی ہے۔"

اس عمارت کو دیکھ کر اس زمانے کے لوگوں اور مسافروں پر جو اثر پڑتا تھا، اس کی مرقع
کرنے میں ضیاء الدین برنی کا قلم رقص کرنے لگا ہے۔

"یہ عمارت ایسی عجیب و غریب ہے کہ یہاں کے رہنے والے اور باہر سے آنے
والے مسافروں میں جو بھی یہاں پہونچ جاتا ہے، وہ تصور کرتا ہے کہ وہ بہشت عدن
میں آگیا ہے، یا فردوس میں جگہ پاگیا ہے، یہاں داخل ہوتے ہی اس کا حزن و ملال
جاتا رہتا ہے، اس کو دیکھ کر مغموم دل کھل جاتے ہیں، اس کے روح افزا نظارہ سے
خستہ روحوں میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے، اور لوگ اپنے پرانے غم کو
بھول جاتے ہیں، اس عمارت کو دیکھ کر اس کے ایسے شیفتہ اور دلدادہ ہو جاتے
ہیں کہ ان کو اپنے گھروں کی یاد نہیں آتی، وہ اپنے کام کو بھول جاتے ہیں، اور
اس مدرسہ سے باہر آنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا ہے۔"

مولانا ضیاء الدین برنی کا یہ بھی بیان ہے کہ لوگ اس مدرسہ کے ایسے دلدادہ ہو گئے تھے،
اپنی پرانی رہائش گاہوں کو چھوڑ کر اس کے اردگرد آباد ہونے لگے تھے، اور روزانہ دس پندرہ ہزار

...ے اندر آکر سیر کرے تو بھی اس ...

... کی تشنگی نہیں ہوتی، اس کو ...

ے، ان کو اس طرح ...

... ابند کرتے ہیں۔

باہر کے مسافر اس کی ہوا کی خوبی کی وجہ سے اسی جگہ قیام پذیر ہوگئے ہیں اور اپنے سفر کے مقصد اور ضرورت کو بھول گئے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بقیہ عمر یہیں گذرے۔ اطراف عالم سے جو بھی یہاں آتا ہے، اس کی عجیب و غریب عمارت اور یہاں کی لطیف ہوا سے متاثر ہوتا ہے، اور شدید قسمیں کھا کر کہتا ہے کہ اس نے دنیا کے بہت سے حصوں کا سفر کیا ہے، اور بہت سے شہر دیکھے ہیں لیکن مدرسہ فیروز شاہی جیسی خوبصورت عمارت اور اس کی جیسی روح افزا ہوا کہیں نہیں پائی، یہ اپنی خوبی اور تناسب کے لحاظ سے ایسی نادر ہے کہ خورنق نے بابل میں جو عمارت بنائی یا کسریٰ نے جو محل بنوایا، ان پر اپنی برتری کا دعویٰ کرے تو جائز ہوگا۔"

پھر مدرسہ کی معنوی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے، مولانا ضیاء الدین برنی رقمطراز ہیں کہ یہ خیرات حسنات کا منبع ہے، اس میں لازمی و متعدی دونوں قسم کی عبادتیں کی جاتی ہیں، پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا ہوتی ہے، ان کے علاوہ صوفیہ، چاشت، اشراق، زوال، اوابین اور تہجد کی نمازیں پڑھتے رہتے ہیں، اور شب و روز یہیں اپنا وقت گذارنا پسند کرتے ہیں، یہیں نہایت قابل استاد مولانا جلال الدین رومی دینی علوم کا درس دیتے رہتے ہیں، تفسیر، حدیث اور فقہ کی بھی تعلیم دیتے ہیں، حفاظ ختم قرآن کرنے میں مصروف رہتے ہیں، موذن جب اذان دیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آواز آسمان تک پہونچ رہی ہے، طلبہ کے لیے وظائف اور انعامات مقرر ہیں، ان کے دسترخوان نعمتوں سے بھرے رہتے ہیں، یہاں جو بھی ہوتا ہے۔

چاہے عبادت کرنے والے ہوں یا طلبہ یا اساتذہ، یا اہلِ یاد اگر یا باہر سے آکر یہاں مقیم ہوں سب کی راحت اور آسائش کا سامان کیا جاتا ہے، یہ سب کچھ لکھ کر مولانا ضیاء الدین برنی ایک بادشاہ کی عمارت کی تعریف یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ شداد بن عاد نے باغ ارم تعمیر کیا تھا لیکن اس منحوس عمارت سے کسی کو فائدہ نہیں پہونچا، مگر اس مدرسہ کی عمارت کو اس سے برتری حاصل ہے، یہ عالموں صالحوں اور عابدوں کی معدن و منبع بنی ہوئی ہے، دہلی میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں ان میں بے حساب روپئے خرچ کیے گئے لیکن اب وہ دیوؤں اور پریوں کا مسکن بنی ہوئی ہیں، اس کے مقابلہ میں مدرسہ فیروز شاہی کی عمارت میں جو خوبصورتی، فرحت اور راحت موجود ہے، وہ کسی اور میں نہیں (تاریخ فیروز شاہی، صفحہ ۵۶۵ - ۵۶۲)

فیروز شاہ نے ایک دوسرا مدرسہ بالا بند سیری میں قائم کیا تھا جس کی عالی شان اور خوبصورت عمارت مدرسہ فیروز شاہی ہی کی طرح تھی، یہ مدرسہ قصر معلوم ہوتا تھا، اس میں بہشت کے سے باغ اور سبزہ زار نظر آتے، اس کے نگراں اور مدرس مولانا سید الائمہ العلی نجم الملت والدین سمرقندی تھے، ان کے لئے گاؤں، وظیفہ اور انعام مقرر تھے۔ بہت سے طلبہ کو نان اور خوراک وظیفے کے طور پر دی جاتی تھی، جو روزانہ دینی علوم کے درس لیتے (تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۶۶ - ۵۶۵) فیروز شاہ نے اپنے لڑکے شہزادہ فتح خان کے مقبرہ کے ساتھ بھی ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا جس کے اخراجات حکومت کی طرف سے برداشت کئے جاتے ان کے علاوہ اس عہد میں ۳۰ اور مدرسے قائم کئے گئے۔ (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۵۱)

ہمایوں نے دہلی میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے، پھر ہمایوں کے مقبرہ کے اوپر بھی ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ مقبرہ کے پہلو کے چھوٹے چھوٹے کمروں میں طلبہ رہا کرتے تھے، عہد اکبری میں اکبر کی مرضعہ ماہم بیگم نے پرانے قلعہ کے مغربی دروازہ کے

سامنے ایک مسجد اور ایک مدرسہ بھی بنوایا، جس کا نام خیر المنازل تھا، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے دہلی کے جس مدرسہ میں تعلیم پائی، اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا، دہلی کی شاہجہانی مسجد کے جنوبی رخ پر بھی ایک شاہی مدرسہ تھا جس کا نام دار البقا تھا، شاہ عبدالرحیمؒ نے دہلی میں جو مدرسہ قائم کیا، اس میں شاہ ولی اللہ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، شاہ اسحٰقؒ اور شاہ عبدالقادرؒ جیسے جید اور نادرہ روزگار علما نے تعلیم پائی، اور باری باری اسکے مسند درس و تدریس پر متمکن ہوئے۔

بہادر شاہ اول کے عہد میں غازی الدین خاں فیروز جنگ نے اجمیری دروازہ کے پاس ایک مدرسہ قائم کیا، لکھنو کے نواب اعتماد الدولہ فضل علی خان نے اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے ایک لاکھ ستر ہزار روپیے دیئے تھے، محمد شاہ کے عہد میں نواب شرف الدولہ ارادت خاں نے بھی ۱۱۳۵ھ میں یہاں ایک مدرسہ قائم کیا، (مزید دیکھو ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ، صفحہ ۲۰-۲۰)

افسوس ہے کہ دہلی کے ان تاریخی مدارس کے نام و نشان تک مٹ گئے ہیں، محکمہ آثار قدیمہ کے ماہروں کو ان کے کھنڈرات بھی کہیں مشکل ہی سے ملیں گے،

جس مدرسہ سے قاضی ابو یوسف اور امام شیبانی کے پایہ کے بزرگ پیدا ہوئے یا جس مدرسہ کی عمارت باغ ارم اور قصرِ کسریٰ سے برتر تھی، یا جس مدرسہ سے تعلیم پاکر شیخ عبدالحق دہلویؒ جیسے محدث نے ہندوستان میں حدیث کی قندیلیں روشن کیں یا جس مدرسہ میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ اسمٰعیل نے تعلیم پاکر دینی علوم کا سونا پھیلایا اور اپنی تحریروں کی نکہت بیزیوں سے ہندوستان کے اسلامی ماحول کو معطر معطر کیا، ان کو تو انکی ملت سینوں سے لگائے رکھتی، مگر ان کے نام و نشان مٹ گئے، آخر کیوں؟

صوفیائے کرام کے مقبروں اور خانقاہوں کی عمارتیں جب سے تعمیر ہوئیں، اب تک قائم ہیں، حالانکہ ایک بڑے طبقہ کا یہ الزام ہے، کہ ان ہی سے بدعتیں پھیلیں، مگر جن مدرسوں سے توحید، رسالت، ارکان اربعہ اور ایمان کے سرچشمے بہتے رہے، وہ کیوں ختم ہو گئے ؟ ہمارے پاس اس وقت کوئی ایسا مدرسہ نہیں جس کی تاریخ صدیوں کی ہو، یہ عجیب المیہ ہے، کہ جب مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت اور حکومت ہندوستان میں ختم ہوئی، تو انتہائی بے سروسامانی اور حکومت کی سرپرستی کے بغیر جو مدرسے قائم ہوئے، ان کے تو صد سالہ جشن دھوم دھام کے ساتھ منائے جا رہے ہیں، مگر جب حکومت کی سرپرستی حاصل رہی اور مدرسوں کے لیے بہشت کے نمونے کی عمارتیں تعمیر ہوئیں، ان کے لیے جاگیریں بھی وقف ہوئیں، ان کے اساتذہ خاطر خواہ تنخواہیں بھی پاتے رہے، اور ان کے طلبہ کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا بہتر سے بہتر انتظام تھا، وہ آج نقش ونگار طاق نسیاں ہو گئے ہیں، یورپ کی بعض تعلیم گاہوں کی تاریخ صدیوں سے چلی آ رہی ہے، مگر ہمارے پاس ایک بھی ایسا مدرسہ نہیں جس کی بقاء کی میعاد صدیوں تک رہی ہو، آخر کیوں ؟

اس کا جواب اگر جذباتی اور تاویلی انداز میں دیا گیا تو وہ اطمینان بخش نہیں ہوگا، بلکہ اس کا جواب مورخانہ اور مبصرانہ انداز میں ڈھونڈنا پڑے گا، اس سلسلہ میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، اس زمانے کے علماء میں قاضی ابو یوسف اور امام شیبانی تو پیدا ہوئے، وہ محدثین فقہا، اور مفتی بن کر عالم اسلام میں نمایاں رہے، مگر آخر وہ مدرسہ فیروز شاہی جیسے شاندار مدرسہ کو کیوں باقی نہیں رکھ سکے ؟ یا شاہ عبدالرحیم کی قائم کردہ درسگاہ کی تاریخ کو لمبی کیوں نہ بنا سکے ؟ کیا اس لیے کہ ان میں حرارت ایمانی تو ضرور رہی، مگر وہ اپنے کو فعال نہ بنا سکے وہ دعوت تو دیتے رہے مگر ان میں عزیمت نہیں رہی، وہ محراب و منبر کی زینت تو بنے رہے، مگر

ان میں تنظیمی اور تعمیری صلاحیتیں پیدا نہیں ہوئیں، وہ درس و تدریس دینے میں تو نادرۂ روزگار تھے، لیکن وہ حکومت یا عام معاشرے پر اس طرح اثر انداز نہیں ہو سکے کہ وہ ان مدرسوں کو قائم رکھتے، وہ اپنے عقائد میں بڑے راسخ اور پاکیزہ تو رہے، مگر دوسروں کے عقائد سے طی نظر ان کو ایسا اختلاف رہا کہ ان میں وہ باہمی یگانگت دروانت پیدا نہ ہو سکی، جو اپنے تعلیمی اداروں کو ایک باضابطہ تنظیم کے ساتھ موتیوں کی لڑیوں اور تسبیح کے دانوں کی طرح اس طرح ملائے رکھتے کہ ایک دوسرے کو بڑی تقویت پہونچتی رہتی اور جو مدرسے قائم ہوتے وہ ایسے چلتے رہتے کہ آج ان کا صد سالہ کیا بلکہ ہفت صد سالہ جشن منایا جاتا۔

مورخانہ تجزیہ کیا جائے تو ان مدرسوں میں جو تعلیم ہوتی رہی، ان سے حسب ذیل قسموں کے علماء پیدا ہوتے رہے،

(۱) ایک قسم تو پاک طینت علماء کی تھی جنھوں نے اپنے کردار کو ہر حال میں اعلیٰ اور اونچا رکھا، وہ دوسرے علماء کے لیے نمونہ بنے، مگر ایسے علماء یا تو گوشہ نشیں ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے یا تصنیف و تالیف میں وقت صرف کرتے۔

(۲) دوسری قسم میں وہ علماء تھے، جن کا مشغلہ درس و تدریس تھا، ان کے تلامذہ حصول تعلیم کے بعد ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل جاتے، عوام میں اسلام کے نقیب و محافظ ہوتے، ان ہی کی بدولت قَالَ اللّٰہُ وَقَالَ رَسُولُ اللّٰہ کی صدائیں مختلف گوشوں میں بلند ہوتی رہتیں، مگر صرف محراب و منبر کی زینت بننے ہی پر اکتفا کرتے، یا درس و تدریس میں لگ جاتے۔

(۳) تیسری قسم میں وہ علماء تھے، جو حکمران طبقہ کے معاون اور مددگار بن گئے۔ گوشہ نشین پاک طینت علماء ایسے علماء کو جاگیردار، دنیادار اور جاہ پرست کہتے، ان کا خیال تھا کہ جو علماء دربار سے وابستہ ہوتے ہیں، ان کا نام اللہ کی بارگاہ سے خارج ہو جاتا ہے، مگر حکمران طبقہ کے

معاون علماء کے گوشہ عافیت میں بیٹھ کر عبادت وریاضت سے عاقبت تو ضرور سنور جاتی ہو،
لیکن ملت نظر انداز ہوجاتی ہے۔

مدرسوں سے نکلے ہوئے، ان تین قسموں کے علماء کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ آخر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنی زندگی میں جو تجدیدی کارنامے انجام دیئے، ویسے کارنامے ہر زمانہ میں کسی عالم نے تنہا نہیں تو مجموعی حیثیت سے کیوں نہیں انجام دیا، یا آخری زمانہ میں حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور سید اسمٰعیل شہیدؒ نے جس ایمانی ولولہ انگیزی سرفروشی، جانبازی اور قربانی کا ثبوت دیا، اس کی مثال صرف ایک ہی کیوں ہے۔

ہمارے علماء مسلمانوں کے دور حکومت میں برابر کڑھتے رہے، کہ مسلمان حکمرانوں کے طرز حکومت میں قیصر وکسریٰ کا فاسقانہ اور فاجرانہ رنگ ہے، مگر وہ ان حکمرانوں کو خلفائے راشدین کے طرز حکومت کا عمل پیرا کیوں نہیں کرا سکے، کہا جاسکتا ہے کہ ان حکمرانوں کے قاہرانہ، جابرانہ اور خود غرضانہ طرز عمل کو قابو میں لانا ان کے بس کی بات نہ تھی مگر عوام کو اپنی دعوت وعزیمت سے اپنا ہمنوا اس طرح بنا سکتے تھے کہ یہ عوام غیر معمولی طور پر اچھے ہوجاتے، تو خواص وسلاطین بھی انکے رنگ میں رنگ جاتے، مگر عوام تو خود ان فاسق وفاجر حکمرانوں کے رنگ میں رنگتے چلے گئے، اس کی ذمہ داری کس پر آتی ہے، عوام کو مذہبی بنانا حکمران طبقہ کا کام نہیں، اس کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے، کیا وہ مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں اس ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہوئے؟ اس کا تجزیہ ناقدانہ طور پر کرنے کی ضرورت ہے، سلاطین وخواص کا برا ہونا کوئی تعجب انگیز نہیں، دولت وامارت کے ساتھ فسق وفجور کا آنا لازمی ہوجاتا ہے، مگر اس دور میں ہمارے مسلمان عوام کا معاشرہ صالح، توانا اور تندرست ہوتا تو شاید ان کے حکمرانوں کی سلطنت پر زوال نہ آتا، ہمارے علماء اپنے حکمرانوں کی حکومت سے بدظن ہوکر

خلافت راشدہ کے طرز حکومت کے خواہاں تو ضرور رہے لیکن اس طرز حکومت کے [illegible]
راشدہ کی معاشرت بھی پیدا کرنے کی ضرورت تھی، جو علماء ہی کے ذریعے پیدا ہو
ہو سکتی تھی، لیکن وہ محراب و منبر اور درس و تدریس کی دو نقطے بچھی پر اکتفا کرتے رہے احیائے
دین اور تجدید یقین کے لیے جس اجتہاد، قوت محرکہ اور عزیمت کی ضرورت تھی، ان کو عمل میں لائے۔

مسلمان بادشاہوں اور ان کے فوجی سرداروں میں شہاب الدین غوری نے ترائین کی
جنگ جیت کر ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کی ایسی بنیاد ڈالی کہ وہ ساڑھے چھ سو
برس تک چلی، بختیار خلجی نے مٹھی بھر فوج لے کر بہار اور بنگال کی تسخیر کی، علاء الدین خلجی کے دربار
کا ایک خواجہ سرا ملک کافور فوجی سردار بن کر دہلی سے چلا تو پورے جنوبی ہند کو فتح کر کے اس کو
سلطنت دہلی کے ماتحت کر دیا، اکبر نے راجپوتوں کے دلوں کی تسخیر کر کے پورے راجستھان کو
اپنے قلمرو کا باجگذار بنالیا، اورنگ زیب کے زمانے میں مسلمانوں کی حکومت کا پرچم کشمیر سے
ارکان تک لہراتا رہا، ہندوستان کو اسی نے پہلی بار جغرافیائی وحدت عطا کی۔

ایسی مثالیں علماء کے طبقہ سے بھی ملنی چاہیے تھیں، وہ بھی اٹھتے اپنی تبلیغ و تلقین سے خطے کا
خطہ اسلام کے دائرے میں لے آتے، وہ ایسا کسی وجہ سے نہ کر سکے تھے، تو کم از کم کوئی ایک
ایسی شاندار درسگاہ بنا کر اس کو اپنے سینوں میں اس طرح لگائے رکھتے کہ یہاں سے اس وقت
سے لیکر اب تک دینی علوم کا سوتا پھلا کرتا، مگر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
ان کے مدرسے ختم ہونے کے لیے قائم کئے جاتے رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صبح الاعشیٰ میں ہے کہ
دہلی میں تغلق کے عہد میں ایک ہزار مدرسے تھے، اس زمانہ میں بھی اسکا فیصلہ کرنا مشکل ہوتا
کہ ان میں کتنے واقعی دین کی تعلیم کی ترویج کی خالص نیت سے کتنے دینی اور فقہی اختلافات کی
بنا پر کتنے باہمی رقابت اور کتنے ذاتی جلب منفعت کی خاطر قائم ہوئے تھے، ان میں سے کسی کی بھی

ارغ لمبی ہوتی، تو وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی علوم و فنون کی ترویج کا بہت بڑا قلعہ بنا رہتا۔

جب تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں رہی، اس کی سرپرستی میں دینی مدارس کے پھلنے پھولنے کا پورا موقع تھا، یہاں کے فارغ شدہ علماء اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں اسی قسم کی تنظیم قائم کر سکتے تھے، جو برطانوی حکومت کے زمانے میں عیسائی مبلغوں نے پورے ملک میں کی تھی، مگر وہ یہ بھی نہ کر سکے، یہ صحیح ہے کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت علمائے کرام ہی کی بدولت وجود میں آئی، مگر دہلی سے بنگال تک جو علاقے ہیں، ان میں مسلمانوں کی اکثریت کیوں نہیں ہو سکی، دہلی اور اس کے اطراف و جوانب میں بزرگان دین کے مزارات قدم قدم پر ملیں گے، مگر یہ علاقے پورے طور پر اسلام کی شمع سے منور کیوں نہیں ہو سکے؟ یہ صحیح ہے کہ یہ مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے تو نہ ہو سکے، لیکن ان ہی علاقوں سے دینی علوم کا سرچشمہ پورے ہندوستان میں بہتا رہا، اور اب بھی بہہ رہا ہے، مگر جب یورپ میں محققین اور مفکرین ہر قسم کے علوم و فنون پر کتابیں لکھ کر نئے نظام حیات اور نئی فکر و نظر سے اپنی قوموں کو روشناس کر رہے تھے، تو ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کیا ہمارے علماء ہم کو اپنی ایسی ہی تصانیف دے رہے تھے؟ انھوں نے اس زمانے میں کتابیں ضرور لکھیں، لیکن ان سے عام مسلمان زیادہ مستفید نہیں ہو سکے، جو کچھ لکھتا ایک خاص طبقہ تک محدود رہتا۔ جو خود تو ان کو پڑھ کر سمجھ لیتا، مگر عوام کو سمجھانے میں قاصر رہا، اسلئے ایسے علماء کی نظری و فکری چیزیں زیادہ نہیں پھیل سکیں، ان میں زیادہ تر تقلید ہی کے قائل تھے، اس تقلید جامد کا روشن پہلو یہ ضرور رہا کہ مسلمانوں کی مذہبی غیرت اور دینی حمیت ایسی برقرار رہی کہ وہ غیر مسلموں کے تصورات سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے، اور ان کی انفرادیت مٹ نہ سکی، مگر اس انفرادیت کو جاندار بنائے رکھنے میں معاشرہ کے نئے جائز تقاضوں کی تکمیل کی خاطر جس مجتہدانہ فکر اور عزیمت بالعمل کی

ضرورت تھی وہ بروے کار نہیں آتی رہیں۔

ایک بات اور، اس زمانہ کے رہنماؤں سے جو علماء پیدا ہوئے، کیا انھوں نے ہندوستان جیسے ملک میں اسلام کے رب کو رب المسلمین یا رب العالمین، اور پھر اسلام کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رحمۃ المسلمین یا رحمۃ العالمین بنا کر پیش کیا؟ ہم خود سوچیں کہ ہمارے علماء نے ان میں سے کون سا رنگ اختیار کیا، پاک طینت علماء کے یہاں تو بڑی رواداری اور فراخدلی رہی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض علماء نے اپنی انتہاپسندی میں ایسی اشتعال انگیز تحریریں لکھیں جن سے رب العالمین رب المسلمین اور رحمۃ اللعالمین رحمۃ المسلمین ہی سمجھے گئے، اس سے اسلام کی تبلیغ میں وہ فروغ حاصل نہیں ہوسکا، جو ہونا چاہئے تھا۔

اگر ہمارے علماء بالعزم اور بالجزم ان ہی باتوں پر عمل کرتے رہتے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ نے نجران کے عیسائیوں کے لیے روا رکھا تھا، تو کیا عجب کہ اس رواداری، فراخدلی اور سیرچشمی سے اس ملک میں ہماری تاریخ کچھ اور ہوتی، اس سے انکار نہیں کہ علماء اور صوفیائے کرام ہی کی بدولت اسلام ہندوستان کی سرزمین میں سرسبز اور شاداب ہوا، مگر ہماری محرومی یہ بھی ہے کہ انھوں نے یہاں کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کے لیے جو روادارانہ اور فراخدلانہ اقدام کئے، ان کی تاریخ قلمبند نہیں کی گئی، اس کے بجائے ان کے باہمی اختلافات اور تنازعات کو زیادہ نمایاں کیا گیا،

ماضی کی باتیں اس لحاظ سے قابل اعتنا ہوتی ہیں، ان سے حال میں درس لے کر مستقبل کو سنوارا جاسکتا ہے، ماضی میں اسلامی درسگاہوں سے نکل کر ہمارے علماء نے جو روشن کارنامے انجام دیئے ان کی تو ہم قدر کرتا سکیں، مگر ان سے جو کسی وجہ سے کوتاہی ہوئی اس کی تلافی موجودہ دور کی اسلامی درسگاہوں کے علماء ہی کو کرنا ہے، کیونکہ ان سے جو علماء نکلتے ہیں

وہی صحیح معنوں میں اسلام کے نگہبان اور پشتیبان ہوتے ہیں، موجودہ دور میں ذہنی ارتداد لادینی تصورات اور گمراہ کن نظری اور فکری تخیلات کا بے پناہ لشکر آگے بڑھتا چلا آرہا ہے، ان کے خلاف مقدس ترین جہاد کرنے کے لیے ہمارے مدرسوں ہی کے سرفروش اور جانباز مجاہدین تیار ہو سکتے ہیں، لیکن اگر ان کو محراب کی امامت ہی پر اکتفا کرنا ہے، تو پھر دعا ہے کہ

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہو ملت کی زندگی کا پیام

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون پر اور جگہوں کے مقابلہ میں کم کام نہیں ہوا ہے، ان تمام علوم پر ہندوستانی علماء اور مصنفین کی بہترین کتابیں موجود ہیں لیکن ان کی کوئی جامع فہرست موجود نہیں تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مولانا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب سابق ناظم ندوۃ العلما نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے ایک مفید کتاب مرتب کی تھی، جس کو شام کے مشہور علمی ادارے مجمع العلمی العربی دمشق نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، یہ اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس میں ہندوستانی علماء کی تصانیف کے ساتھ مسلمانوں کی مکمل علمی و تعلیمی و ذہنی و فکری تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

مترجمہ مولانا ابو العرفان ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

ضخامت :- قیمت : ۲۵ روپے

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں :- قیمت : ۱۰ روپے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث (الجزء الثالث)

مرتبہ مولانا حافظ محمد یوسف کوکن صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، طباعت عمدہ، کتابت ٹائپ، صفحات ۲۰۲، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: حافظ ہاؤس پرنٹرز اینڈ پبلشرز ۱۳ حارث پیلا مدراس ۱۷۔

مولانا حافظ محمد یوسف کوکن نے عربی زبان و ادب کے جدید شعراء و مصنفین کے حالات و سوانح کی ترتیب و اشاعت کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس کی دو جلدیں پہلے چھپ چکی تھیں، جن پر معارف میں ریویو کیا جا چکا ہے، یہ تیسری جلد ہے جو چھیالیس اصحاب شعر و ادب کے تراجم پر مشتمل ہے، ان میں چند کا انتقال اس صدی کے ربع اول میں ہوا ہے لیکن زیادہ ایسے لوگ ہیں جن کا انتقال اس صدی کے نصف اول میں ہوا ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جن کی وفات ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیان ہوئی، لائق مصنف نے ان اصحاب علم و ادب کے حالات و واقعات زندگی قلمبند کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کی علمی، ادبی، تنقیدی، شعری، سیاسی اور سماجی خدمات پر مفید بحث و تبصرہ بھی کیا ہے اور ان کے ادبی کارناموں کی اہمیت بھی دکھائی ہے، اس کتاب میں جن لوگوں کا ترجمہ شامل ہے، ان میں بعض اہم اور قابل ذکر نام یہ ہیں: احمد لطفی السید، شیخ مصطفےٰ صادق رافعی، عبد الرحمٰن شکری، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، ڈاکٹر احمد امین، ڈاکٹر زکی مبارک، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، عباس محمود عقاد، توفیق الحکیم، ڈاکٹر احمد حسن زیات، خیر الدین زرکلی، خلیل مردم بک، شفیق جبری، حسن البنا اور سید قطب وغیرہ، ان میں اکثر مصنفین کی تصنیفات کے اردو ترجمے بھی ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اردو داں طبقہ ان کے ناموں سے واقف ہے، اس جلد میں متعدد ایسے شعراء اور اہل قلم کا ذکر ہے جن میں دینی، ادبی، تنقیدی اور تاریخی مسائل پر باہم بحث

...رہ چکا ہے، جن کا ذکر مصنف نے ان کے ترجمے میں کیا ہے، اس کتاب میں جہاں ادبی حیثیت سے ممتاز بعض
...کا تذکرہ ہے وہاں بعض ایسے لوگوں کا بھی ذکر ہے جن پر الحاد و زندقہ کا الزام عائد کیا گیا ہے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین
...لوگوں میں ہیں، مصنف نے ان کے متعدد ایسے خیالات نقل کئے ہیں جن کی وجہ سے اصحاب علم و دین نے ان
...نکتہ چینی کی ہے، مثلاً آزادیٔ نسواں کی حمایت، پردہ کی مخالفت، وطن و دین کی تفریق، حکومت کی اساس دین
...ئے عربی قومیت کو قرار دینا اور اپنی تصنیفات الشعر الجاہلی اور الادب الجاہلی میں جاہلی شعر و ادب کو منحول ثابت
...وغیرہ، فاضل مصنف نے بڑی محنت اور سلیقہ سے موجودہ دور کے ممتاز عربی ادیبوں اور شاعروں کے حالات
...کارناموں کے بارہ میں مفید اور دلچسپ معلومات جمع کئے ہیں، ان کو اردو کی طرح عربی لکھنے کا اچھا ملکہ ہے، اس
...سے عربی زبان و ادب پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ عربی زبان و ادب کے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے
...ئق ہے،

قرآن مجید اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ مرتبہ جناب رشید احمد جالندھری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۰۰، قیمت ۲۰ روپیے، ناشر جامعہ بلوچستان کوئٹہ

بلوچستان یونیورسٹی میں پندرہویں صدی ہجری کے استقبال کی مناسبت سے "قرآن مجید اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ"
...کے موضوع پر ایک علمی مذاکرہ منعقد ہوا تھا، یہ کتاب اس میں پڑھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے،
...حصہ میں تین اردو اور دوسرے میں تین انگریزی مضامین شامل ہیں، اردو حصہ کی ابتدا میں جامعۂ بلوچستان کے سربراہ
...اکبر شاہ کی افتتاحی تقریر اور مولانا محمد طیب مرحوم مہتمم دار العلوم دیوبند کا پیغام بھی درج ہے، اس حصہ کا اہم اور
...بسوط مضمون خود فاضل مرتب کا ہے، انھوں نے شریعت اور قانون کی وسعت و ہمہ گیری، اجتماعی زندگی میں ان کی
...ہمیت اور ان کے بنیادی مقصد پر بحث کرکے موجودہ زمانہ میں اسلامی قوانین کا از سر نو جائزہ لینے کی دعوت دی ہے
...اور اس سلسلہ میں اجتماعی زندگی کو پورے طور پر قرآن اور اسلام کی اخلاقی و اجتماعی قدروں کی بنیاد پر استوار کرنے
...کی ضرورت واضح کی ہے، مولانا محمد طاسین مجلس علمی کراچی کے مقالہ "قرآن مجید کا تصور معاشرہ" میں پہلے اجتماعیت و انفرادیت

کے بارہ میں قرآن کا تصور پیش کیا گئے ہیں اسا آخر میں ان خصوصیات کا ذکر ہے جو قرآن میں، ڈاکٹر صبحی حسن مصری نے چودہویں صدی ہجری میں لکھی جانے والی منتخب ذیل اہم تفاسیر کا تعارف کرایا ہے : (۱) ترجمان القرآن (مولانا ابوالکلام آزاد) (۲) تفہیم القرآن (مولانا سید ابو الاعلی) (۳) معارف القرآن (مولانا مفتی محمد شفیع) (۴) تفسیر معارف القرآن (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) تدبر قرآن (مولانا امین احسن اصلاحی) (۶) ترجمہ و تفسیر (مولانا عبدالماجد دریابادی) انگریزی مضامین یہ ہیں : (۱) قرآن مجید کا فلسفیانہ پہلو (پروفیسر منظور احمد کراچی یونیورسٹی) (۲) قرآن مجید میں کال (پروفیسر سید حسین جعفری، بیروت یونیورسٹی) اسمائے حسنیٰ اور تقوٰی کا کلام (آر۔ اے۔ بٹلر) شروع سے قرآن مجید کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنے اور اس کی بنیادوں پر نئے معاشرہ کی داغ بیل ڈالنے کی پُر شد یہ سب مضامین غور و فکر سے لکھے گئے ہیں اور مطالعہ کے لائق ہیں۔

کردار کے غازی قاضی محمد عدیل عباسی } مرتبہ ڈاکٹر اختر بستوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت، صفحات ۲۵۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۰ روپیے پتہ (۱) اینڈ سنس ریتی کا پل، گورکھپور (۲) دانش محل، بکسیلرز، امین الدولہ پارک، لکھ

یہ کتاب مشہور قومی و ملی کارکن، بستی کے کامیاب وکیل اور اردو کے اچھے خطیب و اہل قا عباسی مرحوم پر اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو ان کی وفات کے بعد مختلف اخباروں اور رسا ان کی پہلی برسی کے موقع پر بستی کے ہفتہ وار اخبار بستی کی آواز کے قاضی محمد عدیل عباسی ہوئے تھے، اب ڈاکٹر اختر بستوی استاد شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے عام فائدہ کے لئے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، شروع میں انھوں نے قاضی صاحب کے اہم واقعات سنہ وا اس میں ان کی تصنیفات کی فہرست بھی دی ہے ایک اور تحریر میں قاضی صاحب کے والد بزرگ سے قاضی صاحب کی صحیح تاریخ پیدائش نقل کی گئی ہے، اس کے بعد مختلف اہل قلم کے ۲۲ مضا

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، علی جواد زیدی، حیات اللہ انصاری اور ڈاکٹر

کے مضامین بھی اس کتاب کی زینت ہیں۔ قاضی صاحب کے عزیزوں میں ان کے دونوں بھائیوں مولانا

عباسی ندوی اور قاضی خلیل عباسی، خویش محمد حامد علی، فرزند قاضی محمد ارشد عباسی اور احباب

عنوان پرشاد سری واستوا اور حکیم ابو الکلام کے مضامین سے ان کے متعلق مفید معلومات حاصل ہو

جناب خلیل الرب کا مضمون خاص طور پر پسند آیا، دوسرے مضامین بھی اچھے ہیں، آخر میں شعرا کا

خراج عقیدت درج ہے۔ قاضی صاحب بڑے عملی آدمی اور بے باک کردار کے غازی تھے، وہ فرقہ واریت

اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارہ میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف عمر بھر جہاد کرتے رہے اور اتر پر

دینی تعلیمی تحریک کی تاسیس و تشکیل ان کا بڑا کارنامہ ہے، انھوں نے قوم پروری اور حب الوطنی کے جذ

سرشار ہونے کے باوجود اپنی ایمانی غیرت اور ملی حمیت پر آنچ نہیں آنے دی، اس کتاب میں ان خصوصیا

ان کے خاندانی حالات، تعلیم، قومی، ملی و سیاسی مشاغل، تحریر و تصنیف اور سیرت و کردار کی بلندی پ

ڈالی گئی ہے، جس کا مطالعہ مفید اور سبق آموز ہے، مگر یہ کمی رہ گئی ہے کہ ان کی مطبوعہ تصنیفات کا

اور غیر مطبوعہ کا سنہ تصنیف نہیں دیا ہے۔

پٹھان شاعرات کا تذکرہ مرتبہ ڈاکٹر خان محمد عاطف خاں، تقطیع خورد، کاغذ معمولی

کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲۲، قیمت تحریر نہیں، پتے: (۱) ڈاکٹر خان محمد عاطف

۳/۲۳۔ اسٹیشن روڈ، لکھنؤ، (۲) صدیق بکڈپو۔ امین آباد، لکھنؤ،

ڈاکٹر خان محمد عاطف لکچرر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی نے اس کتاب میں ۵۰ پٹھان شاعرات ک

قلمبند کیا ہے اور ان کا نمونۂ کلام بھی دیا ہے، ڈاکٹر صاحب ملیح آباد کے پٹھان خاندان سے تعلق رکھ

اس کتاب میں چند ملیح آبادی خواتین کا ذکر بھی ہے، شروع میں دیباچہ اور معلومات پر مشتمل مقدمہ بھی ہے

میں عورتوں کی اہمیت اور سماجی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے اسلام کی بعض ہدایات پیش کی گئی ہیں، م

پٹھانوں کی خصوصیت رہی ہے کہ ... دکھایا ہے کہ صاحب شمشیر و سنان ہونے کے ساتھ [illegible]

بھی تھے جس کا ثبوت پٹھان عورتوں کی شاعری ہے کہ جب ان کے ذوقِ شعر و سخن کا یہ حال ہو تو مرد

بھلا اس میں کیوں پیچھے رہ سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں پٹھانوں کی اصل زبان پشتو اور فارسی دونوں زبانوں

کی شاعری کے نمونے دیئے ہیں اور پٹھان شاعری کے مزاج و خصوصیات پر بھی گفتگو کی ہے، مقدمہ میں پٹھانوں کی

مختصر تاریخ اور ہندوستان میں ان کی سیاسی و سماجی خدمات کا ذکر ہے، مصنف نے پٹھانوں کے آرین ہونے کی تردید

کی ہے اور انھیں نسلاً اسرائیلی قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں آریوں کے متعلق ضروری معلومات تحریر کرکے یہ ثابت کیا ہے

کہ وہ نسل و قوم کے بجائے مذہب و عقیدہ کی بنیاد پر آریہ کہلاتے تھے، اصل تذکرہ مختصر ہے، اکثر خواتین کی ولادت

و وفات کے نہ سنین کا ذکر ہے اور نہ کلام پر سیر حاصل تبصرہ، مصنف نے دیباچہ میں اس اختصار کی کوئی وجہ نہیں لکھی

ہے، تاہم انھوں نے ایک انوکھے موضوع کا انتخاب کرکے اور اس پر اس قدر مواد جمع کرکے بھی اپنے ذوق، محنت اور

لگن کا ثبوت دیا ہے، جابجا کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی ہیں، متعدد الفاظ کا املا بھی درست نہیں ہے، جیسے

مورخ علمی ص۲۲ (اجتبیٰ) نصب ص۲۶ (نسب) اثبات ص۸۲ (اسباط) لا تمنوا ص۱۲۸ (لا تمنعوا) دقائق

ص۱۳۱ (حقائق یا دقائق) خلقت ص۱۵ (خلعت) ص۱۳۹ پر دو عربی شعر بالکل غلط تحریر کئے گئے ہیں، ص۱۱۹ پر

"قرآن پاک کی مبارک الفاظ" لکھا ہے اور ص۱۲۳ پر واقف کا لفظ بالکل غلط استعمال ہوا ہے، لکھتے ہیں "آج مرحومہ

دنیائے ادب میں ز۔ خ۔ ش کے نام سے واقف ہے۔"

مکاتیب نگم مرتبہ جناب محمد ایوب واقف صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت

عمدہ بہتر، صفحات ۱۸۲، مجلد، قیمت ۲۰ روپیے، پتے: (۱) انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر

نئی دہلی، (۲) محب بکڈپو، بھنڈی بازار، بمبئی (۳) نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔

اردو کے محب و شیدائی اور بے لوث خدمت گذار منشی دیا نرائن نگم کی زندگی رسالہ زمانہ کے لئے وقف

ہوگئی تھی، جس نے نصف صدی تک قوم و ملک کی ذہنی و روحانی تربیت اور اردو زبان و ادب کی زریں خدمت

کے علاوہ اردو کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی شہرت میں چار چاند لگائے، دیا نرائن نگم کے اپنے دور کے مشاہیر
اور اچھے اہل قلم سے مخلصانہ روابط تھے، اس لئے ان سے ان کی برابر خط و کتابت رہتی تھی، مگر ابھی تک نہ ان کے
خطوط کا کوئی مجموعہ چھپا ہے اور نہ اس کی توقع ہی تھی کیونکہ ان کی وفات کو طویل عرصہ گذر چکا ہے اور جن لوگوں
کو وہ خطوط لکھتے رہے ہیں ان میں سے اکثر لوگ بھی اب موجود نہیں رہ گئے ہیں، مگر جناب محمد ایوب واقف کی
محنت و کوشش سے منشی جی کے ۰ ۹ خطوط کا یہ مجموعہ شائع ہوا ہے، جس کے لئے وہ اور منشی جی کے فرزند اور
اس مجموعہ کے ناشر جناب برج نرائن نگم اردو زبان و ادب کے قدر دانوں کی تحسین کے مستحق ہیں، منشی جی کی تحریریں
سلیس اور شگفتہ ہوتی تھیں، یہ خطوط اس کا نمونہ ہیں، ان سے اردو زبان اور رسالہ زمانہ سے ان کے عشق و رسالے
کے معیار کو بلند کرنے کی فکر، اس کی ترتیب میں غیر معمولی محنت و دماغ سوزی، نوجوان اور ہونہار ادیبوں کی
تربیت اور حوصلہ افزائی اور مشاق اہل قلم کی قدر دانی کا پتہ بھی چلتا ہے اور بعض اہل قلم نیز اردو انجمنوں اور
تحریکوں کے بارہ میں ان کے خیالات اور زبان و ادب کی بعض مفید باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں، شروع میں ایک
مقدمہ میں خطوط نگاری کی ادبی اہمیت، منشی جی کے خطوط کی خصوصیات اور ان کی خدمات ادب پر اچھی بحث
کی گئی ہے، آخر میں ان لوگوں کا مختصر حال تحریر کیا ہے جن کے نام کے خطوط اس مجموعہ میں درج ہیں اور مکاتیب
میں جن لوگوں کا ذکر آگیا ہے ان پر مختصر توضیحی حواشی بھی دیئے ہیں، واقف صاحب کو لکھنے پڑھنے کا شوق
اور لگن ہے، مگر ابھی وہ نوجوان ہیں اس لئے ہلکے پھلکے کاموں پر محنت و مطالعہ کو ترجیح دینا اور کمیت
سے زیادہ کیفیت کا خیال رکھنا چاہیئے، تاکہ ان کی تحریر گہرائی اور گیرائی سے خالی نہ رہے۔

بین السطور از جناب صبیح محسن صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر،
صفحات ۲۰۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت بیس روپے، پتہ: مکتبہ جمال، ۱۲۱، شرف آباد، کراچی

یہ جناب صبیح محسن کے ایک درجن سے زیادہ مختصر مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، اس سے طنز و مزاح
سے ان کی طبعی مناسبت اور فطری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، لائق مصنف نے موجودہ ماحول کی متعدد

ایسی معیب باتوں کی ظریفانہ انداز میں [illegible] ہیں اور [illegible]
نے اس میں سوسائٹی کے مختلف طبقوں کی [illegible] بنایا ہے جیسے ...
بیلک ... میاں بیوی، وزیر اور ان کی بیگم، مالک مکان و کرایہ دار ...
... دینے والے وغیرہ، ان کے علاوہ تفوق اور سماجی برتری کے خواہشمند، سستی شہرت کے آرزومند
نمود و نمائش پسند لوگوں کے خدوخال بھی نمایاں کئے ہیں، اور وقت کے معاملہ میں بے پرواہ لوگوں
کا خاکہ بھی کھینچا ہے، مصنف کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مضحک پہلوؤں کا جوڑ واقعات سے ملا دیا ہے
ان کا طنز و مزاح مصنوعی نہ ہونے کے باوجود اپنے اندر افسانے جیسا لطف رکھتا ہے، انداز شائستہ
متین اور ابتذال و رکاکت سے خالی ہے، اس مجموعہ سے مصنف کے احساس و مشاہدہ کی قوت کا
اندازہ بھی ہوتا ہے، دراصل انھوں نے موجودہ سماج کی مختلف خامیوں اور کمزوریوں کی ایسے
شگفتہ انداز میں لفظی تصویر کھینچی ہے کہ قاری کیف و سرور اور فرحت و انبساط بھی حاصل کرتا ہے
اور اسے موجودہ عام اور ہمہ گیر پست ذہنیت اور غیر شریفانہ انداز کی قباحت کا اندازہ بھی ہوتا
ہے، شروع میں پاکستان کے مشہور اہل قلم مشفق خواجہ صاحب نے مصنف اور تصنیف کا نہایت
ظریفانہ انداز میں تعارف کرایا ہے جو ان کی خوش ذوقی و خوش طبعی کا ثبوت ہے، کتاب کے
مصنف کو دل پذیر اردو میں انداز بیان کی شگفتگی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا
جو سلیقہ ہے، امید کہ اس کا صحیح مصرف برابر لیتے رہیں گے اور جہاں ہیں وہاں کے حلقے میں نمایاں
حیثیت حاصل کرینگے، کتاب کا نام موجودہ مذاق کی ترجمانی ضرور کرتا ہے، مگر اس سے کتاب کی نوعیت
کا اندازہ نہیں ہوتا، اس سے پہلے کے مزاح نویس اور طنز نگار اپنی تصانیف کے جو نام رکھتے تھے ان
سے ان کے نقش تحریر کا اظہار مطالعہ سے پہلے ہوجایا کرتا تھا۔

"ض"

ہندستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ملکی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب دارالمصنفین کی رفاقت میں آئے، اور ان کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کرکے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت ۲۲٫۰۰ روپیہ

مُرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

"منیجر"

[illegible] علامہ [illegible] کی بعض اہم تصنیفات

سیرۃ النبی حصہ اول: اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
ولادت باسعادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات و غزوات
کی تفصیل اور اس پر تبصرہ، قیمت: ۴۹ روپیہ،

سیرۃ النبی حصہ دوم: اقامت امن، تاسیس خلافت اور
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و شمائل کا
مفصل بیان قیمت: بیس روپیہ

الفاروق حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانحعمری
اور ان کے مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل مولانا
شبلی کے قلم کی شاہکار کتاب، جس پر مصنف کو بھی
ناز تھا، قیمت: ۲۲ روپیہ

الغزالی حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی
سوانحعمری اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل نیز ان کی
تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ، قیمت ۱۱ روپیہ،

المامون خلیفہ مامون الرشید کی سوانح حیات
کے علاوہ اس کے عہد حکومت کے سیاسی، علمی، مذہبی
اخلاقی تمدنی حالات، جن سے دولت عباسیہ بغداد کے
عروج و کمال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے
قیمت: ۱۱ روپیے،

سیرۃ النعمان امام ابو حنیفہ کی سوانح عمری اور
ان کے مجتہدات، استنباط مسائل اور فقہ
حنفی کی خصوصیات (زیر طبع)

سوانح مولانا روم: مولانا جلال الدین رومی
کی مفصل سوانحعمری اور ان کی شاہکار تصنیف مثنوی
شریف پر مبسوط تبصرہ، (زیر طبع)

موازنہ انیس و دبیر: مشہور مرثیہ نگار میر انیس کی
شاعری پر ریویو، اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ
زیر طبع

کلیات فارسی: مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ
قیمت ۱۱ روپیہ،

کلیات اردو: مولانا کی تمام اردو نظموں کا
مجموعہ جو انھوں نے مسجد کانپور، جنگ طرابلس
غزوۂ بلقان، مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے
متعلق لکھیں، قیمت: ۶ روپیہ،

مکاتیب شبلی: مولانا کے دوستوں، عزیزوں اور
شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ حصہ اول، حصہ دوم
۱۶ روپیہ، [illegible] روپیہ

رجسٹرڈ نمبر ایل ایم ۔ ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت بیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(پن ۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

۱- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲- ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ
۳- مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۴- سید صباح الدین عبدالرحمن

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک بیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:- ۸ روپیے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:- ۱۰ روپیے،

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

(مرتبہ)

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۳۴ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۴ء عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

ایک ضروری اطلاع

کاغذ کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے دارالمصنفین کی مطبوعات کی قیمت میں یکم اکتوبر ۱۹۸۴ء سے بیس فیصدی کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اور معارف کا سالانہ چندہ بھی جنوری ۱۹۸۵ء سے ہندوستان کے لیے تیس روپیے اور بیرون ہند کے لیے ساٹھ روپیے کر دیا گیا ہے، امید ہے کہ دارالمصنفین اور معارف کے قدردان اس معمولی اضافہ کو بطیب خاطر گوارا کریں گے۔

"منیجر"

شذرات

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تاریخ دعوت وعزیمت کی پانچویں جلد اس سال شایع ہوئی ہے، اس کی اشاعت کے

اس سلسلۃ الذہب کی تکمیل کا اعلان کیا گیا ہے، گو اہل علم کے ذوق کا مطالبہ ہے کہ یہ ابھی جاری رہتا۔

اس کی پہلی جلد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام غزالیؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، نورالدین زنگیؒ، صلاح الدین ایوبیؒ، شیخ الاسلام عزالدینؒ بن عبدالسلام، مولانا جلال الدین رومیؒ اور شمس تبریزؒ، دوسری میں امام ابن تیمیہؒ اور ان کے تلامذہ، تیسری میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ نظام الدینؒ اور حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ، چوتھی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ، اور اس پانچویں میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حالات اور کارناموں کا ذکر خیر ہے، یہ وہ بزرگان دین ہیں جن کی شخصیتیں جانی پہچانی ہوئی ہیں مگر مولانا کے قلم کی ساحری، ان کی تحریر کی شیوا بیانی اور طرز ادا کی شگفتگی سے ان پرانی یادوں میں تازگی کے نئے کنول کھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، مولانا کی فطری برق طبعی، وہبی شیریں مقالی، خداداد پختہ خیالی اور ولولہ انگیز جوش ایمانی ان کی تصنیفی زندگی کے اجزائے ترکیبی ہیں، جن سے ان کی خوش وضع اور خوش آہنگ تحریریں خود بخود جاندار اور باوقار ہوجاتی ہیں، آج کل ادب و انشاء کی باگ جن ہاتھوں کے ہاتھوں میں ہے، ان کا معیار یہ ہے کہ جو کوئی اچھی ناول نگاری اور افسانہ نویسی کرے، یا شعر و ادب پر اپنی تنقید نگاری کی صحیح یا غلط جولانی طبع دکھائے، یا تفریحی تحریریں لکھ کر لوگوں سے واہ واہ حاصل کرے تو وہی ادیب اور انشاء پرداز ہے، لیکن جو مذہبی، تاریخی اور کلامی رنگ کی تحریروں کے چمن میں اپنے جگر کے خون دے دے کر گل اور بوٹے کھلائے، ان کو وہ اپنی بدمذاقی سے ادیب اور انشاء پرداز تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ادب و انشاء کا کمال تو یہ ہے کہ خشک موضوع کے خارستان کو شگفتہ تحریروں سے لالہ زار بنادیا جائے، مباحث کے اغلاق اور اشکال میں دلآویز طرز ادا سے گل و گلزار کی کیفیت پیدا کردی جائے، ناظرین محسوس کریں

کہ ان کے خیالات کے ریگستان میں معرفت و بصیرت کا سبزہ زار لہلہا رہا ہے، مولانا ابو الحسن علی ندوی کی تحریروں میں یہ سارے محاسن پائے جاتے ہیں، ابھی اپنی تصنیف دعوت و عزیمت کی چوتھی جلد میں اکبر کے دین الٰہی کی فتنہ انگیزی اس کی مدافعت میں ابو الفضل کے قلم کی گمراہ کن طرازی پھر اس کی مخالفت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی تب و تاب کی بے چینی اور مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی موشگافی اور نکتہ رسی کی وضاحت جس طرح کی ہے اس سے ارباب علم لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ ان کی پانچویں جلد کی علمی نعمتوں کا خوان نغماسب کے سامنے بچھ گیا، اس کی ابتدا بارہویں صدی ہجری میں عالم اسلام کی سیاست کے ساتھ اس زمانے کے ہندوستان کی تاریخ سے ہوئی ہے، پھر شاہ ولی اللہؒ کے اجداد و والد بزرگوار اور خود ان کے حالات ہیں، اس کے بعد ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے کہ انھوں نے کس طرح اصلاح عقائد پر زور دیا، دعوت الی القرآن کی تلقین کی، حدیث و سنت کی اشاعت و ترویج کی سعی کی، فقہ و حدیث میں تطبیق کی دعوت دی، شریعت اسلامی کی مربوط و مدلل ترجمانی کی، حجۃ اللہ البالغہ کے آئینے میں اسرار و مقاصد کی وضاحت کی، احادیث مقدسہ کو سمجھنے اور سمجھانے کا شوق دلایا، نظام خلافت کی اہمیت کا احساس پیدا کیا، خلفائے راشدین کے احسانات کو تسلیم کرنے کا جذبہ بیدار کیا، بعض حیثیتوں سے قابل توجہ وہ حصہ ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مغلیہ دور کے احتضار و انتشار میں ان کا قائدانہ کردار کیا رہا، پھر انھوں نے اپنے زمانے کے مختلف طبقات کا احتساب جس طرح کیا ہے اس کی طرف توجہ دلا کر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ آج بھی مسلمانوں کے لیے مشعل ہدایت ہے، ان کے فرزندان گرامی، خلفائے ذی مرتبت اور نامور معاصرین کے ذکر سے کتاب پُر از معلومات ہو گئی ہے، آخر میں ان کی تصنیفات پر مختصر لیکن پُر مغز تبصرہ ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا سمجھنا آسان نہیں تھا، شاہ ولی اللہؒ کے علمی و تجدیدی کارناموں کا ادراک بھی مشکل تھا، مگر مولانا نے جس طرح حضرت مجدد الف ثانیؒ کو سمجھا کر ان کے نظری و فکری مسائل کو یسیر الفہم کر دیا ہے، اسی طرح شاہ ولی اللہؒ کی علمی، دعوتی، اصلاحی اور تجدیدی کوششوں کا احاطہ اس خوبی سے کیا ہے کہ اب ان کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی، علامہ شبلیؒ نے اپنی کتاب علم الکلام میں لکھا تھا کہ شاہ ولی اللہؒ کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی

ہنگ تھے جو نکتہ سنج بھی [illegible] صاحب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے [illegible]

اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مورخین بلکہ سیاست داں طبقے کے ذوق کا بھی سامان بھی مل گیا ہے جس پر موجود
مسلمانوں کے زوال کا تجزیہ کر سکتے ہیں پھر اس میں شاہ ولی اللہ کی تحریروں کی روشنی میں حدیث و فقہ کی تطبیق، اجتہاد
تقلید کے درمیان نقطۂ معتدل، ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاق، علم الاجتماع، تمدن، سیاست اور احسان کے باہمی ربط اور
لی مذاہب اربعہ میں جمع و تالیف کی کوشش کے سلسلہ کے جو مباحث ہیں ان میں موجودہ دور کے علما کیلئے دعوت فکر بھی
ی ہے پھر ان تلخ مسائل کے ساتھ شاہ ولی اللہ نے امکان دولت ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں بٹ جانے والے مشایخ کی اولاد، غلط کار
لموں، متقشف واعظوں اور تارک الدنیا زاہدوں وغیرہ کی دکھتی ہوئی رگوں پر جس طرح انگلی رکھی ہے ان سب کو اس کتاب میں آسان و دلآویز
شگفتہ انداز میں سمجھایا گیا ہے اور یہی اس کی امتیازی خوبی ہے، امید کہ یہ علمی حلقوں میں شوق سے پڑھی جائے گی جس کے
اس کے ناظرین کے دلوں سے یہ آواز اٹھے گی کہ اردو کے لٹریچر میں ایک بہت اچھی کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔

تاریخ دعوت و عزیمت کی گذشتہ چار جلدوں کے انگریزی ترجمے بھی شایع ہو چکے ہیں ان کے مترجم جناب محی الدین صاحب ہیں،
لکھنؤ کے سکریٹریٹ کے فائلوں میں گم ہونے کے بعد روزانہ اپنے کو مولانا کی کتابوں اور تحریروں میں از سر نو دریافت کر لیتے ہیں
انگریزی میں مولانا کی کتابوں کے ترجمے کرنے میں جو لذت ملتی ہے، وہ شاید ساغر و مینا سے شغل رکھنے والوں کو اپنی چھلکتی اور ابلتی
ہوئی ارغوانی میں نہ ملتی ہوگی، منشی ذکاء اللہ مرحوم کے فرزند جناب عنایت اللہ دہلوی مرحوم نے انگریزی سے اردو میں ترجمے کرنے میں
ناموری حاصل کی، انھوں نے ترجمے کے فن کو انتہائے کمال تک پہونچا دیا تھا، ان کا بیان تھا کہ جب وہ انگریزی اخبار پڑھتے ہیں تو
انگریزی سطروں کے بجائے ان کے اردو ترجمے نظر آتے ہیں، محی الدین صاحب کا بھی یہ حال ہے کہ وہ مولانا کی کوئی کتاب یا تحریر پڑھتے ہیں تو ان کو
اس میں اردو سطروں کے بجائے انگریزی ترجمے نظر آتے ہیں، اس لیے مولانا کی جو کتاب بھی شایع ہوتی ہے، وہ ان کی تمام
جہ سے فوراً انگریزی میں منتقل ہو جاتی ہے، مولانا کی یہ کتاب جنوری ۱۹۸۴ء میں شایع ہوئی ہے، محی الدین صاحب نے
اس کا انگریزی ترجمہ اب تک کر لیا ہوگا، اس کی اشاعت کے بعد اس کے مطالعہ سے امید ہے کہ ارباب ذوق اسی طرح
ظ ہوں گے جس طرح کہ مولانا کی اور کتابوں کے انگریزی ترجموں سے پہلے محظوظ ہو چکے ہیں۔

مقالات

مستشرقین اور مطالعۂ سیرت

ڈاکٹر نثار احمد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، پاکستان،

مستشرقین کی زیر نظر فہرست دو حصوں میں منقسم ہے، حصہ اول میں اکثر و بیشتر وہ مستشرقین شامل ہیں جنھوں نے سیرت رسول پر مستقل تصنیف یادگار چھوڑی ہے، یا جو مطالعۂ سیرت کے حوالے سے مشہور و معروف ہیں، اور جن کا مکمل حوالہ بھی مل گیا ہے، دوسرے حصہ میں وہ مستشرقین شامل ہیں جن کی سیرت پر اگرچہ مستقل تصنیف نہیں ہے، لیکن ان کے مضامین، مقالات اور کتابوں میں سیرت کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور جن کا پورا حوالہ بھی دستیاب نہیں ہوا، دونوں حصوں میں ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے، زمانی تقدم و تاخر کا لحاظ نہیں رکھا گیا،

اس فہرست کی تیاری میں اگرچہ ان تمام کتابوں سے مدد لی گئی ہے جن کا حوالہ وقتاً فوقتاً تاریخی جائزہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے، تاہم بطور خاص تین کتابوں سے آزادانہ استفادہ کیا گیا ہے، یعنی (۱) العقیقی، نجیب۔ المستشرقون، (۲) الزرکلی، خیرالدین۔ الاعلام، (۳) حماوے۔ محمد دی پروفٹ اے سلیکٹیڈ ببلیوگرافی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وقت اور وسائل کی کمیابی کے سبب یہ ممکن نہ تھا کہ مستشرقین کے ناموں کے تلفظ اور ہجے، وطن ملک اور زبان کی رعایت سے تحقیق کر کے لکھے جاتے، اس سلسلہ میں عام انگریزی مفہوم کو سامنے رکھا گیا ہے، تاہم یہ توقع ہے کہ تحقیق مزید کے ضمن میں یہ سرسری فہرست انشاء اللہ نقطۂ آغاز ثابت ہوگی، اور دوسرے کام کرنے والوں کیلئے ممد و معاون ہوگی، (وما توفیقی الا باللہ)

فہرست مستشرقین حصہ اول

۱- آدم	Adams, Isaac	Mohammad and Mohammadanism (Chicago, 1900)
۲- ایڈیسن	Addison, Lancelot	The Life and Death of Mohammad, the author of the Turkish religion. (London, 1679
۳- ایڈلر	Addler, Felix, H.	Moyammed (Philladelphia 1901)
۴- اہرن	Ahren, Karl	Mohammad al Religious Stifter (Leipzig 1935)
۵- ایٹن	Aiton, John	The Land of the Messiah, Mahomet, and the Pope (London 1854)
۶- آرنلڈ	Arnold, T. W.	The Preaching of Islam. (London 1896)
۷- آرنلڈ	Arnold, J. M.	Islam, its History, Character and relation to Christianity. (London, 1874)
۸- ارونگ	Irving, Washington	Life of Mahomet (Newyork 1911

History of the Saracens (London 1847) Ockley, Simon ۹- اوکلے

Confutacion del Alocan y Secta Mahometana (Granada. 1555) Okxegon, L. de. ۱۰- اوکس گان

Mohammadade Profet der Arabieren (Amesterdom. 1898) Eigeman, Jakob ۱۱- ایج مین

Des effets de tareligion de Mohamed (Paris. 1810) .lsner, C.B. ۱۲- اولسنر

Islam under the Arabs(London 1876) Osbem, R.D. ۱۳- اوسبرن

Vizlat Muhamad Kuranjanak ethikajabiz (Budapest 1902) Osstern, S. ۱۴- اوسٹرن

An Account of the Rise and Progress of Mahometanism (London. 1911) Stubb, H. ۱۵- اسٹب

History of the Ottomon Empire. Preeaded by the life of Muhammad (Hurst. 1826-35) Upham, Edward ۱۶- اپہام

[illegible]

Arbuthnot, F.F — ١٧- اربتھنوٹ

[illegible]

Life of Mohammad. (Allahabad 1851) Das Leben und die Lehre des Mohammad (1851-1861) — Sprenger, A. — ١٨- اسپرنگر

Muhammad and Muhammadanism. London. 1874 (Reprint-Lahore) — Smith, Bosworth — ١٩- سمتھ

Mahomet et Les Arabes (Rome. 1878) — Bachelat, theodore — ٢٠- بچیلٹ

Mohammad and Islam-A comparision with orthodox christianity. (Newyork, 1911) — Bacon, A.S — ٢١- بیکن

Mohammad und de Seinen. (Leipzig. 1907) — Beckendorf, H.C. — ٢٢- بیکن ڈارف

Talks on Mohamed and his followers (London. 1932) — Barton, theodor. — ٢٣- بارٹن

The dictionary historical and critical of Mr. Peter Bayle (Ed) (London. 1734-1735) — Bayle, Pierre — ٢٤- بائیل

Mohammedin imposturae. (London. 1615) — Bedwell, W. — ٢٥- بیڈویل

Muhammed, His Biography and the begining of the Religion of Islam (Warsaw. 1914)	Bernfeld, Simon.	۲۶. برنفیلڈ
The Life and Teachings of Muhammed. (Adyar. 1932)	Besant, Annie.	۲۷. انی بیسنٹ
Le Problems de Mahomet (Paris. 1952)	Blachere, Regis.	۲۸. بلاشر
Mohammed of Koranen (Hamar 1904)	Blom, P.	۲۹. بلام
Muhamed Islam Store Profet. Kristianiica. 1911	Blytt, Eva.	۳۰. بلائٹ
Life of Mohammed (Bombay 1851	Bowen, George.	۳۱. بووین
Muhamed Skuespiel. the akter (Ohenbava. 1895)	Brandes. C. E. C.	۳۲. برانڈے
The Messenger- the life of Mohammed (London. 1946)	Bodley, R. V. C.	۳۳. بوڈلے
(1) Histore des Arabes, Aved, la vie de Mahomet (Amesterdom 1731)	Boulain Villiers H. C.	۳۴. بولین ولیرز

(11) Vie de Mahomet-(1730)

۳۵- بریگنی Brequigny,H.D. Veber Muhammed-(Frankfurt 1791)

۳۶- بریم Brian,O.E. Budha,Muhammad,Jesus (London.1998)

۳۷- بروکلمان Broeckelmann,C. History of the Islamic People(Newyork.1947)English Tr.

۳۸- بروکس Brooks,Archibald Islam : A short Study

۳۹- براؤن Brown,D.A. The Way of the Prophet An Introduction to Islam (London.1962)

۴۰- براؤن Brown,G.L. The Era of Mahomet(London 1856)

۴۱- بکل Buckle,Henry The Begger of the Soldier Gautama or Mahomet(London. 1903)

۴۲- بہل Buhl,F.P.W. Des leben Muhameds(Leipzig 1930)

۴۳- بروز Burrows,Miller Founders of Great Religion

Being personal sketches of [illegible]
famous leaders (Newyork, 1931)

۴۴۔ بش — Bush, George — The Life of Mohammad: Founder of the Religion of Islam and the Empire of the Saracens. (Newyark, 1830)

۴۵۔ باسے — Basset, Rene — قصیدہ بردہ۔ بوصیری مع سیرت مصنف، نقد و شرح کلکتہ ۱۸۹۲

۴۶۔ برٹن — Burton — Pilgrimage to Mecca and Medina. (1856)

۴۷۔ پونی — Penet, Rudi — Mohammad und der Koran (Stuttzart, 1951)

۴۸۔ پاینی — Payne, P.S.R. — The Holy Sword of the Story of Islam from Muhammad to the present (London, 1961)

۴۹۔ پیڈیو — Pedio, San Pasual — Contra Los partalistan Mahometanos (Rome. 1905--06)

۵۰۔ پروکش — Pruckseh, Otto — Uber die Bluctrache beiden vornlamisschen Arubern und Mahomeds (Leipzig--1899)

Title	Author	
History of Mohammedanism and its sects. (London-1894)	Taylor, W.C	[illegible]۔۵۱
Sources of the Quran. (London-1905)	Tisdall, W. St. C	۵۲۔ٹسڈال
Mohammad the Great Arabian (Hougton-1912)	Townsend, Med. W.	۵۳۔ٹاؤن سینڈ
A study of History (London-1954-61)	Toynbee, A.J.	۵۴۔ٹاؤن بی
Muhammed (Leipzig.1907)	Trance, E. Von.	۵۵۔ٹرنچ
Studies in Biography. (London-1865)	Trotter, H.J.	۵۶۔ٹروٹر
Historie de la vie de Mahomet Legislative de l' Arabie, (Paris 1776--79)	Tuppin, F.R.	۵۷۔ٹرپن
Muhammad and the Conquests of Islam (Newyork.1968)	Gabrieli, Francesco	۵۸۔جبرئیلی
Vie de Mahomet (Amesterdam 1748)	Jagnier, J	۵۹۔جیگنیر
Mohammed (Paris-1838)	Genevay, A.	۶۰۔جینوے

Dr. Z
Jamia Nagar
New Delhi

Mohammed ein Characerbild   Georgen.N.V.   ۶۱۔ جیورجن

(Berlin.1878)

Islam Mohammed and his Reli-.Jaffery,Arthur   ۶۲۔ جیفری

gion(Newyork.1958)

Muhammad and his Power   Johnston,P.Lacy de   ۶۳۔ جانسٹن

(Newyork.1901)

سیرت ابن ہشام مع متن و ترجمہ لاطینی، لیڈن ۱۸۸۱ء بمعاونت دی خویہ   Jong,P.de.   ۶۴۔ جونگ

La vie de Mohomet(Paris.1962)   Gheorghiu,C.V.   ۶۵۔ جیورجیو

Mahomet les Khalifes.(Paris-   Chagavat,Michel.S.   ۶۶۔ چگاوٹ

1912)

La Vie de Mahomet(Paris 1929)   Dermenghem,E.   ۶۷۔ درمنگھم

Maometta(1931)   Ducati,Bruno   ۶۸۔ دوکاٹ

Maishaya Muhammad.(London-   Dale,Godetrey   ۶۹۔ ڈالے

1909)

Mohammad.(Newyaork.1926)   Dibble,R.F.   ۷۰۔ ڈبلے

Apology for Mohammed and the   Davenport,John.   ۷۱۔ ڈیون پورٹ

Quran.(London.1869) Reprint.

Lahore—1975.

The Alcoran of Mahomet   Du Ryer,Andre.   ۷۲۔ ڈورییر

(London.1649)

Mahomet, Founder of Islam (London.1694) — Draycott, G.M. — ٧٣۔ ڈریکاٹ

Mahomet daus Son Lamps (Geneva, 1908) — Ducasse Raymond — ٧٤۔ ڈوکاسے

Vie de Mohammed (Paris 1837) — Desvergers, N. — ٧٥۔ ڈیورجرس

Spanish Islam (1883) — Dozy, R.P.A. — ٧٦۔ ڈوزی

Het Islamisime (Kruseman. 1863)

The Life and Death of Mahomet (London. 1637) — Raleigh, Sir W. — ٧٧۔ ریلے

Vita di Maometto (Milano. 1922) — Ram Poldi — ٧٨۔ رام پولڈی

Mohamed und die Seninen (Leipzig 1907) — Reckender, H. — ٧٩۔ ریکینڈر

Reflections on Mohamedanism and the conduct of Mohamed (London. 1712) — Reeland, A. — ٨٠۔ ریلینڈ

Mohamed und die Welt des Islam (Leipzig-1765) — Rehm, H.S — ٨١۔ ریم

Notice Sur Mahomet (Paris 1860) — Reinaud, J.T. — ٨٢۔ رینو

De religione Mohamedica libra due (Utruht 1704) — Reland, H. — ٨٣۔ ریلان

Mahomet et ler origines de L' Islamism.(Paris-1880)	Renan,Ernest	۸۴۔ رینان
L'Islam et Son Prophet (Lausaune -1870)	Rink,F.Th	۸۵۔ رنک
Hayyey Muhammad (Mizz).1932	Rivlin,Josef.J.	۸۶۔ ریولن
(i) L'Islam:Mahomel et les Origines de L'Islam(Paris-1957) (ii) Mahomet.(Paris.1961)	Rodinson,M.	۸۷۔ روڈنسن
Life of Mahomet.(London.1833)	Roebuck,J.A.	۸۸۔ روبک
Mahomed.(Newyork.1907)	Romro,Jacob	۸۹۔ رومرو
Voice Le Vraj Mohamed et Ja feu'x Coran(Paris 1960)	Zakarias,Heuna.	۹۰۔ زکریا
le Cedenze religiose de Maometto.(Rome-1922)	Sacco,G.	۹۱۔ سیکو
The Koran or Al-Coran of Mohammad.(London.1734)	Sale,George	۹۲۔ سیل
Morale de Mahomet(Paris 1784)	Sawary Claude E.	۹۳۔ [illegible]

The Life of Muhamad (London — Sell, Edward [illegible] 1913)

Onp Successu Davideros Hyma- nes Unitatis Sis Muhamed. Upsaliso, 1886) — Svan Borg, A. ۹۵۔ سوان

A History of Medieval Islam (London, 1965) — Saunders, J.J. ۹۶۔ سونڈرز

Muhammad testies venitatis-Contraseipsum (Leipzig, 1718) — Schreeder, M.G. ۹۷۔ شروڈر

Mohammed: The Man and his faith. (Tr.) London, 1956 — Tor-Andrae ۹۸۔ طورانیڈرے

Mahomet: La Science Chezles Arabs (Paris, 1866) — Favrot, Alexis ۹۹۔ فیورٹ

Mahometanism Unveiled. (London, 1829) — Forster, Charles ۱۰۰۔ فارسٹر

Mohammad a Regebbi Zeridosag-Megitelaseben (Budapest, 1934) — Fried, Dezero ۱۰۱۔ فرائڈ

Mohamed, Munzer und Bockold (Hanover, 1700) — Ferebing, J.C. ۱۰۲۔ فوربنگ

۱۰۳۔ کیتانی (i) Annalidell e Islampoli. Caetani, Leone 1905-26)

(ii) Maometto Profeta d'Arabia (Italina 1910)

۱۰۴۔ کارلائل The Hero as Prophet-Mahomet. Carlyle, Thomas (Newyork, 1902)

۱۰۵۔ کاستری Comte de L'Islam-Impressions Castries, Heuridelac et etudes. (Paris, 1912)

۱۰۶۔ کلیمن Leben Muhamed's des Stifters Olemens, J.F.G. der Muhammadanism Religion. (Himberg 1814)

۱۰۷۔ کلاوڈیس Muhameds Religion aus dem Claudius, K.H. Koran (Atena-1908)

۱۰۸۔ کورینالڈی Maometto egli Ebrie (Milans. Corinaldi, Gino 1925)

۱۰۹۔ کریمی Anecdotes of Hazrat Mohammad Karimi. R.W. London, 1929)

۱۱۰۔ کاسٹین Muhammed, Hans Lefnad bers- Kastman, Carl tted. (Stockholm, 1908)

Mohamed and Mohamedanism (London, 1889) — Koelle, S.W. — ١١١۔ کوئیل

Mohamed der Prophet. (Humberg- 1851) — Kroppen, P. — ١١٢۔ کروپن

Essai Sur l'Histoire des Arabes. (1847) — Caussin de Perceval A.P. — ١١٣۔ کاسن ڈی پرسیوال

Risalah--Ed. Tien (London. 1880) — Al-Kindi — ١١٤۔ الکندی، عبدالمسیح بن اسحاق

The Apology of al-Kindi. (London. 1887) By Muir.

Le Doctrine et les Deviors de la Religion Musulmane. (Paris. 1826) — Garcin de Tassy — ١١٥۔ گارساں دی تاسی

Mahomet. (Paris. 1957) — Gaudefroy De-Mombynes — ١١٦۔ گاڈفرے ڈی ممباین

Mohamedanism-an Historical Survey (London 1953) — Gibb. H. A. R. — ١١٧۔ گب

Life of Mahomet. (Newyork, 1879) — Gibbon, Edward — ١١٨۔ گبن

Mohamed and Islam. (Tr) Yale. (1917) — Goldziher, Ignac — ١١٩۔ گولڈزیہر

۱۲۰-گلمین — Gilman, Arthur — The Saracens.(London.1887)

۱۲۱-گولڈ — Gold.L.L. — Mahomet et Son Oeuvre.(Paris 1897)

۱۲۲-گرین — Green,Samuel — The Life of Mahomet,founder of the Religion of Islam and the Empire of the Saracens.(London.1840)

۱۲۳-گریم — Gremme,Hubert — Mohammad,Des Leban Nachden Quellen.(Minister.1892-95)

۱۲۴-لنگز — Lings,Martin — Muhammad.(London.1983)

۱۲۵-لیمیریسی — Lemairesse.E.D.G — Vide de Mahomet d'apres La tradition.(Paris.1897-98)

۱۲۶-لامارٹن — Lamartine,A.M. — (i) Mahomet in les Grand Bommes-de-orient(paris.1889)
(ii) Histore de' La Turquie.
(Paris-1854)

۱۲۷-لیٹنر — Leitner.G.W — Muhammadonism(Working 1889)
Reprint Lahore.1893

۱۲۸-لیروگ — Lerougue.R. — Vie de Mahonet.(Paris 1939)

۱۲۹- لیوی — [illegible],Jesus et Mahomet ou- Levy,[illegible]

les Trios Grands(Paris.1887)

۱۳۰- لیوچی فی — The Arabian Prophet : a life Lew,Che,Fi

of Mohammad from Chinese and

Arabic Sources(Shanghai.1921)

۱۳۱- لینارڈ — Islam,Her moral and Spirit- Leonard,Arthur.G.

ual Value.(London.1927)

۱۳۲- لین پول — The Speeches and Table Talk Lane-Pool,Stainley

of the Prophet Mohammad.(Lo-

ndon.1882)

۱۳۳- لامنس — Lammens,P.H.

اخلاص محمد (۱۹۱۱ء)

فاطمہ و بنات محمد (روم ۱۹۱۲ء)

مہد الاسلام (روم ۱۹۱۴ء)

۱۳۴- میڈن — Muhammai,mans hayake Pamoje Madan,A.C.

na habari za Waslinin na Matu

ruki.(London.1888.Eng.Tr.

London.1896

۱۳۵- مگنانی — (i) Allaha il su Profeta Magnani,L.

Parma(Estera.1922)

(ii)Mahomet no impostor.
(London. 1920)

۱۳۴۔ مینفریڈی Manfredi, Vit. La Vita di Maometto.(Milano 1898.)

۱۳۶۔ مارگولیتھ Margoliouth, D.S. Mohammed and the rise of Islam.(Newyork.1905)

۱۳۸۔ مراکی Maracci, Ludovicus Mahumeti-Vita ipsiusque gest-ara Synopsis.(Rome.1691)

۱۳۹۔ مارٹن Martin, M.J. Historia-del falsay perverso Profeta Mahoma.(Madrid.1781)

۱۴۰۔ مینازیس Menezes, J.L The life and the religion of Mohammed the Prophet of Arabia.(London.1921)

۱۴۱۔ مسارا Messara, Pina Maomettoeil paradigma.(Milano.1946)

۱۴۲۔ مل Mills, Charles An History of Mohammedanism London.1817)

۱۴۳۔ ملمین Milsman, H.H. Memories of the life of Mahomet.(London.1727)

Mahoma, Su Vida. (Madrid. 1727) Monters Ividal, J. ۱۴۳- مونٹیرو

False divinities: On Moses, Christ and Mahomet and other religious deceptives. (London 1870) Moses, the Law giver ۱۴۵- موسس

History of Religis: Judaism Christianity, Mohamodanism. (Newyork, 1929) Moore, G.F. ۱۴۶- مور

The life of Mahomet pom ori-ginal Source. (London. 77) Muir, Sir. William ۱۴۷- میور

Spiritual heroes, a study of the World's Prophets. (New-york. 1955) Muzzey, D.S. ۱۴۸- موزے

Vita di Maometto. (Roma. 1846) Nathene, C.A. ۱۴۹- ناتھن

A Literary History of the Arabs. (Newyork, 1907) Nicholson, R.A. ۱۵۰- نکلسن

Das Heben Muhamed's nach der Quellen Populer darqistett (Hanover. 1863) Noldeke, Theslor ۱۵۱- نولدیکے

An Out Hne of Islam(London- Norlth,C.R. ۱۵۲- نارتھ
1934)

(i)Mihammad at Mecca.(1953) Watt.W.M. ۱۵۳- واٹ
(ii)Muhammad at Medina.(1956)
(iii) Muhammad Prophet and
Statesman.(London.1961)

Mohammad de Prophet Sein Leb- Well,Gustav ۱۵۴- ویل
en and Scine Lehre.(Stutt-
gart.1843)

Fra Missionen Blamat Muhemm- Wellejus,H. ۱۵۵- ویلیجس
edaners,(Denmark.1909)

Half Hours with Muhammad : Wollaston,Sir.A.N ۱۵۶- ولاسٹن
Being a populer Account of
the Prophet of Arabia and of
His more immediate followers
together with a short Synop-
sis of the relgion he foun-
ded (London)

Muhamed und sein Werk(Stutt- Wueaz,Friedrich ۱۵۷- وہاز
gurt.1953)

۱۵۸- وسٹنفیلڈ Wüstenfeld, F (تاریخ مکہ مکرمہ، سیرۃ ابن ہشام کی تعلیقات، اماکن مدینہ منورہ۔ تاریخ اشراف مکہ وغیرہ)

۱۵۹- ویتیر Vattier, Pierre — L' Histoire Mahometane. (Paris 1657)

۱۶۰- ویلارڈ Vieillard, Rene — (i) Mohammad, Messenger d' Allah. (Philip. 1657)
(ii) Mohammed (A Bengali Account of the life of Muhammad) Calcutta. 155

۱۶۱- والش Wallich, J. U — Religio Turcica, Mahometi sirta (Sucecrum, 1659)

۱۶۲- ہیس Heas, Hans — Das Bild Muhameds in Wandel der Zeiten. (Berlin 1916)

۱۶۳- ہیٹال Hatala, Peter. — Mohamed elete estsh a. (Buda-pest. 1878)

۱۶۴- ہیڈلے Headley Rowland. G. — The Three Great Prophets of the World. (Woking. 1923)

۱۶۵- ہگنز Higgins, Godfray — An Apology for the life and character of the celebrated

Title	Author	
Prophet of Arabia called Mohammad the illustrious. (London. 1829)		
History of Mahomet the Great Imposture. (Falkirk 1821)	Hills Frederick H.	۱۶۶ ہلارڈ
Mohammed B (Batavia. 1939)	Howell, W. R. B. V.	۱۶۷ ہوویل
Moisa, Jesus, Mahomet (Valencia, 1903)	Holbach, Powl, H.	۱۶۸ ہولباش
Mahomet, Prophete des Arabes (Peris 1946)	Holma Harri	۱۶۹ ہولما
The Story of Mohamed (London 1914)	Holland, Edith	۱۷۰ ہالینڈ
-works in Selected- (ed) (Leiden. 1957)	Hurgronje, C. S.	۱۷۱ ہرگرونج

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

اسلام اور مستشرقین کے سلسلہ میں حسب ذیل کتابیں پریس میں ہیں۔ (۱) روداد سمینار اسلام اور مستشرقین (۲) مجموعۂ مقالات جو اس سمینار میں پڑھے گئے (۳) علامہ شبلیؒ اور مستشرقین (۴) مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مستشرقین۔

کتاب سازی و وراقت

از جناب مولانا محمد عبدالحلیم چشتی صاحب، کانو، ہاشمیہ

(۲)

عہد خلافت راشدہ میں صحابہؓ اسلام کی نشر و اشاعت فتوحات کی وسعت اور علمی مصروفیات کی وجہ سے خط کی آرائش و زیبائش اور ذوق جمال کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے کیونکہ تلوار اور قلم ایک ہی وقت میں ہاتھ میں نہیں پکڑے جا سکتے تھے، اموی دور میں سلطنت کی وسعت، امن و امان کی بحالی اور تمدنی ترقی کی وجہ سے ثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا تو امور خطاطی پیدا ہوئے، مصحف نگاروں میں خالد بن الہیاج کو شہرت حاصل ہے[۱]، اور کاتبوں میں قطبہ جو اپنے وقت کا سب سے بڑا خطاط تسلیم کیا گیا تھا، اس نے چار اسلوب خط ایجاد کئے تھے[۲]، مالک بن دینار المتوفی سنہ ۱۳۰ھ نے مصحف نگاری بطور پیشہ اپنائی[۳]۔

امویوں سے اقتدار عباسیوں کو ملا تو ثقافتی سرگرمیاں اور بھی تیز تر ہو گئیں، اور فن خطاطی کو بہت فروغ حاصل ہوا، شاگردان حسن بصری میں ضحاک بن عجلان، قطبہ سے بازی لے گیا، خلیفہ منصور و مہدی کے دور میں اسحاق بن حماد المتوفی سنہ ۱۵۴ھ نے بہت تلامذہ یادگار چھوڑے جن میں یوسف لقوہ الشاعر اور ابراہیم بن محسن کا نام سرفہرست ہے[۴]، اور ان کے معاصر شقیر، ثناء کاتبہ، عبدالجبار (استادان فن میں تھے، کوئی ان کے رنگ میں نہیں لکھ سکتا تھا[۵]،

---

۱ الفہرست ۱۱ ۲ الندیم ص ۹ ۳ ایضاً، ۴ ایضاً، ۵ پیدائش خط و خطاطان از عبدالمجید ایرانی مصر چاپخانہ چہر نما سنہ ۱۳۶۹ھ ص ۸۶، ۸ قسطنطنیہ مطبعة ابو الضیا سنہ ۱۳۵۰ھ ص ۳، الخطاط البغدادی علی بن ہلال المشہور بابن البواب، تالیف سہیل انور، ترجمہ محمد بہجت الاثری و عزیز سامی البغدادی، بغداد مطبعة المجمع العلمی العراقی سنہ ۱۳۷۷ھ ص [illegible]

ذکرِ بالا حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں خوشنویسی کا فن اتنا ترقی کر گیا تھا کہ اس میں رعنائیاں بھی نمایاں پیدا کر سکی تھیں۔

اقسامِ خط: عہدِ ہارونی میں کاتبوں نے اس فن میں اتنا تنوع پیدا کیا کہ بارہ کوفی رسم الخط رائج ہو گئے، جن میں خطِ جلیل سب سے زیادہ مشکل تھا۔[1] پھر بعد ازیں ایک خط ایجاد ہوا جسے خطِ عراقی اور خطِ وراقی کہا جاتا تھا۔[2] یہ خط برابر ترقی کرتا رہا، یہاں تک کہ کاتب احول نے جو برامکہ کا کاتب تھا، اس خط کے قواعد و اقسام کو منضبط و مدوّن کیا۔[3]

خلیفہ مامون کے عہد میں علوم کی ترقی کے ساتھ فنِ خوشنویسی کو بھی ترقی ہوئی۔ بارہ کوفی طرزِ خط ترقی کر کے بیس تک پہنچ گئے تھے۔[4] ان کا شمار کوفی خط میں تھا، اور کوفی خط سرکاری و مذہبی رسم خط تھا۔[5] وزیرِ مامون ذو الریاستین فضل المتوفی ۲۰۲ھ نے ایک خط ریاسی ایجاد کیا جو گزشتہ سارے رسم خطوں سے فائق تھا۔ اس سے چودہ رسم خط پیدا ہوئے تھے۔[6] اس عہد میں خوشنویسی اتنی ترقی کر گئی تھی کہ خاندان کے خاندان اس شریف پیشے کو اختیار کرنے لگے تھے، چنانچہ مقتدر باللہ کے استاد ابو الحسین اسحاق شاگرد ابن معدان اپنے دور کا سب سے اچھا خوشنویس تھا۔ اس کا بھائی، بیٹا، پوتا سب اسی کی روش پر لکھتے تھے۔[7] اس نے کتابت کے موضوع پر ایک رسالہ بھی الموافق کے نام سے لکھا تھا۔[8] لوگ اس فن کی طرف رغبت کرنے لگے تھے۔ خطاطوں کا مصوروں سے زیادہ مرتبہ بلند تھا۔ اسی لئے ادب و تاریخ کی کتابوں میں ان کا تذکرہ محفوظ ہے۔

اس زمانہ میں ابو علی محمد بن علی ابن مقلہ بغدادی ۲۷۲ھ المقتول ۳۲۸ھ وزیر

---

[1] پیش خط و خطاطان از عبدالمجید ایرانی ص ۷۰، ۸۰ خط و خطاطان ص ۳۰ الخط والبغدادی علی بن الہلال المشہور با بن البواب ص ۱۹، انتشار الخط العربی فی العالم الشرقی و الغربی تالیف عبدالفتاح عبادہ، مصر مطبعہ ہندیہ ۱۹۱۵ء ص ۱۳ [2] الفہرست لابن الندیم ص ۱۱-۱۲ [3] ایضاً ص ۱۳ [4] ایضاً ص ۱۳ [5] ایضاً ص ۲، انتشار الخط العربی ص ۳۳
[6] الفہرست لابن الندیم ص ۱۴-۱۵ [7] ایضاً ص ۱۳۔

خلیفہ معتضد، مقتدر و راضی باللہ، ہندسہ میں شاگرد ابراہیم تجری، اول امام فن خطاطی اور شاعر تھا، کمال خط کا طرز نگارش بھی بلند ساختہ ہے، اس کی اساس زاویہ دار طرز نگارش رہے، ابن مقلہ کو ان دونوں فنون سے طبعی مناسبت تھی، اس نے اس خط کو جس کا ابتداء میں غیر سرکاری تحریروں میں استعمال سے آغاز ہوا تھا، بعد میں خط نسخ کا نام دیا گیا، انقلاب پیدا کیا، اور کوفی رسم الخط کی جگہ اس کو قرآن مجید کا رسم خط بنایا یہی آج بھی ساری دنیا میں اسلام کا رسم خط ہے پیچیدہ کوفی رسم خط جس کا لکھنا پریشانی کا موجب تھا منسوخ قرار دیا، ابن مقلہ نے اس خط کے بارہ قواعد مرتب کئے تھے، [۵] اس کا طرز نگارش ضرب المثل ہے کسی شاعر نے کہا ہے،

فصاحة حسان وخط ابن مقلة — وحكمة لقمان وعفة مريم

حسان کی فصاحت اور ابن مقلہ کا خط — لقمان کی حکمت اور حضرت مریم کی عفت

اذا اجتمعت فی المرء والمرء مفلس — ونودی علیه لا یباع بدرهم [۶]

جب یہ باتیں کسی آدمی میں جمع ہو جائیں اور آدمی بھی وہ مفلس ہو، اور اسکے نمونہ خط کی بولی لگائی جائے تو افلاس کی وجہ سے اسکی قیمت ایک درہم بھی نہیں ہوگی۔

اسلامی تمدن نے مشرق و مغرب میں وہ معنوی دائمی آثار و نقوش نفوس انسانی پر چھوڑے ہیں،

---

[۱] ثمار القلوب فی المضاف والمنسوب للثعالبی تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم، القاہرہ، مطبعۃ المدنی ۱۳۸۴ھ صفحہ ۲۰۰، [۲] وفیات الاعیان ج ۲، ص ۱۹ [۳] الخطاط البغدادی علی بن الہلال المشہور بابن البواب، صفحہ ۱۰، [۴] ایضاً، انتشار الخط العربی، صفحہ ۱۵، [۵] بدیع اللہ دبیر نژاد، سیر خوشنویسی در قرن پنجم ہجری و ظہور ابن بواب، ہنر و مردم شمارہ ۱۳۱ (۱۳۵۱ ف) ص ۵۳-۵۲، تذکرۂ خوشنویسان معاصر از علی راہجری، تہران کتابخانہ ابن سینا (۱۳۴۶ ف) ص ۱۵، [۶] راہجری نے تذکرہ خوشنویسان معاصر (ص ۱۵) میں مصرع اخیرہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔ فلیس له قدر بمقدار درهم

عربی زبان اور اسلامی ثقافت کا جزو رسم خط بھی ہے۔[1] فن خوشنویسی نے فنون جمیلہ کی وہ تربیت کی کہ مسلمان قوم میں تقریباً ہر پڑھا لکھا، عالم و عامی اشکال موزوں کا ذوق رکھنے لگا تھا۔[2] ابن مقلہ نے خط کو عراقی طریقے کی طرف منتقل کیا، پھر ابن البواب المتوفی ۴۲۳ھ نے اس میں درستی پیدا کی، یاقوت مستعصمی المتوفی ۶۹۸ھ نے خط کو پایۂ کمال تک پہنچایا، اور اس کے قوانین کی تکمیل کی۔[3]

یہ عربی رسم خط زینت و آرائش کا موجب رہا اور اس نے اہل یورپ کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ تھامس آرنلڈ (Thamas Arnold) لکھتا ہے،

اسلامی فن میں عربی کا وہ حصہ اس کا رسم الخط ہے جو مسلمانوں کے افراد و اقدار کا ایک عالمگیر نشان تھا کہ اس رسم الخط میں قرآن مجید لکھا جاتا تھا، اس لئے یہ ساری دنیائے اسلام میں مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اس فن میں خوشنویسوں نے ایسا کمال پیدا کیا کہ نہ صرف ایک خوشخط کتاب نہایت قابل قدر چیز سمجھی جاتی تھی، بلکہ کسی باکمال خطاط کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پرزہ بھی شائقین فن کے نزدیک قابل فخر ملکیت تھا۔ اگرچہ یورپی کاریگر اس رسم الخط کو پڑھنے سے قاصر تھے، لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کی شکل و شباہت سے آشنا ہوگئے۔ اس "علم اور جہالت" کا ایک پرانا ثبوت اس طلائی سکہ سے ملتا ہے، جو اوفا (شاہ مرسیہ) (۷۹۶ - ۷۵۷ء) نے مضروب کیا، جو برٹش میوزیم میں ہے، (شکل ۱۴) اس کی شکل مسلمانوں کے دینار سے ملتی جلتی ہے،

اس زمانے کے بعد سے مسیحی یورپ کے کاریگروں کی مصنوعات میں عربی حروف اور ان کی تزیینی آرائشوں کا رواج روز افزوں ہوگیا۔ ۔ ۔ ۔ بہت سے سیاح مسلمان ملکوں میں

---

[1] الخط العربی، ص ۳۳ [2] سید عبداللہ، دور اسلامی میں ابتدائی تعلیم کا آغاز، چٹان (۲۹ جنوری ۱۹۵۱ء)، ص ۶ [3] ذبیح اللہ دبیری نژاد، یاقوت مستعصمی و ہنر خوشنویسی، ہنر و مردم، شمارہ ۱۰۶ (۱۳۵۰ ش) صفحہ ۵۔

بلکہ ان کے سفر کی وجہ مقامات مقدسہ کی زیارت کے علاوہ اس علم کی تشنگی تھی جس کے [illegible]
مسلمان تھے، تجارت اور دوسرے معاملات کی کشش بھی تھی، یہ سیاح جب سفر سے واپس آئے
تو یورپ کی شوکت و عظمت کے افسانے سناتے اور ان کے ثبوت میں مسلمانوں کی صناعی اور
کاریگری کے وہ نمونے پیش کرتے جو وہ مسلمان ملکوں سے لیکر آتے تھے[4]

تحریر و کتب شناسی عہد عباسی میں خطوط شناسی ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئی تھی، چنانچہ اس فن میں
اہل علم درک حاصل کرتے تھے، محمد بن عبد الرحمن بن معمر قرطبی المتوفی سنہ ۴۲۳ھ خلیفہ محمد بن ابی عامر
منصور کے شاہی کتب خانے میں اور اس کے فرزند کے خزانۃ الکتب میں کتابوں کی تصحیح و مقابلہ
پر مامور تھے، ان کو اس فن میں کمال حاصل تھا، چنانچہ ابن الابار کا بیان ہے۔

كان من اعلم الناس بالكتب	وہ موصوف کتابوں اور ان کے اسباب
وعللها وابصرهم بجمعها و	وعلل کے سب سے بڑے عالم تھے کتابوں
افرزهم لخطوطها ونسبهم	کو جمع کرنے اور ان کی وراقوں کی طرف
لها الى وراقها[5]	نسبت کرنے میں سب سے زیادہ ماہر تھے،

کان من اعلم الناس الخ کے الفاظ سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عہد عباسی میں مشرق
(ایشیا و افریقہ) اور مغرب (ہسپانیہ) میں کتب شناس و خطوط شناس کثرت سے موجود تھے،
اس فن میں درک و مہارت حاصل کرنے کے لیے نامور خوشنویسوں اور وراقوں کے خط کے نمونے
جمع کر کے اس فن میں بصیرت حاصل کرتے تھے، شاہی کتب خانوں میں ایسے ہی ماہر خطوط و

---

4. Thomas Arnold Islamic Art and its influence on Painting in Europe - میراث اسلام ترجمہ عبد المجید سالک لاہور مجلس ترقی ادب سنہ ۱۹۶۲ء ص ۵۵ تا
5. التکملہ لکتاب الصلۃ تالیف ابن الابار القضاعی، القاهرة عزت العطار الحسینی، سنہ ۱۹۵۵ء۔

کتب شناسی، تعلیم و مقابلہ و کتب کی ضخامت پر مامور کئے جاتے تھے۔

عربی رسم الخط کی فطری سادگی، رونق و دلکشی اور دوسرے رسم الخطوں پر اس کی فوقیت کا اعتراف اس دور کے شہرۂ آفاق مورخ ٹائن بی کو بھی ہے وہ لکھتا ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید امر ہے کہ ترک لاطینی حروف کو اپنے پرانے رسم الخط کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ بھدا اور ناموزوں پاتے ہیں، بلکہ مشکل اور بے ڈھنگا بھی، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عربی رسم الخط اپنے حسین دائروں کے ساتھ ہمارے لاطینی رسم خط سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے یہ مختصر بھی ہے، اور رواں، مسلسل اور خوش اسلوب بھی، ایک قوم جو عربی رسم الخط استعمال کر رہی ہو اسے شارٹ ہینڈ کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔[۱]

مدرسۂ خوشنویسی | عہد عباسی میں خوشنویسی کا فن مدارس میں سکھایا جاتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ مدارس میں اس کا مستقل شعبہ قائم کیا جاتا تھا، یہ فن خط اعلیٰ کی اشاعت کا سبب تھا تحصیل علم کے بعد طلبہ و اہل علم کو یہ فن مادی زندگی میں معاشی احتیاج سے مستغنی کرتا تھا، چنانچہ ابن باباانطاکی جو نہایت عمدہ شاعر و خطاط تھا، اس نے جب نظام الملک طوسی کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا تو اس نے اس کی بہت قدر کی، جامعہ نظامیہ نیشاپور میں ٹھہرایا، یہاں انھوں نے خوشنویسی سکھائی۔[۲]

کتابت و خوشنویسی کی تعلیم و فروغ کے لئے جداگانہ مدرسہ بھی قائم کیا جاتا تھا، تاکہ کتابوں کی نقل کے لئے کاتبوں اور خوشنویسوں کی کمی معاشرہ میں محسوس نہ کی جا سکے۔

اسی قسم کا ایک مدرسہ ابوالرضی محمد بن احمد بن داؤد المعروف بالمفید المتوفی ۵۸۲ھ / ۱۱۸۹ء نے

---

[۱] Annold J. Toynbee, A study of history (London) Oxford University Press, 1939. vol, II, PP. 51-55

[۲] دمیۃ القصر و عصرۃ اہل العصر تالیف ابوالحسن علی الباخرزی، طبع المطبعۃ العلمیۃ ۱۳۴۸ھ، ص ۶۴۔

بغداد میں کھولا تھا، جس میں معروف خوشنویس ابن الصباغی کی تعلیم دی جاتی تھی[1] [illegible]
یہ کتابی بچی تھی کہ اس قسم کا مدرسہ خوشنویسی کی تربیت گاہ (Training Centre)
کا کام دیتا تھا۔

<u>نقل وضبط کا اہتمام</u> | عہد عباسی میں علماء جو کتابیں تالیف کرتے انھیں پڑھاتے طلبہ اور علماء کو اس امر کی تصدیق کے لئے سند دیتے تھے، کہ یہ کتابیں انھوں نے حسب استعداد اور حسب موقعہ و محل کل یا جزاً استاد یا مصنف سے سمجھ کر پڑھی ہیں، اور استاد نے کتاب کو پڑھانے اور سننے کے بعد اہلیت کی بنیاد پر انھیں کتاب روایت کرنے کی اجازت دی ہے، در اصل استاد یا مصنف کی موجودگی میں کتاب کو سنا سنانا اس کتاب کی صحت کا ضامن ہوتا اس نسخہ کو اغلاط و الحاق سے پاک سمجھا جاتا اس نسخہ کتاب سے پڑھنا، پڑھانا، نقل کرنا اقتباس پیش کرنا مستند سمجھا جاتا تھا، اس کو اصطلاح محدثین میں صحت وضبط کتاب سے تعبیر کیا جاتا ہے محدثین کا یہ وہ زریں اصول ہے، جس کی تقلید ائمہ لغت وغیرہ نے بھی کی ہے[1]۔

وہ عالم جو مصنفین اور اساتذۂ فن سے کتابیں روایت نہیں کرتا اور کتب خانے میں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتا، ان سے اقتباس لیتا، وہ "صحفی" کہا جاتا تھا، اس کی کتاب اور اقتباس کو کبھی سند کا درجہ حاصل نہیں ہوتا تھا، چنانچہ احمد بن محمد البشتی المتوفی ۵۱۰ھ نے جو زبردست لغوی اور کتاب الخصائل کا مصنف تھا، مقدمۂ کتاب میں اس مسلمہ اصول کی مخالفت کی اور کہا:۔

میں نے اس کتاب میں جو اقتباس پیش کئے ہیں وہ مذکورۂ بالا کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

---

[1] الاعلام للزرکلی ج ۹ ص ۲۱۲ [2] تہذیب اللغہ محمد بن احمد الازہری تحقیق عبدالسلام محمد ہارون القاہرۃ، دار القومیۃ العربیۃ للطباعۃ [illegible] ص [illegible]

ممکن ہے بعض لوگ یہ اعتراض کریں اور اس امر پر تنقید کریں کہ میں نے جن علماء کی طرف ان اقوال کی نسبت کی ہے، ان سے مجھے روایت و سماع حاصل نہیں، ان کتابوں سے اقوال نقل کرنا اس عالم کے لیے موجب عیب نہیں جو صحیح و غلط کو پہچانتا ہو۔[1]

ازہری نے موصوف کے اس موقف پر سخت تنقید کی اور کہا بلاشبہ بشتی کو اس امر کا اعتراف ہے کہ جن کتابوں سے اس نے اپنی کتاب میں اقتباسات پیش کیے ہیں ان کا سماع اسے حاصل نہیں، ان اقتباسات کے لئے مذکورۂ بالا عذر پیش کرنا ہی اس امر کا اعتراف ہے کہ وہ صحفی ہے اور صحفی کا ذخیرہ وہ کتابیں ہوتی ہیں جن کا وہ مطالعہ کرتا ہے، ان میں تصحیف کرتا، غلط پڑھتا اور زیادہ پڑھتا ہے، تاکہ ان کتابوں کے مواد سے لوگوں کو متعارف کرائے جنھیں اس نے اساتذۂ فن سے نہیں سنا اور اسے علم نہیں کہ جو کچھ ان کتابوں میں لکھا ہے، وہ صحیح ہے، یا غلط اور ہم نے جو زیادہ پڑھا ہے، وہ زیر زبر اور صحیح نقطوں کے ساتھ ضبط تحریر میں آیا ہے یا نہیں اس کی تصحیح ارباب نظر نے کی ہے یا نہیں، یہ ایسی غلطی ہے جس پر جاہل ہی اعتماد کر سکتا ہے،[2] اس کے یہ معنی نہیں کہ جن کتابوں کی سند حاصل نہیں ان سے اقتباس پیش کرنا درست نہیں، ان سے تائید واستشہاد کے طور پر اقتباس پیش کرنے کا حق ہر عالم کو حاصل ہے، اس لیے کہ اس کے پاس اس کی اصل اپنے سلسلۂ سند سے موجود ہوتی ہے، ازہری فرماتے ہیں۔

" ابو تراب نے ابو سعید ضریر (نابینا) سے برسوں استفادہ کیا، بہت سی کتابوں کا سماع کیا پھر ہرات آکر شمر سے بعض کتابوں کا سماع کیا، اور یہ اس کے علاوہ تھا جو موصوف نے فصیح و بلیغ بدوؤں سے سنا اور یاد کیا تھا، اب وہ کسی ایسے آدمی کا ذکر کریں

---

[1] تہذیب اللغۃ لمحمد بن احمد الازہری تحقیق عبد السلام محمد ہارون، القاہرۃ، دار القومیۃ العربیۃ للطباعۃ سنہ ۱۳۸۴ھ ۱/ص ۳۳ [2] تہذیب اللغۃ ازہری، ص ۳۴۔

جسے انھوں نے دیکھا اور سنا نہیں تو زہری سے کام لیا ہے، اور یہی شکل ہے کہ جو کچھ انھوں نے کتابوں میں دیکھا اسے یاد کیا، اس اعتبار سے کہ انہیں ان کا مصنف سے سماع ثابت ہو۔ ایسی صورت میں جس کو انھوں نے دیکھا، اس کا قول نقل کرنا تائید کے طور پر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اس بات کو اس کے علاوہ دوسرے سے سنا ہے اور یہ محدثین کا مسلک ہے کہ وہ جب کسی باب میں ایسی حدیث پائے جسے کسی معتبر راوی نے کسی ثقہ سے روایت کیا ہو تو اس پر اعتماد کرتے ہوئے اس کا ذکر کرتے ہیں، پھر اس کا شمار ان روایات میں کرتے ہیں، جنہیں انھوں نے اجازةً روایت کیا ہے۔[1]

مصنفین مقدمۂ کتاب میں اسی لئے اس امر کی صراحت کرتے تھے کہ جن کتابوں کے اقتباس ہم نے پیش کئے ہیں ان کا سماع بواسطہ اساتذۂ فن ہمیں مصنفین سے حاصل ہے۔[2] اسی بناء پر ہم نے جو اور کتابوں میں پڑھا ہے یا ان کتابوں میں جنہیں وراقوں نے نقل کیا ہے، دیکھا ہے، کتاب میں درج نہیں کیا ہے، ورنہ کتاب بڑی طویل ہو جاتی اور اسے سند کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔[3]

کتابوں میں اعراب کا اہتمام عربی زبان میں زیر و زبر کے فرق سے الفاظ کے معانی بدل جاتے ہیں یہ بات عربی زبان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اردو میں بھی ہے، چنانچہ بکری اور بکری، ککڑی اور ککڑی میں زیر و زبر اور زبر و پیش کے فرق سے معنی بدل گئے، رسالت مآب کے اقوال سے شرعی احکام مستنبط کئے جاتے ہیں، اس میں زیر و زبر کے فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری سمجھا گیا اور کتابوں میں اعراب کا اہتمام کیا جانے لگا تاکہ غیر متبحر کو پریشانی نہ ہو۔[4]

---

[1] تہذیب اللغة ازہری ص ۴۳ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۴۰ [4] الالماع الی معرفة اصول الروایة وتقیید السماع للعیاض الیٰ موسیٰ تحقیق احمد صقر القاہرة، دار التراث، ۱۳۸۹ھ ص ۱۵۰ - ۱۵۲، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ تالیف محمد بن عبد الرحمٰن السخاوی تحقیق فرانز روزنتھال بغداد مطبعة العانی ۱۹۶۳ء ص ۱۰۱، مناہج العلماء فی البحث العلمی تالیف روزنتھال ترجمہ انیس فریحہ، بیروت، دار الثقافة ۱۹۶۱ء ص ۴۲ - ۴۳۔

ان وجوہ سے محققین نے مشکل حروف اور قابل اشتباہ کلمات کی صحت و ضبط پر زیادہ زور دیا، اور ہدایت کی کہ مشکل حرف کو کتاب کے حاشیہ پر حرف کے سامنے لکھے یہ حرف نقطے والا ہو یا بے نقطے والا تاکہ قاری کو رہنمائی ہو سکے اور اشکال جاتا رہے۔ خاص طور پر جب کتاب باریک اور سطروں میں بھی گنجائش کم ہو تو اسے پورا لکھنے سے اشکال جاتا رہے گا، چنانچہ حا کے نیچے چھوٹی ح بناتے، عین کے نیچے چھوٹا ع اور صاد، طا، دال اور راء کے نیچے چھوٹی سی صا وغیرہ بناتے تھے، یہی بعض اہل مشرق و مغرب کا دستور تھا۔ بعض علما، حروف مہملہ پر تبرہ (ہمزہ کا سا) نشان بناتے تھے، بعض علما، حروف مہملہ میں نقطوں کو بدلتے تھے، اور انھیں اہمال کی غرض سے نیچے لگاتے تھے۔ اہل مشرق کا دستور یہ ہے کہ وہ حروف مہملہ پر نصب نبرہ کے بقدر بہت ہی مختصر خط میں حروف کے اوپر لگاتے ہیں۔[1] بلکہ ابن درستویہ نے تصریح کی ہے کہ بعض کاتب غایت درجہ احتیاط کی وجہ سے ہر مشتبہ حرف جیسے راء، سین، صاد اور عین کے نیچے بھی نقطہ لگاتے تھے، تاکہ راء، شین، صاد، ضاد اور غین جن کے اوپر نقطہ لگایا جاتا ہے، امتیاز رہے۔[2] مذکورۂ بالا امور کی تصدیق کتاب "حذف من نسب قریش عن مورج السدوسی" سے جو مشہور نحوی و وراق، ابراہیم بن عبداللہ نجیرمی المتوفی ـــــہ کے مکتوبہ نسخہ سے کی جا سکتی ہے، جس کی تفصیل صلاح الدین المنجد نے مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۵ پر پیش کی ہے۔[3]

کتاب کا مقابلہ | کتاب کو نقل کرنے کے بعد شیخ کے اصل شنیدہ نسخہ سے مقابلہ کرنا لازم ہے، یا پھر کسی ثقہ کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے، بغیر مقابلہ و صحت نسخہ سے روایت کرنا درست نہیں ہے، عبارت میں اگر کہیں کوئی اشکال ہوتا ہے، تو مقابلہ و صحت سے وہ بھی دور ہو جاتا ہے۔

---

[1] الالماع، ص ۱۵۰ [2] کتاب الکتاب لابن درستویہ، ص ۵۴ [3] کتاب حذف من نسب قریش لمورج بن عمرو السدوسی تحقیق صلاح الدین المنجد القاہرۃ: مکتبہ دار العروبۃ ۱۹۶۰ء ص ۱۵

اس نسخہ سے مقابلہ اس لئے ضروری قرار دیا گیا کہ انسان کا ذہن ہر وقت حاضر نہیں
رہتا ہے قلب غافل ہو جاتا ہے، نظر بھر جاتی ہے، قلم بہک جاتا ہے، اس لئے بلا مقابلہ نسخہ
قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جاتا،[1] اور کتب خانوں میں ایسے نسخوں کی اہمیت زیادہ نہیں ہوتی،

تخریج اور الحاقِ نقص | اگر کتاب نقل کرتے وقت کوئی حرف یا جملہ چھوٹ جائے تو بین السطور
لکھا جائے، حاشیہ کتاب میں (لحق)، اضافہ کو بین السطرین سامنے لکھا جائے عبارت کا آغاز
اوپر کی طرف سے ہو تاکہ وہ اضافہ اسی سطر تک یا دو تین سطروں تک ختم ہو جائے اور اس کے
آخر میں صح کا لفظ یا بعض علماء کی طرح بعد التصحیح، رجع یا انتہی الحق لکھنا چاہئے[2]

ہر وہ بات جو کتاب کے حواشی اور کناروں پر "تنبیہ" "تفسیر اور اختلاف ضبط کے
عنوان سے لکھی جاتی ہے، اس پر تخریج نہ کی جائے کیونکہ اس سے التباس پیدا ہوتا ہے، یا اسے بھی اصل
(متن) کتاب سے سمجھ لیا جاتا ہے، تخریج صرف اسی امر کی کرنا چاہئے، جس کا اصل کتاب سے تعلق ہو
بسا اوقات اس تخریج کے ساتھ حرف پر مثلاً ضبہ یا تصحیح کا اضافہ کیا جاتا ہے، جو اس اضافہ مرقومہ
کا غماز ہوتا ہے[3]

یہ وہ اصول ہیں جو خلیفہ مستنصر باللہ کے خزانۃ الکتب میں "بیت المقابلہ والنسخ" کے نگرانوں
نے اس کے محل میں وضع کئے اور برتے تھے،[4] قاضی عیاض نے تصریح کی ہے کہ ہمارے شیوخ ادب نے
بتایا ہے، کہ حرف صح (صاد اور حا کے ساتھ) اگر لکھا جاتا ہے تو یہ صحت حرف کی علامت ہے،
تاکہ کسی وہمی کو خلل و نقص کا گمان نہ ہو، یہ مختصر لفظ صحیح لکھنے کے برابر ہے اور اگر ص بغیر حا کے لکھی جاتی ہے
تو حرف کے سقیم ہونے کی علامت ہے، اسی لئے اس پر پورا حرف نہیں لکھا جاتا، یہ اس کے نقص کا غماز
ہے، اس حرف کو "ضبہ" کہتے ہیں، یعنی یہ حرف مقفل ہے، اس کے صحیح پڑھنے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی ہو۔[5]

---

[1] الالماع ص ۱۵۸-۱۶۰ [2] ایضاً ص ۱۶۳ [3] ایضاً ص ۱۶۵ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۱۶۹۔

ضرب (قلم زد کرنا) کشط (کھرچنا) اور محو (مٹانا)

نقل کتاب میں حرف، لفظ یا جملہ قلم سے زیادہ نکل گیا، جو اصل کتاب میں نہیں، اس کو قلم زد کرنے، مٹانے کے طریقے حسب ذیل تھے:

جن کلمات کو خط کھینچ کر قلم زد کیا جاتا تھا، اس کو ضرب وشق کہتے ہیں، علماء کلمات کو دو طریقوں سے قلم زد کرتے تھے، بعض علماء کا دستور یہ تھا کہ جن کلمات کو مٹانا ہوتا تھا اس کے اوپر آغاز حرف سے اختتام تک خط کھینچ دیتے تھے، بعض علماء اس طریق کو کتاب کا سیاہ کرنا سمجھتے تھے، وہ آغاز و اختتام عبارت پر نصف دائرہ بناتے تھے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ بین القوسین عبارت قلم زدہ ہے، بسا اوقات تحویق (مٹانے) کے لئے بطور علامت شروع میں حرف "لا" اور آخر میں لفظ "الی" لکھتے تھے، یہ اس وقت کیا جاتا، جب کچھ حصہ غلط ہوتا یا کوئی حدیث کا ٹکڑا یا کلام کا حصہ رہ جاتا۔ لیکن سارا کلام غلط نقل ہو جانے کی صورت میں تحویق تام یعنی پورا قلم زد کرنا بہتر سمجھا جاتا تھا، اچھے کاتب شیوخ ضرب وتحویق کو پسند کرتے تھے، وہ ایسی صورت میں دائرہ صغیرہ اول میں بڑھاتے اور اس کو وہ صفر سے تعبیر کرتے تھے، اس کے معنی ان کے نزدیک صفر کا عدد سے خالی ہوتا تھا، اور یہ اس امر کی علامت تھا کہ دو صفر کے مابین عبارت صحت سے خالی ہے،[1]

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نقل عبارت میں کمی وزیادتی واقع ہونے کی صورت میں کن اصول کو برتا جاتا تھا، یہ عہد عباسی کے وہ اساسی اصول ہیں جن میں کچھ آج بھی (Typing) میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں، نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خریداری اور انتخاب کتب میں ان باتوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تھا، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عہد عباسی میں صنعت تصحیح ومقابلہ ایک فن کی حیثیت اختیار کر گئی تھی، کتب خانوں میں اس کا بہت اہتمام

---

[1] الالماع ص ۱۶۰۔۱۶۱، المحدث الفاصل للرامہرمزی ص ۶۰۶۔۶۰۷، ومناہج العلماء فی البحث العلمی لروزنتھال ص ۴۴۔۴۵

کیا جاتا تھا، اور خریداری میں ان اصول کو مد نظر رکھا جاتا تھا، ان حقائق کی روشنی میں یہ
بجا ہے کہ ارباب فن کی خدمات حاصل کرنے کے لئے جو کوشش آج کل پبلک لائبریریوں میں
کئے جاتے ہیں اس کی ابتدا مسلمانوں نے کی تھی، انھوں نے اپنے کتب خانوں میں اس کا ایک
مستقل شعبہ لائبریری میں قائم کیا، اور جس طرح وہ فنی معلومات بہم پہنچاتے تھے، تصحیح کا کام بھی کرتے
عہد عباسی میں کتابوں کی صحت حسب ذیل ذرائع سے کی جاتی تھی۔

۱۔ اساتذہ کراتے تھے۔

۲۔ نامور علماء سے تصحیح کا کام لیا جاتا تھا۔

۳۔ کتب خانوں میں مقابلہ و تصحیح کے لیے مستقل عملہ رکھا جاتا تھا، جس میں نامور اہل
کتابوں کی تصحیح و مقابلہ کرتے تھے۔

<u>قواعد صحت و احتیاطی پہلو</u> مشہور لغوی ابو محمد قاسم زیدی بچپن ہی سے کتابوں کی خواندگی
میں لگ گئے، اور چالیس برس کتابوں کی صحت کراتے رہے تھے،[1] بعض نابینا علماء بعض کتابوں
کی صحت میں استناد کا درجہ رکھتے تھے، ان سے کتابوں کی تصحیح کی جاتی تھی، چنانچہ مشہور لغوی
ابو القاسم شاطبی المتوفی ۵۹۰ھ سے بخاری، مسلم اور موطا پڑھی جاتی تو ان کی یادداشت سے
نسخوں کی صحت کی جاتی تھی، اور مشکل مقامات پر حل طلب امور اور نکتے بھی لکھے جاتے تھے
عالم و شاعر بقدر استطاعت متعدد نسخوں سے تحقیق، مقابلہ و تصحیح کرتا اور بسا اوقات
اسے بہت سے نسخے میسر آجاتے تھے، جیسا کہ اخبار الی تمام میں صولی کے بیان سے عیاں ہے
امام حسن صغانی لاہوری نے صحیح البخاری کا صحیح نسخہ مرتب کرنے کے لیے اور نسخوں کے علاوہ

---

[1] معجم الادبا ریاقوت ج ۶ ص ۱۰۰، [2] الانباہ الرواۃ للقفطی ج ۲ ص ۱۵۵، [3] اخبار ابی تمام
للصولی تحقیق خلیل محمود عساکر، محمد عبدہ عزام، نظیر الاسلام الہندی، بیروت، المکتب التجاری، د
ت، ص ۸،

امام بخاری کے شاگرد فِربری کا نسخہ بھی پیش نظر رکھا تھا[۱]۔ بادشاہوں وزیروں (امیروں) کے کتب خانوں میں ایک شعبہ تصحیح کا ہوتا تھا، اور یہ کام ماہرِ فن سے لیا جاتا تھا، ابو العلاء حسین بن محمد بن ہرویہ نے کتاب اجناس الجواہر میں لکھا ہے کہ میں ابو علی فارسی نحوی کے پاس بیٹھا ہوا تھا بادشاہ نے ہفتہ میں دو دن انھیں کافی الکفاۃ کے کتب خانہ میں کتاب التذکرہ کی تصحیح کے لئے مامور کیا تھا[۲]، اور حکم ثانی کے کتب خانہ میں تصحیح کرنے والے کتابوں کا مقابلہ و تصحیح قصرِ شاہی کے کتب خانہ قرطبہ میں کرتے تھے[۳]۔

مصنف اپنی کتاب محنت سے تیار کرتا، عرصۂ دراز تک اس کی خامیاں دور کرتا، اس میں اضافہ و تصحیح کرتا تھا[۴]۔ چنانچہ ابوبکر محمد بن عزیز سجستانی نے کتاب نزہۃ القلوب فی تفسیر غریب القرآن پندرہ برس میں لکھی تھی[۵]، اور ابو عبیدہ قاسم بن سلام نے غریب الحدیث چالیس برس میں لکھی تھی[۶]، انہی وجوہ سے تذکرہ نگار صحیح ترین کتابیں رکھنے والوں کی نشاندہی کرتے تھے جس سے مقصد کتابوں کی قدر و قیمت بتانا اور انتخاب میں ان نسخوں کو ترجیح دینا تھا، چنانچہ ابو الحسن علی ابن المغیرہ الاثرم، المتوفی ۲۳۲ھ کے متعلق تصریح کی ہے، کہ ان کے پاس تصحیح شدہ کتابیں تھیں[۷]۔ ابو الحسن علی جلبی المتوفی بعد ۳۰۰ھ نحو و لغت کا عالم اچھا نقل۔ تصحیح کتب کا دلدادہ تھا[۸]۔ اس نے اپنی کتاب میں وہی لکھا، جسے اس کے دل و دماغ نے محفوظ رکھا تھا[۹]۔

---

۱ فتح الباری، ج ۱ ص ۵۰ ، مناہج العلماء فی البحث العلمی ص ۳۰، ۲ معجم الادباء ج ۳ ص ۱۰، ۳ انباہ الرواۃ للقفطی ج ۳ ص ۱۰۶۳، ۴ فہرست ما رواہ من شیوخہ من الدواوین المصنفۃ فی ضروب العلم وانواع المعارف لمحمد ابن خیر الاشبیلی ط القاہرۃ، موسسۃ الخانجی ۱۳۸۲ھ ص ۴۳ ۵ الاتقان للسیوطی ط ۱۳۰۰ ج ۱ ص ۱۱۵ ۶ النہایہ فی غریب الحدیث والاثیر لابن الاثیر تحقیق طاہر احمد الزاوی، محمود محمد الطناحی ط ۲۰ القاہرہ! دار الفکر ۱۳۸۳ھ ج ۱ ص ۶۵ ۷ معجم الادباء ج ۵ ص ۱۱۰ ۸ ایضاً ص ۳۰۴ ۹ ایضاً ص ۲۲۰-۲۲۱۔

صحت کے اصول و ضوابط | نسخے کتاب کی تصحیح و مقابلہ جہاں تک ہو، الفاظ و ان کے اعراب وغیرہ کے ہم معنی الفاظ لکھے جاتے تھے۔[1]

تصحیح میں اختصارات و اصطلاحات | محدثین دو سطروں میں فصل کی خاطر دائرہ بناتے تھے، مسلسل نہیں لکھتے تھے، جو الفاظ حدیث کی کتابوں میں بکثرت استعمال کئے جاتے تھے ان کی درج ذیل مختصر علامتیں مقرر کی گئی تھیں اور یہ طریقہ ان میں شائع و ذائع تھا۔

حدثنا کی جگہ ثنا نا	فحینئذ ۔ فح
اخبرنا ۔ انا، ابنا	الی آخرہ ۔ الخ
قال ۔ ق	والمصنف ۔ المص
قال حدثنا ۔ قثنا	التحویل ۔ ح
المطلوب ۔ ط	البخاری ۔ خ
محال ۔ مح	مسلم ۔ م[2]
باطل ۔ بط	وحینئذ ۔ دح

اس طرح حوالوں میں کتب حدیث کے ناموں کے لیے مختصر علامتیں استعمال کی جاتی تھیں۔[3]
کتابت و کتاب کی آرائش و زیبائش کی خاطر گل کاری کی جاتی، پھول پتی اور بیل بوٹوں میں مفرد و مرکب دونوں قسم کے رنگ بھرے جاتے تھے، چنانچہ زرد، سرخ، گلابی، نیلا، زنگاری،[4] عودی، سبز، گلگون، نارنجی،[5] یہ رنگ عہد عباسی میں خوشنویس برابر استعمال کرتے رہے تھے۔[6]

---

[1] منہاج العمل و رقی البحث العلمی، ص ۴۷۔ [2] ایضاً، ص ۹۔ [3] اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ لابن الاثیر مصر المطبعۃ الوہبیہ، ۱۲۸۰ھ۔ [4] ص ۸۔ [5] مقالہ خط ذہبی الدین محمد قزوینی، جزو دوم شمارہ ۵، ۶ (آبان ۱۳۲۸ ف) ص ۵۱۔ [6] اورنگ چین دیبی پرشاد بدایونی، کانپور، مطبع نظامی ۱۲۹۲ھ ص ۱۰، ۳۱۔

عہد عباسی میں رنگوں کے ذریعہ کتابوں کو ممتاز کیا جاتا اور ترتیب سے رکھا جاتا تھا، چنانچہ ابوبکر صولی المتوفی ۳۳۵ھ نے اپنے کتب خانے میں کتابوں کو رنگوں سے ممتاز کرکے رکھا تھا۔[۱]

اسلامی قلمرو کے دیار مشرق و مغرب میں تیسری صدی ہجری کے نصف ثانی سے کتب خانوں کی رنگوں سے زینت بڑھائی جاتی تھی، کمروں کی چھت، الماری، غالیچے، پردے اور جلدوں میں رنگوں کی مناسبت کا خیال رکھا جاتا تھا، چنانچہ قاضی ابن فطیس قرطبی (۳۴۸ - ۴۰۲ھ) نے اپنے کتب خانے کے کمروں کی چھتوں، دیواروں، دروازوں، غالیچوں، پردوں، الماریوں اور جلدوں میں رنگوں کی مناسبت کا لحاظ رکھا، اور امتیاز قائم کیا تھا۔[۲]

مصاحف کی نقل اور علمی کتابوں کی کتابت و اشاعت کا اہم ذریعہ وراقت کا پیشہ تھا، علماء نے اس کو بہتر پیشہ قرار دیا، اور وراق کو اس نعمت کی قدر بھی بتائی تھی کہ وہ طلبہ و اہل علم کے ساتھ نرمی سے پیش آئے اور جن کے متعلق گمان غالب ہو کہ وہ کاغذ علمی کتابیں لکھنے کے لیے خریدتے ہیں، انھیں ترجیح دیں، اصحاب ہوی اور خرافات لکھنے والوں کو کاغذ فروخت کرنے سے باز رہیں۔[۳]

<u>کاتبوں کا ضابطہ اخلاق</u> آج دنیا میں کسی ملک و قوم کے پاس کوئی ایسا قانون نہیں جو کاتبوں کو کتابت سے روک سکے اور انھیں حسن معاملہ کا پابند بنا سکے لیکن اسلام نے کتابت کو معاملات میں داخل کیا تاجر و مستاجر پر پابندیاں عائد کیں تاکہ معاشی دوڑ میں معاشرہ میں فساد راہ نہ پا سکے۔ وہ پابندیاں حسب ذیل تھیں۔

---

[۱] تاریخ بغداد، ج ۳ ص ۴۳۱ [۲] تاریخ قضاۃ الاندلس لابی الحسن بن عبداللہ، ص ۸۶ المکتب التجاری دار الکاتب المصری، ۱۹۴۸ء ص ۸۰ [۳] معید النعم مبید النقم للسبکی تحقیق محمد علی النجار، القاہرۃ دار الکتاب العربی ۱۹۴۸ء ص ۱۳۲۔

۱۔ کاتب و ناقل پر لازم ہے کہ گمراہ کن اور غیر مفید کتابیں لکھنے سے باز رہے جس سے [illegible]
عزیز برباد ہوتے ہیں، دین کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اسی طرح فحش لٹریچر، موسیقی و ہر کا کھیلکے
موضوع پر کتابیں لکھنے سے گریز کرے، یہ عزت و آبرو کو پامال کرنے کا سبب ہوتی ہیں،
نقل نویسوں کو ان باتوں سے بچنے کی ہدایت اس لئے کی جاتی ہے کہ دنیا دھوکہ دیتی ہے اور
اکثر اوقات اس قسم کی کتابیں نقل کرنے والوں کو علمی کتابوں کے ناقلوں سے زیادہ اجرت
پیش کی جاتی ہے، لہذا نقل نویسوں کو دنیا کے عوض دین فروخت نہیں کرنا چاہئے۔

نقل نویس خدا کا خوف نہیں کرتے، جلدی جلدی لکھتے ہیں کتاب جلد پوری کرنے کی خاطر
نقل کرتے وقت بہت سی عبارتیں چھوڑ جاتے ہیں، حالانکہ معاملہ پوری کتاب کے نقل کا ہوتا
ہے، ایسے نقل نویس علم کو برباد کرتے، اور خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں، کلام کو بے ربط بنانے کا
جرم کرتے ہیں، مصنف کی تصنیف میں قطع و برید کا ارتکاب کرتے اور کلام میں چوری کرتے ہیں۔

فقہاء میں، امام نووی نے تصریح کی ہے کہ کسی نے اجرت پر لکھوایا، پھر کاتب نے غلط
لکھا یا عربی زبان میں لکھوایا، اور اس نے کسی عجمی زبان میں لکھا یا اس کے برعکس کیا تو اس پر
کاغذ کی قیمت کا تاوان آجائے گا، اور وہ کسی قسم کی اجرت کا مستحق نہیں ہوگا، قریب قریب
ایسی ہی بات امام غزالی نے فتاوی میں کہی ہے۔

علی بن عبد الکافی سبکی سے کسی نے فتوی لیا کہ کسی نے نقل نویس سے کتاب نقل کرنے کی
بات طے کی، نقل نویس نے ایک سال تک نہیں لکھا، اور اس مدت میں اس کا خط بڑھیا ہوگیا
تو کیا اسے خط کے بڑھیا ہو جانے کی وجہ سے زیادہ قیمت طلب کرنے یا معاملہ فسخ کرنے کا حق ہے،
موصوف نے فتوی دیا کہ دونوں باتوں کا اسے اختیار نہیں، سابقہ اجرت ہی پر لکھنا لازم ہے، جو نقل
نویس سے اجرت پر لکھوائے، اس پر لازم ہے کہ وہ اوراق اور ہر صفحہ کی سطروں کا بھی تعین کرے

اگر سیاہی متعین نہ کی ہو تو مادہ میں سیاہی سے لکھا جاتا ہے، اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ اختلا
صورت میں وضاحت ضروری ہوگی، ورنہ معاملہ کالعدم قرار دیا جائے گا۔[1]

__کاتب و ناقل کی شرطیں__ جو شخص علوم فقہ، حدیث، اصول وغیرہ کی کتابیں نقل کرنا چاہتا ہے
پر لازم ہے کہ اس نے ان فنون کو پڑھکر ان میں بصیرت پیدا کی ہو تاکہ وہ غلط، تحریف
سے، الفاظ کو غلط پڑھنے، غلط لکھنے سے بچے، ایک باب کے دوسرے باب سے، سوال
جواب سے فصل کے دوسری فصل سے، اصل کے فرع سے اور فرع کے اصل سے امتیاز کو ت
کو فائدہ سے، سوال سائل کو اور معترض کے اعتراض کو خوب پہچانتا ہو، مقصد اور آخر کلا
بات کو سمجھتا ہو، نقل کرتے وقت وہ ایک کلام کو دوسرے کلام سے مختصر فاصلہ پر جدا کر
دوسرے کے قول کو ایسے اشارہ سے نمایاں کر سکے جو اس کے امتیاز کی طرف رہنمائی کر
ورنہ وہ ناقل و ناسخ حاطب لیل ہے، جسے نہیں معلوم کہ کس وقت صبح نمودار ہوگی وہ
سیلاب میں بہ رہا ہے جسے صبح و شام کی خبر نہیں۔

جو تاریخ کی کتابیں لکھنا اور نقل کرنا چاہتا ہے اسے بادشاہوں کے نام، ان کے ا
ان کے اوصاف اور کنیتوں کو جاننا چاہیے، خاص طور پر عجم، ترک و خوارزم کے بادشا
کے اس لئے کہ ان کے نام عربی نہیں ہیں، انھیں نقل کے ذریعہ جانا جاتا ہے، اس بنا
رہنما اصول اور اشاروں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ملک، شہر، دیہات، قلعے،
شہر، قصبے اور اقلیم کے ناموں کو جاننا اور ان اسمار کو جاننا جن میں خطی مشابہت اور
مختلف ہے، یا خطی و لفظی مشابہت ہے اور ان کی نسبت میں اختلاف پایا جاتا ہے
ناگزیر ہے، اگر ان میں امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جائے گا، تو سامع کو الجھن ہوگی، اور واقعا

[1] معید النعم، ص ۱۳۱-۱۳۲۔

اچھی طرح واقف نہیں ہو سکے گا، ناسخ و کاتب کو لازم ہے کہ وہ ان باتوں کو ذہن نشین کر لے۔ ناقل اشعار پر اوزان اور عربیت سے واقفیت بھی لازم ہے[1]

انہی وجوہ سے عہد عباسی کی نوشتہ کتابوں میں غلطیاں کم پائی جاتی ہیں اور مسلمانوں کا ثقافتی ورثہ عام طور پر غلطیوں سے محفوظ رہا ہے، جن اقوام نے اپنے علمی ورثہ میں صحت کا اہتمام نہیں کیا، ان کا تحریری سرمایہ اغلاط سے پر رہا، چنانچہ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط تک یورپ کو جو مسودات ملے تھے، وہ اغلاط سے پر تھے[2]

یہ وہ رہنما اصول ہیں جن سے آج بھی قلمی کتابوں کے نقل میں مفر نہیں۔

---

[1] نہایۃ الارب فی فنون الادب شہاب الدین احمد بن عبدالوہاب النویری، القاہرۃ، مطبعۃ دارالکتب المصریۃ ۱۳۵۱ھ ج ۹ ص ۲۱۴-۲۱۸

[2] The Encyclopaedia Americana

- 194[?]- edn. Vol. 2 8[?]

بزم تیموریہ جلد اول

اس جلد میں شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق اور علمی قدردانی کے سلسلہ میں اوسکے دربار کے گل سرسبد عبدالرحیم خانخاناں کی علم پروری، علم دوستی سخن سنجی اور اوس کے علمی ذوق کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے، وہ جس طرح شعراء کی تربیت کرتا تھا جسطرح فیاضیوں کا مینہ اون پر برساتا تھا، جس طرح ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا، اس پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اور اسی کے ضمن میں خود اوس کے دربار کے منسلک شعراء عرفی، شکیبی، حیاتی، ظہوری، ملک قمی، نظیری نیشاپوری، محتشم کاشی، رسمی، نوعی شیرازی وغیرہ جیسے اساتذۂ سخن کے مختصر حالات کے ساتھ اون کے ہر طرح کے کلام کا بہترین انتخاب بھی کیا ہے، اس سے پہلے بابر اور ہمایوں کے علمی ذوق کے سلسلہ میں اون کے دربار کے ادباء فضلاء اور شعراء کا ذکر اور ان کے کلام کا انتخاب ہے،

قیمت ۱-۲۶ روپیہ، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

علامہ برہان الدین مرغینانی

صاحبِ ہدایہ

از عبید اللہ کوثی ندوی رفیق دار المصنفین

علامہ برہان الدین مرغینانی، ماوراء النہر کے چھٹی صدی ہجری کے ان اکابر فقہاء میں ہیں، جن کی تصنیف ہدایہ نے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے، ہدایہ کے بارے میں علامہ کمال الدین محمد طاش کبری زادہ رومی (م سنہ ۱۰۳۰ھ) نے یہ رائے دی ہے کہ فقہ پر لکھی جانے والی یہ سب سے اہم کتاب ہے۔[۱]

لیکن اس زمانہ کے دوسرے اہل علم کی طرح، علامہ مرغینانی کے حالات بھی زیادہ دستیاب نہیں، تاہم جس قدر فراہم ہو سکے ہیں ذیل کی سطروں میں پیش کئے جاتے ہیں۔

اسم گرامی اور نسب نامہ علی نام اور ابو الحسن کنیت ہے، شیخ الاسلام برہان الدین کے لقب سے شہرت پائی۔[۲] اپنی تصنیف کتاب التجنیس والمزید[۳]، اور البدایہ کے آغاز میں[۴] اپنا نام اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔[۵] "ابو الحسن علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل"۔

مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے یہ نسب نامہ لکھا ہے، "علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل بن الخلیل بن

۱؎ کشف الظنون نمبر ۲۰۳۰ مطبوعہ وکالۃ المعارف ترکی سنہ ۱۹۴۳ء ۲؎ الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ مولفہ محی الدین عبد القادر قرشی مصری ج ۱ ص ۳۸۳ ۳؎ کتاب التجنیس نسخہ قلمی دار المصنفین ۴؎ الفوائد البہیہ ص ۵

ابن بکر الفرغانی المرغینانی تھے لکھتے ہیں، کہ علامہ مرغینانی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نسل سے ہیں،[۱]

علامہ برہان الدین مرغینانی کا سنہ ولادت، زرکلی نے ۵۳۰ھ لکھا ہے[۲] اکتفاء القنوع میں بھی یہی لکھا ہے[۳]، لیکن یہ قطعاً درست نہیں، قیس بن اسحاق ابوالمعالی المرغینانی سمرقند میں مقیم ایک صاحب علم اور باحیثیت شخص تھے، اور وہیں سنہ ۵۲۰ھ میں ان کا انتقال ہوا، ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرے اور انکے درمیان قرابت تھی، میں ان سے ملا ہوں انھوں نے مجھ کو چند اشعار سنائے، یہ وہ اشعار صاحب ہدایہ نے اپنی معجم الشیوخ میں نقل بھی کئے ہیں[۴] ممکن ہے کہ صاحب ہدایہ کی ان سے یہ ملاقات ۵۲۰ھ سے کافی پہلے ہوئی ہو لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ قیس بن اسحاق سے انکی یہ ملاقات ۵۲۰ھ ہی میں ہوئی تھی تب بھی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرغینانی ۵۲۰ھ تک تو یقیناً تعلیم و تربیت کے اس مرحلہ میں پہنچ گئے تھے کہ عربی اشعار سمجھ کر دوسروں کو سنا سکتے تھے، انکے ادبی ذوق اور قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ ان اشعار کو اپنے حافظہ میں محفوظ بھی رکھ سکتے تھے، دوسرا سنہ ولادت، علاء الدین نبیرہ کے حوالے سے عبدالقادر قرشی حنفی نے اپنے اجداد کا نقل کر کے ۵۱۱ھ تحریر کیا[۵] وہ لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام برہان الدین کی ولادت بروز دوشنبہ بعد نماز عصر ۸ رجب ۵۱۱ھ میں ہوئی[۶]، اس لئے زرکلی کا یہ لکھنا کہ ان کی ولادت ۵۳۰ھ میں ہوئی صحیح نہیں،

وطن | شیخ قاسم بن قطلوبغا نے[۷] اور مغل شہنشاہ بابر نے[۸] (جو فرغانہ کا بھی حکمراں تھا) علامہ مرغینانی کا اصل وطن "رشدان" کو قرار دیا ہے ۔

یہ رشدان صوبہ فرغانہ کے شہر مرغینان کا ایک دیہات ہے لیکن اپنی مردم خیزی علمی و دینی حیثیت اور تمدنی اہمیت کی وجہ سے چوتھی صدی ہجری میں مرغینان سے زیادہ اہم اور عظیم تر تھا یاقوت حموی[۹] اور مقدسی بشاری نے[۱۰] رشدان کے بجائے رشتان لکھا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریب المخارج ہونے کی وجہ سے یہ دونوں ہی لفظ مستعمل رہے ہیں ۔

---

۱ مقدمۃ الہدایہ ج ۳ ص ۲ ۲ الاعلام ج ۲ ص ۲۴ ۳ اکتفاء القنوع ص ۲۴۳ ۴ الجواہر ج ۱ ص ۲۴۱ ۵ مقدمۃ الہدایہ ج ۳ ص ۲ ۶ تاج التراجم فی طبقات الحنفیہ ص ۳۱ ۷ تزک بابری ص ۳ ۸ معجم البلدان ج ۴ ص ۲۵۲ مطبوعہ مصر ۱۹۰۶ء ۔ ۹ ایضاً

شیخ الاسلام برہان الدین کو دیہات، شہر اور صوبہ کی مناسبت ہی سے الفرغانی المرغینانی الرشدانی کہا جاتا ہے، فرغانہ صوبہ ماوراء النہر کا ایک حصہ تھا جس میں بخارا، بیکند، دبوسیہ، سمرقند، فاراب، شاش (تاشقند)، کاسان، ترمذ، کاشغر وغیرہ کی ریاستیں شامل تھیں[1]، اور یہ تمام علاقے علوم و فنون کے مرکز تھے، جن کی خاک سے بے شمار اہم شخصیتیں اٹھیں، فرغانہ بھی ایک اہم مرکز شمار کیا جاتا تھا، اس کے شہر مرغینان کے بارے میں یاقوت حموی نے خاص طور پر یہ شہادت دی ہے کہ

مرغینان ماوراء النہر میں فرغانہ کے اطراف کے معروف ترین شہروں میں ہے جو فضلاء اور اہل علم کی ایک بڑی تعداد وہاں پیدا ہوئی۔[2]

تعلیم و تربیت | غالباً صاحب ہدایہ کے والد بزرگوار کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا، ان کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، علامہ مرغینانی کی ابتدائی تعلیم اور تربیت و پرداخت ان کے جد مادری القاضی الامام عمر بن حبیب بن علی زندرامسی کے یہاں ہوئی جو مرغینان میں قاضی کے منصب پر فائز تھے، شمس الائمہ امام سرخسی کے خاص تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، شاعر تھے، فقہ و علم کلام میں متبحر، فتویٰ اور قضا کے مسائل میں دقیق النظر عالم اور امام وقت تھے، تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتے تھے، چنانچہ اپنے ایک استاد قاضی احمد بن عبد العزیز زوزنی کی کتاب مسائل الاسرار پر حاشیہ

---

[1] تقویم البلدان ص ۴۹۲ تا ۵۰۴ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۴۰ء۔ [2] معجم البلدان ج ۸ ص ۲۰ [3] قرشی نے ایک اور موقع پر (ج ۲ ص ۳۱۳) اس کا تلفظ "رامش" سے کیا ہے، یعنی زندرامشی، یاقوت حموی کی معجم البلدان ج ۴ ص ۴۰۹ میں "زندرامش" کو بھی بلدان و امکنہ کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے، لیکن وہ اس کا تلفظ بتلا کر رہ گئے، مزید تفصیل و تعیین نہیں کی، میرے خیال میں صاحب ہدایہ کے نانا کی زندرامس کی طرف نسبت مکانی نہیں بلکہ خاندانی ہے، ہندوستان میں نند خاندان ۴۱۳ ق م سے ۳۲۲ ق م تک یعنی ۹۰ برس حکمراں رہا، اور اس کے نو راجاؤں نے حکومت کی، یونانی مورخوں کے بقول اس خاندان کے آخری حکمراں کا نام "زندرامس" تھا، اس لئے یہ بات کچھ بعید نہیں کہ مولف ہدایہ کے نانا اسی زندرامس کی نسل سے ہوں، قدیم تاریخ ہند باب دوم ضمیمہ ب ص ۱۰ مولفہ ونسنٹ اے اسمتھ ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔

بھی تحریر فرمایا ہے۔ صاحب ہدایہ کے عربی اور ادبی استاد بھی تھے، جبکہ مضمون علم کلام
و منطق و فلسفہ، عقائد اور فرق و ملل کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل ہوتا تھا، عربی زبان و ادب اور
شعر و سخن کی تعلیم حاصل کی، ابھی وہ کم سن تھے کہ حسن اتفاق اور غالباً تبرک کے طور پر، نانا نے ایک
حدیث شریف ان کے سامنے پڑھی، بارگاہ الٰہی سے قوت حافظہ کی دولت عطا ہوئی تھی، چنانچہ
وہ حدیث آخر عمر تک علامہ مرغینانی کو یاد رہی، فرماتے تھے، کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک
روایت حدیث کے جواز کے لئے یہ شرط بھی ہے کہ راوی حفظ حدیث کے زمانہ سے روایت حدیث
کے زمانہ تک، اس کو نہ بھولا ہو، چنانچہ اس شرط کے مطابق میرے لیے اس روایت کو بیان
کرنا جائز ہے،[۱]

اسی دوران میں صاحب ہدایہ نے شیخ منہاج الشریعۃ محمد بن عمر بن الحسین سے استفادہ کیا
فرماتے ہیں کہ میں نے اوائل عمر اور زمانہ کم سنی ہی میں شیخ سے پڑھا ہے، اور اس کے بعد بھی
۵۳۵ھ تک شیخ کے بحر علم سے مسلسل فیض حاصل کرتا رہا۔[۲]

اپنے نانا قاضی عمر بن حبیب زندرامسی کے انتقال کے بعد، علامہ مرغینانی نے فقہ و علم
کلام کی مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے صوبہ کے صدر مقام فرغانہ کے لئے رخت سفر باندھا"
فرغانہ | یہاں امام ابو الحسن بزدوی کے براہ راست شاگرد، ابو المعالی ظہیر الدین بن زیاد
ابن الیاس کی مسند درس خاص طور پر شہرت رکھتی تھی، علامہ مرغینانی نے ان سے استفادہ کیا
وہ اپنی فضیلت علمی کے باوجود خوش اخلاق اور منکسر مزاج تھے، شاگردوں کے ساتھ شفقت
اور محبت کا معاملہ فرماتے۔[۳] فرغانہ ہی کے ایک اور بزرگ عالم شیخ عثمان بن ابراہیم خواقندی
سے بھی علامہ مرغینانی نے فقہ وغیرہ کا درس لیا اور اجازت پائی۔[۴]

---

[۱] الجواہر ج ۱، ص ۳۰۹ [۲] الفوائد البہیہ ص ۲۴۳ [۳] الجواہر ج ۱، ص ۲۴۵ بحوالہ معجم الشیوخ [۴] ایضاً ج ۱

علامہ مرغینانی نے طلب علم کی راہ میں سمرقند و بخارا، نیشاپور، مرو، بلخ وغیرہ کے سفر کیے، وہ حرمین اور بغداد و ہمدان بھی گئے، اس سلسلہ میں وہ کہاں پہلے گئے، اور کہاں بعد میں، یا اساتذہ مابعد سے استفادہ میں تقدم و تاخر کی نوعیت کیا رہی، یہ بتانا دشوار ہے، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ عربی زبان و ادب اور علم کلام و فقہ کی تعلیم مقدم تھی، اور حدیث و تفسیر کی موخر، مگر چونکہ صاحب ہدایہ نے ہر ایک فن کی تعلیم کئی کئی اساتذہ سے حاصل کی ہے، اس لئے شہروں ہی کی ترتیب سے صاحب ہدایہ کے اساتذہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا فرنگی محلی، یا تذکرہ و سوانح کے دوسرے مصنفین نے صاحب ہدایہ کے چند ہی اساتذہ کا ذکر کیا ہے، لیکن حسن اتفاق سے شیخ محی الدین عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیہ میں مختلف فقہاء و محدثین کے تذکرہ میں جا بجا، صاحب ہدایہ کی کتاب معجم الشیوخ سے بھی اقتباسات لیے ہیں، جن سے صاحب ہدایہ کے دور طالب علمی اور ان کے اساتذہ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

سمرقند: نوجوانی ہی میں صاحب ہدایہ سمرقند گئے، جہاں ان کے ایک قرابت دار قیس بن اسحاق ابوالمعالی (وفات ۵۲۰ھ) حیات تھے، وہ امام محمود بن عبداللہ جوزجانی کے شاگرد، اور امام ابوحفص عمر بن محمد نسفی کے استاد تھے[1] ان سے ملاقات اور علمی استفادہ کے علاوہ، علامہ مرغینانی کے لیے امام زاہد، نجم الدین ابوحفص عمر بن محمد نسفی (م ۵۳۷ھ) کی شخصیت خاص طور پر بڑی اہم تھی، وہ مفتی، فقیہ، محدث، مفسر، اور صاحب فضل تھے، ان کی روایت حدیث ۵۵۰ اساتذہ سے مروی تھیں، انھوں نے فقہ و حدیث پر کئی کتابیں لکھیں، جامع صغیر کو منظوم کیا، علامہ مرغینانی نے ان سے کچھ تصنیفات کی سماعت کی، اور امام ظہیر الدین محمد بن عثمان کی رفاقت میں ان سے مضاف کی کتاب المسندات کی

---

[1] جلد ۲ ص ۱۲۔

بھی تحریر فرمایا تھا، صاحب ہدایہ کے مربی اور اولین استاذ بھی تھے جن سے انھوں نے علم کلام (جو منطق و فلسفہ، عقائد اور فرق و ملل کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل ہوتا تھا) عربی زبان و ادب اور شعر و سخن کی تعلیم حاصل کی، ابھی وہ کم سن تھے کہ حسن آغاز اور غالباً تبرک کے طور پر، نانا نے ایک حدیث شریف ان کے سامنے پڑھی، بارگاہ الٰہی سے قوت حافظہ کی دولت عطا ہوئی تھی، چنانچہ وہ حدیث آخر عمر تک علامہ مرغینانی کو یاد رہی، فرماتے تھے، کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک روایت حدیث کے جواز کے لئے یہ شرط بھی ہے کہ راوی حفظ حدیث کے زمانہ سے روایت حدیث کے زمانہ تک، اس کو نہ بھولا ہو، چنانچہ اس شرط کے مطابق میرے لیے اس روایت کو بیان کرنا جائز ہے۔[۱]

اسی دوران میں صاحب ہدایہ نے شیخ منہاج الشریعۃ محمد بن محمد بن الحسین سے استفادہ کیا فرماتے ہیں کہ میں نے اوائل عمر اور زمانہ کم سنی ہی میں شیخ سے پڑھا ہے، اور اس کے بعد بھی ۵۳۵ھ تک شیخ کے بحر علم سے مسلسل فیض حاصل کرتا رہا۔[۲]

اپنے نانا قاضی عمر بن حبیب زندرامسی کے انتقال کے بعد، علامہ مرغینانی نے فقہ و علم کلام کی مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے صوبہ کے صدر مقام فرغانہ کے لئے رخت سفر باندھا۔

فرغانہ | یہاں امام ابوالحسن بزدوی کے براہ راست شاگرد، ابوالمعالی ظہیرالدین بن زیاد ابن الیاس کی مسند درس خاص طور پر شہرت رکھتی تھی، علامہ مرغینانی نے ان سے استفادہ کیا وہ اپنی فضیلت علمی کے باوجود خوش اخلاق اور منکسر مزاج تھے، شاگردوں کے ساتھ شفقت اور محبت کا معاملہ فرماتے۔[۳] فرغانہ ہی کے ایک اور بزرگ عالم شیخ عثمان بن ابراہیم خواقندی سے بھی علامہ مرغینانی نے فقہ وغیرہ کا درس لیا اور اجازت پائی۔[۴]

---

[۱] الجواہر ج ۱ ص ۳۰۹ [۲] الفوائد البہیہ ص [۳] الجواہر ج ۱ ص ۲۴۵ بحوالہ معجم الشیوخ [۴] ایضاً ج ۱ ص

علامہ مرغینانی نے طلب علم کی راہ میں سمرقند، بخاریٰ، نیشاپور، مرو، بلخ وغیرہ کے سفر کیے، وہ حرمین اور بغداد وہمدان بھی گئے، اس سلسلہ میں وہ کہاں پہلے گئے، اور کہاں بعد میں، یا اساتذۂ مابعد سے استفادہ میں تقدم وتاخر کی نوعیت کیا رہی، یہ بتانا دشوار ہے، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ عربی زبان وادب اور علم کلام وفقہ کی تعلیم مقدم تھی، اور حدیث وتفسیر کی موخر، مگر چونکہ صاحب ہدایہ نے ہر ایک فن کی تعلیم کئی کئی اساتذہ سے حاصل کی ہے، اس لئے شہروں ہی کی ترتیب سے صاحب ہدایہ کے اساتذہ کا ذکر کیا جاتا ہے،

مولانا فرنگی محلی، یا تذکرہ وسوانح کے دوسرے مصنفین نے صاحب ہدایہ کے چند ہی اساتذہ کا ذکر کیا ہے، لیکن حسن اتفاق سے شیخ محی الدین عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیہ میں مختلف فقہاء ومحدثین کے تذکرہ میں جابجا، صاحب ہدایہ کی کتاب معجم الشیوخ سے بھی اقتباسات لیے ہیں، جن سے صاحب ہدایہ کے دور طالب علمی اور ان کے اساتذہ پر مزید روشنی پڑتی ہے،

سمرقند: نوجوانی ہی میں صاحب ہدایہ، سمرقند گئے، جہاں ان کے ایک قرابت دار قیس بن اسحاق ابوالمعالی (وفات ۵۲۰ھ) حیات تھے، وہ امام محمود بن عبداللہ جوزجانی کے شاگرد، اور امام ابوحفص عمر بن محمد نسفی کے استاد تھے[1]، ان سے ملاقات اور علمی استفادہ کے علاوہ، علامہ مرغینانی کے لیے امام زاہد، نجم الدین ابوحفص عمر بن محمد نسفی (م ۵۳۷ھ) کی شخصیت خاص طور پر بڑی اہم تھی، وہ مفتی، فقیہ، محدث، مفسر، اور صاحب فضل تھے، ان کی روایت حدیث ۵۵۰ اساتذہ سے مروی تھیں، انھوں نے فقہ وحدیث پر کئی کتابیں لکھیں، جامع صغیر کو منظوم کیا، علامہ مرغینانی نے ان سے کچھ تصنیفات کی سماعت کی، اور امام ظہیر الدین محمد بن عثمان کی رفاقت میں ان سے مضافات کی کتاب المنذرات کی

---

[1] جلد ۲ ص ۱۲۱۔

بھی سماعت کی۔ اور ان کے صاحبزادہ الامام المجد احمد بن عمر نسفی سمرقندی (شہید ۵۵۲ھ) سے بھی روایت حدیث کی اجازت حاصل کی۔[1]

سمرقند ہی میں امام علی بن محمد بن اسماعیل اسبیجابی (م ۵۳۵ھ) جن کو ایک ممتاز عالم ہونے جو شیخ الاسلام کی حیثیت رکھتے تھے، علامہ مرغینانی نے ان سے فن تدریس اور اصول و کلام میں بہت زیادہ استفادہ کیا، زیادات کے کچھ فتاوے اور مبسوط اور جامع صغیر کا ایک حصہ پڑھا، انھوں نے علامہ مرغینانی کو علی الاطلاق افتاء کی اجازت دی اور اس بارے میں شاندار تعریفی الفاظ استعمال کرتے ہوئے اپنے حروف سے تفصیلی سند بھی عنایت فرمائی۔[2]

نیشاپور | یہاں امام نے شیخ صفی الدین ابو البرکات عبد اللہ بن محمد صاعدی سے درس لیا، اور ان کی تمام مرویات کی اجازت مطلقہ حاصل کی، شیخ صاعدی، خاندانی طور پر علم و زہد اور صلاح و تقویٰ کے وارث اور اسی ماحول کے پروردہ تھے۔[3]

مرو | یہاں جن شیوخ سے علامہ مرغینانی نے استفادہ کیا وہ یہ ہیں،

۱۔ محمد بن ابی بکر الخطیب البوسنجی الامام الزاہد، انھوں نے اپنی تمام مسموعات کی روایت کرنے کی اجازت دی اور شیخ علی بن احمد الواحدی کی کتاب التفسیر الوسیط کا ایک نسخہ اپنے دست خاص سے نقل کرکے عنایت فرمایا۔[4]

۲۔ شیخ ضیاء الدین محمد بن حسین یرسوخی، ان کو چار واسطوں سے امام مسلم بن الحجاج القشیری سے صحیح مسلم کی اجازت روایت کا شرف حاصل تھا، چنانچہ انھوں نے صحیح مسلم اور اپنی تمام دیگر مسموعات کی صاحب ہدایہ کو اجازت دی اور اپنے دست خاص سے ۵۴۴ھ[5]

۱؎ ایضاً، ص ۳۹۵، ۲؎ ایضاً، ص ۱۰۱، ۳؎ ایضاً، ص ۲۰۰، ۴؎ ایضاً ۲ ص ۱۱۵ ۵؎ مولانا فرنگی محلی نے جن کا ماخذ انکی تصریح کے مطابق زیادہ تر کفوی کی طبقات الحنفیہ رہی ہے، لکھا ہے کہ شیخ ضیاء الدین کو صحیح مسلم

نے بھی اجازت عامہ لکھ کر عنایت فرمایا، ان کی مسموعات میں کتاب التمہید (مولفہ امام سیف الدین ابو الشکور سالمی بن محمد مکحولی) کی اجازت و روایت بھی شامل تھی[۱]، ان ہی کے واسطے سے امام ابو حنیفہؒ کی کتاب الرسالہ کی روایت بھی تنہا صاحب ہدایہ ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے، جس میں امام ابو حنیفہؒ تک صرف نو واسطے ہیں[۲]۔

۳۔ شیخ محمد بن الحسن بن مسعود، اپنی تمام کتابوں، مرویات و مسموعات کی اجازت اپنے قلم سے تحریر فرما کر دی، جس میں امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کی اجازت بھی شامل تھی[۳]۔

۴۔ شیخ ابو الفتح محمد بن عبد الرحمن کشمیہنی مروزی، آپ تین واسطوں سے امام بخاری کے شاگرد اور روایت بخاری کے مجاز تھے، صاحب ہدایہ نے ان سے ۵۴۴ھ میں بخاری شریف کا بیشتر حصہ پڑھا اور باقی ماندہ کی بھی اجازت حاصل کی[۴]۔

بلخ | ۱۔ قاضی سعید بن یوسف حنفی مقیم بلخ، آپ سے علامہ مرغینانی نے روایت حدیث بھی کی اور اجازت مطلقہ عامہ بھی حاصل کی[۵]۔

۲۔ ابو شجاع ضیاء الاسلام عمر بن محمد بسطامی، بلخ کے مشائخ کبار میں تھے، اور بقول علامہ مرغینانی، ان کے پاس اسانید عالیہ تھیں اور وہ مختلف علوم میں کمال رکھتے تھے، وہ اور ان کے بھائی محمد بن محمد، حنفی مسلک کے فقیہ اور امام تھے، شیخ عمر بسطامی نے صاحب ہدایہ کو تمام مسموعات و مستجازات کی اجازت مطلقہ لکھ کر عنایت فرمائی[۶]۔

بخارا | ۱۔ برہان الائمہ الصدر الشہید عمر بن عبد العزیز بن مازہ (م ۵۳۶ھ)، امام ابن امام اور

(بقیہ حاشیہ) کی روایت و اجازت امام مسلم سے تین واسطوں (عن محمد بن الفضل عن عبد الغافر الفارسی عن الجلودی) کے ذریعہ حاصل تھی دیکھئے الفوائد البہیہ ص[illegible]

[۱] الجواہر ج۱ ص۳۸۳ [۲] کتاب الرسالہ کی دریافت مولانا محمود حسن خاں ٹونکی کے ذریعہ ہوئی جسے انھوں نے اپنی کتاب معجم المصنفین ج۴ ص۲۰۲ مطبوعہ بیروت میں نقل کر دیا ہے۔ [۳] الجواہر ج۲ ص۶۸ [۴] ایضاً ج۲ [۵] ایضاً ج۱ ص[illegible]

[۶] ایضاً ج۱ ص۳۹۰ [۷] ایضاً ج۱ ص۳۰۹

یہی یادگار کے جاتے تھے، فتاویٰ صغریٰ، فتاویٰ کبریٰ اور فروع واقعات متوطول انہی کی تصنیف یادگار ہیں، صاحب ہدایہ کے خصوصی اساتذہ میں ہیں، ان سے انھوں نے فلسفہ اور کلام وفقہ کی تعلیم حاصل کی[1]۔

۲۔ شیخ احمد بن عبد العزیز، برہان الدین عمر بن مازہ کے برادر ہیں، ان کو دو واسطوں سے امام محمد کی شاگردی کا شرف حاصل تھا، انھوں نے صاحب ہدایہ کو السیر الکبیر اور اپنی تمام مسموعات اور مستجازات کی اجازت دی[2]۔

۳۔ شیخ محمد بن عبد الرحمن بخاری (م ۵۴۶ھ) یہ الزاہد العلا کے لقب سے معروف تھے، بقول سمعانی، فقیہ، مفتی، متکلم اور صاحب فضل تھے، ایک ہزار سے زیادہ اجزاء پر مشتمل تفسیر قرآن لکھی، انھوں نے صاحب ہدایہ کو تمام مستجازات مسموعات اور مصنفات کی اجازت مطلقہ دی اور خود اجازت نامہ لکھ کر عنایت فرمایا[3]۔

۴۔ شیخ عثمان بن علی بیکندی، بقول امام سمعانی، بخاری میں شمس الائمہ سرخسی کے آخری شاگردوں میں تھے، یہ بھی صاحب ہدایہ کے مشائخ میں ہیں[4]۔

۵۔ علامہ صدر الدین ابو الرضا محمد بن محمود طرازی (م ۵۸۰ھ) صاحب ہدایہ نے ان کو بھی اپنے اساتذہ میں شمار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ بخاری میں انھوں نے مجھے تعلیم و اجازت سے سرفراز فرمایا[5]۔

مرغینان | غالباً، علامہ مرغینانی سمرقند وغیرہ کے تعلیمی سفروں کے بعد دوبارہ مرغینان واپس آئے اور یہاں کے اکابر شیوخ سے انھوں نے خاص طور پر فن حدیث میں استفادہ کیا اور اجازت حاصل کی، چنانچہ انھوں نے، شیخ عبد اللہ بن ابی الفتح الخانقاہی سے عمومی طور پر روایت حدیث کی اجازت لی[6]، شیخ فضل اللہ بن عمر ابو الفضل اسفورقانی کے یہاں بھی سماعت حدیث

---

[1] الجواہر ج ۱ ص ۱۹۳ [2] ایضاً ج ۱ ص ۹۸، [3] ایضاً ج ۲ ص ۶۱، [4] ایضاً ج ۱ ص ۳۴۵ [5] ایضاً ج ۲ ص ۱۳۱

[6] ایضاً ج ۱ ص ۲۸۰

اور اجازت مطلقہ حاصل کی[1]۔ یہیں امام ظہیرالدین حسن بن علی مرغینانی بھی تھے، جو چار واسطوں سے امام ترمذی کے شاگرد تھے، ان سے صاحب ہدایہ نے ترمذی شریف کا درس لیا، اور اجازت لی[2]، اس کے علاوہ مرغینان ہی میں شیخ ضیاء الدین صاعد بن اسعد مرغینانی سے بھی ترمذی کا درس لیا، اور پھر اجازت پائی۔[3]

رشدان | یہ مرغینان ہی کا ایک گاؤں اور امام برہان الدین کا اصل وطن ہے یہاں ایک بار الامام الخطیب الزاہد محمد بن احمد الحاد کی تشریف لائے، امام برہان الدین کے یہاں قیام فرمایا، امام نے ان سے درس حدیث لیا، اور اجازت حاصل کی[4]۔

شیخ ابوبکر بن حاتم رشدانی، رشدان ہی کے باشندہ اور الحکیم الامام الزاہد کے لقب سے معروف تھے، صاحب ہدایہ نے ان سے بھی تعلیم حاصل کی جس کا انھوں نے اپنی معجم المشائخ میں ذکر کیا ہے، اور ان کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں[5]۔

اوش | شیخ الاسلام نصیرالدین محمد بن سلیمان اوشی اپنے علم و فضل کے علاوہ، زہد و عبادت میں بھی مشہور اور ممتاز تھے، اور زاہدوں میں شمار ہوتے تھے، انھوں نے اپنی تمام مسموعات کی اجازت خود اپنے دست مبارک سے لکھ کر، صاحب ہدایہ کو روانہ کی[6]۔

حرمین و ہمدان | ۵۴۴ھ میں صاحب ہدایہ نے شیخ الاسلام صفی الدین ابو حفص عمر بن عبد المومن گجرادری بلخی کے ہمراہ سفر حج کیا، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور پھر بعد میں ہمدان وغیرہ کی راہ سے سفر واپسی بھی ایک ساتھ ہوا، اس طویل سفر میں جو ایک سال سے زیادہ مدت تک جاری رہا صاحب ہدایہ نے شیخ الاسلام صفی الدین سے درس حدیث لیا اور مختلف مسائل زیر بحث رہے

---

[1] الجواہر ج ۱ ص ۲۰۵ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۹۰ [3] ایضاً ج ۱ ص ۲۵۹ [4] ایضاً ج ۱ ص ۱۳ [5] ایضاً ج ۲ ص ۲۶۷ [6] ایضاً ج ۲ ص ۵۰

انھوں نے اپنے مرویات و مسموعات کی اجازت مرحمت فرمائی۔[1]

شیخ اول مؤلف ہدایہ، اپنی کتاب التجنیس والمزید میں، اپنے بغداد کے سفر کا بھی ذکر کرتے ہیں جہاں انھوں نے شیخ برہان الدین ابو الحسن علی بن الحسن[2] بن عبداللہ الغزنوی[3] سے سماعت حدیث کی، شیخ کے لیے، انھوں نے الامام الاجل الزاہد کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔[4]

دور طالب علمی پر ایک سرسری نظر طلب علم کی راہ میں صاحب ہدایہ نے، اپنے زمانہ کے مشہور علمی و دینی مراکز کا سفر کیا اور اپنے وقت کے مشاہیر علما و مشائخ سے استفادہ کیا، ان کا حافظہ ایسا تھا کہ بچپن میں جو کچھ یاد کر لیا وہ آخر عمر تک محفوظ رہا،[5] وہ اپنی ذہنی و اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے اپنے اساتذہ کے یہاں بھی لائق تحسین اور قابل تعریف قرار پائے، شیخ الاسلام اسبیجابی نے انھیں افتار کی سند دی تو اس میں ان کے بارے میں تحسین کے الفاظ تحریر فرمائے اور . . . . . تفصیل سے ان کی خوبیوں کا ذکر کیا،[6] برہان الائمہ الصدر الشہید، دور طالب علمی میں صاحب ہدایہ[7] کا بے حد اکرام کرتے اور اپنے خاص خاص اسباق میں بھی ان کو اپنے مخصوص تلامذہ میں شمار کرتے اور وہ جہاں ضرورت سمجھتے اپنے اساتذہ کے سامنے بحث و تحقیق سے بھی کام لیتے۔[8]

---

[1] الجواہر ج ۱ ص ۳۹۲ [2] حافظ شمس الدین محمد بن علی داؤدی (م ۹۴۵ھ) نے شیخ کا نام اس طرح لکھا ہے، (شیخ علی بن الحسین بن عبداللہ الغزنوی الواعظ) وہ لکھتے ہیں کہ شیخ غزنوی عربی و فارسی میں گفتگو کرتے تھے، خوش مزاج اور خوش گفتار تھے، فقہ و تفسیر سے واقفیت اچھی تھی، مروت و شرافت، سخاوت اور بذل و عطا میں کامل اور مسلکاً حنفی تھے، مستظہر باللہ خلیفۂ عباسی کی اہلیہ نے ان کے لئے ایک رباط تعمیر کروا دی تھی، وزرا و امرا بلکہ خود خلیفہ بھی ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے، شیخ غزنوی کا انتقال ۵۵۱ھ میں ہوا، بعض مصنفین کو ان پر تشیع کا شبہ ہے، (دیکھئے داؤدی کی تصنیف طبقات المفسرین ج ۱ ص ۳۰۹ مطبوعہ [illegible]) [3] کتاب التجنیس والمزید ص ۱ (نسخہ قلمی دار المصنفین) [4] الجواہر ج ۱ ص ۳۸۳ [5] ایضاً ج ۱ ص ۳۸۳ [6] ایضاً ج ۱ ص ۳۹۱

انھوں نے عربی اور فارسی زبان و ادب[1]، نحو و صرف اور علوم بلاغت و بیان، اصول
فلسفہ و علم کلام، فقہ و حدیث و تفسیر، تربیت افتاء و تدریس اور فنون خلافیات و مناظرہ وغیرہ کی
تعلیم حاصل کی، ان کے ایک عزیز قیس بن اسحاق مرغینانی کا انتقال ۵۲۷ھ میں ہوا ہے۔
صاحب ہدایہ کی عمر اس وقت ۱۵، ۱۶ برس کی تھی، ملاقات اس سے بھی پہلے ہوئی ہوگی، انھوں
صاحب ہدایہ کو عربی اشعار کے ذریعہ اپنا مخاطب بنایا، ان کے اساتذہ میں الصدر الشہید کا انتق
۵۳۶ھ اور الاسبیجابی کا انتقال ۵۳۵ھ میں ہوا ہے، جب کہ وہ ۲۵، ۲۶ برس کے ر
ہونگے، اور زمانۂ تلمذ تو یقیناً اس سے قبل کا ہے، ان حضرات سے مذکورہ علوم کی تحصیل او
عنفوان شباب ہی میں تعلیمی مراحل سے فراغت پالینے کے باوجود وہ ایک سچے طالب علم کی
طرح، اصحاب کمال سے استفادہ کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے، خاص طور پر حدیث تر
سے ان کے تعلیمی شغف اور اس فن کی اسناد عالیہ کے حصول کی کوششوں کا ۵۴۵ھ تک سرا
ملتا ہے، جب کہ ان کی عمر ۳۴ برس کی تھی، حدیث و فقہ کی بعض خاص خاص کتابوں کا انھو
نے ایک سے زیادہ اساتذہ سے درس لیا ہے، اسی لئے علامہ جمال الدین بن مالک نے
یہ رائے دی ہے کہ صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی آٹھ علوم کے ماہر تھے[2]، وہ اپنے اساتذہ ک
خصوصی توجہات کا مرکز رہے، چنانچہ اساتذہ نے اپنے اپنے دست خاص سے اسناد تعلیمی ک
عنایت فرمائیں، الامام الزاہد محمد بن ابی بکر الخطیب البوسنجی نے التفسیر الوسیط للواحدی کا
ایک نسخہ، خود نقل کرکے ان کے سپرد کیا[3]۔ ان کے اساتذہ میں وہ بھی ہیں، جو اپنے تدین اخلا
ذکر و عبادت اور للہیت کی بنا پر "الزاہد" ہی کے لقب سے معروف تھے، مثلاً امام ابوبکر
زیاد الزاہد الخطیب، ابوبکر بن حاتم الرشدانی، الامام الحکیم الزاہد، وغیرہ اس نسبت تلمذ

---

[1] دیکھئے کتاب التجنیس کے مختلف اوراق، [2] الجواہر ج ۱ ص ۳۸۳ [3] ایضاً ج ۱ ص ۳۵۵۔

مولف ہدایہ کے ذہن صفدق اور افتاد طبع کی بھی نشوونما بھی طرح ہوئی۔

ان کے اساتذہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کو چار چار واسطوں سے امام بخاری و امام مسلم، پانچ واسطوں سے امام ترمذی، نو واسطوں سے امام ابو حنیفہ اور ایک ایک واسطہ سے امام سرخسی اور امام ابوالحسن بزدوی کی شاگردی اور ان کی کتب و روایت حدیث کی اجازت کا شرف حاصل رہا ہے، ان کے اساتذہ میں امام ابو حفص عمر بن محمد نسفی (م ۵۳۷ھ) کو ۵۰۰ اساتذہ سے روایت حدیث کی سعادت حاصل تھی، جن کے انتقال کے وقت صاحب ہدایہ ۲۶ برس کے تھے، اور ان سے تلمذ کا زمانہ یقیناً اس سے بھی پہلے کا ہے، کیونکہ شیخ اسبیجابی سے ان کو ۵۳۵ھ یا اس سے بھی پہلے تلمذ حاصل ہو چکا تھا، اور سمرقند میں صاحب ہدایہ کی آمد، مرغینان میں ان کے نانا کے انتقال کے بعد ہی، ان کی طالب علمی کے دوسرے دور میں ہوئی تھی،

عام کمالات علامہ مرغینانی مختلف علوم کے جامع، فقیہ، محدث، محقق، صاحب نظر عالم اور دقیقہ رس امام، زاہد و عابد، اصول شریعت میں باکمال، علوم عربیت میں ماہر ادیب و شاعر تھے، علم و ادب میں ان کا مثل نظر نہیں آتا، خلافیات میں انھیں بڑی مہارت تھی، اور حنفی مسلک پر انھیں کامل عبور تھا[1]

ان کے معاصر ائمہ، امام زین الدین العتابی[2] امام فخر الدین قاضی خاں محیط اور ذخیرہ کے مؤلف الصدر الامام محمود بن احمد بن عبدالعزیز، اور فتاویٰ ظہیریہ کے مؤلف ظہیر الدین محمد بن احمد بخاری[3]، وغیرہ نے امام برہان الدین مرغینانی کے فضل و مرتبہ کا اعتراف کیا ہے وہ بہت جلد اپنے علم و تبحر کی وجہ سے اپنے شیوخ اور اقران سے بھی فائق ہو گئے، اور ہدایہ اد

---

[1] الفوائد البہیۃ ص ۱۴۱ [2] الجواہر ۱/ ص ۳۲۴ [3] الفوائد ص ۱۴۱

کتاب المنتقی کی تصنیف کے بعد لوگوں کی نظروں میں اور بھی بلند ہو گئے،[1]

ادب وشاعری وہ عربی زبان کے ادیب و شاعر بھی تھے،[2] عربی زبان میں ان کی مہارت اور کمال انشاپردازی کا ثبوت ان کی تصنیفات خصوصاً ہدایہ ہے، ان کے شعری کمال کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں، ان کے شاگرد برہان الاسلام زرنوجی نے اپنی کتاب تعلیم المتعلم کی دوسری فصل میں لکھا ہے، کہ میرے استاد اور جلیل القدر امام نے ایک بار شعر سنایا۔

فساد کبیر عالم متہتک — واکبر منہ جاہل متنسک

هما فتنة فی العالمین عظیمة — لمن بهما فی دینه متمسك[3]

۱۔ دین کے بارے میں بے عمل عالم کا وجود بہت بڑا فتنہ ہے، اور اس سے بھی بڑا فتنہ جاہل عبادت گزار ہے،

۲۔ دنیا میں یہ دونوں اس شخص کیلئے بہت بڑا فتنہ ہیں جو اپنے دین کے معاملہ میں انکی پیروی کرتا ہے۔

وہ طالب علم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے اساتذہ ہیں جن سے میں استفادہ نہیں کر سکا لیکن :

لهفی علی فوت اللیالی لهفی — ما کل ما فات ونبقی یلغی[4]

زمانہ کی دی ہوئی فرصت کے ضائع ہو جانے پر افسوس ہے، ورنہ جو لوگ رہ گئے وہ ایسے نہ تھے، کہ ان کو چھوڑ دیا جاتا۔

علامہ برہان الدین نے اپنے معجم الشیوخ میں، اپنے نانا عمر بن حبیب (الجواہر ۱/۳۹۰) شیخ عمر نسفی (۱/۳۹۴) شیخ ابوبکر بن حاتم رشدانی (۲/۲۰۲) شیخ ابوبکر بن زیاد مرغینانی (۲/۲۶۳) اور شیخ عبداللہ بن ابی الفتح الخاتقاہی المرغینانی (۱/۲۸۱) کے اشعار نقل کئے ہیں، ایک بار، ان کے استاد امام ضیاء الدین صاعد بن اسعد مرغینانی نے اپنے والد کا یہ شعر سنایا۔

اذا ضاق بی ذرع الکرام ولم اجد — تحولت عن تلك الدیار واهلها

---

[1] الجواہر ۱/ص ۳۸۳ [2] الفوائد ص ۱۴۱ [3] ایضاً ص ۵۸ - [4] ایضاً ص ۵۸

جب اہل کرم کے ہاتھ میرے پیے تنگ ہو جاتے ہیں اور بے غیرت ہو رہا ہوں تو میں اس علاقہ اور وہاں کے باشندوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہوں۔

مولف ہدایہ اپنے معجم الشیوخ میں مندرجہ بالا شعر کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے مجھے مذکورہ شعر کے مقابلہ میں کسی شاعر کا درج ذیل شعر زیادہ پسند ہے،

اذا کنت فی دار یھینک اھلھا ولم تک مقبولاً بھا فتحول[1]

جس مقام کے باشندے تم کو کم تر سمجھیں اور تم ان کے لئے پسندیدہ خاطر نہ رہو تو اس جگہ سے کنارہ کش ہو جاؤ۔

زہد و تقوی اور فراست ایمانی

شیخ الاسلام برہان الدین، ہدایہ کی تصنیف میں تیرہ برس مصروف رہے، اس دوران میں وہ پابندی سے روزہ رکھتے اور اس بات کے لئے کوشاں رہتے کہ کسی کو ان کے روزہ کی خبر نہ ہو، ان کے اسی زہد و تقوی کا اثر ہے، کہ انکی یہ کتاب اہل علم میں مقبول ہوئی انکی تصنیف کے زمانہ میں، خادم کھانا لاتا تو اسے رکھکر چلے جانے کا حکم دیتے اور کھانا کسی طالب علم یا مہمان کو کھلا دیتے، خادم آکر برتنوں کو خالی پاتا تو یہ سمجھتا کہ آپ نے تناول فرما لیا ہے[2]

صاحب ہدایہ کے سوانحی حالات کی کمیابی کی ایک وجہ، غالباً ان کی یہی اخفا پسندی بھی ہے، اتباع سنت کے سلسلے میں اکابر فقہاء و محدثین کا یہ معمول رہا ہے کہ جن امور سے متعلق قوی روایت نہ ہوتی ضعیف روایت ہی ملتی، یہ حضرات عام حالات میں اپنے ذوق و قیاس کے مقابلہ میں اس ضعیف روایت پر عمل کو ترجیح دیتے، چنانچہ مولف ہدایہ کے بارے میں ان کے ایک شاگرد برہان الاسلام زرنوجی اپنی کتاب تعلیم المتعلم میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے

---

[1] الجواہر، ۱/۳۰۲ [2] کشف الظنون نمبر ۲۰۳۲ [3] مقدمۃ الہدایہ ص ۳،

طلبہ کے اسباق کا آغاز، چہار شنبہ کے انتظار میں روکے رہتے، اور اس بارے میں ایک حدیث شریف بھی روایت کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

جو کام بدھ کے دن شروع کیا جائے، وہ پورا ہو کر رہتا ہے[1]

مولانا فرنگی محلی نے اس روایت پر الفوائد البہیۃ میں تفصیل سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس حدیث کے مفہوم کی صحیح الاسناد روایات سے بھی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مؤلف ہدایہ کے اس طرز عمل کی وجہ سے ہندوستان کے مدارس میں بھی، چہار شنبہ سے آغاز درس کا معمول ہو گیا[2]

صاحب ہدایہ کی فراست ایمانی کا ایک عجیب واقعہ، حضرت نظام الدین اولیاؒ نے شیخ برہان الدین بلخی سے متعلق نقل کیا ہے۔ مولانا برہان الدین بلخی کہتے ہیں کہ میں تقریباً پانچ برس کا خورد سال بچہ تھا، اور اپنے والد کے ہمراہ کہیں جا رہا تھا، سامنے سے صاحب ہدایہ مولانا برہان الدین مرغینانی کی سواری آئی میرے والد ہجوم کی وجہ سے دوسرے راستہ پر چلے گئے، شیخ کی سواری قریب آئی تو میں نے بڑھ کر سلام کیا انھوں نے میری طرف تیز نظروں سے دیکھا، اور فرمایا کہ مجھے اس بچہ میں نور علم نظر آتا ہے، یہ بات سنکر میں ان کے آگے آگے چلنے لگا، پھر فرمایا، خدا مجھے یہ کہلواتا ہے کہ یہ بچہ اپنے عہد میں علامۂ زماں ہوگا[3] ..... میں نے یہ بات سنی اور شیخ کی سواری کے ساتھ چل پڑا۔ پھر فرمایا کہ "خدا مجھ سے یہ کہلواتا ہے کہ یہ لڑکا اس قدر عظیم ہوگا کہ بادشاہ اس کے دروازہ پر حاضری دیں گے[4]

برہان الدین محمود بن ابوالخیر بلخی (م ۶۸۶ھ) سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کے اکابر علماء میں تھے، فقہ، حدیث اور دیگر علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع فنون رسمیہ وعرفیہ

---

[1] الجواہر ج ۲ ص ۳۸۳ [2] الفوائد ص ۱۰۵ [3] فوائد الفوائد فارسی ص ۲۰۴ مطبوعہ لاہور [4] ایضاً

کے ماہر، اور ادیب و شاعر تھے، امام صغانی سے مشارق الانوار کا براہ راست درس لیا تھا، حوض شمسی (دہلی) کے مشرقی جانب ان کی قبر ہے[1]۔

فقہ کی طرف توجہ کا اصل سبب | علامہ برہان الدین کا اصل فن حدیث و فقہ تھا، جس میں انھوں نے غیر معمولی کمال حاصل کیا، اور ہدایہ جیسی عظیم کتاب تالیف فرمائی، فقہ کی طرف ان کی توجہ کا ایک خاص سبب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ انھوں نے اپنے جد مادری کی آغوش شفقت میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا جو فقہ و کلام کے متبحر عالم اور امام سرخسی کے براہ راست شاگرد تھے، اور انھوں نے صاحب ہدایہ کو یہ نصیحت کی تھی کہ

تعلم یا بنی العلم وافقہ — وکن فی الفقہ ذا جہد ورأی

ولا تک مثل حبال تراہ — علی مر الزمان الی وراء[2]

۱۔ اے بیٹے علم سیکھو اور اس میں سمجھ پیدا کرو۔ اور فقہ کے بارے میں خاص طور پر غور و فکر اور محنت سے کام لو۔

۲۔ میں نے تمھاری اس وقت پرورش اور پرداخت کی ہے جب تم نحیف و نزار تھے جیسے رسیاں کہ وہ پھر دوبارہ کمزور ہونے لگتی ہیں۔

اس کے علاوہ، ان کے استاد، شیخ ظہیر الدین زیاد بن الیاس ابو المعالی) جو براہ راست امام ابو الحسن بزدوی کے شاگرد تھے، ان سے استفادہ کرنے لے لئے قاضی محمد بن فضل اصبہانی نے صاحب ہدایہ کو بطور خاص، درج ذیل اشعار کے ذریعہ تاکید اور نصیحت کی تھی،

اسعد فقد نلت لقیا افضل الناس — ابی المعالی زیاد نجل الیاس

تم خوش قسمت ہو کہ لوگوں میں سب سے بہتر آدمی الیاس کے فرزند زیاد ابو المعالی کو تمھاری ملاقات ہو گئی ہے

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند (تحقیق و ترجمہ ایوب قادری) ص ۱۳۰۔ [2] الجواہر، ج ۱، ص ۳۹۰۔

والفضل في نفحات الورد والآس ۔۔۔ وانها لعبادية تلقى المجد مبتسما

ان کی مجلسوں میں وقت گذارو جہاں وقتی اور تبسم ریز ہواؤں میں تم عزت اور شرافت پاؤگے،

فالجرح الليالي غيره آسي ۔۔۔ ولذ به من زمان جائر نكد

زمانہ کی ستم رانیوں سے بچنے کے لیے ان کی پناہ لو، اس لئے کہ زمانہ کے زخموں پر وہی غم خواری کرینگے

فقسه فالشئ قد يدري بمقياس ۔۔۔ ان لم تحط بهداة في فضائله

فضائل و مناقب میں ان کا احاطہ نہ کر سکو تو بھی ان کی مثال سامنے رکھو پیمانہ سے ہر ایک چیز کو سمجھا جاسکتا ہے۔

في حكم احنف في فضل بن عباس[۵] ۔۔۔ جود البرامكة في نطق بن ساعدة

وہ برامکہ کی طرح سخی، ابن ساعدہ جیسے فصیح، احنف کی طرح منصف اور ابن عباس کی طرح فضل والے ہیں۔

صاحب ہدایہ کے معاصرین اور فقہ میں علامہ مرغینانی کا مقام،	ماوراء النہر، اور عالم اسلام کے دوسرے حصوں میں صاحب ہدایہ کے اہم معاصر علماء یہ ہیں۔

احناف میں امام ابوبکر بن مسعود کاسانی مصنف البدائع والصنائع (م ۵۸۷ھ) امام فخر الدین حسن قاضی خان مؤلف فتاوی وغیرہ (م ۵۹۲ھ) شافعی علماء میں امام ابراہیم ابن منصور عراقی مصری شارح المہذب (م ۵۹۶ھ) اور علامہ ابن ابی عصرون تمیمی موصلی مؤلف صفوۃ المذہب (م ۵۸۳ھ) اور مالکی علماء میں علامہ محمد بن رشد مؤلف بدایۃ المجتہد (م ۵۹۵ھ)

علامہ ابن رشد، اگرچہ مالکی مسلک کے پیرو ہیں لیکن انھوں نے بدایۃ المجتہد میں تمام مذاہب

۵ الجواہر ج ۱ ص ۳۸۶

فقیہ کے دلائل اور ان کے طریقہ استنباط سے بحث کی ہے، ان کی بحثوں کا امام و مجتہد انہ ہے۔
پھر بھی وہ اپنی اس کتاب میں فقیہ کے بجائے ایک محدث کی حیثیت سے زیادہ نمایاں نظر
آتے ہیں، ان کے علاوہ مذکورہ بالا بقیہ فقہاء، اپنے اپنے مسلک کی تشریح اور اپنے ائمہ کے
اصول و قواعد کی روشنی میں تخریج اور ترجیح کے عمل میں مصروف نظر آتے ہیں، صاحب ہدایہ
نے بھی، علامہ ابن رشد کی طرح فقہ کے دیگر مکاتب فکر اور ان کے دلائل بیان کئے ہیں لیکن
ان کا کام ابن رشد کے مقابلہ میں تین حیثیتوں سے ممتاز نظر آتا ہے۔

۱۔ خالص قانونی اور فقہی ترتیب اور انداز بیان، (۲) قرآن و حدیث اور اصول
اجتہاد کی روشنی میں فقہ حنفی کی ترجیح، (۳) نقلی دلائل کے ساتھ ہی عقلی دلیلوں اور اصول عامہ
استدلال۔

مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے تھے، کہ صاحب ہدایہ کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ درمختار
کے مؤلف جیسے ہزار فقیہ بھی ان کے مقام بلند تک نہیں پہنچ سکتے، ہدایہ کے مولف فقیہ النفس
ہیں، جن کا سینہ علم و معرفت کا گنجینہ ہے، اور درمختار کے مؤلف کا علم اوراق و کتب کا
مرہون منت ہے، ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا (مقدمۃ نصب الرایہ ص ۱۴)

اجتہاد، تخریج، ترجیح اور جمع و تدوین مسائل کے لحاظ سے اہل فقہ نے فقہاء کی درجہ
بندی کی ہے جس سے ان کے مقام و مرتبہ کے تعین میں آسانی ہو جاتی ہے۔

شیخ احمد بن سلیمان بن کمال پاشا (م ۹۴۰ھ) علامہ ابن عابدین شامی کے نزدیک[1]
امام جلال الدین سیوطی سے زیادہ دقیقہ رس اور صاحب فہم و نظر عالم تھے، اور متاخر فقہاء
احناف میں ان کی آراء و تحقیقات کو نظر اعتبار سے دیکھا گیا ہے، ابن کمال پاشا نے اپنے

---

[1] رد المحتار ج ۱ ص ۲۸۔

یک "رسالۃ الوقف" میں "فقہار کی جو "درجہ بندی" کی ہے، اس کو علامہ علی القاری نے اپنی کتاب مناقب ابی حنیفہ میں نقل کیا ہے[1] ہم یہاں اس کے خلاصہ ہی پر اکتفا کریں گے، وہ لکھتے ہیں کہ:-

علامہ ابن کمال پاشا نے فقہار کو سات طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ مجتہدین فی الشرع، جن کو مجتہد مستقل بھی کہتے ہیں جیسے ائمہ اربعہ،

۲۔ مجتہدین فی المذہب، جن کو مجتہد منتسب بھی کہا جاتا ہے، جیسے امام ابو یوسف امام محمد اور امام مزنی وغیرہ۔

۳۔ مجتہدین فی المسائل، جیسے خصاف، ابو جعفر طحاوی، ابو الحسن کرخی، شمس الائمہ سرخسی شمس الائمہ حلوانی، فخر الاسلام بزدوی، فخر الدین قاضی خاں وغیرہ۔

۴۔ اصحاب تخریج، جیسے امام ابو بکر جصاص رازی وغیرہ۔

۵۔ اصحاب ترجیح، جیسے امام ابو الحسن قدوری، امام برہان الدین مرغینانی مؤلف ہدایہ وغیرہ۔

۶۔ اصحاب تمیز و تصحیح، مثلاً کنز و در مختار، وقایہ و مجمع[2] وغیرہ کے مؤلفین،

۷۔ مقلدین غیر متمیزین، جن کے لیے قوی اور ضعیف میں تمیز اور وجوہ ترجیح کو سمجھنا ... مشکل ہے

مذکورہ بالا تقسیم میں قاضی خاں کو تیسری قسم میں اور صاحب ہدایہ کو پانچویں قسم میں شمار کیا گیا ہے لیکن مولانا عبدالحی

مذکورہ بالا تقسیم پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ صاحب ہدایہ کسی طرح بھی قاضی خاں سے کم نہیں، دلائل کی پرکھ اور مسائل کے استنباط میں، صاحب ہدایہ واقعی کتنے بلند ہیں، اسی لئے وہ اجتہاد فی المذہب کے رتبہ کے زیادہ مستحق ہیں، اور مجتہدین فی المذہب میں ان کو شمار کرنا ہی قرین عقل ہے۔[3]

---

[1] مناقب ابی حنیفہ (ذیل الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۵۵۹) اور الفوائد البہیۃ حاشیہ ص ۴، ۵ معجم المصنفین ص ۱۵۴ [2] مجمع سے مراد مجمع البحرین ہے جو مؤلفہ شیخ مظفر الدین احمد بن علی بغدادی (م ۶۹۴ھ) [3] الفوائد ص ۵،

مولانا فرنگی محلی نے صاحب ہدایہ کو دوسرے طبقہ مجتہدین فی المذہب یعنی امام ابویوسف اور امام محمد وغیرہ کی صف میں جگہ دی ہے لیکن یہ بات محل نظر ہے، مفتی اعظم ابن کمال پاشا نے دوسرے طبقہ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ :-

> دوسرا طبقہ مجتہدین فی المذہب کا ہے، جیسے ابویوسف، محمد اور باقی تلامذہ ابوحنیفہؒ یہ لوگ قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس سے ان اصول کی روشنی میں مسائل کا استنباط کرتے ہیں جو امام ابوحنیفہ نے مقرر کر دیئے ہیں، انھوں نے اگرچہ بعض فروعی مسائل میں امام سے اختلاف کیا ہے لیکن بنیادی اصول میں وہ امام کی تقلید کرتے ہیں، اور اس طرح وہ امام شافعیؒ وغیرہ سے مختلف ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ امام شافعی اور ان کی طرح کے دوسرے ائمہ، امام ابوحنیفہؒ سے صرف اصول ہی میں نہیں بلکہ مسائل اور فروع میں بھی اختلاف رکھتے ہیں۔

علامہ مرغینانی کی تصنیفات ہدایہ وغیرہ کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اصول و فروع دونوں میں اپنا استقلال ظاہر نہیں کیا، اس لئے ان کو مجتہدین فی المذہب کے طبقہ میں شمار کیا جانا درست نہیں، وہ تو مجتہدین فی المسائل یعنی تیسرے طبقہ تک کی تصریحات کے پابند نظر آتے ہیں یہاں تک کہ وہ رائے جس میں دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ واضح نہ ہو یا ایسا مبہم حکم جس میں دو باتوں کا احتمال نکلتا ہو، اس میں تفصیل وتعیین بھی (جو چوتھے طبقہ یعنی اصحاب تخریج کی خصوصیت ہے) صاحب ہدایہ خود نہیں کرتے بلکہ کذا فی تخریج الکرخی، اور کذا فی تخریج الرازی وغیرہ جیسے الفاظ کے ذریعہ دوسروں ہی کی تخریجات نقل کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں اوفق للقیاس، وہذا ارفق للناس کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں، جو اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ وہ اصحاب ترجیح میں سے ہیں، اور جن مسائل میں ائمہ اجتہاد یا اصحاب

تخریج کی کئی روایتیں منقول ہیں، صاحب ہدایہ ان میں سے کسی ایک رائے کی ترجیح واضح کر دیتے ہیں، اور کہیں کہیں وجوہ ترجیح کی طرف اشارہ بھی فرما دیتے ہیں، شیخ شہاب الدین ابن بہاء الدین مرجانی (م ۱۳۰۶ھ قازان) اپنی کتاب (ناظورة الحق فی فرضیة العشاء وان لم یغب الشفق) میں لکھتے ہیں کہ

صاحب ہدایہ کا مقام، قاضی خاں سے فروتر نہیں، صاحب ہدایہ کی تو امام فخرالدین قاضی خاں وغیرہ نے بھی تعریف کی ہے اور یہ اقرار کیا ہے، کہ وہ اپنے شیوخ اور ہم زمانہ لوگوں پر تفوق اور امتیاز رکھتے تھے، اس لئے صاحب ہدایہ کو قاضی خاں کے مقابلہ میں فروتر حیثیت (پانچویں طبقہ میں) دینا صحیح نہیں، اس لئے کہ اجتہاد، اس کے اصول اور طریقۂ کار کے معاملہ میں صاحب ہدایہ، قاضی خاں سے بڑھکر ہیں۔ (ملخصاً) [1]

لیکن شیخ مرجانی کی اس گفتگو سے صرف اتنا واضح ہوتا ہے کہ قاضی خاں کو تیسرے طبقہ میں شمار کرنا ہی اصل میں محل نزاع ہے، اس موقع پر ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ فقہائے احناف نے چوتھی صدی ہجری کے بعد کیا اجتہاد فی الشرع یا اجتہاد فی المذہب کا طریقہ اختیار کیا تھا، یا یہ کہ انھوں نے صرف اپنے ائمہ کے اصول و فروع کے مطابق تخریج اور ترجیح ہی کی راہ اختیار کی تھی، علامہ طاش کبریٰ زادہ (م ۹۶۲ھ) اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں لکھتے ہیں کہ

"قدیم فقہاء جو دوسری اور چوتھی صدی ہجری کے درمیان ہوئے ان میں اجتہاد اور ترجیح کا پہلو غالب ہے اور متاخر فقہاء جو چوتھی صدی ہجری کے بعد ہوئے ان میں صرف ترجیح ہی کو وصف غالب کی حیثیت حاصل ہے۔" [2]

---

[1] حسن التقاضی فی سیرۃ الامام ابی یوسف القاضی ص ۲۰ للکوثری مطبوعہ قاہرہ ۱۳۶۸ھ،

[2] کشف الظنون نمبر ۱۲۸۳۔ عنوان علم الفقہ،

اس لئے بجا تھے اور پانچویں طبقہ میں شمار کئے جانے والے اکابر فقہاء بھی، اگرچہ کبھی اجتہاد فی المسائل بھی کرتے رہے ہوں مگر ان پر تخریج اور ترجیح کا فقہی رنگ ہی غالب اور نمایاں تھا جس طرح کہ وہ لوگ جن کو تیسرے طبقہ میں شمار کیا گیا ہے، ان کا بھی وصف غالب یہی ہے، اس لئے ان تینوں طبقات کی تقسیم یا ان میں فرق مراتب کی ضرورت نہ تھی، تینوں کو یکسانی مجتہدین فی المسائل کے طبقہ سوم میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

تلامذہ و مستفیدین قرشی نے لکھا ہے کہ علامہ مرغینانی کے ذریعہ ماوراء النہر (جس کا ایک صوبہ فرغانہ بھی تھا) میں حنفی فقہ کی نشر و اشاعت ہوئی، اور کثیر تعداد نے ان سے استفادہ اور ان کی تعلیم و تدریس کے ذریعہ کمال پیدا کیا[1] ہم یہاں چند لوگوں کے نام درج کرتے ہیں،

۱۔ شمس الائمہ محمد بن عبدالستار کردری، (الجواہر ج ۲ صفحہ ۸۲)

۲۔ شیخ جلال الدین محمود بن الحسین استروشنی (جو الفصول الاستروشنیہ کے مؤلف مفتی محمد کے والد گرامی ہیں) الفوائد البہیۃ۔ صفحہ ۵۰،

۳۔ القاضی الامام عمر بن محمود بن محمد (الجواہر جلد ۲ صفحہ ۳۹۹)

۴۔ قاضی القضاۃ محمد بن علی بن عثمان سمرقندی (الجواہر جلد ۲ صفحہ ۹۲)

۵۔ امام ابو الفضائل فخر الدین الجد بن نصر دہستانی، (الجواہر جلد ۲ صفحہ ۱۵۱)

۶۔ برہان الاسلام زرنوجی مؤلف تعلیم المتعلم (الفوائد صفحہ ۵۰، الجواہر جلد ۲ صفحہ ۳۴۴)

ان تلامذہ میں، علامہ مرغینانی کے صاحبزادے بھی ہیں، جن کا آئندہ سطروں میں ذکر کیا جارہا ہے۔

اولاد و احفاد علامہ مرغینانی کے صرف دو صاحبزادے تھے۔

۱۔ شیخ الاسلام نظام الدین ابو حفص عمر بن علی، اپنے والد گرامی سے تعلیم حاصل کی فقہ میں

---

[1] الجواہر جلد ۱ صفحہ ۳۸۳۔

خاص طور پر کمال حاصل کیا، اور افتاء کے منصب پر فائز ہوئے[۵۱] جواہر الفقہ اور الفوائد الخ
کی تالیفات ہیں[۵۲] (۲) ابوحفص محمد بن علی الملقب بہ عماد الدین، یہ بھی اپنے والد سے مستفید
ہوئے، اور فقہ میں امتیاز پیدا کیا[۵۳] ان کو بھی شیخ الاسلام کا رتبہ حاصل تھا، کتاب ادب
القاضی ان ہی کی تصنیف ہے[۵۴]

شیخ عبدالقادر قرشی کی تصریح کے مطابق علامہ مرغینانی کے ڈو صاحبزادے تھے[۵۵] لیکن
مولانا فرنگی محلی نے از راہ سہو، تیسرے صاحبزادے کا بھی ذکر کیا ہے، اور ان کا نام اس طرح لکھا ہے
"ابوالفتح جلال الدین محمد"[۵۶] لیکن محمد تو ان ہی صاحبزادہ کا نام ہے، جو عماد الدین کے لقب
سے معروف تھے[۵۷] شیخ قاسم بن قطلوبغا نے تاج التراجم (صفحہ ۱۳) میں ابوالفتح بن ابی بکر بن
عبدالجلیل المرغینانی السمرقندی کا ذکر کیا ہے، لیکن جیسا کہ ان کے نسب نامہ ہی سے ظاہر ہے کہ
وہ صاحبزادہ نہ تھے، بلکہ صاحب ہدایہ کے برادر تھے، جن کا انتقال سنہ ۶۱۲ھ میں ہوا ہے،

شیخ الاسلام برہان الدین مرغینانی کے ایک پوتے یعنی شیخ عماد الدین محمد بن علی مرغینانی
کے صاحبزادہ، زین الدین عبدالرحیم، فقہ میں بڑی ممتاز حیثیت اور شہرت کے مالک تھے، انھوں
نے "الفصول العمادیہ" جیسی مشہور کتاب لکھی جس کی تکمیل شعبان سنہ ۶۵۱ھ میں سمرقند میں ہوئی،
ان کی بھی کنیت ابوالفتح تھی،[۵۸]

تیمور لنگ نے جب سمرقند پر قبضہ کیا ہے، اس وقت مولانا عبدالملک سمرقند کے
ایک معروف فقیہ بھی حیات تھے، ان کے بارہ میں ابن عرب شاہ اپنی کتاب عجائب المقدور

---

[۵۱] الجواہر ج ۱ ص ۳۹۳ [۵۲] الفوائد البہیۃ ص ۶۰، کشف الظنون نمبر ۱۲۹، اور نمبر ۶۱۵
[۵۳] الجواہر ج ۲ ص ۹۹ [۵۴] الفوائد البہیۃ ص ۹۵ [۵۵] الجواہر ج ۱ ص ۳۸۳ [۵۶] الفوائد البہیۃ ص ۵
و ص ۴۰، [۵۷] الجواہر ج ۲ ص ۹۹ [۵۸] الفوائد البہیۃ ص ۱۰۵ حاشیہ نمبر ۵، تفصیلی حالات کیلئے دیکھئے
الفوائد ص ۴۰،

(مطبوعہ ۱۸۶۶ء) میں لکھتا ہے کہ

"وہ مولف ہدایہ کی نسل سے ہیں، ایک ہی وقت میں درس بھی دیتے، شطرنج

اور نرد کے بارے میں بتلاتے رہتے اور اشعار بھی موزوں کرتے جاتے"[1]

ان کے بعد انھیں کے برادر عم زاد خواجہ عبدالاول، درس و تعلیم کی مسند پر پورے ماوراءالنہر میں صدر نشین کی حیثیت رکھتے تھے، اور جب ان کا بھی انتقال ہوگیا تو مولانا عبدالملک کے صاحبزادہ مولانا عصام الدین ماوراءالنہر میں درس و تعلیم کے سب سے بڑے اور آخری مرجع کی حیثیت سے مشہور و ممتاز اور عجائب المقدور کی تالیف کے وقت حیات تھے[2]

انتقال اور تدفین | شیخ الاسلام برہان الدین مرغینانی کا زیادہ تر قیام سمرقند ہی میں رہا اور بالآخر، انھوں نے تعلیم و تدریس، افتاء و ارشاد، تصنیف و تالیف اور ذکر و عبادت میں مصروف زندگی گزارنے کے بعد ۵۹۳ھ[3] میں سمرقند میں ہی انتقال فرمایا[4]، جب کہ سہ شنبہ کی شب اور ذی الحجہ کی ۱۴ تاریخ تھی،[5]

سمرقند کے شہر "ماکردین" میں "تربۃ المحمدین" قبرستان میں ۴ سو سے زیادہ صاحب تصنیف و افتاء اہل علم مدفون تھے، جن کا نام "محمد" تھا اور ان سے لوگوں نے بڑی تعداد میں استفادہ کیا تھا، علامہ مرغینانی کو اسی قبرستان میں دفن کرنے کی کوشش کی گئی، مگر چونکہ وہاں دفن کرنے کے لئے نام والی شرط پوری نہ ہوتی تھی، اس لئے قبرستان کے ذمہ داروں نے تدفین کی اجازت نہ دی، چنانچہ علامہ مرغینانی کو اس کے قریب ہی دفن کردیا گیا[6]

---

[1] عجائب المقدور فی اخبار تیمور (تاریخ تیموری) ص ۴۴۴ مؤلفہ شہاب الدین احمد بن محمد بن عبداللہ دمشقی انصاری [2] ایضاً [3] الجواہر ج ۱ ص ۴ تاج التراجم ص ۳۱، کشف الظنون نمبر ۲۰۳۲ [4] مقدمۃ الہدایہ ص ۲، کشف الظنون، [5] الجواہر ج ۱ ص ۴ مقدمۃ الہدایہ ص ۲،

تلخیص و تبصرہ

گوتم بدھ کی تعلیمات

از

سری نیواس لاہوتی

جناب سری نیواس لاہوتی، حیدرآباد اور اندھرا پردیش میں اردو زبان کی ترویج کے بہت ہی مخلص اور سرگرم رہنما ہیں، انھوں نے مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات کا خلاصہ لکھ کر بھیجا ہے، امید کہ معارف کے وہ ناظرین جو بودھ مت کی تعلیمات سے زیادہ واقف نہیں ہیں، اس کو شوق سے پڑھیں گے۔ "ص۔ ع"

آج سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ سے کوئی چھ سو سال قبل ہندوستان سے لے کر چین، ایران اور یونان تک مختلف ملکوں میں بڑے بڑے لوگ، بڑے بڑے فلسفی اور مذاہب کے بانی پیدا ہوئے تھے، اگرچہ یہ سب ہمعصر نہ تھے، لیکن ان کا دور اتنا قریب قریب گذرا ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح کو تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے، اس زمانے میں دنیا میں مذہبی فکر کی ایک لہر دوڑ رہی تھی، یونان میں فیثا غورث، ایران میں زرتشت، چین میں کنفوشیش اور ہندوستان میں گوتم اور مہاویر جیسے بانیان مذاہب کی پیدائش کا سہرا تاریخ میں اسی دور کو حاصل ہے، کیونکہ مذاہب کے یہ بڑے بڑے بانی ہمیشہ بہتری کی تلاش میں رہے، اور اپنی قوموں کی حالت بدلنے، انھیں بہتر بنانے، اور ان کی مصیبتوں کو دور کرنے کی جستجو کرتے رہے، اور اس میں

انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک کے اثرات ان کے ملک ہی تک محدود نہیں رہے، بلکہ اقصائے عالم میں صورتیں اور نام بدل بدل کر پہنچے، لیکن ان عظیم ہستیوں میں گوتم بدھ کو ان کی تعلیمات کی وجہ سے انفرادی حیثیت حاصل ہے۔

بدھ کی پیدائش کے وقت ہندوستان میں ویدک دھرم پھیلا ہوا تھا جس کی بنیاد طبقہ واریت پر تھی، اور برہمن چاہتے تھے کہ رائج الوقت معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہو، ان کا نظریہ اعمال یہ تھا کہ برہمن یگیہ کریں، چھتری جنگ لڑیں، ویشیہ کھیتی باڑی اور تجارت سنبھالے رہیں اور شودر ان سب کی خدمت گزاری کریں، جنھیں یہ نظریۂ اعمال پسند نہ ہوں وہ جنگل میں جاکر تپسیہ کریں اور وہیں فنا ہو جائیں، کسی فرد کو اس وقت یہ اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ اس معاشرے میں کوئی تبدیلی لائے، کیونکہ ذاتوں کا بندھن بڑا سخت تھا، اور عام آدمی توہمات کا شکار تھا، اور مذہبی ٹھیکیداروں نے عوام کو اپنی مٹھی میں بند رکھا تھا، اور وہ حکمرانوں کو بھی چیلنج کرنے لگے تھے جس کی وجہ سے ویدک دھرم اپنی اصلی تعلیم سے ہٹ گیا تھا، اس کے برخلاف گوتم بدھ عوام کے سامنے مصلح کی حیثیت سے نمودار ہوئے، اور انھوں نے پروہتوں (مذہبی ٹھیکے داروں) کے اس ظلم اور ان تمام برائیوں کے خلاف جو ویدک دھرم میں داخل ہو گئی تھیں آواز اٹھائی انھوں نے اس پر زور دیا کہ پاکیزہ زندگی بسر کرنا اور نیک کام کرنا انسان کا بنیادی حق ہے۔

گوتم بدھ کا جنم جدید تحقیقات کی روشنی میں ۶۲۳ قبل مسیح قرار پاتا ہے، ان کی پیدائش کے (۳۱۶) سال بعد اشوک نے اس جگہ ایک کتبہ نصب کروایا، جو آج بھی اس واقعہ کی تاریخی شہادت پیش کرتا ہے، یہ ایک چھتری اور شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے، ان کا نام سدارتھ اور ان کی والدہ کا نام مایا رانی تھا، جن کے متعلق تاریخ شاہد ہے کہ ہر شخص دل سے ان کا احترام کرتا تھا، اور وہ اپنے عقیدے کی بڑی پابند خاتون تھیں، گوتم کے والدین نے انھیں بڑے ناز و نعم سے پالا تھا، اور

اس حد تک اہتمام کیا تھا کہ کوئی تکلیف یا مصیبت کا منظر ان کی نظر سے نہ گزرے، چنانچہ قصہ مشہور ہے کہ انھوں نے ایک بار ایک غریب اور مصیبت زدہ آدمی نیز ایک مردے کو دیکھا جس کا ان کے دل و دماغ پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اس طرح دنیاوی زندگی کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھ لینے کے بعد گوتم جیسا حساس شہزادہ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہا، اور اس جستجو میں پڑ گیا کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، موت و حیات سے اس کا کیا تعلق ہے، غم کی بنیاد کیا ہے، اس کے بعد سے ان کو محل میں چین سے زندگی گزارنا مشکل ہو گیا، تمام عیش و عشرت کو خیرباد کہہ دیا، حتیٰ کہ ان کی حسین اور نوجوان بیوی بھی، جس سے وہ بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کے دماغ سے انسانی مصیبت کی فکر دور نہ کر سکی۔ رفتہ رفتہ ان کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑنے لگا کہ دنیا کو ان مصیبتوں سے نجات دلانا چاہیے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اس ذہنی اذیت کو برداشت نہیں کر سکے، مرض بڑھا اور انھوں نے موت کے وجود کا پتہ لگانے کے لیے دنیا کو خیرباد کہنے کی ٹھان لی، اور ایک دن ایسا آیا کہ رات کی خاموشی میں محل اور اپنے بیوی بچہ کو چھوڑ کر صحرا کی طرف نکل پڑے تاکہ جو سوالات ان کے دل میں کھٹک رہے تھے، ان کا حل تلاش کریں۔

اس زمانے میں لوگ علم اور معرفت حاصل کرنے کے لیے تپسیہ کیا کرتے تھے، یا سنیاس لیا کرتے تھے، انھوں نے بھی اسی راہ کو اپنایا، وہ عالموں کی خدمت میں زندگی گزارنے لگے لیکن کتابی علم ان کی ذہنی کشمکش کو نہیں مٹا سکا، اس کے بعد ریاضت کا راستہ اختیار کیا، بھوکے رہ کر دھیان وگیان میں لگ گئے لیکن ان کی یہ چھ سالہ ریاضت بھی لاحاصل رہی اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، ہمت نہیں ہاری، سانس روکی، گوشت سکھایا، سوکھ کر کانٹا ہو گئے، مگر ضمیر روشن نہیں ہوا، آخر کار کئی برس بعد گیا میں ایک درخت کے نیچے وہ بیٹھے ہوئے تھے، کہ ان کا ضمیر روشن ہوا، اور انھیں نروان یعنی ان کے گیان کو روشنی ملی، اور وہ

سب کچھ حاصل ہوگیا، جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے، اس گیان کو "بودھی" بھی کہتے ہیں اور وہ اسی دن سے گوتم بدھ کہلانے لگے، جس درخت کے نیچے وہ بیٹھے ہوئے تھے، وہ "بودھی درکش" کے نام سے مشہور ہوا۔ کاشی کے قدیم شہر سارناتھ میں بدھ نے اپنی تعلیمات کی تبلیغ شروع کی، دیوتاؤں کے نام پر کی جانے والی قربانیوں کی مذمت کی اور اس بات پر زور دیا کہ اگر قربانی کرنی ہی ہے تو انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے غصے، حسد اور خواہشات کو قربان کرے۔ نروان یعنی معرفت حاصل کرنے والی رات کو ان پر یہ منکشف ہوا کہ غم سے نجات حاصل کرنا ہی زندگی کا مقصد اور عمل ہے، اس کے لیے انھوں نے "علت و معلول" کی تشریح کی اور اس کی بنا پر انھیں وہ چیز حاصل ہوئی، جو "بدھ ازم" کی بنیاد ہے، بدھ ازم کے فلسفہ کی تشریح کے لیے خود گوتم بدھ نے مثبت و منفی طریقہ اپنایا اور کہا کہ "پیدائش، ضعیفی، بیماری، دکھ اور عیبوں کا مجموعہ ہوتے ہوئے اور ان باتوں کا شکار ہو بھی ہیں، ان کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے میں نے اس کی تلاش شروع کی، جو کہ غیر مخلوق، غیر تغیر پذیر زندگی، بے غم، بے عیب، اور ہر پابندی سے آزاد و محفوظ ہے، یعنی نروان اور میں نے اس کو پالیا۔"

برہمنوں کے زور کی وجہ سے بدھ کی تعلیمات عرصہ تک ہندوستان میں مقبول نہیں ہوسکیں، لیکن رفتہ رفتہ دنیا میں پھیلتی گئیں، آج ہندوستان میں بدھ کی تعلیمات معدوم ہو گئی ہیں لیکن اب بھی اس کے پیرو اور مقلدین دنیا میں سب سے زیادہ ہیں، خاص طور پر مغربی ایشیا کو چھوڑ کر ایشیا کے پورے براعظم میں ان کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہے، اس کے بعد عیسائیت، اسلام اور ہندو مت کا نمبر آتا ہے۔

بدھ نے انسانی زندگی میں عقل ہی کو سب سے بڑی اہمیت دی ہے، ان کا قول ہے کہ کوئی کام یوں ہی آنکھ بند کر کے نہ کرو بلکہ سوچ سمجھ کر کرو، جو سچ ہے، وہی مانو اور میری بات بھی اتنی ہی مانو جتنی کہ تمھاری سمجھ میں آئے اور تمھاری عقل کی کسوٹی پر پوری اترے۔" یہ بات کہہ کر

بدھ نے عقل کے دروازے سب پر کھول دیے، عورتیں اور شودر بھی ان کے گیان سے فیضیاب ہونے لگے، انھوں نے کٹرپن کی سخت مذمت کی، اور سکھایا کہ انسان کو ہٹ دھرمی کے بجائے دوسروں کی باتوں کی بھی قدر کرنی چاہئے، ان کا پیغام امن اور شانتی کا پیغام ہے، اور اس کی بنیاد ان اصولوں پر مبنی ہے، جو انسانیت کو ذہنی اور روحانی سکون بخشتے ہیں۔

گوتم بدھ اس امر پر سب سے زیادہ زور دیتے تھے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ اسباب و علل کے ماتحت وجود میں آئی ہیں، اور ہر چیز، ہر لمحہ ایک غیر محسوس اور نامعلوم طریقے پر بدلتی رہی ہے، وہ جنت اور جہنم کو نہیں مانتے تھے، لیکن اس بات کو تسلیم کرتے تھے، کہ ایسی دنیائیں ہیں جہاں "دیوتا" رہتے ہیں، مگر ان کے خیال میں ان دیوتاؤں کی زندگیاں بھی اسی حد تک مادی یا غیر مادی ہو سکتی ہیں، جس حد تک انھوں نے پہلے جنم میں نیکیاں کی ہیں، ان کا خیال ہے کہ دیوتا بھی انسانوں کی طرح سے مرجاتے ہیں، اور ان کی دنیائیں بھی، ان ہی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں، ان کا خیال تھا، کہ انقلابات ہوتے رہتے ہیں، اور ان کے بننے اور بگڑنے کا ایک دورہ مسلسل ہے، جسکی ابتدا اور انتہا انسانی علم سے باہر ہے، ترکیب و تحلیل کا قانون عام ہے اور اس سے انسان ہو یا دیوتا کوئی بھی بری نہیں ہے، وہ عناصر جن کی ترکیب سے ایک ذی حس وجود بنا ہے اس کی تحلیل ایک نہ ایک دن ضروری ہے، اور یہ انسان کی جہالت اور خود فریبی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عالم کی ساری چیزوں سے الگ تھلگ اور موجود بالذات سمجھتا ہے،

کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا میں غم ہے، لیکن ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ اس کا غم کیوں کر دور ہو گا، نتیجہ کے طور پر ہر کوئی دوسرے کو تباہ کر کے خود کو سکھی بنانا چاہتا ہے، لیکن گوتم بدھ نے سب سے پہلے اس خیال کا انکشاف کیا کہ غم کا حقیقی سبب روح یا فطرت نہیں بلکہ اس کا دوسرا نام انسانی تشنگی یا خواہشات ہے، خواہشات کی وجہ سے ہی غم پیدا

ہوتا ہے، خواہشات کہاں سے آئیں، یہ سوال بے معنی ہے، جب تک خواہشات ہیں تب تک غم پیدا ہوتا رہے گا۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے، اس لیے خواہشات پر قابو پانا چاہیئے۔

ایک دفعہ بھکشوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے گوتم بدھ نے فرمایا تھا کہ "جو ایسا کہتے ہیں، اور مانتے ہیں کہ انسان جو بھی سکھ دکھ اٹھاتا ہے، وہ سب خدا کا دین ہے، ایسے لوگوں سے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ان کا عقیدہ ہے، اور جب وہ ہاں کہتے ہیں تو میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ یہ جو تم چور، قاتل، بدمعاش، دروغ گو، چغل خور اور فضول گوئی کرنے والے دوسروں کی دولت پر نظر رکھنے والے حاسد اور بدچشم بن گئے ہو تو کیا خدا نے تمھیں ایسا بنایا ہے، اگر اسے سچ مان لیا جائے کہ یہ سب خدا کی دین ہے تو پھر نیک اعمال کے تئیں لگن اور حوصلہ نہیں رہے گا، اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ فلاں کام کرنا چاہیئے یا فلاں نہیں کرنا چاہیئے، اس لیے بنیادی حقیقت یہ ہے کہ انسان خود اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اپنی غلطی کو خدا کے سر منڈھتا ہے۔"

یہاں پر یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ گوتم بدھ نے محض علم الحقائق کے ذریعہ مکتی یا نجات حاصل کرنے کے لیے گھر بار نہیں چھوڑا تھا، اپنے پڑوسیوں پر ہتھیار اٹھانا انھیں اچھا نہیں لگا، اور ان کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا کہ کیا ہتھیاروں کے بغیر باہمی دوستی اور رفاقت کی بنیادوں پر کوئی معاشرہ کھڑا نہیں کیا جا سکتا، یہی بنیادی فلسفہ تھا، جس کیلئے انھوں نے گھر بار چھوڑ کر تپسیہ شروع کی اور جب دیکھا کہ تپسیہ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے، تو اسے تیاگ کر ایک ایسا راستہ اپنایا جو امن اور آشتی کا راستہ تھا، انسانی علم و فہم کا راستہ تھا، جس نے بدھ کی زبان سے یہ کہلوایا کہ "مصیبت میں میرے اعمال ہی میرے مونس و غم خوار ہوں گے، میرے اعمال ہی میرے محافظ ہیں، اور جو نیک و بد اعمال مجھ سے سرزد ہوں گے،

ان کے بیج میں جو ابھی ہوں گا، کیونکہ ایسے غور وفکر سے جسم زبان اور ذہن سے ہونے والے اعمال بد ختم ہو جائیں گے، انسان کو ہمت واستقلال سے نیک اعمال انجام دینے چاہئیں اس سلسلے میں "دھمپد" کا ایک اشلوک قابل غور ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ "انسان کو نیک کام کرنے میں جلدی کرنی چاہئے تاکہ گناہوں سے رہائی حاصل ہو سکے، کیونکہ سست روی سے نیک کام کرنے والے کا دل گناہ پسند ہو جاتا ہے۔"

گوتم بدھ نے (۳۵) سال میں نروان حاصل کیا اور (۴۵) سال تک اس کی تبلیغ کی اور (۴۸۳) قبل مسیح میں ان کا انتقال ہوا انھوں نے اپنی زندگی میں .... نہ کوئی مندر تعمیر کروایا، اور نہ کوئی خانقاہ، اور نہ ہی کوئی ملک فتح کیا، اور نہ کوئی حکومت قائم کی، بلکہ تاج وتخت کو ٹھکرا کر سنیاس لے لیا، اور لوگوں کے دل جیتے، انسانیت کی خدمت کی، اور دنیا کو اپنے خیال میں سچائی کا راستہ دکھایا، آج بھی ان کی تعلیمات اور ان کا نام زندہ ہے۔

(دارالمصنفین کی نئی کتاب)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

جلد سوم

اس میں مغل خاندان کے گل سر سبد شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں یعنی بہادر شاہ اول جہاں دار شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ وغیرہ کی مذہبی رواداری، فراخدلی معاصر تاریخوں کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے، اس میں اورنگزیب کے وہ تمام فرامین بھی آگئے ہیں جو مختلف شہروں کے مندروں کی مدد، اور ہندو پجاریوں کو جاگیریں دینے کے سلسلہ میں اوس نے لکھے، اور وشوناتھ مندر کے انہدام کے قصہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

مرتبہ :۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت :۔ ۲۰ روپیے

معیار و اقدار :- از ۔ ڈاکٹر عبد المغنی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت پچیس روپیہ، پتہ (۱) محمد اسلام، چتکوہرہ (نزد روڈ نمبر ۳)، ڈاکخانہ انیس آباد، پٹنہ (۲) کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ،

پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم بہار میں تنقید نگاری کے امام سمجھے جاتے تھے، مگر اب یہ امامت جناب ڈاکٹر عبد المغنی کے یہاں منتقل ہوگئی ہے، گو ان کی تنقید نگاری کا فن پروفیسر کلیم الدین احمد سے مختلف ہے، ان کے یہاں سلامت روی، اعتدال پسندی اور شائستگی تحریر کے ساتھ ہی مخصوص ادبی و تنقیدی نظریہ بھی ہے، جس کی وضاحت انھوں نے زیر نظر مجموعہ کے دیباچہ میں اس طرح کی ہے کہ تنقید نکتہ چینی اور عیب جوئی کے بجائے کسی چیز کی صحیح قدر و قیمت معین کرنے کا نام ہے، ان کا نظریۂ تنقید فکری طور پر دینی اور عملی طور پر اخلاقی ہے، وہ پچیس برس تک مسلسل ادبی مسائل پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ادب کی عظمت لازماً کسی اخلاقی معیار سے دریافت کی جائے گی اور اس معیار کی تشکیل ایک دینی نقطۂ نظر سے ہوگی، یہ زیر نظر کتاب مصنف کے تنقیدی مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے، اس کے پندرہ مضامین میں انھوں نے اپنے موضوعاتِ مطالعہ کی حقیقت کا سراغ تو خالص ادبی و فنی اور بالکل معروضی نقطۂ نظر سے لگایا ہے، مگر ان کی عظمت کی پیمائش اپنے خاص دینی و اخلاقی نظریے کے مطابق کی ہے، پہلے مضمون "فن اور ناقد" میں فن اور تنقید کو یکساں درجہ کی چیز بتانے کے ساتھ ہی ناقد کی ضرورت و اہمیت اور اس کے فرائض کی وضاحت کی ہے اور اس کے اور صاحب فن کے

درمیان برابری اور برادری کا رشتہ دکھایا ہے، اور اس کے لئے نظر کے ساتھ نظریہ اور کسی نظام فکر سے وابستگی کو ضروری قرار دیا ہے، جو تنقید اور فن دونوں کے لئے مفید ہے، مصنف اقبال کے پرستار بھی ہیں، اور ان کا مطالعہ اقبال وسیع اور گہرا بھی ہے، اس مجموعہ کا دوسرا مضمون "اقبال اور نئی دنیا" خاصے کی چیز ہے، اس مجموعہ کے مضامین کی دو نوعیتیں ہیں پہلی نوعیت کے مضامین میں ڈاکٹر عابد حسین، آغا حشر، فیض احمد فیض، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اختر اورینوی، پروفیسر محمد محسن ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اور غیاث احمد گدی کے متنوع ادبی و فنی کارناموں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ انھوں نے ان کے ساتھ اپنے اختلاف کا برملا اظہار بلکہ ان کی تردید بھی کی ہے۔ اور ان کی خوبیوں کی تشریح بلکہ ان کے بعض نمونوں کو ادب العالیہ کی روایات کا جز بھی قرار دیا ہے، اور اسی حیثیت سے تاریخ ادب میں ان کا درجہ متعین کیا ہے، وہ ڈاکٹر سید عابد حسین کی ادبی و تنقیدی بصیرت، علمی گہرائی، اردو پر قدرت وغیرہ کا اعتراف کرنے کے بعد انھیں باضابطہ مفکر قرار دیتے ہیں، اور ان کی کتابوں "قومی تہذیب کا مسئلہ" اور "ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں" کو ان کا شاہکار بتاتے ہیں مگر انہی کتابوں کا دیدہ وری سے جائزہ لیکر ڈاکٹر صاحب کی بعض فکری خامیوں کی جس مبصرانہ انداز سے نشاندہی کی ہے اس سے لائق مصنف کی تنقیدی بصیرت اور ملک و ملت کے مسائل کے بارہ میں سنجیدہ اور سلجھی فکر و رائے کا پتہ چلتا ہے،

اسی نوعیت کا اہم مضمون "یوسف حسین خاں عالم یا ناقد" بھی ہے، اس میں عالم و محقق اور ناقد کے دائرۂ عمل، طریق کار اور الگ الگ فرائض بتانے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو ایک بڑا عالم و محقق بتایا ہے اور اس کے ثبوت میں ان کی پانچ اہم عالمانہ تصنیفات کے فنی معلومات اور علمی اطلاعات کا ذکر کیا ہے، مگر وہ انھیں ناقد نہیں مانتے اس سلسلہ میں ان کی بعض تصنیفات کا گہرا تنقیدی جائزہ لیکر اس پہلو سے ان کے نقص و کمی کا ذکر کیا ہے، اسی انداز سے فیض کی شاعری، اختر اورینوی کی تنقید نگاری پروفیسر محمد محسن کی نفسیاتی تنقید نگاری، خلیل الرحمٰن اعظمی کی ادبی حیثیت اور غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری پر سیر حاصل

تبصرہ کرکے انکی قدر و عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے، اور ان کے ناقص انداز نظر پر رد و کد بھی کی ہی، دوسری نوعیت کے مضامین میں اصناف ادب پر بحث و گفتگو کی ہے، اس سلسلہ کے دو مضامین افسانے کے بارے میں ہیں، ایک میں اردو افسانے میں ہیئتی تجربے پر گفتگو کی ہے، اس میں تجربے کا مطلب اور روایت سے اس کا تعلق دکھانے کے بعد افسانے میں ہیئتی تجربوں کی موجودہ کوششوں کا جائزہ لیکر ان کے نقائص دکھائے ہیں، اور تلافی کی صورت بھی بتائی ہے، دوسرے مضمون "ہم عصر افسانہ میں اقدار کی اہمیت" میں بھی پہلے اقدار کا مفہوم واضح کیا ہے، یہ بحث بجائے خود بہت دیدہ ریزی اور بڑی دقت نظر سے کی گئی ہے، اس کے بعد موجودہ افسانوں کی ہیئت و اسلوب پر اقدار کے انتشار و بحران کے اثرات دکھائے ہیں، جن سے افسانے کی افسانویت تک خطرے میں پڑ گئی ہے، شاعری سے متعلق بھی دو مضامین ہیں، "غزل - مہذب ترین صنف شاعری" میں اس کا جواب دیا ہے، کہ "وہ ایک نیم وحشی صنف شاعری ہے"۔ اس میں اس کی ہیئت، موضوع اور اسلوب وغیرہ کے علاوہ اردو غزل کی دین، اس کے تہذیبی کردار، اسکی جمالیاتی و تہذیبی قوت وغیرہ پر بحث کرکے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ "شاعری ادب کا امتیازی سرمایہ ہے، اور شاعری کا بنیادی سرمایہ غزل ہے ... اس طرح وہ فکری و فنی اعتبار سے مہذب ترین صنف شاعری ہے"، اس سلسلہ کے ایک اور مضمون میں نثری نظم اور آزاد غزل پر بحث کرکے دونوں کو اردو شاعری کی روایت اور مزاج کے خلاف بتایا ہے، اور لکھا ہو کہ یہ اجتہاد و اختراع کے بجائے تقلید و نقالی ہے، جو غلامانہ ذہنیت کی غماز ہے، مصنف کے تنقیدی بحث و تجزیے انکے اخذ کردہ نتائج اور کہیں کہیں لب و لہجہ سے اختلاف کیا جاسکتا ہی، مگر انکا ہر مضمون محنت، مطالعہ، غور و فکر اور دقت نظر کا نتیجہ اور بڑی قوت و اعتماد کے ساتھ لکھا گیا ہے، انھوں نے اپنے خیالات کو بہت مربوط اور منطقیانہ انداز میں بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے، ان کے پہلے مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی اردو کے تنقیدی ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب :- مرتبہ جناب مولوی محمد عبید اللہ الاسعدی صاحب

تقطیع متوسط کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ... مع رنگین کور، قیمت ۲۵ روپیے،
ناشر مکتبہ رحمانیہ مہتورا، باندہ، یوپی۔

اسلام ایک مکمل اور جامع دین ہے، اس نے ایمانیات وعقائد، اعمال وعبادات، اخلاق و معاملات اور سیاست وتمدن ہر ایک کے بارے میں احکام وہدایات دئے ہیں، اس کتاب میں عام فہم انداز میں بہت اختصار کے ساتھ انہی امور ومسائل کے متعلق اسلامی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، چنانچہ پہلے ایمان کا مطلب تحریر کیا ہے اور توحید، ملائکہ، وحی، رسالت، تقدیر اور آخرت پر بحث کی ہے پھر ارکان عبادات کے عنوان کے تحت شہادتین کے اقرار، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا ذکر کیا ہے، اور علم کی اہمیت واضح کرنے کے بعد مسلمانوں کے مخصوص دینی علوم تفسیر، حدیث، کلام، فقہ، تصوف واخلاق، ادب وعربیت اور تاریخ وسیر کے علاوہ عام علوم اور صنعت وحرفت سے مسلمانوں کی دلچسپی دکھائی ہے، اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت، اسکے سیاسی نظام، جہاد، عدل، معاشرتی وعائلی، اخلاقی ومعاشی نظام اور تعزیرات وغیرہ پر گفتگو کی ہے، اور کائنات ونظام کائنات، مساوات، آزادی اور عورت کے بارے میں اسلامی تصورات بیان کئے ہیں، اسلامی قوانین کی بنیادوں کتاب وسنت اور اجماع وقیاس کا ذکر اور خانہ کعبہ، مسجد نبوی اور بیت المقدس کے متعلق کچھ معلومات بھی درج ہیں آخر میں اسلام کے ایک معتدل ومتوازن مذہب ہونے اور اسکے بارے میں غیر مسلموں کی بعض رائیں نقل کی ہیں، وحی کی بحث میں آسمانی کتابوں اور رسالت کے ضمن میں مشہور انبیاء کے مختصر حالات دئے گئے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی اولاد وازواج، متعلقین واعزہ اور صحابہ کرام کا بھی ذکر ہے آخرت کی بحث میں عالم برزخ اور جنت ودوزخ کا تذکرہ ہے، اہم مفسرین، محدثین اور فقہا کا تذکرہ اور مشہور کلامی وفقہی مذاہب کی بحث کی ہے، اور اسلام کے سیاسی نظام کے ضمن میں مسلمانوں کی قدیم اہم حکومتوں اور موجودہ دور کی اسلامی حکومتوں کا تذکرہ کیا ہے، اگرچہ کہیں کہیں زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے جیسے عبادات، معاشرت، اخلاق اور اسلام کے معاشی وعائلی نظام پر بہت مختصر بحث وگفتگو کی ہے اور آخرت کے ضمن میں موت اور تجہیز وتکفین کا ذکر رہ گیا ہے بعض غیر ضروری بحثیں بھی آگئی ہیں مثلاً آنحضرت کے تذکرہ میں آپکے عزیزوں اور صحابہ کرام کا تذکرہ، اس کتاب کا علمی وتحقیقی پایہ گو بلند نہیں ہے مگر مصنف نے اس میں بہت

مفید باتیں جمع کردی ہیں یہ عام لوگوں کے مطالعہ کے لائق ہو جس نے دیباچہ میں لکھا ہو کہ انھیں پڑھنے سے زیادہ لکھنے لکھانے کا خبط آگیا، یہ خبط دور کرکے پڑھنے پڑھانے پر زیادہ توجہ مبذول کریں تو ان کی تصنیفی زندگی بہتر ہو سکتی ہے۔

انتخاب غزلیات ثاقبؔ، انتخاب مومنؔ	مرتبہ ڈاکٹر منظر عباس نقوی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی
انتخاب خواجہ وزیرؔ، انتخاب غزلیات برقؔ	شاہ محمد باقر، آغا محمد باقر، سید سلیمان حسین،
انتخاب کلام مونسؔ، انتخاب میر سوزؔ، انتخاب	غلام حسین، ڈاکٹر انیس اشفاق، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت
غزلیات قائمؔ چاندپوری،	و طباعت بہتر، صفحات بالترتیب ۱۲۴، ۱۱۲، ۱۲۰، ۱۵۰،

۸۶، ۸۸، ۱۳۲، قیمت بالترتیب ۳ روپے پچاس پیسے، ۴ روپے، ۵ روپے، ۶ روپے ۵۰ پیسے، ۴ روپے ۵ روپے پچاس، ۶ روپے، ناشر اتر پردیش اردو اکاڈمی، بلھرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اردو کے معماروں اور اساتذۂ فن کے منتخب کلام کی اشاعت کا مفید پروگرام بنایا ہے، یہ ساتوں کتابیں اسی پروگرام کے ماتحت شائع کی گئی ہیں، جو اردو کے باکمال شاعروں کے کلام کا انتخاب ہیں، یہ انتخاب مختلف یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق کیا ہے، ہر کتاب کے شروع میں فاضل مرتبین کے قلم سے مختصر مقدمے بھی ہیں، منظر عباس استاذ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ثاقبؔ کے کلام کا انتخاب بڑی خوش مذاقی اور اچھے ڈھنگ سے کیا ہے، انھوں نے ثاقبؔ کا اچھا تعارف بھی لکھا ہے، اور ان کے کلام کی خصوصیات پر بھی سیر حاصل بحث کرکے انکی شاعرانہ عظمت واضح کی ہے اور لکھا ہے کہ "یہ زبان میر اور تخیل غالب کی نمائندگی کرتے تھے"، مقدمہ سے انکی ادبی ژرف نگاہی اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، ڈاکٹر ظفر صدیقی استاذ شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کا مقدمہ بھی محنت و مطالعہ کا نتیجہ ہے، انھوں نے حکیم مومن خاں مومنؔ کے مختلف اصناف کلام کا انتخاب کیا ہے، جناب شاہ محمد باقر اور آغا محمد باقر نے ناسخؔ کے دو ممتاز شاگردوں اور دبستان لکھنؤ کے باکمال شاعروں خواجہ محمد وزیرؔ اور مرزا محمد رضا برقؔ کے کلام کا انتخاب کیا ہے اور دونوں نے انکے کلام کی خصوصیات پر بھی گفتگو کی ہے اس سے لکھنؤ کی شاعری کے خاص رنگ کے علاوہ ان شعراء کے اپنے استاذ کے طرز کو فروغ دینے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے، برقؔ کے کلام کے محاسن کے ساتھ اس کے بعض معائب کا بھی تذکرہ آگیا ہے، ایک اور مجموعہ میں بھی دبستان لکھنؤ کے ایک صاحب کمال شاعر مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ لکھنوی کی غزلوں اور رباعیات کا انتخاب کیا گیا ہے، اور مقدمہ میں ان کا مختصر حال اور شاعرانہ درجہ و مرتبہ واضح کیا گیا ہے، دو مجموعے میں میرؔ و مرزاؔ کے ہمعصر اور باکمال شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے، ایک میں میر سوزؔ کے اور دوسرے میں سوداؔ کے شاگرد اور منفرد طرز سخن کے مالک قائمؔ چاندپوری کی غزلوں کا انتخاب دیا گیا ہے، اور مقدمہ میں انکے حالات وغیرہ کا ذکر ہی مگر میر سوزؔ کی شاعری پر بحث و تبصرہ مزید تفصیل و کاوش کا متقاضی تھا، اردو کے کلاسیکل شعراء کے انتخاب کلام کی اشاعت ایک مفید ادبی خدمت ہے جس کے لئے اتر پردیش اردو اکاڈمی مستحق ستایش ہے۔

"ض"

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی رہیں، ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے، لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور ان کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت: ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

"منیجر"

حجۃ الاسلام مولانا شبلیؒ کی بعض اہم تصنیفات

سیرۃ النبی حصہ اول: اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات و غزوات کی تفصیل اور اس پر تبصرہ، قیمت: ۲۹ روپیہ

سیرۃ النبی حصہ دوم: اقامت امن، تاسیس خلافت، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و شمائل کا مفصل بیان۔ قیمت: بیس روپیہ

الفاروق: حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانح عمری ان کے مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل مولانا کے قلم کی شاہکار کتاب، جس پر مصنف کو بھی ناز تھا، قیمت: ۲۲ روپیہ

الغزالی: حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل، ان کی تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ، قیمت ۱۱ روپیہ

المامون: خلیفہ مامون الرشید کی سوانح و حالات کے علاوہ اس کے عہد حکومت کے سیاسی، علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی حالات، جس سے دولت عباسیہ بغداد کے عروج و کمال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ قیمت: ۱۱ روپیے

سیرۃ النعمان: امام ابوحنیفہؒ کی سوانح عمری اور ان کے اجتہادات اور استنباط و مسائل اور فقہ حنفی کی خصوصیات (زیر طبع)

سوانح مولانا روم: مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانح عمری اور ان کی شاہکار تصنیف مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ، (زیر طبع)

موازنۂ انیس و دبیر: مشہور مرثیہ نگار میر انیس کی شاعری پر ریویو اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ، زیر طبع

کلیات فارسی: مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ قیمت: ۱۱ روپیہ

کلیات اردو: مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جو انھوں نے مسجد کانپور، جنگ طرابلس، غزوۂ بلقان، مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھیں، قیمت: ۶ روپیہ

مکاتیب شبلی: مولانا کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، حصہ اول، حصہ دوم ۱۶ روپیہ، ۱۲ روپیہ

رجسٹرڈ نمبر ایل - ۱۶

نومبر ۱۹۸۲ء

28/11/8

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت بیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(پن ۲۷۶۰۰۱)

مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ ۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ
۳۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۔ ۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمن

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک بیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:۔ ۵۰ روپے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:۔ ۱۰ روپے،

جلد سوم

اس میں اورنگ زیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

.....مرتبہ.....

سید صباح الدین عبدالرحمن

Zakir Husain Lib.
J. M. I. New Delhi

جلد ۱۳۴ ماہ صفر المظفر سنہ ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۸۴ء عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

شریمتی اندرا گاندھی اب اس دنیائے فانی میں نہیں رہیں کچھ نادان وطن دشمن اور ناعاقبت اندیش مردوں کے پستول اور ماسٹن گن سے نہیں بلکہ ان کی بے رحمی بے دردی اور سفاکی کی گولیوں کا نشانہ بنیں اور راہی ہو کر سب سے رخصت ہو گئیں، دو مردوں نے ایک ۶۷ سالہ عورت کو اپنی ۲۲ بائیس گولیوں کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ دنیا کے تمام مردوں کے مردانگی کی تذلیل کی، انسانیت کی گردن شرم سے جھکا دی اور وطن کی ناموس خاک میں ملا دی، مگر خود شریمتی اندرا گاندھی کی عظمت، جلالت اور صولت میں چار چاند لگا دیا، ان کی وفات اپنی فطری موت سے ہوتی تو ان کی عزت، مقبولیت اور محبوبیت میں اتنا اضافہ نہ ہوتا جتنا کہ اب ہوا، گلابوں اور سورج مکھیوں سے لدی ہوئی ان کی ارتھی بحری، ہوائی اور بری لشکریوں کے دستوں کی میت اور لاکھوں عقیدتمندوں کے جلو میں روانہ ہوئی تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی لاڈلی، ہندوستان کی بیٹی اور سیاست کی دیوی اپنے میکے سے فنا کی سہاگن بنی ہوئی بے پناہ آنسوؤں کا جہیز لیکر وداع ہو رہی ہے، سو سے زیادہ ملکوں کے ممتاز نمایندے ان کے احترام میں جھکے ہوئے تھے، مردوں اور عورتوں کا بے پناہ سوگوار ہجوم زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کی فضا پر جب تک سورج کی روشنی چمکتی رہیگی، چاند کی چاندنی پھیلتی رہیگی اور شبنم کے قطرے یہاں کے پھولوں کو تازہ اور شاداب کرتے رہیں گے، ہندوستان کی تاریخ میں شریمتی اندرا گاندھی کا نام باقی رہے گا۔

کچھ سیاسی شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو زمانہ کے سپرد ہو جاتی ہیں مگر کچھ سیاسی شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے سپرد زمانہ ہو جاتا ہے، اندرا گاندھی کی شخصیت ایسی تھی جس کے سپرد خود زمانہ ہو گیا تھا، ان کے سر پر وفات عظمیٰ کا تاج رکھا گیا تھا تو پورے ہندوستان کا دل دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ اس تاج کی لاج کس طرح برقرار رکھیں گی، مگر اقبال خود ان کی وزارت عظمیٰ کی مانگ پر افشاں چھڑکتا رہا، کامیابی خود بڑھ کر ان کی سیاست کے پاؤں میں چھاگل بنی رہی، عزم بالجزم ان کی قوت فیصلہ کا سہارا لیکر ان کی سیاست کے گلے میں مرصع کار ہار بنا رہا، اور اب جبکہ ان کی سیاسی زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا ہے، مورخوں کو یہ لکھنے میں تامل نہیں ہوگا کہ کیسی سوگوم

متحرک، محنتی، جہاں ہمت، حوصلہ مند، نڈر، وطن کے کونے کونے کی خاک چھاننے والی، لاکھوں کے مجمع کو اپنی طرف کھینچنے والی، دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہونے والی، اپنے مخالفوں سے صبر و سکون کے ساتھ نبرد آزما ہونے والی، اپنی ناکامی کے باوجود از سر نو ابھرنے والی اور طرح طرح کے مسائل میں مبتلا رہ کر ان کو حل کرنے کی کوشش کرنے والی حکمراں خاتون دنیا کی تاریخ میں شاید پیدا نہیں ہوئی۔

رومن امپائر میں کلیوپیٹرا، تھیوڈورا، زوی، برونائٹ اور ایرین اپنے زمانے کی سیاست پر چھائی رہیں، فرانس میں میری انٹونایٹ اور کیتھرائن اپنے ملک کی سیاست میں بہت نمایاں ہوئیں، انگلستان میں ایلزبتھ، میری اور وکٹوریہ نے اپنی حکمرانی میں بڑا نام پیدا کیا، ہندوستان کے اندر رضیہ سلطانہ، حبہ خاتون، بیگم ماہم، نورجہاں، درگاوتی اور تارابائی کو اپنے زمانہ میں بڑی شہرت ہوئی، مگر ان تمام حکمراں خواتین کی سیاسی سرگرمیاں محلوں اور درباروں تک رہیں، اس کے برخلاف اندرا گاندھی کی سیاست پارلیمنٹ کے ایوانوں، مخالف جماعتوں کی شدید مخالفتوں، انتخابات کے ہنگاموں، سڑکوں، گلیوں اور کوچوں کے طوفانی دوروں میں ابھری، اس لحاظ سے وہ ان تمام خواتین حکمرانوں پر فوقیت رکھتی ہیں ان کی معاصر سیاسی خواتین میں اسرائیل میں گولڈا مائر، سری لنکا میں مسز بندرا نائکے اور انگلستان میں مسز تھیچر وزارت عظمیٰ پر ضرور فائز رہیں، ان کے ملکوں کا رقبہ اور ان کی آبادی بھی زیادہ نہیں، مگر اس کے باوجود وہ اپنے اپنے ملک پر اس طرح حاوی نہ ہو سکیں جس طرح اندرا گاندھی ستر کروڑ کی آبادی والے ملک کے الجھے ہوئے صبر آزما اور ہمت شکن مسائل پر رہیں، اس لحاظ سے بھی ان کی معاصر حکمراں خواتین ان کی شہرت کے آگے ماند رہیں۔

تاریخ کی عظیم شخصیتوں کا جائزہ لینے میں جہاں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے جاتے ہیں وہاں تنقید و تنقیص کی چنگاریاں بھی برسائی جاتی ہیں، اندرا گاندھی کے کارناموں کا بھی آیندہ جائزہ لیا جائے گا، مگر ہندوستان کی تاریخ عظمت کا ہار پہنا کر ان کو شہرت کے بقائے دوام کے دربار

جو مقام دے چکی ہے اس سے ان کا بڑے سے بڑا ناقد اور مخالف بھی ہٹا نہیں سکتا۔

ان کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے لڑکے راجیو گاندھی ان کے جانشین ہوں، ان کی المناک موت سے یہ آرزو پوری ہوگئی، اب راجیو گاندھی کی طرف سارے ہندوستان کی نظر اٹھی ہوئی ہے کہ اس بھاری ذمہ داری سے وہ کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں، حکومت آرڈی ننس کے ذریعہ سے بھی کی جاتی ہے، یہ پولیس کے ذریعہ سے بھی امن وامان قائم کرا لیتی ہے، فوج کے سہارے فسادات پر بھی قابو پا لیتی ہے، ایسی حکمرانی تو بہت آسان ہے، مگر دلوں کی تسخیر کرکے لوگوں پر حکومت کرنا آسان نہیں بلکہ مشکل ہے، ایک حکمران کا اصلی کارنامہ تو یہ ہے کہ وہ جھک کر قد آور ہو، مفتوح بن کر فاتح ہو، مغلوب ہو کر غالب ہو، راجیو گاندھی کی وزارت عظمیٰ کی آزمائش اس میں ہے کہ اس ملک کے ہر فرقہ بلکہ ہر آدمی کے لیے ان کے دل میں محبت کی گنگا اور اخلاص کی جمنا کس طرح بہتی ہے، یہ قانون یا کاغذی تحریروں یا زبانی تقریروں سے نہیں بہہ سکتی، بلکہ لوگ محسوس کریں کہ ان کے سربراہ کی واقعی مخلصانہ، دردمندانہ اور ہمدردانہ حکمت عملی کی وجہ سے اس کے لیے ان کے دلوں کے اندر شیفتگی اور وارفتگی کے شہد کی نہر بہہ رہی ہے۔

دارالمصنفین شریمتی اندرا گاندھی کی حسرتناک موت سے اس لیے بھی سوگوار ہے کہ ان کے خاندان سے اس ادارہ کا گہرا تعلق رہا، ان کے دادا پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے والد بزرگوار پنڈت جواہر لال نہرو اس کو اپنی تشریف آوری اور کرم سے برابر نوازتے رہے، خود انھوں نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا اس لیے ان کی وفات کو یہ ادارہ اپنا بہت بڑا سانحہ سمجھتا ہے، اس سوگواری کے عالم میں اس کی خوشی ہے کہ ہندوستان کی وزارت عظمیٰ اسی فخر روزگار خاندان میں پھر آگئی، راجیو گاندھی کو پیام تعزیت بھیجنے کے ساتھ ادارہ ان کے اس عہدۂ جلیلہ کے لیے مبارکباد بھی پیش کرتا ہے۔

مقالات

مستشرقین اور مطالعۂ سیرت

جناب ڈاکٹر نثار احمد صاحب اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی پاکستان

فہرست مستشرقین "حصہ دوم"

(۲)

۱۷۲ـــ اتین مارک	Etiennne Marc Quatreimere
۱۷۳ـــ اڈمنڈ کاسل	Edumund Castell
۱۷۴ـــ اڈولف وارمنڈ	Adolf Wahrmund
۱۷۵ـــ البرتوس شولتنز	Albertus Schultens
۱۷۶ـــ الفرڈ اکتاف بل	Alfred Octave Bel
۱۷۷ـــ امیلو لافونتے الکنترا	Emilo Lafouentey Alcontara
۱۷۸ـــ اربی نوس	Erpenues
۱۷۹ـــ ایڈلر	Adler, J.G.
۱۸۰ـــ اسٹینلے ڈین	Stanley Dean
۱۸۱ـــ الفنسٹن	Elphistone
۱۸۲ـــ امبریکو آف مینز	Embrico Of Mainz
۱۸۳ـــ اسمتھ	Smith, W.C.
۱۸۴ـــ اوٹو	Otto Richard
۱۸۵ـــ الیکزنیڈر روس	Allexander Ross
۱۸۶ـــ الیس	Alles, T.W.

۱۸۷ — الکوک	Alcocke, Nathan.
۱۸۸ — اموس	Amos Pasud
۱۸۹ — اجودی سانتالا	Ugodi Santalla
۱۹۰ — ایڈورڈ جے جرجی	Edward J. Jurji
۱۹۱ — احرث	Ehrherth, Jacob
۱۹۲ — الورث	Ahlwardt, Wilhelm
۱۹۳ — ابرڈس	Imberdis Victor
۱۹۴ — اشپربر	Sperher, Jakob
۱۹۵ — اسپائن	Spien Bernard
۱۹۶ — اسپائرو	Spiro Jean
۱۹۷ — اڈیلر آف باث	Adelard of Bath .
۱۹۸ — براؤن	Brown, E.G.
۱۹۹ — بیریزین	Beresine, N
۲۰۰ — بارتھولڈ	Barthold, V.V.
۲۰۱ — برقاردٹ	Burchardt. L.
۲۰۲ — بی . وائز	Beauvais Vincent de
۲۰۳ — بیجر.	Badger, G.P.
۲۰۴ — بارو	Barrau, J.J.
۲۰۵ — بارٹول	Bartol

۲۰۶ — باڈیر	Beudier, Michel
۲۰۷ — بازن	Basin, Louis
۲۰۸ — بینسن	Benson, A.C.
۲۰۹ — بیتھمان	Bethman, W.C.
۲۱۰ — بیون	Bevan A.A.
۲۱۱ — بھلیانڈر	Bihliander, theodor.
۲۱۲ — بلم	Blum, Ernest, Alfred
۲۱۳ — بوساشیو	Baccacio, Giovamir
۲۱۴ — بولیتھو	Bolitho, William
۲۱۵ — بیکر	Becker, G.H.
۲۱۶ — بریفالٹ	Briffault, R.S.
۲۱۷ — بنگ	Byng, E.J
۲۱۸ — بارکر	Barker, E.
۲۱۹ — برنارڈ لوئیس	Lewis, B.
۲۲۰ — بیل	Bell, R.
۲۲۱ — پوکاک	Pococke, E.
۲۲۲ — پوسٹل — قواعد اللغۃ العربیہ ۱۵۳۸ء	Postel, G.
۲۲۳ — پیرون۔ ترجمہ الطب النبوی از جلال الدین ابی سلیمان داؤد ۱۸۶۰ء	Perron, A.
....	....

۲۲۴ – پکتھال (ترجمۃ القرآن، الثقافۃ الاسلامیۃ) — Pickthal, M.W.

۲۲۵ – پامر — Palmer, E.H.

۲۲۶ – پالگریو — Arabia-1867 – (Palgrave)

۲۲۷ – پرائس — History of Mohamadan dynesties (Major Price London 1812.

۲۲۸ – پیٹر — Peter the Venerable

۲۲۹ – تھیوفین — Theophanes, Saint.

۲۳۰ – تھامس برٹران — Thomas Bertran.

۲۳۱ – تھامسر — Thompson J.W.

۲۳۲ – تھامسن — Thom son William.

۲۳۳ – ٹیٹس — Titus.M.T.

۲۳۴ – ٹوری — Tory,Fouoford.H.

۲۳۵ – ٹرٹین — Tritton,A.S.

۲۳۶ – ٹروِلش — Troltsch,Charlotle.F.K.

۲۳۷ – تشودی — Tochudi,R.

۲۳۸ – تھیوڈور ولیم جان — Theodore Wilhelum Jean Juynoboll.

۲۳۹ – جرترود مارگریٹ – انگریز مستشرقہ — Gertrude Margaret Lowthian Bell

۲۴۰ – جوتلف برک — Gotlbelf Bergstrasser.

۲۴۱ – جارج جیکب — Jacob,George.

۲۴۲ – جویدی — Ignazio Guidi.

۲۴۳ ۔ جلاذر	E?nard Glaser.
۲۴۴ ۔ جان ارتوکی	Jean Arthoski
۲۴۵ ۔ جبرئیل فیران	Gabriel Ferrand
۲۴۶ ۔ جبرئیل لیوان	Gabriel Leveng
۲۴۷ ۔ جربردی اورلیاک	Jerbert de Oraliac
۲۴۸ ۔ جیر	Geer,B.J.
۲۴۹ ۔ جرازبری	Jarazbhry,A.Q.A.
۲۵۰ ۔ جیکل	Jackel,R.
۲۵۱ ۔ جیمز ڈی روڈا	Jimez de Roda.R.
۲۵۲ ۔ جان	John V
۲۵۳ ۔ جونز	Jones David .
۲۵۴ ۔ جونگ	Jong,P.De.
۲۵۵ ۔ جانسن	Johnson,E.N.
۲۵۶ ۔ جان کینتیز	John Continueam.
۲۵۷ ۔ جونز	Sir William Jones.
۲۵۸ ۔ جان آف دمشق	John of Damascus.
۲۵۹ ۔ جانسٹن	Johnston.
۲۶۰ ۔ جان لڈگیٹ	John Lydgate.
۲۶۱ ۔ جین بررڈ	Gene Berard

نمبر شمار	نام	Name
۲۸۱	رینکے	Ranke,Leopold,Von
۲۸۲	راٹی جی	Rattigen,W.H.
۲۸۳	ریناخ	Reinach,Salmon
۲۸۴	ریسکے	Reiske,J.K.
۲۸۵	ریوش	Reusch,R.
۲۸۶	رائمنڈ	Raymond,J.
۲۸۷	رٹر	Ritter,H
۲۸۸	روپر	Ruper,C.L
۲۸۹	راجر بیکن	Roger Bacon
۲۹۰	راڈویل	Rodwell,J.M.
۲۹۱	ریکینڈورف	Reckendorf
۲۹۲	روزنتھال	Rosenthal,E.I.J.
۲۹۳	روزنتھال	Rosenthal,F.
۲۹۴	روتزیوال	Sabastien Ronsevalle
۲۹۵	روزن	Victor Romanoviche Rosen
۲۹۶	رازموسن	Lassen Rasmussen
۲۹۷	زمبرینی	Zam Brini,F.
۲۹۸	زویمر	Zwemer,S.M.
۲۹۹	زخاؤ	Sachau,E.

۳۰۰ — زیٹرسٹین — Zetterstean, K.V.

۳۰۱ — ساسمنٹو — Sarmiento, Mantin.

۳۰۲ — سرسانو — Sarsano, M.Y.S.

۳۰۳ — سرویر — Serview, Andoe

۳۰۴ — سائن — Sine, W.

۳۰۵ — سائمن — Simon, Gotterfried

۳۰۶ — سلیرو — Solero, Silvio

۳۰۷ — سارڈل — Sourdel, D.

۳۰۸ — سودے — South y, R.

۳۰۹ — سائیکس — Sykes, Sir Percy.

۳۱۰ — سائبرگ — Syburg, F.

۳۱۱ — سیورے — Savery.

۳۱۲ — سینٹ ہلیر — Barthelony St. Hailaire

۳۱۳ — سان پیڈرو پیسکال — San Pedro Perscual.

۳۱۴ — سدیو جان جاک — Sedillot, J.J.

۳۱۵ — سلیم نوفل — . alim

۳۱۶ — سشن — Sohmon, F.J.

۳۱۷ — شول — Scholl, Adolf.

۳۱۸ — شرودڈر — Schroeder, E.

۳۱۹ــ شرودن	Victor A
۳۲۰ــ شولتنز	S hultens
۳۲۱ ـ شاخت	Schacht,J.
۳۲۲ ـ شولتنز	Schultens.J.J.
۳۲۳ ـ شوفاجیہ	Jean Sauvaget
۳۲۴ ـ شیخاس	Francis Joseph Steingass
۳۲۵ ـ طنطاوی، الشیخ محمد عیاد	
۳۲۶ ـ غریفینی	Eugeino Griffini
۳۲۷ ـ فلکے	Falke,Robert
۳۲۸ ـ فنگر	Finger,Charles
۳۲۹ ـ فنلے	Finlay, G.
۳۳۰ ـ فشر	Fisher,A.M.
۳۳۱ ـ فلیگل	Flugel,G.L.
۳۳۲ ـ فونٹین	Foutane Marivo,E.
۳۳۳ ـ فوسٹر	Foster.,H.F.
۳۳۴ ـ فری مین	Freeman,E.A.
۳۳۵ ـ فک	Fuck,J
۳۳۶ ـ فان کریمر	Alfred Von Kremer.
۳۳۷ ـ فلائیشر	Fleischer.H.L.

۳۳۸ ـ [illegible]	August Ferdinand Mehren
۳۳۹ ـ نیل	Gottbold Nail
۳۴۰ ـ قسطنطین الافریقی	Constantinus African
۳۴۱ ـ کانتو	Cantu,Cesare
۳۴۲ ـ کارا	Carra de Vox,B.
۳۴۳ ـ کیش	Cash.N.W.
۳۴۴ ـ کیو	Cave,Sydney.
۳۴۵ ـ کلارک	Clarke,James.F.
۳۴۶ ـ کلینارڈس	Clenardus,N.
۳۴۷ ـ کریگ	Cragg;Kenneth.
۳۴۸ ـ کیوریو	Curiò,C.A.
۳۴۹ ـ کیبل	Kaibel,F.V.
۳۵۰ ـ کلرہال	Kellerhals;E.
۳۵۱ ـ کلین	Klein;F.A.P.
۳۵۲ ـ کرے ہل	Krehl,C.L.E.
۳۵۳ ـ کارلائل	Carlyl.H.H.Macartney.
۳۵۴ ـ کیورٹین	William Curreton.
۳۵۵ ـ کوزے گارٹن	J.G.L.Kosegarten
۳۵۶ ـ کونڈے	Cond'e

۳۵۷ ـ کوڈیرا	Franciscus Codera Zaydin.
۳۵۸ ـ کروگر	Kruger.
۳۵۹ ـ کلودکاہن	Cohen,Cl
۳۶۰ ـ کولن جارج	Colin,G.S.
۳۶۱ ـ کاظم مرزا بیک	
۳۶۲ ـ کریمسکی	Krynsky,A.E.
۳۶۳ ـ کراتشوفسکی	Kratch Koisky,I.J.
۳۶۴ ـ کلورلے	Calverley,E.E.
۳۶۵ ـ کلسٹینو	Clestino Schiaparelli
۳۶۶ ـ گیر	Gear,Joseph
۳۶۷ ـ گارڈے	Gardet,L.
۳۶۸ ـ گولڈسیکر	Goldsack,William
۳۶۹ ـ گڈرچ	Goodrich,C.A.
۳۷۰ ـ گیبرٹس	Guibertus
۳۷۱ ـ گیدی	Guidi,M.
۳۷۲ ـ گیام	Gui Uaume,Alfred.
۳۷۳ ـ گوئٹے	Goethe
۳۷۴ ـ گرینیبام	Grunebaum ,G.E.V.
۳۷۵ ـ لسڈن	Leusden Johan.

نمبر	نام	Name
۳۷۶	[illegible]یوم	La Besme,J.
۳۷۷	لفیٹے	Laffitte,Pierre.
۳۷۸	لنٹ	Lunt,Theodore
۳۷۹	لائتھ	Lyth,Henricue.
۳۸۰	لیبان	Lebon.Dr.G.
۳۸۱	لیفی پروفنسال	Levi Provencel,E.
۳۸۲	لارنس	Lawrence,T.E.
۳۸۳	لین	Edward William Lane.
۳۸۴	لینڈبرگ	Carlo Landberg.
۳۸۵	لیس	William Nassan Lees.
۳۸۶	میکڈونلڈ	Macdonald,D.E.
۳۸۷	ماسں	Mass'e Henri
۳۸۸	مازاس	azas, Alexander.
۳۸۹	مورلے	illiam Hook M rley.
۳۹۰	مینسنگ	J.Petrus M Mensing.
۳۹۱	ل مین	Milman.
۳۹۲	مورس	Maurice.F.D.
۳۹۳	میلبوگنار	Melb Gunnar
۳۹۴	رکاڈیر	Mercadier,G.

۳۹۵ ۔ مارکیل	Markel G.N.C.
۳۹۶ ۔ میار	Mayer,Eduard
۳۹۷ ۔ میر	Mayer.J.J.
۳۹۸ ۔ میرس	Meyerus,P.
۳۹۹ ۔ میمیر	Meynier,E.
۴۰۰ ۔ میرو	Mierow,C.C.
۴۰۱ ۔ میور	Muir John
۴۰۲ ۔ موزرے	Mouseray,F.de.
۴۰۳ ۔ مویر	Moyer,E.S.
۴۰۴ ۔ منرو	Munro,D.C.
۴۰۵ ۔ مینارڈ	Meynard, Barbier de.
۴۰۶ ۔ مونٹے	Montet,Ed.
۴۰۷ ۔ میشو	Michaus Bellire,E
۴۰۸ ۔ ملر	Augurt Muller
۴۰۹ ۔ متغ	Eugen Mittwoch
۴۱۰ ۔ مرکس ملر	Marcus Joseph Mullen.
۴۱۱ ۔ ناتھر	Nather,E.S.
۴۱۲ ۔ نونسال	Naubhal,I.
۴۱۳ ۔ نیسل	Neele,W.H

۱ ۔ ہاٹنجر	Hottinger,J.H.
۔ ہالان	Hallan
۔ ہیکس پین	Hackspan.
۔ ہال	Hall, M.P.
۔ ہارٹ مین	Hartman,M.
۔ ہیمر	Hammer,P.J.
۔ ہوری	Hauri,Joh.
۔ ہارٹ	Haurt,C.L.
۔ ہیوٹ	Havet,Ernest.
۔ ہاکنس	Hawkins,A.F.H.
۔ ہربیلوٹ	Herbelot d
۔ ہیل	Hell,Joseph.
۔ ہربل	Herbal of de Molainville
۔ ہالفن	Halphen.L.
۔ ہرمیلن	Hermalin,D.
۔ ہجین	Higden Ranulf.
۔ ہنڈاس	Hondas,O.V.
۔ ہبنر	Hubner,F.
۔ ہیوز	Hughes,J.P.

۴۵۲	ہیوز	Hughes, William
۴۵۳	ہاروے	New Comb Harvey.
۴۵۴	ہمفرے	Prideautt Humphrey.
۴۵۵	یوپانیوس	Dupenuis Thomas
۴۵۶	یولوجیس قرطبی	Eulogius Cordovan
۴۵۷	یوجین یونگ	Eugene Young.

مقالات شبلی جلد ششم

یورپ میں اسلام، اسلامی روایات، اسلامی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس و بابرکت اور تمام عالم کے لئے باعث رحمت زندگی کے مختلف پہلوؤں پر وہاں کے اسلام دشمن مستشرقوں نے بہت افسوسناک غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں، مولانا شبلیؒ اپنی زندگی بھر ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو رفع فرماتے رہے اور ان کے رد میں محققانہ مضامین لکھتے رہے، ایک بڑی غلط فہمی انھوں نے کتب خانۂ اسکندریہ کے خلاف پھیلا رکھی تھی کہ مسلمانوں نے فتح مصر کے بعد صدیوں کے اس بیش قیمت اور عظیم کتب خانہ کو جلا کر خاکستر کر دیا، مولانا نے ایک مضمون لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتب خانہ مسلمانوں کے مصر میں فاتحانہ داخل ہونے کے صدیوں پہلے جلایا جا چکا تھا، مقالات کی یہ جلد مستشرقین کے اعتراضات کے رد میں اسی قسم کے مضامین پر مشتمل ہے۔

قیمت :-   ۱۳ روپئے

علامہ برہان الدین مرغینانی

صاحب ہدایہ

از
عبید اللہ کوئی، ندوی، رفیق دارالمصنفین،

(۲)

تصنیفات امام مرغینانی کی تصنیفات میں سو آٹھ کا شیخ قاسم بن قطلو بغانے (تاج صفحہ ۳۰) ۹ کتابوں کا مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے (الفوائد صفحہ ۵۰) اور ۱۱ کتابوں کا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام[1] نے ذکر کیا ہے، مجھے تلاش و جستجو کے بعد ۱۴ کتابوں کا علم ہو سکا ہے، جو درج ذیل ہیں،

۱- ہدایۃ المبتدی۔ (اس متن کی تالیف مختصر القدوری اور جامع صغیر کی روشنی میں کی گئی ہے۔

۲- کفایۃ المنتہی۔ اس کا ذکر صاحب ہدایہ نے آغاز کتاب میں کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناتمام چھوڑ دی گئی، طاش کبری زادہ نے لکھا ہے کہ علامہ مرغینانی نے کفایۃ المنتہی کے نام سے ہدایہ کی ۸۰ جلدوں میں شرح لکھی[2]۔

یہی بات قاسم بن قطلوبغا اور دوسرے مصنفین نے بھی لکھی ہے، مگر پھر بھی انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے، کہ یہ شرح آٹھ جلدوں میں تھی،

۳- ہدایہ (۴) التجنیس والمزید (کشف الظنون نمبر ۳۵۲) (۵) مناسک الحج (کشف الظنون نمبر ۱۸۳۰)

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بعنوان مرغینانی ص ۴۰۹ مطبوعہ لندن ۱۹۲۳ء [2] مفتاح السعادہ ص ۱۲۶

۹۔ مختار مجموع النوازل (کشف الظنون نمبر ۱۶۲۲) اسی کو مختارات النوازل بھی کہا گیا ہے، ۱۰۔ کتاب فی الفرائض (کشف الظنون نمبر ۱۲۴۳ ص ۵۰) فرائض عثمانی حاجی خلیفہ چلپی نے اس کا ذکر ایک مستقل تصنیف کے طور پر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا متن شیخ عثمانی کا تالیف کردہ ہے، جس میں انھوں نے مسائل رد، ذوی الارحام اور چند اور فروعی احکام کو نظر انداز کر دیا تھا، علامہ مرغینانی نے تصحیح کے علاوہ، مزید اضافوں کے ساتھ اپنے افادات بھی ذکر کر دیئے ہیں، وہ اپنے وفور علم اور بے مثل شخصیت کی وجہ سے خود ہی اس موضوع پر مستقل تصنیف کے اہل تھے، لیکن انھوں نے ازراہ تواضع اور شیخ عثمانی کے احترام میں، اس متن پر تصحیح و اضافہ کا کام انجام دیا ہے، فرائض عثمانی کی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ایک شرح شیخ منہاج الدین ابراہیم بن سلیمان مرابی کی مفاتح الاقفال کے نام سے ہے، جس کی تکمیل خوارزم میں ۷۰۱ھ میں ہوئی[1] (۹) المشیختہ (تاج التراجم ص ۳۱، قرشی نے (۱/۱۳۱، ۲/۷۷۲) اسے معجم الشیوخ کے نام سے بھی یاد کیا ہے، (۱۰) کتاب المنتقی فی الفروع (کشف نمبر ۱۸۵۲) (۱۱) نشر المذہب (کشف نمبر ۱۹۵۲) (۱۲) شرح الجامع الصغیر للامام محمد الشیبانی، (کشف نمبر ۵۶۹ انسائیکلوپیڈیا ص ۲۶۹)[2] (۱۳) المزید فی فروع الحنفیہ (کشف الظنون نمبر ۱۶۶۰) (۱۴) شرح کتاب الحیطان (التجنیس نسخہ قلمی مملوکہ دار المصنفین ورق آخر)

مذکورہ کتابوں میں سے ہدایہ قدوری کا اختصار ہے، ہدایہ کے متن کے طور پر موجود ہے، اس کے علاوہ بعض کتب خانوں میں الگ سے کتابی صورت میں اس کے قلمی نسخے بھی موجود ہیں کتب خانہ آصفیہ میں اس کے دو نسخے ہیں، (دیکھئے فہرست آصفیہ جلد دوم ص ۱۰۷۴، نمبر کتاب ۲۲ و ۲۷۲) کتب خانہ رام پور میں بھی (نمبر ۶ فقہ) ایک نسخہ موجود ہے، مختارات مجموع النوازل کا

---

[1] کشف الظنون ج ۲ نمبر ۱۲۵۱۔

[2] قرشی نے اسامی شرح الجامع الصغیر کے ذیل میں صاحب ہدایہ کا بھی نام درج کیا ہے دیکھئے الجواہر ج ۲ ص ۴۲۹

ایک نسخہ کتب خانہ رام پور (دیکھئے فہرست مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۴۶ - نمبر ۵۲ کل صفحات ۳۱۵) میں پایا جاتا ہے۔ فتاویٰ التجنیس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، دیکھئے فہرست جلد دوم صفحہ ۱۰۵۴ - نمبر کتاب ۲۵ کتابت ۱۰۸۹ھ دوسرا نسخہ رام پور میں (نمبر کتاب ۵، کل صفحات ۴۰۲) موجود ہے۔ اسی کتاب کا ایک قدیم خوشخط قلمی نسخہ (سنہ کتابت نامعلوم) دار المصنفین کے کتب خانہ میں التجنیس والمزید کے نام سے موجود ہے۔ جس کا اسی مقالہ میں تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔

کفایۃ المنتہی کے بارے میں کشف الظنون نے لکھا ہے کہ اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں، بقیہ تصنیفات بھی حوادث زمانہ کے ہاتھوں اور غالباً حملۂ تاتار کے سبب برباد ہو چکی ہیں، البتہ معجم الشیوخ کے مختلف اقتباسات، قرشی نے الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیہ میں نقل کئے ہیں، اور اس مقالہ میں جا بجا ان سے استفادہ کیا گیا ہے، اس کا بھی علاحدہ سے کوئی نسخہ دستیاب نہیں، بہرحال مؤلف ہدایہ کی اب صرف چار ہی کتابیں پائی جاتی ہیں، بدایہ مع ہدایہ، التجنیس والمزید، مختارات مجموع النوازل، ہم اپنے مقالہ میں فی الحال، التجنیس المزید، اور ہدایہ ہی کے بارے میں قدرے اختصار کے ساتھ چند باتیں عرض کریں گے۔

التجنیس والمزید | اس کتاب کا قدیم اور خوشخط قلمی نسخہ کتبخانہ دار المصنفین میں موجود ہے، ۱۲×۵/۸ کی تقطیع میں ۱۶۶ ورق ہیں، اور ہر ایک صفحہ میں ۲۱ سطریں ہیں، اس کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے، الحمد اللہ القدیم الحلیم الخبیر ذی الایادی الظاہرۃ والنعم الباطنۃ والظاہرۃ، حمد و ثنا کے بعد فرماتے ہیں۔ "قال العبد الضعیف ابو الحسن علی بن ابی بکر (ابن) عبد الجلیل غفر اللہ لہ ولوالدیہ" پھر چند سطروں کے بعد اپنے ایک شیخ سے بسند متصل روایت حدیث کرتے ہیں۔

اخبرنا به الشیخ الامام الاجل الزاهد برهان الدین ابوالحسن علی بن الحسن (و الحسین) بن عبد الله العزنوی (و الغزنوی) رحمه الله قراءة علیه ببغداد سنة خمس واربعین وخمسمائة قال "الخ، شیخ ابوالحسن غزنوی سے صاحب ہدایہ کے بغداد میں ۵۴۵ھ میں استفادہ اور تلمذ کا علم، ان کی اسی تحریر سے ہوتا ہے، عبدالقادر قرشی نے علامہ مرغینانی کے سفر حج ۵۴۴ھ کا ذکر کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ ہمدان سے ہوتے ہوئے، اپنے وطن کی طرف مراجعت فرمائی، یہ واپسی یقینی طور پر بغداد کی راہ سے ہوئی، جہاں انھوں نے شیخ غزنوی سے ۵۴۵ھ میں استفادہ کیا۔

علامہ مرغینانی لکھتے ہیں، "وقد ذکر فی المختصر" (ورق ۹۰ الف) یہ اشارہ غالباً ہدایہ کے متن البدایہ کی جانب ہے، وہ البدایہ کی طرح کتاب الفرائض بھی التجنیس والمزاید سے پہلے ہی لکھ چکے تھے، چنانچہ اسی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ذکرناها فی کتاب الفرائض" ورق ۱۶۶ ب (اس مسئلہ کا ہم نے کتاب الفرائض میں ذکر کر دیا ہے،) انھوں نے ایک جگہ اپنی ایک اور تصنیف شرح کتاب الحیطان کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں کہ

یہ وہ مسائل ہیں جن کو ہم نے کامل تفصیل کے ساتھ شرح کتاب الحیطان میں ذکر کیا ہے

(ورق ۱۶۶ ب)

علامہ مرغینانی نے جس کتاب کی شرح لکھی ہے، یعنی کتاب الحیطان، اس کے بارے میں حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ وہ "شیخ مرجی ثقفی حنفی کی تالیف ہے، چونکہ بقول ایک شارح (الرشید) باغات، راستوں، وادیوں اور ندی نالوں کے مسائل کا شمار فقہ کے دشوار اور پیچیدہ مسائل میں ہوتا ہے، اور اس موضوع پر یہی ایک کتاب لکھی گئی تھی، اس لئے قاضی القضاۃ ابوعبداللہ . . . . . دامغانی وغیرہ نے اس کی شرحیں لکھیں" [۱]

---

[۱] کشف الظنون نمبر ۱۴۱۴

مذکورہ بالا وضاحت حاجی خلیفہ کی طرف سے کی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب ہدایہ کی کتاب شرح کتاب الحیطان ان کی نظر سے نہیں گذری، اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی اس شرح کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ خود علامہ مرغینانی کی اپنی کتاب "التجنیس" میں اس کا ذکر موجود ہے۔

کتاب التجنیس کی تالیف کا آغاز، دراصل صاحب ہدایہ کے استاذ الصدر الامام الاجل الاستاذ الشہید حسام الدینؒ نے کیا تھا، ان کے بعد، صاحب ہدایہ نے ترتیب و اضافہ کے ذریعہ اسکی تکمیل کی ہے،[1] اور ابتداء میں اپنے ماخذ کا بھی ذکر کر دیا ہے، جو یہ ہیں :۔

"فقیہ ابو اللیث کی النوازل اور عیون المسائل، ابو العباس ناطفی کی الواقعات امام ابو بکر بن الفضل کی فتاویٰ، ناطفی کی اجناس، امام ابو شجاع کی غریب الروایہ شیخ نجم الدین عمر نسفی کے فتاویٰ، مبسوط کی مختلف شرحیں، شیخ حسام الدین صدر شہید کی فتاویٰ صغریٰ"۔۔۔۔ لیکن انکے علاوہ صاحب ہدایہ کے پیش نظر اور کتابیں بھی تھیں جن کا ذکر کتاب کے مختلف مباحث میں جابجا کیا گیا ہے۔

کتاب التجنیس فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق ہے، مگر اس کا آغاز باب العلم سے کیا گیا ہے، اس کے بعد مختلف موضوعات کے لحاظ سے کتاب ۹۲ حصوں میں تقسیم ہے، اور ان کے ذیل میں دیگر مباحث اور جزئیات کو باب اور فصل کے زیر عنوان بیان کیا گیا ہے، موضوعات کے لحاظ سے عنوانات کی تقسیم اس طرح ہے۔۔

کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب العتاق، کتاب الایمان، کتاب الحدود، کتاب السیر کتاب السرقہ، کتاب اللقیط، کتاب اللقطہ، کتاب المفقود، کتاب الآبق، کتاب الغصب

---

[1] کتبخانہ رامپور کی فہرست کتب مطبوعہ ۱۹۲۰ء نمبر ۵، میں التجنیس والمزید کا سنہ تالیف ۵۲۵ھ درج کیا گیا ہے،
(دیکھئے فہرست صفحہ ۱۶۴)

کتاب الودیعۃ، کتاب العاریۃ، کتاب الشرکۃ، کتاب الصید، کتاب الذبائح، کتاب الاضحیۃ، کتاب الوقف، کتاب الہبۃ والصدقۃ، کتاب البیوع، کتاب الکفالۃ، کتاب الشفعۃ، کتاب القسمۃ،

مذکورہ بالا موضوعات اور ہدایہ کے مباحث میں ترتیب و تالیف کے انداز اور بحثوں کی نوعیت میں بھی نمایاں فرق ہے، التجنیس کا موضوع صرف اجتہاد اور تخریج یا ترجیح کے مسائل ہیں۔ پیش آمدہ مسائل کے بارے میں حنفی مسلک کے اصول و فروع، اور روایات ائمہ و فقہاء کی روشنی میں رہنمائی اور کسی ایک پہلو کی ترجیح واضح کی گئی ہے۔ ہدایہ کے پیش نظر تمام مسائل کا استقصاء ہے، اکثر فروع اور نظائر و امثال کے ذریعہ ورنہ اصول و کلیات دیکر تاکہ غیر مذکور جزئیات کے سلسلہ میں، ان اصول و کلیات کی روشنی میں حکم کا استخراج اور تعین کیا جاسکے، لیکن کتاب التجنیس نے روایات و اصول کی روشنی میں پیش آنے والے اہم جزئیات ہی سے بحث کی ہے؛ ہدایہ، دیگر فقہی مکاتب فکر (شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ) اور حنفی مسلک کے مسائل اور دلائل پر جامعیت کے ساتھ مکمل بحث کرتی ہے؛ اور کتاب التجنیس نے، فقہ حنفی کے مختلف ائمہ کے آراء و افکار کی روشنی میں جزئی واقعات پر تخریج اور ترجیح آراء کی حد تک اپنے مباحث کو محدود رکھا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ۔

> یہ کتاب انہی جزئیات کی تشریح کے لئے ہے، جن کو متاخرین نے مستنبط کیا ہے اور متقدمین نے ان کی وضاحت نہیں کی الا یہ کہ کہیں کوئی شاذ قول ان سے روایت کر لیا گیا ہو۔[1]

بہرحال مذکورہ خصوصیات کی بنا پر، فقہ سے شغف رکھنے والوں اور بالخصوص حنفی مکتب فکر کے فقہاء کے لئے۔ اجتہادی صلاحیت کے استعمال اور تخریج و ترجیح کے اصول کی وضاحت کیلئے

---

[1] کشف الظنون ص ۳۵۲۔ التجنیس کے نسخہ قلمی مملوکہ دارالمصنفین میں یہ عبارت نہیں ہے،

اسطالعہ بڑی اہمیت اور افادیت کا حامل ہوگا۔
بن کے نسخۂ قلمی میں کہیں کہیں کتابت کے اغلاط ہیں، ضرورت ہے، کہ دوسرے
سے اس کا ایک صحیح ترنسخہ تیار کیا جائے۔
ب التجنیس کی آخری سطریں یہ ہیں :۔

لکتاب بحمد اللہ تعالٰی وعونہ وحسن توفیقہ والحمد للہ رب العالمین
لسلام علی سیدنا محمد خاتم الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین
نہ ونعم الوکیل ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم (اس کے بعد کا ٹکڑا
تم کا اضافہ کردہ ہے) والحمد للہ وحدہ وکان الفراغ من وقت الضحی،
الکہ ولمن قرأ فیہ اونقل فیہ ودعا لہ بالمغفرۃ والحمد للہ رب

غ الاسلام برہان الدین مرغینانی کی وہ تصنیف ہے، "جس کے مطالعہ سے علمائے
لف ومسرت میں اضافہ ہوا، اور متاخرین علماء کے لیے اس میں اشتغال وانہماک
۔ کا سبب بنا، ہر دور میں اور سب ہی جگہ، اہل علم نے درس وتدریس کے ذریعہ
ر رکھا، اس لئے کہ وہ دقیق مباحث پر حاوی، اور اہم حقائق کی جامع ہے، مفتی بہ
ل، احکام کے اسرار ومصالح سے آراستہ اور تمام جزئیات کا احاطہ کرنے والی
سائل کے جواب میں تسلی بخش، اصول وقواعد، ابواب وفصول، مسائل ودلائل، ترتیب،
نتخاب اور جملوں کے دروبست کے لحاظ سے قابل قدر، پسندیدہ اور ہر طرح حیرت انگیز
ان ہے"[1] یہی وہ کتاب ہے، جس کی وجہ سے صاحب ہدایہ کو، ان کے شیوخ واقران

[1] شرح ہدایہ ص ۲، ۳ ملخصاً،

ال سبقت اور امتیاز حاصل ہوا۔[۱] اور اپنے عہد تصنیف سے آج تک فقہ حنفی بلکہ قانون
لامی کے ماہرین، فقہا و محدثین کے یہاں، یہ کتاب مقبول اور متداول رہی۔

ت ہدایہ کا سبب | علامہ مرغینانی فرماتے ہیں کہ میں نے بدایۃ المبتدی کی تمہید میں یہ وعدہ کیا تھا
کفایۃ المنتہی" کے نام سے اس کی ایک شرح بھی لکھوں گا، جب یہ وعدہ، ایفاء کی منزل
ـ آیا، اور قریب تھا کہ میں اس سے فارغ ہو جاؤں، کہ اچانک مجھے اس میں اطناب کا
ساس ہوا، اور یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اطناب کی وجہ سے، کفایہ سے لوگ صرف
رہ کرلیں، لہٰذا میں نے قلم کی باگ، ہدایہ کی طرف موڑ دی اھ[۲]

ہدایہ کی شرح کفایہ تو واقعی، گم ہوگئی، حاجی خلیفہ چلپی نے لکھا ہے کہ کہیں دستیاب نہیں[۳]
؛ ہدایہ، اپنے دور اول سے لیکر آج تک مقبول چلی آتی ہے،

از تحریر | شیخ الاسلام مرغینانی نے ہدایہ کی تالیف کا آغاز بروز دوشنبہ بوقت ظہر ذی قعدہ
۵۷۳ھ میں کیا،[۴] اس وقت وہ ۶۲ برس کے تھے، تیرہ سال، ہدایہ کی تالیف میں صرف ہوئے،[۵]
لف نے اس دوران میں روزہ کا التزام کیا، کوشش کرتے کہ کسی کو ان کے روزہ کی خبر نہ ہو،[۶] خادم
ا لاکر رکھ جاتا، اور شیخ الاسلام اس کے جانے کے بعد کسی طالب علم یا مہمان کو کھلا دیتے، خادم
برتن خالی پاتا تو یہ سمجھتا کہ شیخ نے کھانا تناول فرمالیا ہے،[۷]

بولیت | تالیف ہدایہ کے زمانہ میں، تیرہ برس کے اس پُرمشقت اہتمام بلکہ تصنیفی اعتکاف کا
ہی یہ اثر ہے، کہ یہ کتاب نظر اعتبار سے دیکھی گئی، اور اہل علم میں مقبول ہوئی، صاحب کشف
ظنون نے ایک شعر جو ہدایہ کے حق میں زبان زد تھا، یہ نقل کیا ہے کہ

---

۱ الجواہر ج ۱ ص ۳۸۳ ۲ ہدایہ (دیباچہ) ص ۲ ۳ کشف الظنون ۲۰۳۸ ۴ مقدمۃ الہدایہ ص ۳
۵ کشف الظنون نمبر ۲۰۳۲ ۶ ایضاً ۷ مقدمہ ص ۳۔

ان الھدایۃ کالقرآن قد نسخت ماصنفوا قبلھا فی الشرع من کتب

فاحفظ قواعدھا واسلک مسالکھا یسلم مقالک من زیغ ومن کذب[1]

۱۔ ہدایہ کی مثال قرآن جیسی ہے، کہ جس نے شریعت کی سابقہ کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے،

۲۔ اس لئے اس کے اصول و قواعد کو یاد کر لو اسی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلو اس طرح تمہاری بات غلطی اور کجی سے محفوظ رہے گی۔

اور امام عماد الدین بن شیخ الاسلام مرغینانی، ہدایہ کے بارے میں یہ فرماتے ہیں:۔

کتاب الھدایۃ یھدی الھدی الی حافظیہ ویجلو العمی

فلازمہ واحفظہ یاذا الحجی فمن نالہ نال اقصی المنی[2]

۱۔ کتاب ہدایہ اس کے یاد کرنے والوں کی رہنمائی کرتی ہے، اور تاریکی کو دور کرتی ہے۔

۲۔ پس اے عقلمند اسے مضبوطی سے پکڑ اور اس کو یاد کرلے اس لئے کہ جس نے اسے پالیا اس نے گویا، اپنی سب بڑی تمنا پوری کرلی۔

حفظ ہدایہ | ابتدائے اسلام میں احادیث نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) کے حفظ کا دستور عام تھا، بعد میں فقہی کتابوں کے حفظ کا بھی رواج ہو گیا، چنانچہ قدوری اور مبسوط کے حفظ کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں[3] ہدایہ کی تالیف کے بعد جب اس نے عالمگیر شہرت پائی تو اہل علم نے اس کو بھی حفظ کیا، چنانچہ ماوراء النہر، خراسان، شام، سوڈان اور ہندوستان میں بہت سے طلبہ اور اہل علم اس کو زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔

حلب (شام) کے فقہاء میں محمد بن حسن حلبی نے اپنے بچپن ہی میں ہدایہ کو حفظ کر لیا تھا، وہ ایک بار کسی محفل میں علامہ ابوحفص عمر بن الوردی کے سامنے پیش کئے گئے، اور لوگوں نے انکی

---

[1] کشف ۲۰۳۲ [2] مقدمہ ص ۲ [3] الجواہر ج ۱ ص ۹۳، ۲۰۳۔

حیرت انگیز یادداشت کا مشاہدہ کیا، اس موقع پر علامہ ابن الاہدل نے درج ذیل سند لکھ دی تھی۔

فاضل لبیب شمس الدین محمد بن حسن حنفی نے میرے سامنے ہدایہ کے مختلف حصے اول و آخر اور درمیان سے زبانی پڑھکر سنائے وہ بڑی روانی، صفائی، اور حسن ادا کے ساتھ پڑھ رہے تھے، وہ بڑی عجیب اور حیرت انگیز صلاحیتوں کے حامل نظر آئے، جوان جیسا ہے اس پر ظلم و زیادتی کا امکان نہیں، اللہ انھیں کتاب کے مندرجات پر علم و عمل کی توفیق دے، محمد بن حسن کے بارے میں کچھ عجب نہیں کہ آئندہ وہ اعیان و اکابر میں شمار کیے جائیں یہ تحریر نصف شعبان ۸۲۲ھ میں لکھی گئی۔[1]

ایک اور فقیہ شیخ ابوالحسن علی بن نوح ابوی جن کا زبید (یمن) میں ۸۰۱ھ میں انتقال ہوا ہے، سوڈان کے رہنے والے اور مؤلف نصب الرایہ امام زیلعی کے شاگرد ہیں ان کے بارے میں بھی یہ تصریح ملتی ہے کہ

وہ اپنی یادداشت کی مدد سے کتاب ہدایہ زبانی سنادیا کرتے تھے۔[1]

شیخ عثمان بن داؤد ملتانی (م ۷۳۶ھ گجرات) خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے اجل خلفاء میں تھے، محمد تغلق شاہ نے جب دولت آباد منتقلی کا فیصلہ کیا تو انھوں نے دہلی سے منتقل ہوکر، گجرات میں سکونت اختیار کرلی، فقہ، اصول اور تصوف کے بڑے زبردست عالم تھے، ہدایہ اور اصول بزدوی وغیرہ انھیں حفظ تھیں۔[2]

ہدایہ سے یہ تعلق صرف درس و تدریس کا شغل رکھنے والے علماء ہی کو نہ تھا، بلکہ سلاطین بھی اس امر خاص میں علماء کے ساتھ شانہ بشانہ نظر آتے ہیں، مسالک الابصار کے مصنف نے لکھا ہو کہ

---

[1] الجواہر المضیئہ کتاب العقود اللؤلؤیہ ج ۲ ص ۸۵۔ مولفہ شیخ علی بن الحسن خزرجی مطبوعہ مصر ۱۹۱۳ء۔

[2] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۷۶۔ بحوالہ گلزار ابرار۔

سلطان محمد تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) کلام پاک اور ہدایہ کا حافظ تھا۔[1]

ہندوستان اور ہدایہ | شیخ برہان الدین بلخی (م ۶۸۶ھ) دہلی، سلطان غیاث الدین بلبن کے اکابر علماء و فضلاء میں تھے، سلطان ہر جمعہ کو بعد نماز ان کی خدمت میں حاضری دیتا اور دیر تک ان کے پاس بیٹھتا۔[2] وہ فقہ حنفی کے امام متقی اور کامل الفن استاد تھے، انھوں نے اپنے بچپن میں علامہ مرغینانی کا دیدار کیا تھا، اور علامہ نے ان کے متعلق اپنی فراست ایمانی سے چند باتیں بھی ارشاد فرمائی تھیں،[3] جن کی تفصیل اسی مقالہ میں گزر چکی ہے۔

فقہ و حدیث و لغت کے مشہور امام، حسن بن محمد صغانی لاہوری (مؤلف مشارق الانوار) کے بارے میں علامہ ذہبی نے اپنی کتاب تاریخ الاسلام میں یہ تصریح کی ہے کہ ان کو صاحب ہدایہ کے فرزند شیخ الاسلام عمر بن علی مرغینانی سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔[4]

شیخ وجیہ الدین پائلی، دہلی کے ائمۂ فن میں شمار ہوتے تھے، انھوں نے نوسوجی سے، نوسوجی نے حمید الدین الضریر سے، انھوں نے کردری سے اور کردری نے براہ راست علامہ مرغینانی سے حصول علم کیا تھا۔[5]

شیخ وجیہ الدین کے ایک شاگرد، سراج الدین عمر بن اسحاق بن احمد ابو حفص تھے، ان سے الجواہر المضیۃ کے مؤلف الامام المحدث عبد القادر محمد قرشی مصری (م ۷۷۵ھ) کو بھی تلمذ کی نسبت حاصل تھی،[6] جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندرون ملک ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بیرون ہند،

---

[1] عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک ص ۲۰۲ نیز دیکھئے پروفیسر ایشوری پرشاد کی کتاب History of the Qaraunah Turks in India-P311/1 [2] تذکرہ علمائے ہند (ترجمہ محمد ایوب قادری)، صفحہ ۱۳۰ [3] فوائد الفواد (فارسی) صفحہ ۳۰۸، ۳۲۴، [4] دیکھئے تاج العروس مادہ صغن اور ماہنامہ معارف ج ۳۶ صفحہ ۱۱۲۹ [5] الجواہر ج ۲ ص ۲۰۲ - [6] ایضاً ج ۲ ص ۲۰۲۔

مصر جیسے مرکز علم میں بھی فقہ اور خصوصاً ہدایہ جیسی کتاب کی اشاعت کا ایک ذریعہ ہندوستان ہی تھا سراج الدین عمر بن اسحاق غزنوی ہندی ملک کے تلمذ ہدایہ کی سند یہ ہے، ابوالقاسم تونجی، عن حمید الدین الضریر، عن الکردری، عن صاحب الہدایہ[1]

"الامام العلامہ" رکن الدین بدایونی بھی ہدایہ کی تدریس میں خصوصی شہرت رکھتے تھے۔ شیخ وجیہ الدین پائلی کی طرح ان کو بھی امام نوسوجی، حمید الدین ضریر کردری کے صرف تین واسطوں سے صاحب ہدایہ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا[2]

سرزمین ہند کو علامہ مرغینانی سے ایک اور نسبت بھی حاصل ہے، اور وہ یہ کہ علامہ قاضی عبدالسمیع حنفی اندجانی جو فلسفہ وحکمت کے مشہور علما میں تھے، مولانا احمد چند سے تعلیم حاصل کی اور مغل بادشاہ اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آئے تو بادشاہ نے ان کو قضاء اکبر کے منصب پر فائز کیا، وہ ہدایہ کے مؤلف علامہ مرغینانی کی نسل سے تھے، اور شرح مواقف، شرح مطالع اور ان کے حواشی کی تدریس میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے تھے[3]

درس ہدایہ کا ایک عجیب واقعہ

شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے یہاں مختلف علوم وفنون کے ماہرین یکجا ہوتے ان میں ایک مولانا فخرالدین زرادی بھی تھے، خواجہ میر خورد (سیرالاولیاء کے مؤلف جنھوں نے اپنی اس کتاب میں سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے حالات وواقعات درج کیے ہیں،) کے والد نے خانقاہ سے متعلق ایک مدرسہ قائم کر دیا تھا[4] خواجہ میر خورد کہتے ہیں کہ چاشت کی نماز کے بعد مولینا فخرالدین ہدایہ کا درس دیا کرتے تھے،

ایک دن عالم ربانی مولنا کمال الدین سامانی جو مشاہیر علماء میں تھے، سلطان المشائخ کی زیارت کو

---

[1] الجواہر ج ۲ ص ۳۱۲ [2] ایضاً ص ۲۹۶ [3] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۰۹، بحوالہ ہفت اقلیم مولفہ امین بن احمد رازی، [4] سیرالاولیاء ص ۲۰۸۔

تشریف لائے وہاں سے جب واپس ہوئے تو اس تعلق کی وجہ سے جو انھیں مولنا فخر الدین سے تھا،
اس مجلس میں حاضر ہوئے، (سیر الاولیاء ص ۲۶۸)

یہ مولنا کمال الدین غالباً کوئی غیر حنفی عالم تھے، ان کی آمد پر مولنا فخر الدین نے ہدایہ پڑھانے کا طریقہ بدل دیا، میر خورد لکھتے ہیں کہ جب انھوں نے مولنا کمال الدین کو دیکھا تو

چون خدمت مولانا کمال الدین دید	جب انھوں نے مولنا کمال الدین کو
احادیث تمسکات ہدایہ را ترک دادہ۔	دیکھا تو احادیث ہدایہ سے استدلال ترک
(سیر الاولیاء، ص ۲۶۹)	کر دیا۔

یعنی حنفی مسلک کی تائید میں صاحب ہدایہ جن حدیثوں کو عموماً پیش کرتے ہیں مولنا فخر الدین ان حدیثوں سے استدلال ترک فرما کر اور ہدایہ کی حدیثوں کو چھوڑ کر صحیحین کی حدیثوں سے استدلال فرمانے لگے۔

ہدایہ کی جن حدیثوں کے نیچے ارباب حاشیہ "غریب جدا" "نادر جداً" کے الفاظ لکھ دیا کرتے ہیں، یہ غرابت و ندرت صرف لفظ کی حد تک ہے ورنہ اگر الفاظ سے قطع نظر کر لیا جائے تو انہی حدیثوں کے مفہوم اور مفاد کو اکثر و بیشتر صحاح کی حدیثوں کے الفاظ سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔[1]

ہدایہ کے ماخذ و مصادر علمائے متقدمین کے یہاں، اپنے ماخذ کا حوالہ دیتے وقت بالعموم تصنیفات کے بجائے ان کے مصنفین کے ناموں کے ذکر کرنے کا رواج تھا، اس سلسلہ میں جن فقہاء و محدثین، کے حوالے، ہدایہ میں مصادر اور ماخذ کے طور پر مذکور ہیں، ان میں سرفہرست تو ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) ہیں پھر ابوداؤد و ابن ماجہ سو بقیہ کتب صحاح کے مولفین کے علاوہ ہدایہ میں جن علماء و مولفین سے استفادہ کیا گیا ہے، ان کے نام درج ذیل ہیں،

---

[1] نظام تعلیم و تربیت ج ۱ ص ۱۵۶۔

فقیہ ابوبکر محمد بن فضل کماری بخاری، ابوجعفر بلخی ہندوانی (م ۳۶۲ھ)، ابوحفص الکبیر احمد بن حفص (م ۲۱۷ھ)، قاضی عبدالحمید بن عبدالعزیز (م ۲۹۲ھ)، موسیٰ بن سلیمان جوزجانی (م بعد ۲۰۰ھ)، ابواللیث سمرقندی (م ۳۷۳ھ)، ابومنصور ماتریدی (م ۳۳۳ھ)، قاضی ابن ابی لیلیٰ (م ۱۴۸ھ)، ابن سماعہ (م ۲۳۳ھ)، ابن شبرمہ (م ۱۴۴ھ)، امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ) حسن بن زیاد لؤلؤی شاگرد امام ابوحنیفہ، جنھوں نے ۱۲ ہزار حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، (م ۲۰۴ھ)، ابوبکر احمد بن عمرو شیبانی الخصاف (م ۲۶۱ھ)، خلیل بن احمد فراہیدی ازدی (م ۱۷۰ھ)، خواہر زادہ (م ۴۸۳ھ)، امام زعفرانی الشافعی (م ۲۶۰ھ)، امام زہری (م ۱۲۴ھ)، شمس الائمہ سرخسی (م ۴۹۰ھ)، شمس الائمہ حلوانی (م ۴۴۹ھ)، امام طحاوی (م ۳۲۱ھ)، امام فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی (م ۴۸۲ھ)، امام ابوالحسین احمد بن محمد قدوری (م ۴۲۸ھ)، امام ابوالحسن عبیداللہ کرخی (م ۳۴۰ھ)، امام عبداللہ بن مبارک (م ۱۸۱ھ)، ابن السکیت (م ۲۴۴ھ)، اصمعی (م ۲۱۶ھ)، محمد بن شجاع ثلجی (م ۲۶۶ھ)، معلی بن منصور رازی (م ۲۱۱ھ)، ابوالعباس احمد ناطفی مؤلف الواقعات (م ۴۴۶ھ)،

ہدایہ کی خصوصیات ۱۔ جامعیت اور حسن بیان: مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے تھے کہ ائمہ فقہ کے آثار کی تشریح، حسن بیان، واضح اور فصیح طرز تحریر اور دقیق مباحث کی اطمینان بخش تشریح و ترتیب کے لحاظ سے چاروں فقہی مسالک میں ہدایہ جیسی کوئی دوسری کتاب موجود نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ دریاؤں کی روانی، اس کی موجوں اور لہروں یا کسی چمن زار کی مدح و توصیف، پھولوں اور باغات کے منظر کو دلکش اور خوبصورت انداز میں بیان کرنا کوئی بڑی اور انوکھی بات نہیں، انشا پردازی کا کمال، اور ادب کا جمال تو درحقیقت اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ

پیچیدہ مباحث اور دقیق مسائل کو آسان اور رواں اسلوب میں بیان کر دیا جائے، اور فصاحت و بلاغت کے آداب سے بھی سر مو انحراف نہ کیا جائے، مولانا کشمیری فرماتے تھے کہ مجھ سے ایک صاحب علم نے یہ پوچھا کہ، کیا آپ فتح القدیر جیسی شرح لکھ سکتے ہیں، میں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے کہا کہ "اور ہدایہ جیسی کوئی تصنیف؟" میں نے عرض کیا کہ ہرگز نہیں، میں ہدایہ کی طرح چند سطریں بھی لکھنے پر قادر نہیں"۔[1]

۲۔ قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال۔ صاحب ہدایہ نے مسائل فقہیہ کے لیے سب سے پہلے قرآن شریف کی آیات اور پھر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال کیا ہے، چنانچہ علامہ عینی لکھتے ہیں۔ وہ امکانی حد تک قرآن و حدیث کے نصوص ترک نہیں کرتے۔[2]

یعنی امکانی حد تک اس بات کی جستجو میں رہتے ہیں کہ مسائل کے بارے میں قرآن و حدیث کے نصوص ہی سے استدلال کریں، جب وہاں کوئی نص نہیں ملتی تو جیسا کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت معاذ بن جبلؓ سے گفتگو ہوئی اور آپؐ نے، قرآن و حدیث میں کسی مسئلہ کے بارے میں وضاحت یا رہنمائی نہ پانے کی صورت میں اجتہاد کی راہ بتائی،[3] یہی راہ صاحب ہدایہ بھی دوسرے تمام ائمہ و فقہاء کی طرح اختیار کرتے ہیں، وہ ایسے اجتہادی مسائل میں اصول استنباط اور شریعت کے قواعد کلیہ کو اپنا مستدل بناتے ہیں، اور اس بارے میں، عقلی، لغوی، عرفی دلائل و قرائن سے بھی مدد لیتے ہیں، دراصل ہدایہ کے مباحث کا یہی حصہ علامہ مرغینانی کے مفاخر میں شمار کیا گیا ہے، جس میں وہ حنفی مسلک ہی نہیں بلکہ دیگر فقہی مسلکوں کے مؤلفین کے مقابلہ میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں، اور ان کی علمی، عقلی اور اجتہادی، صلاحیتوں کی آماجگاہ یہی مباحث ہیں، انھوں نے جس کثرت اور التزام کے ساتھ ہر ایک

---

[1] مقدمہ نصب الرایہ ص ۱۲ ملخصاً، [2] البنایہ ج ۱ ص ۳ [3] مشکوٰۃ باب العمل فی القضاء و الخوف،

مسلک کی [illegible] [illegible] اور حنفی مسلک کی مستدل احادیث پیش کی ہیں، ان کی [illegible]
صحیح بخاری کی طرح ہدایہ بھی فقہ حدیث کا ایک قیمتی ماخذ بن گئی ہے، اور ذوق اجتہاد اور طریق استنباط
کے تعارف میں ان کے اس طریق کار سے بڑی مدد ملتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب نے صرف
رجال فقہ ہی کو نہیں بلکہ محدثین کبار کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے،

احادیث ہدایہ کی تخریج | اکابر محدثین ابتدائے عہد تالیف ہدایہ سے ہی، ہدایہ کی پیش کردہ روایات
پر اپنی صلاحیتیں صرف کرتے رہے ہیں، چنانچہ ہدایہ کی بیان کردہ روایات و احادیث کی تخریج
کے سلسلہ میں خاص طور پر درج ذیل کوششیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ شیخ محی الدین عبد القادر قرشی مصری نے ہدایہ کی احادیث کی تخریج کی اور العنایہ کی
کے نام سے ۷۷۶ھ میں ایک مستقل کتاب لکھی[1] اس کے علاوہ اور امام الہند کے نام سے بھی [illegible] نے ایک کتاب تصنیف کی

۲۔ شیخ علاء الدین علی بن عثمان (معروف بہ ابن الترکمانی ماردینی م ۷۵۰ھ) نے دو جلدوں میں الکفایۃ فی تخریج احادیث الہدایہ تالیف فرمائی۔[2]

۳۔ امام جمال الدین یوسف زیلعی (م ۷۶۲ھ) نے دو جلدوں میں نصب الرایۃ لاحادیث الہدایہ مرتب کی۔

۴۔ امام زیلعی کی نصب الرایہ کی تلخیص، حافظ حدیث علامہ احمد بن علی ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے الدرایۃ فی منتخب احادیث الہدایۃ کے نام سے لکھی جس میں وہ لکھتے ہیں کہ
امام زیلعی نے، صاحب ہدایہ کی بیان کردہ تمام ہی احادیث و آثار کا احاطہ کر لیا ہے، پھر ہر باب
میں مخالفین کے دلائل بھی ذکر کر دیئے ہیں، وہ بہت زیادہ انصاف پسند شخص ہیں، جو کچھ انھیں،
دستیاب ہوا، بے تکلف بیان کر دیا، اسی لئے ان کی کتاب توجہ خاص کا مرکز بن گئی۔[3]

---

[1] کشف الظنون نمبر ۲۰۳۴، تاج التراجم ص ۲۰۰ [2] الاعلام ج ۴ ص ۳۶۵ [3] کشف الظنون نمبر ۲۰۳۵ [4] ایضاً نمبر ۲۰۳۶

۵۔ ابوالعباس سروجی نے "الغایہ فی شرح الہدایہ" میں اور (مصر کے قاضی القضاۃ) ابوحفص عمر بن اسحاق غزنوی نے "توشیح الہدایہ" میں بھی احادیث ہدایہ کی تخریج کا التزام کیا ہے۔[۱]

۶۔ شیخ قاسم بن قطلوبغا نے جو علامہ ابن حجر عسقلانی کے معروف اور مایۂ ناز شاگرد ہیں۔ "مُنیۃ الالمعی فیما فات من تخریج احادیث الھدایہ" لکھی لیکن اس کتاب کا کامل نسخہ دستیاب نہیں، شیخ زاہد کوثری نے ۱۹۵۰ء میں مصر سے جو ناتمام نسخہ شائع کیا ہے وہ کتاب الطہارۃ سے کتاب الوصیۃ تک ہے، اور آخر میں ضمیمہ کے طور پر شیخ قاسم بن قطلوبغا کے وہ حواشی بھی شائع کر دیئے ہیں جو انھوں نے "الدرایۃ" کے ایک نسخہ پر بطور استدراک جابجا اپنے قلم سے تحریر فرمائے تھے، یہ الدرایہ جلد اول کا نسخہ ہے، جو محدث شہیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی تلاش اور اور توجہ کے نتیجہ میں سامنے آیا، اندازہ یہ ہے کہ اسی طرح کے حواشی الدرایہ حصۂ دوم پر بھی تحریر کیئے ہوں گے مگر اس کے بارے میں کسی قسم کی کوئی اطلاع نہیں، حصۂ اول کے حواشی میں ۲۹ احادیث کی نشاندہی اور ان پر بحث کی گئی ہے،

ہدایہ کی بعض روایات میں غرابت | ہدایہ میں کچھ ایسی روایات بھی ہیں، جن کے بارے میں امام زیلعی اور علامہ ابن حجر عسقلانی نے "غریب" ہونے کی صراحت کی ہے، لیکن کسی روایت کے غریب ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب وہ روایت ناقابل اعتبار یا ضعیف قرار پاگئی ہو۔ اور اس سے مسائل و احکام میں استدلال کرنا درست نہ سمجھا جائے، شافعی علماء میں امام رافعی صف اول کے لوگوں میں بلکہ ان میں بھی سرفہرست سمجھے جاتے ہیں، ان کی ذکر کردہ احادیث کی، علامہ ابوحفص عمر بن الملقن نے تخریج کی ہے اور انھوں نے بھی امام رافعی کی مستدل کچھ روایات کو غریب قرار دیا، ہے۔[۲] دراصل ایک روایت غریب ہوتے ہوئے بھی صحیح یا حسن ہوسکتی ہے، اور ایسی صورت میں

۱۔ منیۃ الالمعی ص ۹ ۲۔ ایضاً۔ ص ۶۱۔ تا ۶۲۔

اہل فقہ کے یہاں اس سے استدلال کیا جائے گا۔ علم حدیث کی فنی زبان میں "غریب" ایک اصطلاحی لفظ ہے، جو اردو کے مفہوم میں مستعمل نہیں ہوا، بلکہ حدیث کی سند کے اعتبار سے ایک خاص قسم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، راوی کے حالات اور مزید قرائن کے پیش نظر، ایک غریب روایت مقبول ہو سکتی ہے، اور اس سے استدلال بھی کیا جا سکتا ہے[1]

امام ابو اسحاق نے مہذب میں اور امام الحرمین نے نہایہ میں ضعیف روایات سے بھی استدلال کیا ہے، اور امام بیہقی، امام نووی اور امام منذری نے کئی موقعوں پر اس بات کو تسلیم بھی کیا ہے،[2] احادیث کی وہ قسم جسے موقوف یا مراسیل صحابہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، احناف کے یہاں اسے بھی قیاس پر مقدم سمجھا جاتا ہے، امام مالک کا بھی یہی مسلک ہے[3]، چنانچہ صاحب ہدایہ نے اگر کہیں صحیح و حسن کے علاوہ حدیث کی دوسری اقسام سے استدلال کیا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دیگر ائمۂ احناف کی طرح، ان مختلف اقسام کی موجودگی میں جب کہ صحیح اور حسن روایات نہ ہوں، قیاس کا سہارا نہیں لیتے بلکہ ممکن حد تک احادیث ہی کو اپنا مستدل بناتے ہیں۔

ہدایہ کی بعض روایات کے بارے میں امام زیلعی یا علامہ ابن حجر نے عدم علم یا عدم وجود کی بھی صراحت کی ہے، اس موقع پر یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ ان دونوں حضرات یا ان میں سے کسی ایک نے جن روایتوں کے بارے میں "لا اصل لہ" یا "لم اجدہ" وغیرہ جیسے الفاظ درج کئے ہیں، ان کی ایک بڑی تعداد کی شیخ قاسم بن قطلوبغا نے نشاندہی کی ہے، یا جن روایات کے بارے میں ان حضرات نے غریب ہونے کا دعویٰ کیا ہے، ان کی متابع روایات بھی

---

[1] دیکھئے نزہۃ النظر فی شرح نخبۃ الفکر ص ۹ تا ص ۱۱ نیز تدریب الراوی اور اصول حدیث پر لکھی گئی، دیگر کتابیں [2] مقدمہ شرح النقایہ ص ۱ و ۲ [3] ایضاً

شیخ قاسم نے درج کر دی ہیں، اور بتایا ہے، کہ وہ دوسری اسناد کے ساتھ کہاں اور کن کتابوں میں نقل کی گئی ہیں، چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :۔

۱۔ حدیث "الحنا طیب" حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مجھے نہیں ملی (لم اجدہ) شیخ قاسم نے تبلایا ہے کہ طبرانی کبیر میں یہ روایت موجود ہے، (تعلیقات نمبر ۲ منیۃ الالمعی ص ۱۶)

۲۔ حدیث "ادرؤا الحدود بالشبہات" حافظ کہتے ہیں کہ یہ روایت نہیں ملی، حالانکہ حارثی نے اپنی مسند میں ابن عباسؓ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے، (تعلیقات نمبر ۱ منیہ ص ۶۲)

۳۔ امام زیلعی لکھتے ہیں کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان عند فقد السواک یعالج بالاصبع یہ روایت غریب ہے، حالانکہ مسند احمد نے حضرت علیؓ سے اور طبرانی نے حضرت ابو ایوبؓ سے اسی روایت کو نقل کیا ہے، (المنیۃ ص ۱۱ حدیث نمبر ۵)

۴۔ باب صلوٰۃ الکسوف، پانچویں حدیث کے بارے میں بھی امام زیلعی نے غرابت کا حکم لگایا ہو، لیکن شیخ قاسم لکھتے ہیں کہ محمد بن الحسن نے بھی اس روایت کو کتاب الاصل میں نقل کیا ہے، اس لئے یہ حدیث غریب نہیں ہے، (المنیۃ ص ۳۲)

امام زیلعی کی نصب الرایہ پر شیخ کے استدراکات یا علامہ ابن حجر کی الدرایہ پر ان کے تعلیقات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ برہان الدین مرغینانی کی ہدایہ میں نقل کردہ بعض روایات پر "لا اصل لہ" "لم اجدہ" "یا غریب" اور "فیہ غرابۃ" جیسے الفاظ، صاحب ہدایہ کے بارے میں تنقید کا حرف آخر نہیں ہیں، پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ

" امام مرغینانی نے جو روایات درج کی ہیں ان کا ماخذ، حدیث کی مشہور و متداول کتب کے علاوہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام طحاوی، خصاف، جصاص رازی اور کرخی وغیرہ بھی ہیں، اور یہ وہ ائمہ تھے، جو اپنے سلسلۂ اسناد سے روایات کا ایک

وافر ذخیرہ رکھتے تھے"[1]

صاحب ہدایہ کے مآخذ میں ایک نام امام حسن بن زیادہ اللؤلؤی کا بھی ہے، جو امام
کے شاگرد تھے اور انھوں نے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں بارہ ہزار حدیثیں تھ
یہ اور ایسے ہی دوسرے مصادر بھی صاحب ہدایہ کے پیش نظر تھے چنانچہ صاحب ہدایہ میں فقیہ ا
محدث کی دوگونہ صفات یکجا ہو گئی تھیں، یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے
صاحب ہدایہ نے استدلال کی غرض سے جو روایات درج کی ہیں، ان میں بقدر استدلال حصو ر
انھوں نے اکتفاء کیا ہے، جیسا کہ خود امام بخاریؒ نے بھی، تراجم وابواب کی مناسبت سے احادیث
اجزار ہی جابجا نقل کئے ہیں پھر کہیں کہیں صاحب ہدایہ ایجاز واختصار کی غرض سے روایت بالمعنی سے
لیتے ہیں اور پوری روایت یا اس کے تمام الفاظ کی تلاش وجستجو کا کام، قاری ہدایہ پر چھوڑ دیتے ہیں، لیکن
تفصیلی گفتگو کے بعد، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صاحب ہدایہ نے کہیں کہیں بعض ایسی روایات حدیث
استدلال کیا ہے، جن کے مقابلہ میں ان ہی مسائل کے استدلال کے لیے، موجودہ ذخیرۂ احادیث میں
صحیح روایات موجود ہیں، چنانچہ ہدایہ کے شارحین نے ان روایات کی نشاندہی کی ہے، علامہ عینی۔
اپنی شرح البنایہ کی ایک خصوصیت یہ قرار دی ہے کہ

"اس میں احادیث صحاح کو استدلال کیلئے پیش کیا گیا ہے بعض مجروح روایات جن سے
ہدایہ میں اخذ مسائل کے لیے مدد لی گئی ہے انکی وضاحت کرنے کے ساتھ ہی ثقہ راویوں کی
بیان کردہ روایات کے ذکر کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی ہے"[3]

تسامحات ہدایہ، فقہ کی دوسری کتابوں اور خاص طور پر قدوری کی ترتیب کے مطابق مرتب
لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس میں باب الفرائض (وراثت کی تقسیم سے متعلق مسائل کا باب) نہ

---

[1] منیۃ الالمعی ص ۹ [2] الفوائد البھیۃ ص ۲۰ [3] البنایہ ج ۱ ص ۵،

ممکن ہے صاحب ہدایہ کو سہو ہوگیا ہو یا پھر اس کی اصل وجہ یہ ہو کہ وہ اس سے قبل خاص فرائض ہی کے موضوع پر ایک مستقل کتاب، کتاب الفرائض لکھ چکے تھے، اس لئے انھوں نے ہدایہ میں اس باب سے متعلق گفتگو کرنی مناسب نہ سمجھی ہو، ہدایہ میں دیگر تمام عظیم مصنفین کی کتابوں کی طرح چند تسامحات بھی ہیں، چنانچہ شیخ محی الدین عبدالقادر قرشی حنفی مصری نے اپنی شرح العنایۃ بمعرفۃ احادیث الہدایہ میں، صاحب ہدایہ کے تسامحات کا تفصیل اور التزام کے ساتھ ذکر کیا ہے، الجواہر المضیۃ ج ۲ صفحات ۲۳۸ اور ۲۴۰ میں بھی انھوں نے تسامحات کی تین مثالیں درج کی ہیں، مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے العنایۃ، فتح القدیر، البنایہ وغیرہ مختلف شرحوں کی مدد سے ہدایہ اوّل دوم میں گیارہ اور سوم چہارم میں ۹ غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، نیز مذیلۃ الدرایہ کی فصل المذکورین میں مزید دو کا اضافہ کیا ہے، جس میں ایک مکرر ہے، اس طرح تسامحات کی تعداد ۲۱ ہو جاتی ہے، اس میں چند تو واضح طور پر سہو کتابت کا نتیجہ ہیں، چند میں اسماء رواۃ کی ترتیب بدل گئی ہے، اور چند وہ ہیں، جن میں بعض ائمہ فقہ کی طرف وہ قول منسوب ہو گیا ہے، جس کے وہ کبھی قائل نہیں رہے، چونکہ یہ تسامحات لفظی ہیں یا خالص طالب علمانہ، اس لئے اس مقالہ میں ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

ہدایہ کی شرح و حواشی کشف الظنون نے (۲۰۳۲ سے ۲۰۴۴ تک) ہدایہ کی جن مکمل شرحوں یا اس کے مختلف اجزاء کی شروح اور تعلیقات و حواشی کا ذکر کیا ہے، ہم یہاں صرف ان کے ناموں ہی پر اکتفاء کریں گے، ان کے علاوہ جن مزید شرحوں کا علم ہو سکا ہے جو الجات کے ساتھ وہ بھی درج فہرست کی جا رہی ہیں، تخریج احادیث ہدایہ کے ذیل میں جن کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔

۱۔ النہایہ۔ حسام الدین صغناقی (م ۷۱۰ھ) علامہ سیوطی کی رائے کے مطابق یہ ہدایہ کی سب سے پہلی شرح ہے،

۲۔ الفوائد ۔ حمید الدین علی بن محمد الضریر بخاری (م ۶۶۶ھ) بعض بزرگوں کی رائے کے مطابق ہدایہ کی پہلی شرح یہی ہے۔

۳۔ معراج الدرایۃ الی شرح الہدایہ ۔ قوام الدین محمد بن محمد کاکی بخاری (م ۷۴۹ھ) ۲۱ محرم ۷۱۳ھ میں اس شرح کی تکمیل ہوئی۔

۴۔ غایۃ البیان ونادرۃ الاقران ۔ قوام الدین امیر کاتب الاتقانی (م ۷۵۸ھ)

۵۔ الکفایہ ۔ محمود بن عبید اللہ بن محمود تاج الشریعہ مؤلف الوقایہ،

۶۔ فتح القدیر ۔ کمال الدین محمد بن ہمام (م ۸۶۱ھ) یہ ہدایہ کی سب سے بہتر شرح ہے جسے مؤلف نے کتاب الوکالہ تک تحریر کیا تھا۔

۷۔ تکملہ فتح القدیر ۔ زکریا بن بیرام المفتی (م ۱۰۰۱ھ) مؤلف نے فتح القدیر کے باقی ماندہ حصوں کی ۹۹۴ھ میں تکمیل کی۔

۸۔ نہایۃ ۔ الکفایۃ فی درایۃ الہدایہ ۔ تاج الشریعہ عمر بن صدر الشریعہ الاوّل عبید اللہ المحبوبی

۹۔ الغایہ ۔ قاضی ابو العباس احمد بن السروجی (م ۷۱۰ھ) یہ شرح نامکمل رہ گئی تھی، اور قاضی سعد الدین محمد دیری (م ۸۶۷ھ) نے کتاب الایمان سے کتاب الرد تک شرح لکھ کر اس کی تکمیل کی۔

۱۰۔ شرح ہدایہ ۔ حافظ الدین ابو البرکات عبد بن احمد نسفی (م ۷۱۰ھ)

۱۱۔ ۱۲ ۔ شیخ سراج الدین عمر بن اسحاق غزنوی ہندی (م ۷۷۳ھ) نے دو شرحیں لکھیں۔ شرح کبیر، جس کا نام توشیح ہے، اور شرح صغیر جو چھ جلدوں میں ہے اور بحث و جدل کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

۱۳۔ عنایہ ۔ اکمل الدین محمد بن محمود بابرتی حنفی (م ۷۸۶ھ) مؤلف نے قوام الدین

سکاکی سے ہدایہ کی روایت کی ہے، اور بقول حاجی خلیفہ چلپی، ۲ جلدوں میں اچھی شرح لکھی ہے بلاد روم میں اس کو قدر و اعتبار کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

۱۴۔ شرح۔ علاء الدین علی بن محمد خلاطی (م ۷۰۸ھ)

۱۵۔ شرح۔ علاء الدین علی بن الترکمانی ماردینی (م ۷۵۰ھ) یہ شرح نامکمل رہ گئی تھی، جس کی تکمیل ان کے صاحبزادہ جمال الدین عبداللہ (م ۷۶۹ھ) نے کی۔

۱۶۔ النہایہ[1] قاضی بدرالدین محمود بن احمد عینی (م ۸۵۵ھ) شرح کی تکمیل ۱۰ محرم ۸۲۵ھ میں ہوئی، جب کہ علامہ عینی کی عمر ۶۰ برس کی تھی،

۱۷، ۱۸۔ ابوالمکارم احمد بن حسن تبریزی جاربردی شافعی (م ۷۴۶ھ) اور تاج الدین احمد مصر (م ۷۴۴ھ) نے بھی ہدایہ کی الگ الگ شرحیں لکھیں۔

۱۹۔ ارشاد الہدایہ فی شرح الہدایۃ۔ مصلح الدین مصطفیٰ دوغمش قرمانی (م ۹۰۰ھ)،

۲۰۔ زبدۃ الدرایۃ۔ قاضی عبدالرحیم بن علی آمدی، یہ شرح کچھ کمی بیشی کے ساتھ شرح عینی ہی سے ماخوذ ہے۔

۲۱۔ شرح۔ احمد بن حسن معروف بہ ابن الزرکشی (م ۸۳۰ھ) ابن الشحنہ کے خیال میں یہ شرح، سروجی کی شرح کا اختصار ہے، لیکن قرشی نے لکھا ہے کہ یہ دراصل شرح صغناقی کا انتخاب و تلخیص ہے[2]

۲۲۔ الدرایہ۔ محمد بن مبارک ملقب بہ معین ہروی۔

۲۳۔ شرح۔ ابوالفضل محمد ابن الشحنہ حلبی،

۲۴۔ شرح۔ نجم الدین ابراہیم بن علی طرسوسی حنفی (م ۷۵۸ھ)، پانچ جلدیں۔

---

[1] لیکن خود علامہ عینی نے اپنی شرح کا نام البنایہ فی شرح الہدایہ بتایا ہے دیکھئے البنایہ کا مقدمہ ص ۵ [2] الجواہر ج ۱ ص ۶۴۔

۲۵۔ خلاصۃ النہایہ ۔ قاضی القضاۃ محمود بن احمد بن مسعود قونوی دمشقی معروف بہ ابن السراج نے یہ صغناقی کی شرح ہدایہ کی تلخیص ہے[1]۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ مزید شارحین کے نام یہ ہیں۔

۲۶ تا ۳۱۔ شیخ تقی الدین ابوبکر بن محمد حصنی (م ۸۲۹ھ) شیخ خداداد دہلوی، شیخ تاج الدین ابو محمد احمد بن عبدالقادر حنفی (م ۷۴۹ھ) سید علی بن محمد جرجانی (م ۸۱۶ھ) ابراہیم بن علی دمشقی (م ۷۴۴ھ) عبدالحلیم بن محمد معروف بہ اخی زادہ (م ۱۰۱۳ھ)

نامکمل شرحیں :۔ ۱۔ نہایۃ النہایہ ۔ محب الدین محمد معروف بہ ابن الشحنہ حلبی (م ۸۹۰ھ) فصل الغسل تک پانچ جلدیں ہیں، ۲۔ شرح ہدایہ ۔ شیخ حمید الدین مخلص بہ ابن عبداللہ ہندی دہلوی (م ۷۶۳ھ)[2] کشف الظنون نے المخلص بن عبداللہ نام درج کیا ہے۔

اجزاء ہدایہ کی شرحیں :۔ ہدایہ کے مختلف ابواب کی بھی شرحیں لکھی گئی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے۔

۳۔ دیباچہ ہدایہ کی شرح۔ احمد بن مصطفیٰ معروف بہ طاش کبری زادہ (م ۹۶۸ھ)

۴ تا ۸۔ مولیٰ عطاء اللہ، علی بن قاسم زیتونی، صاری کرز زادہ محمد (م ۹۹۰ھ) قرۃ یعقوب بن ادریس رومی (م ۸۳۲ھ) اور احمد بن سلیمان ابن کمال پاشا (م ۹۴۰ھ) نے کتاب الطہارۃ والزکاۃ والصوم اور کتاب النکاح والبیوع کی شرح لکھی۔

۹۔ شرح کتاب الحج ۔ ابن کمال ۔

۱۰۔ شرح مختصر کتاب البیوع تک، ۔ علی بن محمد معروف بہ مصنفک (م ۸۷۵ھ)

۱۱۔ نہایۃ الامجاد (شرح کتاب الجہاد من الہدایہ) مولیٰ ابو سعود۔

تعلیقات وحواشی :۔ ۱۔ ترغیب اللبیب ۔ ابن کمال، ایک مقالہ کی صورت میں ہے جس میں

---

[1] الجواہر ج ۲ ص ۱۵۶ [2] الثقافۃ الاسلامیہ ص ۱۰۵ ۔

ہدایہ کے مشکل مباحث کی تشریح اور دقیق مضامین کی شرح کی گئی ہے۔

۲۔ حاشیہ۔ جلال الدین عمر بن محمد خبازی تکملۃ الفوائد کے نام سے محمد بن محمد قونوی نے مذکورہ حاشیہ کی تکمیل کی،

اصحاب حواشی کے مزید اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

۳۔ سراج الدین عمر بن علی کنانی معروف بہ قاری ہدایہ (م ۸۲۹ھ)

۴۔ محمد بن علی معروف بہ برکلی (م ۹۸۱ھ)

۵۔ بابازادہ محمد قرمانی (م ۹۹۲ھ) ۶۔ محی الدین محمد بن مصطفیٰ معروف بہ شیخ زادہ (م ۹۵۱ھ)

۷۔ نجم الدین ابو الطاہر اسحاق بن علی حنفی (م ۸۱۱ھ) دو جلد ہیں،

۸۔ السمرقندی الحمیدی نے سلطان محمد فاتح کے لئے نکات الوری کے نام سے مختصر حاشیہ لکھا جو کتاب الوقف تک ہے

۹۔ سیف الدین احمد (م ۹۱۶ھ) نے اوائل ہدایہ پر حاشیہ لکھا ہے، اسکے مؤلف امام سعد الدین تفتازانی کے پوتے ہیں

۱۰۔ محب الدین محمد بن احمد الموعوبہ مولانا زادہ اقسرائی حنفی (م ۸۵۹ھ)

۱۱۔ مصلح الدین مصطفیٰ بن شعبان سروری (م ۹۶۹ھ) احادیث ہدایہ کے بارے میں تفصیلی بحث بھی کی ہے۔

۱۲۔ عبد الرحمٰن بن سیدی علی اماسی (م ۹۸۳ھ) ابتدا میں ترغیب اللبیب کے نام سے ایک مقدمہ بھی ہے۔

۱۳۔ علی متقی بن بالی (م ۹۹۲ھ) یہ حاشیہ صرف کتاب الزکاۃ تک ہے۔

۱۴۔ ابو السعود بن محمد عمادی (م ۹۸۲ھ) صرف کتاب البیع پر حاشیہ ہے۔

ہدایہ کی تجرید و اختصار | مسائل ہدایہ کو اسکے عقلی و نقلی دلائل و مباحث سے الگ کرکے علیحدہ یکجا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے، اس سلسلہ میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ یہ ہیں،

۱۔ الکفایہ۔ ابن الترکمانی ماردینی (م ۷۵۰ھ) یہ غالباً ہدایہ کا اولین اختصار ہے۔

۲۔ سلالۃ الہدایہ۔ ابراہیم بن احمد موصلی، اس اختصار کا زمانہ تصنیف ۷۵۰ھ کے بعد ہے۔

۳۔ الرعایہ فی تحریر مسائل الہدایہ۔ ابو الملیح محمد بن عثمان معروف بہ ابن اقرب (م ۷۷۳ھ)

۴۔ عمدۃ اصحاب الہدایۃ والنہایۃ فی تجرید مسائل الہدایہ۔ کمال الدین محمد بن احمد، ایک جلد ہے۔ مؤلف نے جمادی الآخرۃ ۱۰۲۴ھ میں اس کتاب کی تکمیل کی۔

۵-۶- خلاصۃ النہایۃ فی فوائد الہدایہ۔ اور۔ التکملۃ من فوائد الہدایہ[1] دونوں کتابیں ایک ایک جلد میں ہیں مولفہ قاضی القضاۃ محمود بن احمد قونوی دمشقی معروف بہ ابن السراج۔

۷- مختصر الہدایہ[2] - شاہ اہل اللہ برادر شاہ ولی اللہ دہلوی۔

۸- تطہیر الاموال معروف بہ عطر ہدایہ شیخ محمد لکھنوی، معاملات خصوصاً مالی امور کے مباحث اور اس سلسلہ میں ہدایہ کی بحثوں کی تشریح و تسہیل کی گئی ہے، نیز عرف اور زمانہ کی تبدیلی سے اجتہادی امور میں جو تغیر ہوا ہے، اسکی تشریح کی ہے۔

قدوری پر ہدایہ کے زوائد | علامہ مرغینانی نے صراحت کی ہے کہ ہدایہ کا متن بنیادی طور پر قدوری سے ماخوذ ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہدایہ میں قدوری سے زیادہ مسائل اور جزئیات پائے جاتے ہیں چنانچہ جو مسائل اور جزئیات جن کا قدوری پر اضافہ کیا گیا ہے، شیخ نور الدین علی بن نصر (م ۶۹۰ھ) نے ان کو ایک جلد میں یکجا کر دیا۔

ہندوستان میں ہدایہ کے حواشی اور ترجمے | ہندوستان میں ہدایہ کی مستقل شرحوں کے علاوہ جن کا ذکر کیا جا چکا ہے حواشی بھی لکھے گئے ہیں، ہم ذیل کی سطروں میں ان علماء کی ایک فہرست[3] درج کرتے ہیں، جنھوں نے ہدایہ پر اپنے اپنے زمانہ میں حواشی لکھے۔

(۱) شیخ حسین خیاپوری بن عمر بریلوی (م ۹۰۵ھ) (۲) مخدوم سید اشرف سمنانی کچھوچھوی (م ۸۰۸ھ) (۳) شیخ الہ داد جونپوری، (۴) شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (۵) مفتی عبد السلام اعظمی دیوی، (۶) شیخ محمد نعیم جونپوری (۷) شیخ پیر محمد جونپوری لکھنوی (۸) شیخ ولی اللہ لکھنوی (۹) شیخ عبد الحکیم لکھنوی، (۱۰) مولانا عبد الحلیم لکھنوی (۱۱) سید عبد اللہ حسینی بلگرامی بن آل احمد (کتاب البیوع سے کتاب الشفعہ تک) (۱۲) مولانا عبد الحی فرنگی محلی لکھنوی، (۱۳) مولوی محمد حسن سنبھلی۔

ترجمے | مذکورۂ بالا حواشی کے علاوہ ہندوستان میں ہدایہ کے دو فارسی ترجمے بھی ہوئے ہیں، ایک ترجمہ شیخ عبد الحق سرہندی نے کیا تھا، اور دوسرا ترجمہ قاضی غلام یحییٰ بہاری نے (کسی انگریز افسر کی ایما پر کیا تھا) اور بعد میں شیخ محمد راشد بردوانی نے اس ترجمہ کی تصحیح کی اور اس کو دوبارہ مرتب کیا[4]۔

مولانا سید امیر علی لکھنوی (ملیح آبادی) سابق مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ہدایہ کا ایک اردو ترجمہ، نولکشور پریس سے پہلی بار شائع ہوا تھا، اسکے مقدمہ میں مولانا نے فقہ و اصول فقہ کے علاوہ، ہدایہ فہمی کے چند بنیادی اصول بھی بڑی وضاحت سے بیان کر دیے ہیں۔

---

[1] الجواہر ج ۲ ص ۱۵۰ [2] الثقافۃ الاسلامیہ ص ۱۱۲ [3] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۱۲ [4] ایضاً ص ۱۰۶

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

از

جناب شمس بدایونی صاحب، بدایوں

ڈاکٹر محمد ایوب قادری سے میری دیرینہ ملاقات تھی، جب جب کراچی جانے کا موقع ملا، وہ بہت ہی عزیزانہ طور پر ملے، ہر ملاقات میں پہلے سے زیادہ اپنی ملنساری، شرافت طبع، عجز اور انکسار کا ثبوت دیتے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہوئے، جیسا کہ حسب ذیل مضمون سے ظاہر ہوگا، انکے قلم میں بڑی برق وشی تھی، کسی کتاب کو لکھنا یا ترجمہ کرنا شروع کرتے تو بڑی کم مدت میں یہ کام ختم کر دیتے، وہ جس بلند مرتبہ کے مصنف تھے اپنے عجز وانکساری کی بدولت اس سے اپنے کو کم ہی ظاہر کرتے، وہ اپنی ہر کتاب دارالمصنفین ضرور بھیجتے اور اس کو یہ راقم شوق سے پڑھتا، جب انھوں نے کراچی کے قیام میں شاہنواز خاں کی تصنیف مآثر الامراء کی تین جلدوں کے ترجمے ہدیہ کیے، تو یہ تینوں جلدیں میری میز پر برابر رہیں، اور جب کبھی ان میں سے کسی اقتباس کو اصل فارسی سے ملایا، تو انکو ہر طرح صحیح، سلیس اور فصیح پایا، اس سے ترجمہ کرنے میں ان کی مہارت اور قدرت کا معترف ہوا، جب وہ طبقات اکبری کا ترجمہ کر رہے تھے تو ان سے یہ گفتگو آئی کہ اکبرنامہ کا ترجمہ ایک انگریز نے انگریزی میں کر دیا ہے، لیکن یہ بڑی ندامت اور شرم کی بات ہے کہ کتاب تک اس کا اردو میں ترجمہ نہیں ہو سکا، گو یہ بہت مشکل کام ہے، لیکن جب اس کا

ترجمہ انگریزی میں ہو سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو میں نہ ہو سکے، جناب ایوب قادری صاحب نے کہا کہ طبقات اکبری کے ترجمہ کے بعد انشاء اللہ اکبر نامہ کی جلدوں کا ترجمہ کر کے لوگوں کی ندامت کو دور کر دوں گا، اس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی مگر گذشتہ نومبر میں میرے قیام کراچی ہی میں ان کی المناک وفات ہوئی، وفات سے ایک روز پہلے ان کا ٹیلی فون آیا کہ ہم ان کے ساتھ رات کو کھانا کھائیں، جس روز یہ دعوت ملنے تھی، اسی روز خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے، اس عظیم سانحہ سے بڑا دکھ ہوا، پاکستان کے تمام اخباروں میں ان کا بڑا ماتم ہوا، تمام مشاہیر کے تعزیتی بیانات شائع ہوتے، ان پر اخباروں میں اچھے اچھے مضامین بھی لکھے گیے، جس سے پتہ چلا کہ وہ اپنے علمی رتبہ کی وجہ سے وہاں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ان سے جو علمی تعلقات تھے اس بنا پر برابر خیال رہا کہ ان پر ایک طویل مضمون لکھوں، لیکن اپنی مشغولیت کی وجہ سے یہ حق ادا نہ کر سکا، جس کا بڑا افسوس ہے، لیکن وہ برابر یاد آتے ہیں اور اکثر یاد آتے رہیں گے، ان کے چھوٹے بھائی جناب نعمت اللہ قادری عرف ابو معاویہ صاحب کو بھی دار المصنفین سے بڑا قلبی لگاؤ رہا، انھوں نے تو اس کی زیارت کرنے کے لیے یہاں آنے کی زحمت بھی گوارا کی، وہ اس کی مطبوعات کے بڑے قدردان تھے، اور اسکی اشاعت کیلئے برابر فکرمند رہتے، ان کی وفات بھی سڑک ہی پر ہوئی، موٹر سائیکل کے حادثہ میں وہ جان بحق ہوئے، دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں بھائیوں کو اپنی بے پایاں رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز کرے، آمین! "ص ۔ ع"

ہند و پاک میں مستند علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، اور اس قلیل تعداد میں بھی ہر ایک عالم و محقق پر تکیہ نہیں کر سکتے، بلکہ ان میں بھی بعض اعلیٰ اور بعض اعلیٰ تر ہیں، انہی

ہستیوں میں ایک نام ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا بھی ہے، جو ۲۵ر نومبر ۱۹۸۳ء سے مرحوم کے اضافہ کے ساتھ لکھا اور بولا جانے لگا ہے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا نام اردو دنیا میں ایک ممتاز محقق، مولف اور مترجم کی حیثیت سے متعارف ہے، انہوں نے بعض ایسے علمی موضوعات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جو ارباب علم نظر انداز کیے ہوئے تھے، اور بعض ایسی کتابوں کو اردو دنیا سے متعارف کرایا جو نادر و کمیاب تھیں۔

قادری مرحوم کا موضوع تاریخ، سوانح، ادب، فن اسماء الرجال اور حوالہ جاتی ادب تھا، اس میں وہ شبلی اسکول سے بڑی حد تک قریب نظر آتے ہیں، ان موضوعات کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، ان پر وہی قلم اٹھائیگا جس نے خود کو علم و ادب کے لیے وقف کر دیا ہو، یا تلاش و جستجو جس کا مزاج ہو، اور جس کی زندگی کا مقصد و مدعا بھی محض علم و ادب کی خدمت ہو، مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

"قادری صاحب گزشتہ ربع صدی سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں، ان کی علمی لگن کو دیکھ کر دہ علمائے سلف یاد آجاتے ہیں، جنھوں نے ہر طرح کی آسائشوں سے بے نیاز ہو کر خدمت علم ہی کو اپنا اصل کام سمجھا، قادری صاحب سے میرے مراسم تقریباً چھبیس ۲۶ برسوں سے ہیں، میں نے اس دوران میں انہیں علمی و ادبی موضوعات کے علاوہ کبھی کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا، وہ جب بھی ملے کسی نہ کسی علمی کام کی لگن میں سرشار ملے، کبھی کسی قدیم مطبوعہ کتاب کا ذکر ہے، تو کبھی کسی مخطوطے کا، کبھی کسی گمنام مصنف کے حالات کی تلاش ہے، تو کبھی کسی معروف مصنف کے کم معروف پہلو پر روشنی ڈالی جا رہی ہے، خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے کہ ان سے مل کر یہ خوشی ہوتی ہے کہ ہمارا معاشرہ ان "دیوانوں" سے ابھی خالی نہیں ہوا، جو ہمیشہ "بکار علم" ہشیار رہتے ہیں۔" (مشفق خواجہ، دیباچہ کاروان رفتہ، کراچی ۱۹۸۳ء)

[illegible]

[illegible] ... کی

مستند گر غیر معروف [illegible] موضوعات

کیے جاسکتے ہیں، اس ضمن میں انھوں نے کثیر سرمایہ چھوڑا ہے،

قصبہ آنولہ ضلع بریلی کا ایک تاریخی قصبہ ہے، بجز قنوج کے اس کی تاریخی قدامت کی ہمسری اتر پردیش کا کوئی شہر نہیں کرسکتا، یہ حکومت روہیلہ کا پہلا دارالحکومت تھا، اور اس حکومت کے پہلے فرماں روا نواب علی محمد خاں (ف ۱۱۶۱ھ) تھے، ان کی وفات کے بعد حافظ رحمت خاں ان کے جانشین ہوئے، جنھوں نے بریلی میں سکونت اختیار کرلی، نواب علی محمد خاں اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ابتدائی عہد میں روہیل کھنڈ کا صدر مقام آنولہ ہی رہا، اور اس دور میں یہاں غیر معمولی ترقی ہوئی، مولوی حکیم عبدالغفور لکھتے ہیں:

"روہیلوں کے زمانے میں شہر آنولہ علماء، فضلاء، شعراء، حکماء، اور اہل اللہ کا مرکز بن گیا، نواب علی محمد خاں کے فرزند نواب محمد یار خاں امیر کے دربار سے قدرت اللہ شوق، مصحفی، قائم چاندپوری اور فدوی لاہوری، جیسے مشاہیر شعراء وابستہ تھے، مصحفی نے آنولہ کی یاد بڑی دردمندی سے کی ہے، چنانچہ وہ اپنے تذکرے "ہندی گویاں" میں قائم کے ذکر میں لکھتے ہیں" واللہ کہ یادِ آں صحبت داغ ناکامی بردل دردمندی گزارد"[1]

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں:

"آنولہ نواب علی محمد خاں کے عہد میں دارالاسلام تھا، اور نواب ممدوح نے بڑی کوشش کے ساتھ اس کی آبادی میں ترقی دی تھی، قلعہ اور مسجدیں تعمیر کرائی تھیں

---

[1] سوانحات المتاخرین آنولہ ص ۱۲ (قلمی مملوکہ راقم الحروف) مؤلف مولوی حکیم عبدالغفور (مرحوم)

آنولہ کی دینداری پر باد ... [illegible]

حافظ رحمت خاں کے بریلی منتقل ہونے اور اس کے شہر مصطفیٰ ... کے ختم ہونے پر بھی اس کی رونق اور عظمت رفتہ کے کچھ نقوش نصف صدی تک قائم رہے جن کی طرف ڈبلیو فرینکلن نے "ہسٹری آف شاہ عالم" میں اشارہ کیا ہے۔

یہی وہ تاریخی قصبہ ہے جو ایوب قادری کا آبائی وطن تھا، ان کے مورث اعلیٰ روہیلوں کے عہد میں آنولہ آئے، نواب علی محمد خاں والی روہیل کھنڈ نے حضرت شاہ نوری غازیؒ کی زیارت کے بعد جو بڑی اراضی وقف کی تھی، اس کے متولی حکیم حمد اللہ تھے، جو اپنے دور کے نامور عالم اور خطیب تھے۔ ان کے صاحبزادے حکیم حبیب اللہ تھے، جو علم و فضل میں ممتاز تھے۔ ان کے فرزند حکیم عظیم اللہ قادری تھے جو علم الفرائض اور تجوید میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، معارف المیراث، کاشف الحقائق، تفسیر سورۃ والعصر ان سے یادگار ہیں، انہوں نے بعض کتابوں پر حواشی بھی لکھے، سنہ ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی،[1]

حکیم عظیم اللہ قادری کے چار صاحبزادے حکیم الٰہی بخش، حکیم سعید اللہ، میاں وحید اللہ اور حافظ امام الدین تھے، حکیم سعید اللہ سنہ ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۰۷ء میں وفات پائی، خاندانی پیشہ طب کرتے تھے، سنہ ۱۸۵۷ء میں خان بہادر خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی فوج میں بھرتی ہو کر نگرالہ ضلع بدایوں اور کنپلہ فرخ آباد میں انگریزی فوج سے مقابلہ کیا۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں اور بعض کتابوں پر قیمتی حواشی بھی لکھے ہیں،[2] حکیم سعید اللہ کے ایک فرزند مولوی رحیم بخش (سنہ ۱۸۵۷ء - سنہ ۱۹۲۰ء) تھے، جنھیں فن خطاطی میں کمال حاصل تھا، ابن عربی کا خاص مطالعہ کیا تھا، عربی ادب پر بھی گہری نظر تھی، ان کے ایک فرزند مولوی مشیت اللہ (سنہ ۱۸۸۹ء - سنہ ۱۹۵۹ء) تھے، اور یہ قادری مرحوم کے والد ماجد تھے، فارسی میں بہت اچھی قابلیت تھی، تاریخ اور انساب پر بڑی گہری نظر تھی،[3] ڈاکٹر معین الدین عقیل ان کے متعلق

---

[1] اخبار الصنادید بحوالہ سوانحات المتاخرین آنولہ، [2] سوانحات المتاخرین آنولہ ص ۴۶-۴۷، [3] ایضاً ص ... ، ...

ترجمہ انگریزی ہے۔ [illegible] موضوعات تحقیق پر ان [illegible] بہت کچھ [illegible]

کیفیت "مع حوالہ جاتی ادب" اور علمائے ہند و پاک کے مستند [illegible] کی

مستند مگر غیر معروف کتابوں پر جس [illegible] سے داد تحقیق دی ہے [illegible] موضوعات

کیے جاسکتے ہیں، اس ضمن میں انھوں نے کثیر سرمایہ چھوڑا ہے،

قصبہ آنولہ ضلع بریلی کا ایک تاریخی قصبہ ہے، بجز قنوج کے اس کی تاریخی قدامت کی ہمسری اتر پردیش کا کوئی شہر نہیں کرسکتا، یہ حکومت روہیلہ کا پہلا دارالحکومت تھا۔ اور اس حکومت کے پہلے فرماں روا نواب علی محمد خاں (ف سنہ ۱۷۴۹ء) تھے، ان کی وفات کے بعد حافظ رحمت خاں ان کے جانشین ہوئے، جنھوں نے بریلی میں سکونت اختیار کرلی، نواب علی محمد خاں اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ابتدائی عہد میں روہیل کھنڈ کا صدر مقام آنولہ ہی رہا، اور اس دور میں یہاں غیر معمولی ترقی ہوئی، مولوی حکیم عبدالغفور لکھتے ہیں:

"روہیلوں کے زمانے میں شہر آنولہ علماء، فضلاء، شعراء، حکماء اور اہل اللہ کا مرکز بن گیا۔ نواب علی محمد خاں کے فرزند نواب محمد یار خاں امیر کے دربار سے قدرت اللہ شوق، مصحفی، قائم چاندپوری اور فدوی لاہوری، جیسے مشاہیر شعراء وابستہ تھے۔ مصحفی نے آنولہ کی یاد بڑی دردمندی سے کی ہے چنانچہ وہ اپنے تذکرے ہندی گویاں میں قائم کے ذکر میں لکھتے ہیں" واللہ کہ یاد آں صحبت داغ ناکامی بردل دردمندی گزارد[1]"

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں:

"آنولہ نواب علی محمد خاں کے عہد میں دارالاسلام تھا، اور نواب ممدوح نے بڑی کوشش کے ساتھ اس کی آبادی میں ترقی دی تھی، قلعہ اور مسجدیں تعمیر کرائی تھیں،

---

[1] سوانحات المتاخرین آنولہ ص ۱۲ (قلمی مملوکہ راقم الحروف) مؤلف مولوی حکیم عبدالغفور (مرحوم)

آنولہ کی دینداری پر عالم اسلام کو رشک تھا

حافظ رحمت خاں کے بریلی منتقل ہونے اور اس کے شجاع الدولہ کے ہاتھوں تلف ہو جانے ہونے پر بھی اس کی رونق اور عظمت رفتہ کے کچھ نقوش نصف صدی تک قائم رہے جن کی طرف ڈبلیو فرینکلن نے "ہسٹری آف شاہ عالم" میں اشارہ کیا ہے۔

یہی وہ تاریخی قصبہ ہے جو ایوب قادری کا آبائی وطن تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ روہیلوں کے عہد میں آنولہ آئے، نواب علی محمد خاں والی روہیل کھنڈ نے حضرت شاہ نوری قادری کی زیارت کے بعد جو بڑی اراضی وقف کی تھی، اس کے متولی حکیم محمد اللہ تھے، جو اپنے دور کے نامور عالم اور خطیب تھے۔ ان کے صاحبزادے حکیم حبیب اللہ تھے، جو علم و فضل میں ممتاز تھے۔ ان کے فرزند حکیم عظیم اللہ قادری تھے جو علم الفرائض اور تجوید میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، معارف المیراث، کاشف الحقائق، تفسیر سورۃ والعصر ان سے یادگار ہیں۔ انہوں نے بعض کتابوں پر حواشی بھی لکھے ۱۲۸۰ھ میں وفات پائی۔[1]

حکیم عظیم اللہ قادری کے چار صاحبزادے حکیم الٰہی بخش، حکیم سعید اللہ، میاں وحید اللہ اور حافظ امام الدین تھے۔ حکیم سعید اللہ ۱۲۳۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۷ھ میں وفات پائی۔ خاندانی پیشہ طب کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں خان بہادر خاں نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی فوج میں بھرتی ہو کر نگرالہ ضلع بدایوں اور کنپلہ فرخ آباد میں انگریزی فوج سے مقابلہ کیا۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں اور بعض کتابوں پر قیمتی حواشی بھی لکھے ہیں۔[2] حکیم سعید اللہ کے ایک فرزند مولوی رحیم بخش (۱۸۵۷ء۔۱۹۲۰ء) تھے، جنھیں فن خطاطی میں کمال حاصل تھا۔ ابن عربی کا خاص مطالعہ کیا تھا، عربی ادب پر بھی گہری نظر تھی۔ ان کے ایک فرزند مولوی مشیت اللہ (۱۸۸۹ء۔۱۹۵۹ء) تھے، اور یہ قادری مرحوم کے والد ماجد تھے۔ فارسی میں بہت اچھی قابلیت تھی، تاریخ اور انساب پر بڑی گہری نظر تھی۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل ان کے متعلق

---

[1] اخبار الصنادید، بحوالہ سوانحات المتاخرین آنولہ، [2] سوانحات المتاخرین آنولہ ص ۴۲۔۴۴ [3] ایضاً ص ۴۵

رفقاء ندوہ

"تبلیغ دین اور مناظرہ سے خاص دلچسپی تھی مختلف مقامات پر خصوصاً بمبئی سنہ ۱۹۳۱ء سے سنہ ۱۹۳۳ء کے دوران قیام میں مناظرے کیے، تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے، اور کئی غیر مسلموں کو مسلمان کیا، تحریک پاکستان کے زبردست مؤید تھے سنہ ۱۹۵۱ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے، دادو (سندھ) میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا، تاریخ انساب اور ردِّ آریہ اور ردِّ شیعہ میں ان سے بعض کتابیں یادگار ہیں، پروفیسر قادری کے علاوہ عبدالقیوم، عنایت اللہ اور نعمت اللہ ان کے فرزند ہیں"[1]

اس خاندانی تفصیل کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قادری مرحوم کا خاندان شروع سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے، تاریخ، انساب اور علوم دینیہ سے دلچسپی اس کا نمایاں وصف رہا ہے، اور قادری مرحوم کو یہ چیزیں علمی وراثت میں ملیں،

محمد ایوب نام قادری نام کا جزو ہے، ۲۸ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء / ۱۷ ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۴ ہجری بروز بدھ قصبہ آنولہ میں پیدا ہوئے، قصبہ کے ایک بزرگ مولوی حکیم عبدالغفور (ف سنہ ۱۹۶۴ء) نے ان کے کان میں اذان دی، اور "چراغ علم" سے تاریخ پیدائش نکالی، رواج کے مطابق ابتداءً قرآن مجید حافظ عبدالاحد اور حافظ عبدالغنی سے پڑھا، پھر مدرسہ تعلیم المومنین آنولہ میں مکتبی تعلیم پائی، سنہ ۱۹۳۹ء میں پرائمری کے امتحان میں درجۂ اول میں کامیاب ہوئے، اور وظیفہ کے مستحق قرار پائے، سنہ ۱۹۴۲ء میں مڈل کے امتحان میں بھی درجۂ اول میں کامیاب ہوئے، سنہ ۱۹۴۵ء میں الٰہ آباد بورڈ سے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا، اسی دوران میں انھوں نے فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، فارسی کی کچھ کتابیں مولوی اسد علی خاں اور حکیم عبدالغفور سے پڑھیں، سنہ ۱۹۵۰ء میں انٹر اسلامیہ کالج بدایوں سے کیا، اواخر اپریل سنہ ۱۹۵۱ء میں ان کے والد ماجد نے پاکستان کو ہجرت

---

[1] ڈاکٹر معین الدین عقیل: تعارف غالب اور عصر غالب، کراچی سنہ ۱۹۸۲ء،

کی، قادری مرحوم سے والد کی جدائی برداشت نہ ہوئی، چنانچہ وہ بھی مئی ۱۹۵۱ء میں پاکستان پہنچے، ابتداءً والد کے ساتھ دادو (سندھ) میں ہی قیام کیا، تلاشِ روزگار میں کراچی پہنچے اور پھر تادمِ زندگی وہیں کے ہو رہے۔

ستمبر ۱۹۵۱ء سے سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ (وزارت صنعت محکمۂ رسد و ترقیات) سے ملازمت کا آغاز کیا، جو مئی ۱۹۵۷ء تک قائم رہی اس دوران میں تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا، ۱۹۵۶ء میں اردو کالج کراچی سے بی۔ اے کیا۔

جناب سید الطاف علی بریلوی نے ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی میں سکونت اختیار کی اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، ایک سہ ماہی رسالہ "العلم" بھی جاری کیا، اسی دوران میں سید صاحب کی ملاقات قادری مرحوم سے ہوئی، انہوں نے ان کے جوہر ذاتی کو پرکھ لیا، "العلم" کے لیے ان سے کثرت سے مضامین لکھوائے اور شایع کیے، ۱۹۵۷ء میں قادری مرحوم کی پہلی تصنیف "مولانا فیض احمد بدایونی" شایع ہوئی، جو اگرچہ بہت مختصر تھی، لیکن اس سے انکی تحقیقی و تصنیفی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا، ہسٹاریکل سوسائٹی کے معتمد ڈاکٹر معین الحق نے اپنے ادارہ میں معاون تحقیق اور ریسرچ افسر کی حیثیت سے بلا لیا، ملازمت کا یہ سلسلہ مئی ۵۷ء سے ۶۳ء تک قائم رہا، پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر کے مشورہ پر جن کا ساتھ ہسٹاریکل سوسائٹی میں رہا تھا، انھوں نے ۶۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا، اور یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی، ایم۔ اے کی ڈگری سے ان کو یہ فائدہ ہوا کہ ہسٹاریکل سوسائٹی کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کو اردو کالج کراچی میں جز وقتی لکچرار کی حیثیت سے رکھ لیا گیا، ستمبر ۶۲ء سے ۴ مارچ ۶۳ء تک انھوں نے اس طرح تدریسی خدمت انجام دی، ۵ مارچ ۶۳ء سے اسی کالج میں مستقل لکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہو گیے، کچھ دنوں بعد صدر شعبہ کے منصب پر فائز کر دیے گیے، ڈاکٹر معین الدین

...لکھتے ہیں:

"اس عرصہ میں انھوں نے اپنی علمی و تدریسی حیثیت کے سبب ۱۹۷۴ء میں اردو کالج کی جانب سے "ہلال اردو تمغہ" کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی طرف سے ۱۹۷۶ء میں اکیڈمک ایوارڈ میڈل" اور اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کی جانب سے، اسی سال قائداعظم کی صدسالہ تقریبات کے تعلق سے "تمغۂ قائداعظم" حاصل کیے پھر اس عرصہ میں انھوں نے متعدد قومی اور بین الاقوامی مذہبی، تاریخی اور ادبی کانفرنسوں میں بھی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔[1]"

۱۹۷۹ء میں انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا، ان کے تحقیقی مقالہ کا موضوع "اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ" (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک) تھا،

افسوس ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو ایک کار ایکسیڈینٹ میں وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے،

قادری مرحوم بحیثیت انسان بڑی خوبیوں کے مالک تھے، سادہ مزاج تھے، اور نام و نمود سے بے نیاز، صاف دل اور صاف گو ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مخلص بھی تھے مصلحت کوشی، زمانہ سازی اور مذہب بیزاری سے کوسوں دور، علماء کی عزت اور اہل فن کی قدر کرنا ان کا شعار تھا، یہی وہ خوبیاں تھیں جنھوں نے ہر چھوٹے بڑے کے دل میں ان کا احترام پیدا کر دیا تھا، بقول شاعر ؎

صرف باتوں سے تو ہوتی نہیں عزت دل میں
آنکھ کچھ دیکھتی ہے تب وہ ادب کرتی ہے

قادری مرحوم نے تصنیفات و تالیفات اور تراجم وغیرہ کی ایک بڑی تعداد اپنے پیچھے چھوڑی ہے،

تصانیف | ۱۔ مولانا فیض احمد بدایونی: مولانا فیض احمد ۱۸۵۷ء کے مجاہدین میں تھے، انھوں نے قوت سیف و قلم دونوں سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، کبھی وہ پادری فنڈر سے مناظرہ کرتے

---

[1] ڈاکٹر معین الدین عقیل، تعارف غالب اور عصر غالب (کراچی ۱۹۸۳ء)

نظر آتے، اور کبھی بہادر شاہ ظفر کی عدالت کے حاکم، کبھی انگریزوں سے برسرپیکار رہے، کبھی شعروادب سے شغل کرتے۔

غرض ان کی خدمات گوناگوں تھیں، قادری مرحوم نے اس کتاب میں ان کی متنوع شخصیت اور گوناگوں خدمات کا تعارف تاریخ وتحقیق کی روشنی میں کرایا ہے، یہ کتاب پاک اکیڈمی کراچی سے ۱۹۵۷ء میں شایع ہوئی۔

۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت: یہ کتاب تحقیقی انداز پر ترتیب دی گئی ہے۔ حضرت مخدومؒ کو ایک مافوق الفطرت ہستی کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے انہیں ایک عالم باعمل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے جسے ادارۂ تحقیق وتصنیف کراچی نے ۱۹۶۳ء میں شایع کیا۔ اس ادارہ کی بنیاد مارچ ۱۹۶۲ء میں رکھی گئی تھی۔ ایوب قادری اس کے بنیادی رکن اور معتمد اعزازی تھے۔ اس ادارہ کی طرف سے شایع ہونے والی یہ پہلی کتاب تھی۔

۳۔ مولانا محمد احسن نانوتوی: یہ کتاب ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، سہیل کمنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شایع ہوئی۔

۴۔ ارباب فضل وکمال بریلی: ۱۹۷۰ء میں کراچی سے شایع ہوئی۔

۵۔ تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ: ۱۵۲ صفحات پر مشتمل مکتبۂ معاویہ کراچی سے ۱۹۷۱ء میں شایع ہوئی۔

۶۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں: یہ کتاب قادری مرحوم کی وقیع کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں پاک اکیڈمی، کراچی سے شایع ہوئی۔

۷۔ غالب اور عصر غالب: یہ کتاب غالب سے متعلق نو تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے مضامین کے عنوانات یہ ہیں: نواب الٰہی بخش خاں معروف کا غیر مطبوعہ کلام، غالب اور سرسید احمد خاں،

غالب اور تصنیفات الفقات، غالب کے معاصرین کی ادبی چھیڑ چھاڑ، غالب اور مارہرہ، غالب کے چند شاگرد، غالب اور روہیل کھنڈ، مطائبات غالب، قطعات تاریخ انتقال مرزا غالب، یہ مضامین غالبیات میں مفید اور وقیع اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں، ان مضامین سے نہ صرف یہ کہ غالبیات بلکہ کلاسیکی ادب کی تاریخ و تہذیب کے چند نئے باب بھی وا ہوتے ہیں، تعارف ڈاکٹر معین الدین عقیل نے لکھا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں کراچی سے شایع ہوئی،

۸۔ کاروان رفتہ: چھبیس شخصی اور سوانحی مضامین پر مشتمل ہے، یہ مضامین مرحومین سے متعلق ہیں، جن میں علمی و ادبی اور مذہبی شخصیات شامل ہیں، ۱۹۸۳ء میں مکتبہ اسلوب کراچی سے شایع ہوئی، دیباچہ جناب مشفق خواجہ نے لکھا ہے،

ترجمے

۱۔ تذکرۂ علمائے ہند: جناب مولانا رحمان علی صاحب کی تصنیف ہے، اس کا ترجمہ ۱۹۶۱ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے شایع کیا،

۲۔ مجموعۂ وصایا اربعہ: حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیف ہے، اس کا ترجمہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد سے ۱۹۶۴ء میں شایع ہوا،

۳۔ مآثر الامراء: صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کی تصنیف کردہ تین جلدوں کا ترجمہ مرکزی اردو بورڈ لاہور سے بالترتیب ۱۹۶۸ء، ۶۹ء، ۷۰ء میں شایع ہوا، یہ ترجمے قادری مرحوم کی محنت و صلاحیت کے غماز ہیں، تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب کی طرف متوجہ ہونا اور پھر فارسی سے اردو کا جامہ پہنانا ان ہی کا حصہ تھا،

۴۔ فرحت الناظرین: محمد اسلم انصاری پسروری کی کتاب کا ترجمہ ۱۹۷۲ء میں شایع ہوا،

۵۔ سیر العارفین: شیخ فضل اللہ جمالی کی مشہور تصنیف ہے، اس کا ترجمہ ۱۹۷۶ء میں اشاعت پذیر ہوا،

ترتیب و حواشی | حسب ذیل کتابوں کو مرتب کیا، اور ان پر حواشی لکھے:

(۱) علم و عمل (وقایع عبد القادر خانی) جلد دوم (وقایع عبد القادر خانی) (۳) تواریخ عجیب عرف کالا پانی (محمد جعفر تھانیسری) (۴) عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ (تاریخ فرخ آباد مؤلفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی) (۵) مقالات یوم عالمگیر (۶) تذکرۂ نوری (مفصل حالات ابو الحسین نوری مارہروی) (۷) مرقع شہابی (حالات مفتی انتظام اللہ شہابی) (۸) جنگ نامہ آصف الدولہ نواب رامپور (خلیفہ محمد معظم عباسی)

ان کاوشوں کے علاوہ بعض کتابوں میں وہ شریک مؤلف بھی رہے ہیں، اس قسم کی کتابوں میں "خط و خطاطی" "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں" اور "نقوش سیرت" خاص اہمیت رکھتی ہیں،

ان مستقل تصنیفات و تالیفات کے علاوہ انہوں نے تقریباً ڈھائی سو سے زیادہ علمی و تحقیقی مقالے لکھے، جو ہند و پاک کے معیاری رسائل میں شایع ہوئے، تقریباً تیس [۳۰] کتابوں پر مقدمے لکھے،

علمی و ادبی صحافت میں بھی ان کا دخل رہا، سہ ماہی "بصائر" (کراچی) کے اعزازی مدیر اور ماہنامہ "سرحد" کے نگراں رہے، اردو کالج کراچی کے مجلہ "برگ گل" کے بھی ایک عرصہ تک نگراں رہے، ان کی نگرانی میں اس مجلہ کے کئی اہم نمبر شایع ہوئے، سرسید نمبر، تعلیمی پالیسی نمبر، قائد اعظم نمبر، محمد علی جوہر نمبر وغیرہ، "العلم" کراچی کا غالب نمبر بھی انھوں نے ترتیب دیا تھا، یہ تمام کاوشیں گو ماضی کا سرمایہ ہیں، لیکن مستقبل کے لیے یہ ایک ورثہ کے طور پر محفوظ رکھی جا سکتی ہیں،

راقم الحروف کے ان سے بڑے تعلقات تھے، اکثر خط و کتابت رہتی تھی، خطوط میں اپنی سرگرمیوں پر بھی کبھی کبھی روشنی ڈال دیتے تھے، چنانچہ ۱۹۸۰ء میں انھوں نے مجھے لکھا،

"مغلیہ عہد کے ایک مورخ نظام الدین احمد بخشی کی ضخیم تاریخ "طبقات اکبری" سے عنقریب فارغ ہوا ہوں، مرکزی اردو بورڈ لاہور اسے شایع کریگا۔"

ایک اور خط میں تحریر کیا تھا کہ "غزنوی عہد کے ایک عربی نثر" و قصیدہ بھی ...
چل رہی ہے" خدا کرے کہ یہ کتابیں بھی جلد شایع ہوں ۔

قادری مرحوم نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ غالباً اشاعت کے لیے زندگی ...
پبلشر کے سپرد کر دیا ہوگا ۔ اس کا موضوع " اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ (شمالی ...
تک) تھا ، اس کے متعلق انھوں نے اپنے ایک اخباری انٹرویو میں بتایا کہ اردو نثر کی ...
فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتی ہے ، پھر اس کے بعد خطوط غالب کا ذکر آتا ہے ...
میں ہوا[1] اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں نثر کا سلسلہ شروع ہوا ، جس کو سرسید احمد خاں ...
بخشی ۔ فورٹ ولیم کالج اور غالب کے درمیانی دور میں اردو نثر پر کافی کام ہوا ، اس دور ...
دنیوی تعلیم کی حدود آج کی طرح علاحدہ نہیں تھیں ، اس لیے علما نے اس میدان میں خا ...
اور علما کی تصانیف نے اردو نثر کے دامن کو خاصا مالا مال کیا ، مگر سوئے اتفاق کہ ادبی ...
علما کے کام کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی ، وہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے فورٹ ...
ابتدا کرتے ہیں ، اور پھر غالب سے جست لگا کر سرسید احمد خاں پر پہنچ جاتے ہیں ، اور ...
کی عمارت کی تاریخ اس مثلث پر قائم ہے ، اسی بنا پر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ علما کی نثری ...
اس اعتبار سے جائزہ لینا چاہیے ، چنانچہ میں نے اس موضوع پر مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ علما ...
کے میدان میں انتہائی وقیع کارنامے سر انجام دیے ہیں ، اور میرے خیال کے برعکس یہ میدا ...
وسیع معلوم ہوا ، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ شیخ مراد علی سنبھلی کی تصنیف (تف ...
۱۷۷۱ء کی تالیف ہے) اور وہ اردو نثر کا سہل اور سلیس نمونہ ہے ۔

---

[1] ۱۸۵۷ء غالباً سہو کاتب ہے ، کیونکہ یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ غالب کی خطوط نگاری کا آغاز ...
ہوتا ہے ، اور قادری مرحوم اس سے ناواقف نہ ہوں گے ، واللہ اعلم ۔ شمس بدایونی ۔

مقالے میں اکیاسی[۸۱] علماء کی ایک سو باون[۱۵۲] تصانیف میری تحقیق کا موضوع رہی ہیں، جن میں سے پچاس[۵۰] قلمی کتابیں، بقیہ مطبوعہ کتابیں (جو اگرچہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں) ہیں،

یہ مقالہ آٹھ[۸] ابواب پر مشتمل ہے، اس کا پہلا باب شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادگان اور ان کے ہمعصر علماء کی تصانیف سے متعلق ہے، اس باب میں آٹھ[۸] علماء کی گیارہ[۱۱] تصانیف ہیں، ان میں شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور حکیم شریف خاں کا نام تو ادبی تاریخ میں مل جاتا ہے، باقی حضرات کے نام اور ان کی تصانیف انکشاف کی حیثیت رکھتی ہیں،

دوسرے اور تیسرے باب میں سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے نثری کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، سید احمد شہیدؒ کو ہم نے اردو نثر کے مصنف کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے، سید صاحب کے رفقاء میں مولوی سید عبداللہ بن بہادر علی حسینی کی علمی سرگرمیوں کا خاص طور سے تعارف کرایا ہے، کہ انھوں نے کلکتہ میں مطبع احمدی قائم کر کے اردو زبان کی نشر و اشاعت کا بڑا کام کیا

ان دونوں ابواب میں چودہ[۱۴] علماء کی سینتالیس[۴۷] تصانیف پر اظہار خیال ہے، ان میں تقویۃ الایمان اور تنبیہ الغافلین کا تو ادبی تاریخوں میں ذکر ملتا ہے، باقی مصنفین اور کتابیں ایک نوع سے پہلی مرتبہ متعارف ہوئی ہیں،

چوتھا باب شاہ اسحٰق دہلوی کے تلامذہ اور رفقاء کی تصنیفات پر مشتمل ہے، اس میں تیرہ[۱۳] علماء کی پچیس[۲۵] کتابوں پر بحث کی گئی ہے، ان میں مفتی صدر الدین آزردہ، نواب قطب الدین خاں، مفتی عنایت احمد، شاہ احمد سعید، مولوی محمد شاہ اور قاری عبدالرحمن جیسے علماء، حکیم نصر اللہ خاں وصال، ظہور علی ظہور جیسے شاعر اور مولوی شیخ عبداللہ جیسے مبلغ شامل ہیں،

پانچواں اور چھٹا باب علمائے روہیل کھنڈ کی تصنیفات کے جائزہ پر مشتمل ہے، ان دونوں ابواب میں پچیس[۲۵] علماء کی چالیس تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے، اس جائزہ میں سید شاہ حقانی کی

"تفسیر حقانی" ۱۳۰۵ھ کی تالیف ہے، اسی طرح مولوی شاہ عبدالمجید بدایونی نے ۱۲۹۰ھ میں "سیرت رسول" پر ایک کتاب "محافل الانوار" اردو نثر میں سب سے پہلے لکھی،

ساتواں باب علمائے اودھ کی علمی کاوشوں پر مشتمل ہے، ان میں تیرہ[۱۳] علماء کی سترہ[۱۷] تصانیف کو موضوع بحث بنایا گیا ہے،

آٹھواں اور آخری باب میں بنگال اور بہار کے علماء کی کتابوں کو متعارف کرایا گیا ہے باب میں چھ[۶] علماء کی گیارہ[۱۱] تصانیف پر اظہار خیال کیا گیا ہے،

حیات شبلی

یہ کتاب محض علامہ شبلی مرحوم کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ ان کی وفات سے تک ہندوستان کی مذہبی، علمی، تعلیمی اور اصلاحی، اور ان کے دور کی اور بہت سی تحریکوں اور کی مفصل تاریخ ہے، شروع میں جدید علم کلام کی نوعیت، اہمیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم علمی خدمات پر تبصرہ ہے، اس کے بعد مقدمہ ہے، جس میں ہندوستان کے خلجی و تغلق سلاطین کے عہد سے انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبۂ آگرہ و اودھ خصوصاً اسکے شمالی اضلاع بنارس، غازیپور، جونپور اعظم گڈھ کے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کے ساتھ ہر دور کے ارباب فضل و کمال اور اصحاب درس و تدریس مثلاً ملا محمد افضل جونپوری، دیوان عبدالرشید، ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ، مولانا کرامت علی حنفی، محمد فصیح غازیپوری، مولانا سخاوت علی جونپوری، اور ان کے مشہور تلامذہ وغیرہ کے حالات و سوانح ان کے علمی کارنامے بڑی تلاش و جستجو اور تذکرہ و تاریخ کی کتابوں کے ہزاروں صفحات کے مطالعہ کے بعد لکھے گئے ہیں، جس کی ضخامت مع مقدمہ، دیباچہ اور مراثی اور قطعات تاریخ کے (۸۵۰) صفحے ہیں،

مؤلفہ: مولانا سید سلیمان ندوی، قیمت: ۸۰/ روپیہ۔ "منیجر"

حضرت سلمان فارسیؓ کی عمر

از

جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ طبقۂ صحابہ میں ممتاز عباد و زہاد میں سے تھے، ان کے بڑے مناقب و فضائل ہیں، فارس کے مقام اصفہان یا رام ہرمز یا جَے کے رہنے والے تھے، صحیح دین کی تلاش و طلب میں مدتوں سرگرداں رہے، مختلف دیار و امصار کا چکر کاٹا، متعدد بار غلام بنائے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے پر مسلمان ہوگئے، غلامی کی وجہ سے ابتدائی غزوات میں شریک نہ ہوسکے، حتی کہ ۵ھ میں پہلی بار غزوۂ خندق میں شریک ہوئے، اس کے بعد عہد رسالت کے تمام غزوات میں حصہ لیتے رہے، عہد فاروقی میں عراق و مدائن وغیرہ کی فتوحات میں بھی برابر شریک رہے، آخر میں مدائن کے قاضی اور والی بنائے گئے، اور اسی دور میں وہیں ۳۵ھ کے آخر یا ۳۶ھ کی ابتداء میں انتقال کیا، بعض مورخین نے ان کی وفات ۳۳ھ یا ۳۴ھ یا ۳۵ھ میں بتائی ہے۔

حضرت سلمانؓ کا شمار معمر صحابہ میں ہوتا ہے یعنی وہ طویل العمر صحابہ میں سے ہیں، عام طور سے مورخین و محدثین کے یہاں سو سوا سو، اور ڈیڑھ سو سال تک کے عمر دراز لوگوں پر معمر کا اطلاق ہوتا ہے، بعد میں ایک بزرگ نے بغیر کسی مستند حوالہ کے بتایا کہ اہل علم کہتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ ساڑھے تین سو سال تک زندہ رہے اور ان کے ڈھائی سو سال تک زندہ رہنے میں تو شک ہی نہیں ہے، ان کے بعد آنے والے تقریباً تمام مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے حضرت سلمانؓ کے ذکر میں اس قول کو بلا نقد و نظر کے نقل کر دیا، حتی کہ آٹھویں صدی میں امام ذہبیؒ نے حضرت سلمانؓ کی عمر تحقیق کر کے صرف اسی سال بتائی، اور نویں صدی میں حافظ ابن حجرؒ نے امام ذہبی کے اس قول کو بایں کہ کر ساڑھے تین سو، یا ڈھائی سو سال والے قول کی صحت کا امکان

خرقِ عادت اور کرامت کے طور پر ظاہر کیا،

ذیل میں مذکورہ بالا باتوں کو ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں، اور آخر میں اپنی رائے پیش کریں گے، اہلِ علم سے اس بارے میں مزید تحقیق کی گذارش ہے

ابن سعد متوفی ۲۳۰ھ نے حضرت سلمان فارسیؓ کی وفات عہد عثمانی میں مدائن میں بتائی ہے، اور ان کی عمر کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے[1]،

خلیفہ بن خیاط متوفی ۲۴۰ھ نے ان کی وفات ۳۶ھ میں لکھی ہے، عمر کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی ہے[2]، امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ نے نہ سنہ وفات بتایا ہے اور نہ ہی عمر کے بارے میں کچھ لکھا ہے[3]،

ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ پہلے مورخ ہیں، جنھوں نے حضرت سلمانؓ کو طویل العمر بتایا ہے، اور واضح طور سے ان کی درازی عمر کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں،

حضرت سلمانؓ نے طویل عمر پائی اور خلافت عثمانی کی ابتدار میں فوت ہوئے، اور بعض روایتوں میں ہے کہ خلافت فاروقی میں فوت ہوئے[4]،

ہمارے علم میں علامہ ابن قتیبہؒ پہلے مورخ اور تذکرہ نگار ہیں، جنھوں نے حضرت سلمانؓ کو طویل العمر بتایا ہے، ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ نے امام بخاریؒ کی طرح ان کے سنہ وفات اور عمر کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے[5]، ابن عبد البر اندلسی متوفی ۴۶۳ھ نے حضرت سلمانؓ کی عمر کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا ہے[6]،

مذکورہ بالا ان تمام قدیم و ثقہ محدثین اور مستند مورخین میں سے کسی نے حضرت سلمانؓ کی درازیِ عمر کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، حالانکہ ان کی وفات کے اختلاف سنین کو مفصل بیان کیا ہے، البتہ ان میں ابن قُتَیبَہ نے ان کی طولانی عمر کی پہلی بار تصریح کی ہے، مگر اس کی مدت بیان نہیں کی ہے،

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۴، ص ۳۱۹ بیروت، [2] تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۲۱۲، [3] تاریخ کبیر ج ۲ قسم ۲ ص ۱۳۶ [4] المعارف ص ۱۱۱، [5] الجرح والتعدیل ج ۲ قسم ۱ ص ۲۹۶، [6] الاستیعاب ج ۲ ص ۵۷۳،

بعد کے مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں میں خطیب بغدادی پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے حضرت سلمانؓ کی عمر کے بارے میں ایک قول نقل کیا ہے، مگر اس پر کوئی نقد و نظر نہیں کی بلکہ اس کے آخر میں "وکان من المعمرین" کہہ کر گویا اس قول کی تضعیف کر دی، جیسا کہ ان کے شیخ حافظ ابونعیم اصفہانی کا یہی قول ہے، ہم یہاں خطیب بغدادی کا پورا بیان پیش کرتے ہیں

"جعفر بن احمد بن فارس کا بیان ہے کہ میں نے عباس بن یزید کو محمد بن نعمان سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اہل علم کہتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ ساڑھے تین سو سال تک زندہ رہے اور ڈھائی سو سال میں شک ہی نہیں کرتے ہیں، وہ معمرین میں سے تھے، کہا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے وصی کا زمانہ پایا تھا، اور وہ اگلے پچھلے ادیان کے عالم تھے اور انھوں نے دونوں کتابیں (انجیل اور قرآن) پڑھی تھیں"[۱]

عباس بن یزید کون بزرگ ہیں؟ یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکا، خطیب بغدادی نے حافظ ابوالفضل عباس بن یزید بن ابوحبیب بحرانی متوفی ۲۵۸ھ کا ذکر کیا ہے، جو عباسویہ کے لقب سے مشہور ہیں، اور یحییٰ بن سعید القطان اور ابن عُیَینہ وغیرہ کے شاگرد ہیں، یہ صاحب تصانیف کثیرہ محدث ہیں، ان کے بارے میں دارقطنی کا قول ہے کہ تکلموا فیہ (محدثین نے ان کی ثقاہت میں کلام کیا ہے) ان ہی کا دوسرا قول ہے، وہ ثقہ امین ہیں، انھوں نے اصفہان، بغداد، ہمدان اور سامرا میں حدیث کا درس دیا ہے، حافظ محمد بن اسحاق مسوحی اصفہانی کا بیان ہے کہ میں طلب حدیث کے لئے بصرہ گیا تو وہاں کے محدثین نے کہا کہ تم یہاں کس لئے آئے ہو؟ میں نے کہا طلب حدیث کے لئے، انھوں نے کہا تمھارے یہاں (اصفہان میں) عباس بن یزید بحرانی ہیں؟ میں نے کہا ہاں، اس پر انھوں نے کہا کہ تب تم ہمارے یہاں رہ کر کیا کروگے[۲]؟ ہو سکتا ہے کہ یہی عباس بن یزید ہوں جن کا یہ قول حضرت

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۶۴، [۲] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۱۴۳

سلمانؓ کی عمر کے بارے میں جو سب سے زیادہ قابل اعتماد بیان ہے وہ ابوالشیخ نے بھی بیان کیا ہے [illegible]
یہ قول نقل کیا ہے[1] بعد کے آنے والے تقریباً سب ہی تذکرہ نویسوں نے اس قول کو بلا تنقید نقل کیا ہے

چنانچہ ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے صفۃ الصفوۃ میں لکھا ہے:۔

"علمائے سیر نے کہا ہے کہ حضرت سلمانؓ معمرین میں سے تھے، حضرت عیسیٰؑ کے وصی کا زمانہ پایا تھا، اور ڈھائی سو سال تک زندہ رہے، اور کہا گیا ہے کہ اس سے زیادہ مدت تک زندہ رہے[2]۔"

ابن اثیر جزری متوفی ۶۳۰ھ نے قال العباس بن یزید: قال اهل العلم لکھ کر یہی قول نقل کیا ہے، اور اس کے بعد حافظ ابونعیم کا قول بھی نقل کیا ہے کہ حضرت سلمانؓ معمرین میں سے تھے اسی کے ساتھ یہ قول لکھ کر لکھا ہے کہ انھوں نے خود حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے، جب کہ خطیب اور ابن جوزی نے وصی عیسیٰ کا نام لیا ہے[3]۔

حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ نے تہذیب التہذیب میں ابوالشیخ کے حوالے سے عباس بن یزید کا صرف قول نقل کر دیا ہے، اور اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر نہیں کی ہے[4]۔ مگر اصابہ میں کرامۃً اس کو ممکن بتایا ہے پہلے انھوں نے امام ذہبی متوفی ۷۴۸ھ کی یہ تحقیق پیش کی ہے،

"ذہبی نے کہا ہے کہ میں نے حضرت سلمانؓ کے سن کے متعلق تمام اقوال دیکھے ہیں، ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر ڈھائی سو سال سے متجاوز تھی، اور اختلاف اس سے زائد میں ہے، پھر تحقیق کے بعد میں نے اس سے رجوع کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ ان کی عمر اسی سال سے زیادہ نہیں تھی،،

پھر معاً اس قول پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

---

[1] الاصابہ ج ۳ ص۱۱۳، [2] صفۃ الصفوۃ ج ۱ ص۲۲۴، [3] اسد الغابہ ج ۲ ص۳۳۲ طبع اول، [4] تہذیب التہذیب ج ۴ ص۱۳۸،

لیکن کتاب میں لکھا ہے کہ ذہبی نے اپنے اس قول کی بنیاد اور سند نہیں بیان کی ہے میرا خیال ہے کہ
اس قول کی وجہ حضرت سلمان فارسیؓ کی وصال نبوی کے بعد فتوحات میں شرکت اور قبیلہ کندہ کی
ایک عورت سے شادی وغیرہ ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ان کی زندگی میں
نشاط اور تاب و توان کی کچھ قدریں باقی تھیں، لیکن اگر ان کی درازی عمر کا قول ثابت ہو جائے
تو یہ ان کے حق میں کرامت ہوگی، اور اس کے ثبوت سے کوئی چیز مانع نہیں ہے کیونکہ ابو الشیخ
نے طبقات الاصبہانیین میں عباس بن یزید سے روایت کی ہے کہ اہل علم کہتے ہیں کہ حضرت
سلمانؓ ساڑھے تین سو سال تک زندہ رہے اور ڈھائی سو سال میں تو شک ہی نہیں کرتے ہیں[۱]

مذکورہ بالا مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تیسری صدی تک حضرت سلمان فارسیؓ کی درازی عمر کے متعلق
کوئی روایت نہیں ملتی ہے، ابن سعد، خلیفہ بن خیاط، امام بخاری، ابن ابی حاتم رازی، ابن عبد البر اندلسی رحمہم اللہ
نے ان کے حالات میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، البتہ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ حضرت سلمانؓ کو طویل عمر دی گئی
تھی، ان تمام ائمہ حدیث و تاریخ اور علمائے اخبار و سیر کے مقابلہ میں خطیب بغدادی نے ایک عالم کا قول نقل
کیا ہے کہ حضرت سلمانؓ ساڑھے تین سو سال تک زندہ رہے اور ڈھائی سو سال میں تو شک ہی نہیں ہے خطیب کے
بعد عام مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے اپنی کتابوں میں اس قول کو نقل کر کے خاموشی اختیار کی، اکثر نے اسی
کے ساتھ "وکان سلمان من المعمرین" لکھ دیا، اور مذکورہ روایت پر نقد و نظر کے لئے اتنا ہی کافی
سمجھا، ان میں صرف امام ذہبیؒ نے اس بارے میں تحقیق و تلاش سے کام لیا اور ان کی عمر صرف اسی سال تک آئی
ساڑھے تین سو سال یا ڈھائی سو سال والی روایت بوجوہ قابل نظر ہے، تین چار صدی گذرنے کے
بعد ایک عالم و محدث نے اپنے ایک دوست یا تلمیذ سے یہ بات کہی جسے ایک راوی نے سنا اور اس کی روایت
کی، عباس بن یزید، محمد بن نعمان اور جعفر بن احمد بن فارس کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ محدثین میں

---

[۱] الاصابہ ج ۳ صلا،

ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ اور سب سے بڑھ کر اس قول کی سند قال اھل العلم، یا اھل العلم یرون (اہل علم نے لکھا ہے، یا اہل علم کہتے ہیں) بالکل مجہول و غیر مستند ہے، اتنی بڑی اور اہم بات کہنے والے اہل علم کے نام، حالات اور مبلغ علم کا معلوم ہونا ضروری ہے، اس بارے میں داستان گوئی کا انداز غیر معتبر ہے، پھر اس قول کا انداز بھی غیر ذمہ دارانہ قسم کا معلوم ہوتا ہے جیسے ان اہل علم کو اپنے قول پر خود اعتماد نہیں ہے، اور ساڑھے تین سو سال کہہ کر فوراً ہی گھٹا کر ڈھائی سو کر دیا اور اس کو شک و شبہ سے بالاتر بتایا، حالانکہ کھلے طور سے ڈھائی سو سال میں کمی زیادتی کا احتمال ہے، کیونکہ حضرت سلمانؓ کی وفات ۳۳ھ، ۳۴ھ، ۳۵ھ، ۳۷ھ میں سے کسی ایک میں بتائی گئی ہے،

ذہبیؒ نے تجرید اسماء الصحابہ میں حضرت سلمانؓ کا صرف نام لیا ہے، نہ ان کا سنہ وفات لکھا ہے اور نہ ہی عمر کے متعلق کچھ لکھا ہے، مگر جیسا کہ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے[1]، انھوں نے اپنی تحقیق سے حضرت سلمانؓ کی عمر صرف اسی سال بتائی ہے، اور حافظ ابن حجر نے اسی سے اختلاف کرتے ہوئے اسے بے سند بتایا ہے، حالانکہ اس کی سند میں وہی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں جن کو ابن حجر نے اپنے خیال کے مطابق نقل کیا ہے، کیونکہ ڈھائی سو سال کی عمر میں فتوحات میں شرکت اور نکاح کوئی معنی نہیں رکھتا ہے، وصال نبویؐ کے بعد ان میں اتنی طاقت و توانائی تھی کہ وہ ان کاموں سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے تھے، ہمارے خیال میں ذہبیؒ کے یہ دلائل عباس بن یزید کی دلیل، قال اہل العلم، سے زیادہ قوی ہیں، جس کو حافظ ابن حجرؒ نے کرامۃً زیادتی عمر کے سلسلہ میں پیش کیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امام ذہبیؒ کا قول اس سلسلہ میں قول فیصل ہے، بلکہ اس سے بھی اختلاف کی گنجائش ہے، مدت عمر کی تعیین کے بغیر حضرت سلمانؓ کو معمرین میں شمار کرنا احوط ہے جس کا اطلاق سو سال یا اس سے زائد والے لوگوں پر ہوتا ہے، صاحب مشکوٰۃ نے اکمال میں وکان من المعمرین لکھ کر قیل کے بعد ڈھائی سو سال اور ساڑھے تین سو سال لکھا ہے، اور اول الذکر کو بلا دلیل اصح بتایا ہے،

---

[1] تجرید اسماء الصحابہ ج ۲، ص ۲۳۰

مدارسِ عربیہ کا نصابِ تعلیم

از
جناب شیخ نذیر حسین، مدیر اردو دائرۃ المعارف / انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

معارف (مارچ ۱۹۸۵ء) میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم پر ایک مذاکرے کی کارروائی پڑھنے کا اتفاق ہوا، چونکہ مجھے بھی درس نظامی کی بعض چھوٹی اور بڑی کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہے، اس لئے میری گذارشات بھی پیش خدمت ہیں،

جہاں تک تبدیلی نصاب کا تعلق ہے، میری ناقص رائے میں قرآن مجید اور صحاح ستہ کا متن تاقیام قیامت شامل نصاب رہے گا، ان کو مستثنیٰ کرکے باقی سب مضامین اور کتابوں میں تبدیلی کی گنجائش ہے، ان کے علاوہ فقہ میں ہدایہ نہایت جامع اور مفید ہے اور صدیوں سے دینی مدارس کے نصاب کا جزو اعظم بنی ہوئی ہے، ادب کی تعلیم کے لئے دیوان الحماسہ ضروری ہے، قرآن مجید کے ادبی اور اعجازی محاسن کی تفہیم و تعلیم کے لئے دلائل الاعجاز (عبد القاہر الجرجانی) بے نظیر ہے جو کہ کرد علی شامی کے الفاظ میں صحیفۃ من ادب العالی (ادبی شاہکار) ہے، اسی طرح اسرار شریعت میں شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ لاثانی ہے، موخر الذکر دونوں کتابیں ندوہ کے نصاب تعلیم کی مابہ الامتیاز کتابیں ہیں، لہٰذا ان کو بھی نصاب میں شامل رہنا چاہیئے،

درس نظامی میں غیر اہم اور ناقابل لحاظ مضمون علم التفسیر رہا ہے، جس میں صرف دو کتابیں جلالین اور بیضاوی شامل نصاب ہیں، جلالین کے الفاظ قرآن مجید کے الفاظ کے برابر ہیں جبکہ تفسیر بیضاوی کے ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں، ہمارے ہاں (پاکستان) تو جلالین کے بعد بیضاوی کا صرف ایک

پارہ تبرک کے طور پر پڑھا دیا جاتا ہے اور بس، حالانکہ علیحدہ درسگاہوں تک تفسیر میں مدارک تفسیر کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں،

حدیث کی تعلیم جامتی مسلک کے تحت دی جاتی ہے، اور وہ بھی سرسری، درس حدیث میں مختلف فیہ فقہی مسائل (آمین، رفع یدین اور رکعت تراویح و تہجد کی تعداد کی تعیین) میں کئی کئی دن بحث جاری رہتی ہے جبکہ اخلاقی مباحث کا سرسری ذکر ہوتا ہے، اس کے علاوہ میری تجویز ہے کہ حدیث کی جو بھی کتاب پڑھائی جائے وہ کامل اور پوری پڑھائی جائے، مدارس عربیہ کی طرح مختلف کتب حدیث سے مختلف ابواب منتخب کرکے ان کی تعلیم نہ دی جائے، حدیث کے بلاغی پہلوؤں پر شاید ہی کسی کی نظر جاتی ہو، حالانکہ خود عرب ادبا نے عربی زبان و ادب کی تدریس کے لئے حدیث کے مطالعہ کو ضروری قرار دیا ہے، مشہور ادیب اور ناقد ادب ضیاء الدین ابن الاثیر نے المثل السائر میں لکھا ہے کہ اس نے صرف ملکہ انشا حاصل کرنے کے لئے صحاح ستہ کا دس برس تک لگاتار مطالعہ کیا ہے، کرد علی شامی نے مذکرات میں اپنی انشاپردازی کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس نے ادب آموزی کے لئے صحیحین (بخاری و مسلم) کا بارہا مطالعہ کیا ہے،

اگر قدیم فلسفہ کی ایک آدھ معیاری کتاب (مثلاً امام غزالی کی مقاصد الفلاسفہ) شامل نصاب رہے تو مضائقہ نہ ہوگا۔

عربی صرف و نحو کی تعلیم میں بڑا وقت برباد ہوتا ہے۔ اب عربی قواعد سیکھنے کے لئے فارسی کتب (مثلاً نحو میر، فصول اکبری) علم الصیغہ بے مناسب ہیں، آج سے چوتھائی صدی پیشتر مولوی عبدالعزیز میمن مرحوم نے آداب العربیہ کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون مخزن (لاہور) میں لکھا تھا، کتب نحو کے بارے میں ان کے دلچسپ تاثرات ملاحظہ ہوں:

> مجھے اپنے ملک کے نصاب تعلیم پر بھی کچھ کہنا ہے، سو میں کہے دیتا ہوں، بلاد عرب میں صرف و نحو کی تعلیم کے لئے بالتدریج یہ کتابیں مقرر ہیں۔ اجرومیہ، لامیۃ الافعال، ابن عقیل شرح الفیہ، قطر الندی یا شذور الذہب، اور اگر کسی کو خاص شوق ہوا تو التوضیح لابن

جیسلم وشغنی اللبیب، سبحان اللہ! کیا خوب اور سادہ کتابیں ہیں، صاف الفاظ میں قواعد سمجھا کر مثالوں میں ان کو رواں کر دیتی ہیں، جو نحو کا اصل مقصد تھا، مگر ہمارے یہاں تو جو ناموئی کی موشگافیاں، بسم اللہ کی غیر متناہی ترکیب، کافیہ کے جملہ "الکلمۃُ لفظٌ وُضع لمعنیٰ مفردٍ" میں مفرد کے صورسہ گانہ، مسئلۂ الکحل، مسئلۂ الحسنُ الوجہُ پھر شرح جامی کا مسئلہ حاصل ومحصول جو درحقیقت علم نحو ہی سے کچھ سروکار نہیں رکھتا، اعتراضات حقہ رضی بر کافیہ، جوابات باردہ مولوی جامی، یہ سب نحو کے اعضائے رئیسہ قرار دیئے گئے ہیں، جن سے اصل نحو کچھ ایسی غائب ہو گئی کہ سات آٹھ سال تک بھی طالب علم کو اس کا سراغ نہیں ملتا، پھر اب ایسا غوجی سے قاضی مبارک اور صدرا وشمس بازغہ تک تقریباً ان تیس درسی کتابوں کا ذکر کیجیے جو تقریباً عمر گرانمایہ کے چھ سات سال لیتی ہیں اور طالب علم کو اس قابل بنا دیتی ہیں، کہ کسی کا کہنا نہ مانے، اور ہر بات میں بال کی کھال نکالنے کی کوشش کرے اور اپنی زندگی کا حاصل اور مساعی غیر مشکور کا محصول انہی چند اعتراضوں یا جوابوں کو گردانے جو اس نے اپنے استاذ یا کتاب کے برخلاف نہایت دقت آفرینی و دماغ سوزی سے تیار کیے ہیں۔ (مخزن جولائی ۱۹۲۰ء)

مولانا میمن مرحوم ومغفور نے یہ تاثرات آج سے چونسٹھ برس قبل لکھے تھے، میرا آج بھی یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ہمارے یہاں کے نوّے فی صد فارغ التحصیل طلبہ عربی کی عبارت کو صحت اعراب کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے، ایک طالب علم متنبی کا دیوان پڑھ لیتا ہے، لیکن اس کو پتا نہیں چلتا کہ متنبی کون تھا، اور اس کا کیا نام تھا، اس کے کلام پر نقد وتبصرہ تو اونچی بات ہے،

دار العلوم ندوۃ العلماء نے عربی ریڈریں لکھوا کر قابل تحسین کارنامہ انجام دیا ہے، ان میں مولانا محمد رابع ندوی کی منثورات ثانوی درجات میں عربی ادب کی تعلیم کے لئے نہایت مفید ہے۔ اگر اس کتاب میں چند صفحات عربی

اشعار، دیوان ابوالعتاھیہ، دیوان امام شافعی اور کتاب الادب (حماسہ) سے انتخاب) کے بھی شامل کر دیئے جائیں تو یہ کتاب جامع اور مفید تر ثابت ہو سکتی ہے۔

اس زمانے میں عربی میں تقریر و تحریر کی اہلیت اور ضرورت واضح ہے، لیکن ہماری غرض مقصود تفسیر، حدیث اور فقہ میں معرفت اور مہارت ہونی چاہئے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے بیروت کے عیسائی ائمہ لغت و ادب (ابراہیم یازجی، لوئیس شیخو اور لوئیس معلوف اور میخائیل نعیم کو کبھی اہمیت نہیں دی، ہمارے یہاں تو مفتی محمد عبدہ، سید محمد رشید رضا، قاضی احمد محمد شاکر، اور دوسرے علماء ہی مقبول و محترم رہے ہیں، عربی کا دامن قیام قیامت تک اسلام سے بندھا رہے گا، سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ بڑے طلبہ کو عربی اخبارات و رسائل میں ضرورت سے زیادہ انہماک کے بجائے علوم اسلامیہ کی امہات کتب یعنی حقیقی مصادر و مآخذ سے متعارف کرایا جائے اور ان میں علمی تحقیق کا شوق پیدا کیا جائے،

سائنسی معلومات کی ضرورت جتنی آج ہے، اس سے پیشتر کبھی نہ تھی، اس لئے طلبہ کو every-day Science سے بھی واقف کرانا ضروری ہے، یعنی وہ سائنسی معلومات جن کی روزمرہ کی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے۔

عربی کی اعلیٰ تعلیم صرف اُن طلبہ کو دی جائے جو اس کے اہل و قابل ہوں، عام طلبہ کو قرآن مجید کا ترجمہ، مشکوٰۃ اور ایک دو فقہی کتابیں پڑھا کر فارغ کر دیا جائے، مہنگائی کے اس دور میں بد شوق اور کند ذہن طلبہ کی بھیڑ لگانی بے سود ہے، کتابی تعلیم دینے کے علاوہ طلبہ کو تہذیب نفس کی تعلیم دی جائے انھیں سادہ زندگی، قناعت، سیر چشمی اور محنت و مشقت کا عادی بنایا جائے اور انھیں سیاسی جلسوں اور جلوسوں میں شرکت سے روکا جائے، آخر میں ایک اور ضروری بات عرض کرنا چاہتا ہوں، یعنی ہر مہینے میں ایک دو بار بڑے طالب علموں کو مدرسے کے گرد و نواح کے مواضعات اور قصبات میں بھیجا جائے تاکہ وہ اپنے بے علم مسلمان بھائیوں کو موٹے موٹے فقہی مسائل سے واقف کرائیں،

وفیات

آہ! مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم

کراچی سے یہ دکھ بھری خبر ملی کہ مولانا ابوالجلال ندوی، گزشتہ مہینہ ۱۰ محرم ۱۴۰۵ھ کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی آغوش رحمت کے سپرد ہوگئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ وہ دار المصنفین کے علمی خدمت گزاروں میں تھے، ان کا آبائی وطن تو اعظم گڈھ ہی کا ایک گاؤں محی الدین پور تھا، تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء میں پائی، وہاں کے بڑے لائق اور ذی استعداد طلبہ میں شمار ہوتے تھے، ان کی طرف حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نظر اٹھی تو ان کو دار المصنفین میں رفیق کی حیثیت سے بلالیا، اور وہ یہاں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک رہے، انھوں نے یہاں رہ کر ہر قسم کے علوم و فنون میں بڑی گہری نظر پیدا کی، قرآن مجید، تفسیر، حدیث، رجال، فقہ، تاریخ اور ادب کے علاوہ ویدگیتا، اپنشد اور اس قسم کی ہندوؤں کی مذہبی کتابوں پر بھی ان کو بڑی دسترس حاصل تھی، وہ شاعر بھی تھے، اور کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے، دار المصنفین کے قیام میں معارف کے لئے حسب ذیل مضامین لکھے عربی زبان کا فلسفہ لغت (ستمبر ۱۹۲۷ء) سر اکبر اپنشد دارا شکوہ کا ترجمہ (دسمبر ۱۹۲۷ء و جنوری ۱۹۲۸ء) اسلامی شمسی قمری سال (فروری ۱۹۲۸ء) دروزیوں کا مذہب (اپریل ۱۹۲۸ء) مستدرک حاکم کا مطبوعہ نسخہ (جولائی اگست ۱۹۲۸ء) ان کو علم اشتقاق پر کتاب لکھنے کے لئے کہا گیا تھا، لیکن اس کو وہ پورا نہ کرسکے، ان کی طبیعت میں بڑا انتشار تھا، اسی لئے ان کا علم و فضل بھی منتشر رہا، جن کو وہ اس طرح سمیٹ نہ سکے، جیسا کہ ان کو کرنا چاہئے تھا، وہ دار المصنفین سے مدراس چلے گئے، جہاں جمالیہ کالج کے لائق مدرس شمار کئے جاتے تھے، وہاں بھی ان کا بہت دنوں تک قیام نہیں رہا، پھر ایک ہفتہ وار اخبار نکالا، اس کے ایڈیٹر ہونے کی حیثیت سے بھی، بڑی مقبولیت حاصل کی، مگر اس اخبار

سے بھی زیادہ دنوں تک وابستہ نہیں رہ سکے، مدراس میں متفرق کام کرتے رہے، اور وہاں کے لوگوں نے ان کی علمی صلاحیتوں سے پورا استفادہ کیا،

سنہ ۱۹۴۶ء میں دار المصنفین پھر چلے گئے، اس وقت تک ان کے علم میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا ہو چکی تھی، جس موضوع پر بولتے سننے والوں پر اپنی غیر معمولی علمی تاریخی، ادبی اور مذہبی معلومات کا گہرا اثر پیدا کرتے، بعض اوقات جی چاہتا کہ وہ بولتے رہتے اور ہم لوگ سنتے رہتے، ان کی گفتگوئیں قلم بند کر لی جاتیں تو وہ علمی جواہر ریزے ہو جاتے، وہ اپنے مافی الضمیر کو تو بڑی خوبی سے بولتے وقت ادا کر دیتے اور اس کے لئے ان کے پاس، الفاظ ہاتھ جوڑے کھڑے ہوتے، لیکن یہ علم و فن کی بڑی محرومی رہی کہ جب وہ کسی موضوع پر لکھنے بیٹھتے تو لکھتے چلے جاتے، اور ان کے قلم کی روانی کہیں نہیں رکتی، یہاں تک کہ ایک موضوع پر دو ڈھائی سو صفحے تک لکھ جاتے جن میں اپنی بے پناہ معلومات کی بنا پر موضوع سے ہٹ کر بہت سی غیر متعلق باتیں آ جاتیں، وہ جو کچھ لکھتے اس سے خود غیر مطمئن رہتے، پھر اس میں کانٹ چھانٹ کرنے لگتے، یہاں تک کہ اپنے دو سو صفحوں کی تحریروں کو چالیس پچاس صفحوں میں قلم بند کر دیتے، یہ اختصار بھی ان کو پسند نہ آتا اور خود کہتے کہ یہ اتنا مختصر ہو گیا کہ بہت سی مفید باتیں اس میں نہیں آ سکیں، اس سے بد دل ہو کر ان صفحوں کو ادھر ادھر ڈال دیتے جو بعد میں تلاش کرتے تو ان کو خود نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کہاں رکھے ہوئے ہیں، اس طرح معلوم نہیں ان کی کتنی علمی تحریریں ضائع ہو گئیں، دار المصنفین کے قیام میں کبھی ایسا بھی موقع آیا کہ وہ جو کچھ لکھتے ان کو لے کر پھر مرتب کر دیا جاتا اور وہ معارف میں شائع ہو جاتا، ان کے ذہن کی اس انتشار پسندی اور قلم کے بے پناہ کاوش ہی کی وجہ وہ کسی موضوع پر کوئی خاص کتاب نہ لکھ سکے، لیکن ان کی جو بھی تحریر معارف میں شائع ہوتی، اس پر اہل فن کی نظر ضرور اٹھتی، معارف میں ان کے ایک مضمون کو پڑھ کر پیرس سے ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھ بھیجا تھا کہ دار المصنفین کے علمی افق پر یہ کہاں سے درخشندہ ستارہ طلوع ہوا ہے،

دار المصنفین کے دوبارہ قیام کے زمانہ میں معارف میں ان کی حسب ذیل تحریریں نکلیں، معجزۂ شق القمر کا ذکر قرآن مجید میں (نومبر ۱۹۴۶ء) ۲۔ احادیث عاشورا (اگست ۱۹۴۸ء) ۳۔ تدوین الکلام (جولائی ۱۹۴۹ء) بکہ مبارکہ (اگست ۱۹۴۹ء) المروم [illegible]

السامری، جولائی سنہ ۳۷ء، حضرت ایوب، اگست و ستمبر سنہ ۳۹ء، ہنگ شیام، اکتوبر و نومبر سنہ ۴۰ء، تاریخ یمن کی ایک مسکوکہ، نومبر سنہ ۴۱ء، کتبات حصن غراب، دسمبر سنہ ۴۱ء، تاریخ بابل، جولائی سنہ ۴۲ء، ہاروت و ماروت، اگست سنہ ۴۲ء، تاریخ یمن کا ایک ورق، اکتوبر و نومبر سنہ ۴۳ء، داستان خلیل، بابل قدیم سے ایک صحیفہ کی روایت، مارچ سنہ ۴۵ء، اصحاب الاخدود، جولائی سنہ ۴۸ء، اصحاب الفیل کا واقعہ اور اس کی تاریخ، اکتوبر و نومبر سنہ ۵۰ء، اسی زمانہ میں حضرت سید صاحب نے ان کو اعلام القرآن پر ایک کتاب لکھنے کو کہا، لیکن وہ مکمل نہ کر سکے، اسی میں سے کچھ حصے مذکورۂ بالا مضامین کی شکل میں شائع ہوئے، ان کو کتبات پڑھنے میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی، کتبہ کسی زبان کا اور کتنا ہی پیچیدہ اور گنجلک ہوتا اس کو فر فر پڑھ لیتے، اسی سلسلہ میں عبرانی اور دوسری زبانوں میں بھی دسترس حاصل کی، ان کے اس وصف پر لوگ متحیر رہتے، اور اس وصف کی بنا پر وہ اس برصغیر میں کیا، بلکہ پوری دنیا میں بڑا نام حاصل کر سکتے تھے، مگر نام و نمود کی فکر ان کو بالکل نہیں رہی، دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھکر خود ہی اپنے علم و فضل سے لذت اٹھاتے رہے، اور اس کی ان کو کبھی فکر لاحق نہیں ہوئی کہ ان کو کیا ہونا چاہئے تھا اور کیا نہیں ہو سکے، طبیعت میں بڑی خودداری تھی کردار میں بڑی پختگی رہی، جو رائے قائم کر لیتے اسے دنیا کی کوئی قوت ان کو ہٹا نہیں سکتی تھی، ہندوستان میں جب تک رہے آل انڈیا نیشنل کانگریس کی تحریکوں کے مداح رہے، اور اپنی اس مداحی کی بنا پر نقصانات بھی اٹھائے، لیکن وہ سود و زیاں سے بالاتر ہو کر زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے تھے، اس لئے لوگ ان کو کیا سمجھتے ہیں اس سے کبھی پریشان نہیں رہے اپنی دنیا الگ بنا کر اسی میں آباد رہ کر خوش رہے،

ان کی تین لڑکیاں تھیں، ایک ولادِ نرینہ بھی تھی، ان لڑکیوں کی شادی کراچی میں ہو گئی، تو وہ بھی کراچی منتقل ہو گئے جہاں وہ کبھی کبھی علمی رسائل میں مضامین لکھا کرتے تھے، موہن جوڈارو کے تقریباً دو ہزار کتبات پڑھ کر وہاں کے لوگوں کی مدد کی، لیکن وہاں کی سرزمین سے اپنے علم و فضل کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، یہ ناکسار جب کراچی جاتا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور ان کی علمی گفتگو سے استفادہ کرتا، کوئی موضوع چھیڑ دیا جاتا تو وہ بولتے چلے جاتے، رکنے کا نام نہیں لیتے، گزشتہ اپریل میں ان کی خدمت میں ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا تھا، آنکھوں کی بینائی بہت ہی کم ہو گئی تھی، لکھنے پڑھنے سے بالکل معذور ہو چکے تھے، ان کی بڑی تمنا تھی کہ کوئی ایسا آدمی مل جاتا کہ جو کچھ ان کے سینہ میں تھا، اس کو

یوں کر سفینہ میں منتقل کر دیتے، لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی، یہ خاکسار جب ان کے پاس پہنچا تو گفتگو میں کلام پاک کی ایک آیت کا ذکر آگیا تو اس کی تفسیر بیان کرنے لگے، اس کو سن کر یہ خیال ہوا کہ یہ ان کے افادات بغیر قلمبند ہونے کی وجہ سے ضائع ہو کر رہ جائیں گے، کراچی کے لیاقت کالج کے پرنسپل جناب سید فخر الحسن صاحب نے ان کو قلمبند کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی گفتگو کی روانی کا ساتھ جناب سید فخر الحسن کا قلم نہ دے سکا، ان سے رخصت ہوا تو خیال آیا کہ علم و فضل، فن تعبیر کا ایک مجموعہ کراچی کے ایک گمنام گوشۂ تنہائی میں مقید ہو کر رہ گیا، اور ان کے بعد وہ ساری چیزیں بھی ان کے ساتھ سپرد خاک ہو جائیں گی، اور جب ان کی وفات کی خبر ملی تو ان کی آخری ملاقات برابر یاد آرہی ہے، اور بار بار یہ خیال آتا ہے کہ دنیا سے کیا ہو کر ان کو رخصت ہونا چاہئے تھا، اور کیا ہو کر رخصت ہوئے، دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک اور حدیث مقدس میں ان کی نکتہ رسی اور دیدہ وری کی بدولت ان کو اپنی آغوش رحمت میں لے کر کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائے، آمین!

ڈاکٹر عبد اللطیف مرحوم

کراچی سے جناب ظفر اللہ صاحب کا ایک تار ملا کہ ان کے والد بزرگوار جناب ڈاکٹر محمد عبد اللطیف اللہ کو پیارے ہو گئے، اس خبر سے انتہائی دکھ ہوا کہ شرافت، اخلاق، مروت، اخلاص، مہمان نوازی اور کار خیر کا ایک مجسمہ اب وہاں ہے جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، ان کا آبائی وطن تو مدھیہ پردیش تھا، مگر تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے، پیشے کے لحاظ سے وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے، پاکستان سے وہ کویت چلے گئے، جہاں تقریباً پچیس سال مقیم رہے اور اپنے طبی فن کی وجہ سے بڑی ناموری حاصل کی، اور خدا جانے کتنی دولت پیدا کی، دولت سے تو ان کو لگاؤ کم رہا لیکن کار خیر کرنے سے بڑی محبت رہی، وہ جتنا زیادہ کماتے، اس سے زیادہ اس پر صرف کرتے، بلکہ دنیا کے مختلف حصوں کے دینی مدرسوں اور اداروں کی خدمت کرتے، اور جتنی زیادہ وہ خدمت کرتے، اتنی ہی زیادہ ان کی دولت میں برکت ہوتی، کار خیر کرنے میں ان کو جو لذت ملتی، وہی ان کا سرمایۂ زندگی بنتی رہی، علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور دار المصنفین کی مطبوعات

اور معارف کے بڑے قدر داں رہے، دار المصنفین کی ساری کتابیں اپنے یہاں جمع کر رکھی تھیں، اور ان کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کرتے، معارف پہنچنے میں تاخیر ہوتی تو بے چین ہو جاتے، اور کسی مہینہ نہیں پہنچتا تو تار بھیج کر منگواتے، کراچی میں بڑی عالیشان کوٹھیاں بنا رکھی تھیں، لیکن خود ان کی ذاتی زندگی بڑی سادہ رہی، سادہ لباس پہنتے، اور اپنی گفتگو میں اس کا اظہار نہ ہونے دیتے کہ وہ کیا ہیں، عجز، انکسار، تواضع، خلق، سخاوت اور فیاضی کا مجموعہ بن کر زندگی گزاری، مذہبی کتابیں پڑھتے، اور مذہبی باتیں سننے کے لئے بے چین رہتے، یہ خاکسار جب جب کراچی گیا، تو قیام گاہ پر آکر بڑی شفقت و محبت سے ملتے، اپنے دولت کدہ پر بلاتے اور دیر تک بٹھائے رکھتے، اپنے ملنے والوں کو بھی بلا لیتے اور دیر تک مذہبی گفتگو کو موضوع بنائے رکھنے میں اپنی زندگی کا راس المال سمجھتے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں اور کار خیر کے بے پناہ جذبات کی بدولت ان کو اپنی رحمتوں کے کوثر اور برکتوں کی تسنیم سے سیراب کرے، آمین ثم آمین۔

آہ! شاہ نصر احمد پھلواروی مرحوم

معارف کا یہ رسالہ چھپ رہا تھا کہ اخبار کے ذریعہ شاہ نصر احمد کی انتہائی المناک وفات کی خبر ملی اس سانحہ کی خبر سننے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا، ان کی عمر مشکل سے تیئیس چوبیس سال رہی ہوگی، یہ تحریر لکھتے وقت ان کا چہرہ یاد آ رہا ہے، جس پر معصومیت، طہارت، مذہبیت، محبت، مروت اور اخلاق کے جتنے آثار ہو سکتے تھے، ان سب کے انوار ان پر جھلکتے نظر آتے تھے، وہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے جناب مولانا شاہ عون احمد قادری کے بڑے صاحبزادے تھے، اس تعلق کے علاوہ وہ دار المصنفین میں بھی آکر دو سال رہے، اپنی نیکی اور اخلاص کا جو نقش یہاں کے لوگوں پر چھوڑ گئے ہیں وہ مدت مدید تک یاد رہے گا، وہ یہاں اس غرض سے آئے تھے کہ یہاں رہ کر کچھ سیکھیں لیکن اپنی کم سنی کے زمانہ میں انھوں نے معارف میں علامہ الحرمین پر تین قسطوں میں جو مضمون لکھا، اس پر برصغیر کے تمام ارباب فن کی نظر اٹھی، اور ان کا خیال تھا کہ یہ کسی تجربہ کار اہل قلم اور دیدہ ور عالم کا لکھا ہوا ہے لیکن جب ان کو بتایا جاتا کہ اس کے لکھنے والے کی عمر کیا ہے، تو ان کو یقین نہیں آتا، اس مضمون سے اندازہ ہو گیا تھا کہ

آئندہ علم کی ایک بے پناہ قوت ہندوستان کی علمی دنیا میں ابھر کر رہے گی، لیکن ان کو خود خیال تھا کہ ان میں ابھی بہت کچھ کمی رہ گئی ہے، اس لئے اس کو پورا کرنے کے لئے وہ دارالعلوم ندوۃ العلما مزید تعلیم کے لئے چلے گئے، جہاں انھوں نے تین سال رہ کر وہاں کی تعلیم کی تکمیل کی اور ادب میں تخصص کیا، اسی زمانہ میں ان کی شادی بھی ہو گئی تھی، اور جب وہ گلشن علم میں نسیم نوبہاری بن کر ہر طرف پھیلتے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی مصلحت کی بنا پر ان کو اپنے پاس بلا لیا، وہ اپنی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت جنت الفردوس کی سیر ضرور کریں گے، لیکن ان کے نے پھلواری شریف کا تپہ تپہ، بوٹا بوٹا، خدا جانے کب تک سوگوار رہے گا، ان کے والدین پر اس سانحہ سے جو کچھ گزر رہا ہوگا، اس میں دارالمصنفین کے رفقاء بھی ہر طرح شریک غم ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صبر جمیل کی توفیق دے، اور مرحوم کو اعلیٰ علیین میں وہ ساری نعمتیں حاصل ہوں جو اللہ تعالیٰ کے نیک اور پاکیزہ بندوں کو حاصل ہوا کرتی ہیں آمین (ص ع)

بزم رفتگاں

یہ مصنف کے بعض بزرگوں، دوستوں، معاصر دانشوروں، ادیبوں، مصنفوں اور سیاسی رہنماؤں کی وفات حسرت آیات پر تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے، جن سے ان کو والہانہ محبت اور عقیدت تھی جس کو انھوں نے اپنے والد مرحوم جناب سید محی الدین رحمہ اللہ اور اپنی والدہ محترمہ جناب سلمہ خاتون رحمہا اللہ کے نام معنون کیا ہے،

حصہ اول میں جو مکتبہ جامعہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالسلام ندوی جیسے وقت کے ارباب کمال کی وفات پر مضامین ہیں، اور حصہ دوم میں مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت نہرو، ذاکر صاحب، ہمایوں کبیر، فخرالدین علی احمد، مولانا عبدالماجد دریابادی، ماہر القادری، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر محمد اسحاق وغیرہ جیسے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مشاہیر و اکابر کے انتقال پُرملال پر مضامین ہیں،

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن جلد اول ۱۷ روپیہ جلد دوم ۱۷ روپے

مطبوعات جدیدہ

تذکرہ مصلح الامت مرتبہ مولانا محمد قمر الزماں صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات تین سو بیس (۳۲۰) مجلد، قیمت تیس (۳۰) روپیے، پتے:- (۱) مکتبہ عزیزیہ ۵۳ بخشی بازار، الٰہ آباد، (۲) مکتبہ اشرفیہ ۳۷۷ محمد علی روڈ، بمبئی ۳ (۳) ادارہ علم وحکمت، دیوبند،

مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی ذات رشد وہدایت کا ایک روشن چراغ تھی، اور وہ اس دور کے ایک بڑے شیخ طریقت تھے، جو سالکین کی اصلاح وتربیت میں اپنے مرشد حضرت مولانا تھانویؒ کا مثنیٰ تھے، الٰہ آباد اور وقتاً فوقتاً بمبئی میں قیام کے زمانہ میں انکا دائرۂ فیض بہت وسیع ہوگیا تھا، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا بھی ان کے یہاں رجوع ہوتا تھا، یہ کتاب مولانا کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے، اسمیں انکے خاندان، زندگی، تعلیم، مرشد تھانویؒ سے تعلق، اصلاح وتربیت کے طریقے اور اس سلسلہ میں انکی متعدد تبلیغ وارشاد کی مجلسوں، اصلاحی تقریروں، سلوک، تصوف کے بارہ میں اہم خیالات، روزمرہ اشغال ومعمولات اور انکے خلق عظیم ولطف عمیم کی تصویر کھینچی گئی ہے، اور علالت ووفات کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، لائق مرتب نے مولانا کے پسندیدہ عربی، فارسی اور اردو اشعار بھی نقل کئے ہیں، اور انکے پسماندگان، خلفاء اور تصنیفات کی فہرست بھی دی ہے، آخر میں بعض تعزیتی خطوط درج ہیں، جن سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے، مولانا درس وتدریس کے مشغلہ سے بھی وابستہ رہے، اور آخر تک بعض امہات کتب کا درس دیتے رہے، ان کی سرپرستی میں الٰہ آباد میں ایک عربی مدرسہ بھی قائم ہوا تھا، وہ نصاب کے بارہ میں قدامت پسند نہ تھے، بلکہ ندوۃ العلماء کی تحریک اصلاح نصاب سے متاثر تھے، جس کے نصاب کی بعض کتابیں ان کے مدرسہ میں داخل ہیں، وہ اس کے شاکی تھے کہ مدارس میں جتنی توجہ احادیث کی طرف دی جاتی ہے، اتنی توجہ قرآن مجید کی طرف نہیں دی جاتی، اس کا ترجمہ نہیں کرایا جاتا اور کتب تفسیر کو بھی کم پڑھایا جاتا ہے، اس کتاب میں خود مولانا کی تحریروں اور ملفوظات کی روشنی میں ان کی تعلیمات وہدایات اور سلوک وعرفان کے متعلق ان کے پاکیزہ خیالات پیش کئے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دراصل اکابر مشائخ کے سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی اور حضرت تھانویؒ کی سچی یادگار تھے، اس لئے مروجہ رسمی تصوف سے

پیر تھا اور اس تصوف و احسان کے داعی تھے جو دین و شریعت میں مطلوب ہے، وہ شیخ کے بجائے خدا کو مقصود بنانے کی تلقین کرتے تھے (صفحہ ۲۴) ان کے نزدیک تصوف کوئی مستقل شئی نہیں (صفحہ ۱۶۷) بلکہ اصل چیز تو کتاب و سنت ہے (صفحہ ۱۲۳) ان کے خیال میں کتاب و سنت کے بجائے اقوالِ مشائخ کو معیارِ حق و باطل بنانے سے نظامِ دین درہم برہم ہوگیا ہے (ص ۱۱) وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ کشف کوئی دلیلِ شرعی نہیں ہے (صفحہ ۹) اور طریقت کو شریعت سے الگ چیز قرار دینا جہل ہے (صفحہ ۹۹) وہ کہتے ہیں کہ تصوف ایک مستقل فن ہوگیا اور اس کی صورت جوگ کی سی ہوگئی (صفحہ ۱۱۵) مصنف نے یہ کتاب بڑی عقیدتمندی سے لکھی ہے اور اس سے دین و شریعت اور سلوک و تصوف کے متعلق ایسی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے روح میں بالیدگی اور قلب میں اپنی اصلاح کا داعیہ پیدا ہوتا ہے مگر یہ کوئی منضبط و مرتب سوانح عمری نہیں ہے، مضامین میں انتشار کے علاوہ مکررات بھی بکثرت ہیں۔

الانصاف فی حدود الاختلاف:۔ مرتبہ مولانا سید خلیل حسین میاں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۷۶، قیمت دس روپے، ناشر شعبۂ تصنیفات علیہ مکتبۂ اسلامیہ اصغریہ دار المسافرین، دیوبند، یوپی۔

دار العلوم دیوبند کے افسوسناک اختلاف کی وجہ سے وہاں کے دو گروہوں میں طعن و تشنیع، سب و شتم اور اشتہار بازی وغیرہ کا سلسلہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی زندگی ہی میں شروع ہوگیا تھا، جس کا انھیں خاص طور پر بہت دکھ اور ملال تھا، یہ کتاب حضرت کے ایک مرید باصفا نے اسی اختلاف کے پس منظر میں بڑی دردمندی سے لکھی ہے، جس میں مثبت و منفی دونوں پہلوؤں سے اہلِ ایمان کے اوصاف و خصائل بیان کرکے دکھایا ہے کہ سخت کشمکش اور شدید نزاع کی صورت میں بھی اہلِ حق اور علمائے ربانی کا شیوہ کیا ہوتا ہے، مصنف نے باہمی اتفاق، مومن کی خیرخواہی اور اس کے ساتھ حسن خلق اور خوش گمانی کی تاکید اور اس کی پردہ دری و عیب جوئی، توہین و تحقیر، غیبت و بدگوئی،

بدگمانی اور بدسلوکی اور تفرقہ و انتشار کی مذمت سے متعلق آیتوں اور حدیثوں کے علاوہ حضرت شیخ کی تحریروں کے اقتباسات بھی دیئے ہیں، جو بہت موثر اور مفید ہیں۔

صلیبیں مرے دریچے میں:۔ از جناب فیض احمد فیض صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت سولہ روپئے، ناشر مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۷ سندری موہن ایونیو، کلکتہ ۱۴

جناب فیض احمد فیض موجودہ دور کے مشہور و مقبول شاعر ہیں، ان کی فرمانروائی نظم کی طرح نثر پر بھی ہے، حکومت پاکستان نے ۵۱ء سے ۵۵ء تک انھیں قید و بند میں رکھا، اس اسیری کے زمانہ میں انھوں نے اپنی بیوی کو انگریزی میں جو خطوط لکھے تھے ان کا اردو ترجمہ خود فیض صاحب ہی نے مرزا ظفر الحسن صاحب کی فرمایش پر کیا تھا اور وہ پہلی دفعہ ان کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر ۷۱ء میں شائع ہوا تھا، اب مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے ادبی خدمت کے جذبہ سے اس کا نیا اڈیشن شائع کیا ہے، تاکہ فیض صاحب کے ہندوستانی قدرداں بھی اس کا مطالعہ کر سکیں، ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ مکتوب نگار کی گرفتاری پر ان کی اہلیہ بہت ملول اور افسردہ تھیں اس لئے ان کی گھبراہٹ اور اضطراب دور کرنے کے لئے ان خطوط میں جیل کی بے کیف، صبر آزما اور پر مشقت زندگی کو بھی خوشگوار بتایا گیا ہے، اس سے مکتوب نگار کے عزم، استقلال اور مضبوط قوت ارادی کا پتہ چلتا ہے، ان خطوط میں فیض صاحب کے مطالعہ کی کتابوں اور ان کے مندرجات اور بعض مشہور ادیبوں کا ذکر بھی آگیا ہے اور کہیں کہیں انھوں نے اپنی بیگم کی تحریروں پر تبصرہ کیا ہے اور انھیں زندگی کے عام امور و مسائل کے بارہ میں مشورے بھی دیئے ہیں، اس مجموعہ میں زنداں کے ماحول، عام حالات، موسم، پھولوں اور باغبانی وغیرہ کا تذکرہ اور اپنے بعض تاثرات، محسوسات، خیالات اور تجربات بھی تحریر کئے ہیں، گو ان خطوط میں نہ تو علم و ادب کے اہم امور و مسائل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے اور نہ یہ بہت غور و فکر سے لکھے گئے ہیں، تاہم ان میں بیساختگی، روانی اور بے تکلفی بھی ہے اور

کہیں کہیں مکتوب نگار کے طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ اس سے ان میں قارئین کی دلچسپی کا سامان بھی ہے اور ان سے فیض صاحب کے سوانح نگار کو بھی مدد ملے گی، مگر زبان و بیان کے معاملہ میں وہ زیادہ محتاط نہیں ہیں اور یہ خطوط تو خود ان کے بقول قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں اور "منہ زبانی" ان کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس لئے ان کی زبان کی کوتاہی کی ذمہ داری انھوں نے مرزا ظفر الحسن صاحب کے سر ڈالی ہے۔ اس قسم کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے تاکہ آئندہ اڈیشن میں تصحیح کرلی جائے۔ "اور بہت سی محنت اور تلاش کے بغیر انھیں اردو میں منتقل کرنا محال ہے" (صفحہ ۱۰۷) "بہت ہی خوش دل مجمع ہے" (صفحہ ۳۵) "جو بھی دوست ہاتھ آئے اسے سلام پہنچا دیا" (صفحہ ۶۷) "تمھارے خط پہلے سے زیادہ بشاش معلوم ہوتے ہیں" (صفحہ ۴۹) "میری کوٹھری کی سلاخوں پر دھوپ اور ہوا کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے" (صفحہ ۵۶) "آج من کی کیفیت بہتر ہے اور شاید جلد ہی کچھ لکھا جاسکے" "درد ذہ کے ہلکے سے آثار محسوس ہو رہے ہیں" (صفحہ ۱۳۷) "اسی دوران میں اماں اور آپا یہاں آئے تھے" (صفحہ ۹۵) مندرجۂ ذیل جملوں میں غالباً پنجابی بولی کا اثر ہے "اور ہم نے بہت احسان مند محسوس کیا" (صفحہ ۱۰۷) "جیل خانے میں اس کیفیت کے لئے آدمی کچھ احسان مند محسوس کرتا ہے" (صفحہ ۱۵۶) "اور دل دونوں کے لئے احسان مند محسوس کرتا ہے" (صفحہ ۱۸) "بلکہ نفسیاتی الجھنوں سے ایذا طلبی کا وہ شدید جذبہ بھی سمجھ میں آتا ہے" (صفحہ ۲۱) "تمھارے نتائج کا سن کر بہت خوشی ہوئی" (صفحہ ۳۹) "تمھارے نیگرو شاگرد کا سن کر خوشی ہوئی" (صفحہ ۶۶) "حفیظ کی نظم کا سن کر خوشی ہوئی" (صفحہ ۷۹) اس طرح کے جملے متعدد ہیں۔ بارشیں (صفحہ ۲۹) شامیں (صفحہ ۲۹۲، ۲۴۴، ۱۱) صبحیں (صفحہ ۲۱۶) صبحوں (صفحہ ۱۰۶) روشنیاں (صفحہ ۲۱) وغیرہ جمع کا استعمال بھی گراں معلوم ہوتا ہے، اگرچہ بعض افسانہ نگار، شاعر اور اخبار نویس اس قسم کی جمع بے تکلف استعمال کرنے لگے ہیں اور بعض شاعروں کے یہاں بھی ایسی جمع استعمال ہوتی ہے، مثلاً عشق کا ایک شعر ہے

گردوں نے دکھائیں نئی صبحیں نئی شامیں
کی عرض کہ بابا ہوں عجب رنج و بلا میں

لیکن فصحا ایسی جمع لکھنے سے احتراز کرتے ہیں، لا متناہی کو کئی جگہ لا امتناہی لکھا ہے، جو شاید کتابت کی غلطی ہو۔

"ض"

ہندستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ملکی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار یا پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب دارالمصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدانِ جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت :- ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

"منیجر"

No. ... MAARIF NO ...

... 1964 ... New Delhi

حجۃ الاسلام مولانا شبلیؒ کی بعض اہم تصنیفات

سیرۃ النبی حصہ اول: اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
ولادت باسعادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات، غزوات
کی تفصیل اور اس پر تبصرہ، قیمت: ۲۹ روپیہ،

سیرۃ النبی حصہ دوم: اقامتِ امن، تاسیسِ خلافت، اور
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و شمائل کا
مفصل بیان قیمت: بیس روپیہ

الفاروق حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانحعمری
اور اُن کے مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل مولانا
شبلی کے قلم کی شاہکار کتاب، جس پر مصنف کو بھی
ناز تھا، قیمت: ۲۲ روپیہ

الغزالی حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی
سوانحعمری اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل، اُن کی
تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ، قیمت ۱۱ روپیہ،

المامون خلیفہ مامون الرشید کی سوانح حیات
کے علاوہ اس کے عہدِ حکومت کے سیاسی علمی مذہبی
اخلاقی تمدنی حالات، جن سے دولتِ عباسیہ بغداد کے
عروج و کمال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے
قیمت: ۱۱ روپیہ،

سیرۃ النعمان: امام ابو حنیفہؒ کی سوانح عمری،
ان کے مجاہدات سے استنباط مسائل اور فقہ
حنفی کی خصوصیات (زیر طبع)

سوانح مولانا روم: مولانا جلال الدین رومی
کی مفصل سوانحعمری اور ان کی شاہکار تصنیف مثنوی
شریف پر مبسوط تبصرہ، (زیر طبع)

موازنۂ انیس و دبیر: مشہور مرثیہ نگار میر انیس کی
شاعری پر ریویو اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ،
زیر طبع

کلیاتِ فارسی: مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ
قیمت: ۱۱ روپیہ،

کلیاتِ اردو: مولانا کی تمام اردو نظموں کا
مجموعہ جو انھوں نے مسجد کانپور، جنگ طرابلس
غزوۂ بلقان، مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے
متعلق لکھیں، قیمت: ۶ روپیہ،

مکاتیبِ شبلی: مولانا کے دوستوں، عزیزوں اور
شاگردوں کے تمام خطوط کا مجموعہ حصہ اول و حصہ دوم
۱۹ روپیہ، [illegible] روپیہ

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

(۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

۱- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی   ۲- ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ

۳- مولانا ضیاء الدین اصلاحی   ۴- سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک بیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں،   قیمت :- ۱۰ روپیہ

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں،   قیمت :- ۱۰ روپیے

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں،   زیر طبع

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

Dr. Zakir ... Delhi

جلد ۱۳۴ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۴ء عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

ادبیات

معذرت

اس مہینہ میں ملک کی انتخابی مہم کی
وجہ سے یہ رسالہ خلاف توقع دیر کر کے روانہ
کیا جا رہا ہے، جس کے لیے ادارہ معذرت
خواہ ہے، کاغذ ملنے میں تاخیر ہوئی، بینک اور
ڈاکخانے بھی بند رہے،

شذرات

استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت نومبر ۱۸۸۴ء میں ہوئی تھی، ۱۹۸۴ء میں ان کے عقیدت مندوں اور پرستاروں نے مختلف جگہوں پر ان کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب منائی۔

پیرس سے مکرمی المحترم جناب ڈاکٹر حمید اللہ نے اطلاع دی کہ وہاں ۲۰ نومبر کو حضرت سید صاحبؒ پر ان سے ٹیلی ویژن پر ایک تقریر کرنے کو کہا گیا ہے، کراچی سے جناب سید فخر الحسن صاحب پرنسپل لیاقت علی خاں ڈگری کالج نے خبر دی کہ ان کے کالج کے زیر اہتمام بڑے پیمانہ پر یہ تقریب منائی جارہی ہے، ڈاکٹر محمد شمیم نے بھی کراچی سے لکھا کہ وہاں ایسوسی ایشن کی طرف سے بھی یہ منعقد ہو رہی ہے، ان تقریبات کی تفصیلات ابھی موصول نہیں ہوئی ہیں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو کی طرف سے بھی ایک سمینار ۲۴-۲۵ نومبر کو ہوا، پھر ۱-۲-۳ دسمبر کو بہار اردو اکیڈمی پٹنہ کی طرف سے بھی ایک باوقار اجتماع ہوا، دار المصنفین کی طرف سے بھی دار العلوم ندوۃ العلماء کے تعاون سے یہ صد سالہ سالگرہ جلد ہی منائی جانے والی ہے، اس کی تفصیلات طے ہو جائیں تو تاریخوں کا اعلان کیا جائے گا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سمینار کے متعلق یہ خیال تھا کہ یونیورسٹی کے پیمانہ پر ہوگا، لیکن یہ وہاں کے شعبہ اردو ہی تک محدود رہا، بعض اسباب کی بنا پر اس کی فضا مکدر رہی، جس روز یہ خاکسار شرکت کیلئے علی گڑھ پہنچا تو وہاں کے تہذیب الاخلاق کا تازہ شمارہ ہر ایک کے ہاتھ میں دیا گیا، اس کے ایک مضمون کی سرخی یہ تھی، سیرۃ النبی جلد اول و دوم کا مصنف کون؟ علامہ شبلی نعمانی یا مولانا سید سلیمان ندوی، اس کو دیکھتے ہی ایک صاحب بولے یہ دل جلانے والی سرخی ہے، سمینار شروع ہونے سے پہلے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد کی توجہ دلائی، کیونکہ وہ اس رسالہ کے مدیر ہیں، اس سرخی سے ان کو بھی تکلیف پہنچی، جب سمینار کا افتتاح جناب نواب عبید الرحمن خاں

شروانی پر وہ ... جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں تہذیب و ثقافت کے مضمون کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرکے وہاں کے شائقین ادب ... طرح محظوظ ہوسکے۔

سیمینار کے مقالات کے یہ عنوانات تھے: سیرۃ النبی میں مولانا سید سلیمان ندوی کے اضافے از ڈاکٹر ظہیر حسین صدیقی شعبہ اسلامیات مسلم یونیورسٹی، مولانا سید سلیمان ندوی ... از مولانا عبدالسلام خان ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا سید سلیمان ندوی کا اسلوب از ڈاکٹر نورالحسن صدیقی شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، امیر قاضی میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی انشاپردازی، از خاکسار راقم، مولانا سید سلیمان ندوی کی لسانی تحقیقات از ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، مولانا سید سلیمان ندوی اور تصوف از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی۔

علی گڑھ کے قیام میں اس مرتبہ ڈاکٹر اصغر عباس ریڈر شعبہ اردو نے ہر طرح کی خاطر مدارات کی، انھوں نے جناب رشید احمد صدیقی مرحوم پر یونیورسٹی میگزین کا جو خصوصی نمبر تیار کیا ہے اس کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی، انکی محنت اور خوش سلیقگی کی داد دی، جناب پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے سرسید نگر میں ایک خوبصورت مکان بنوایا ہے انھوں نے وہاں بلاکر نواب عبیدالرحمن خان شروانی اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ساتھ ایک بہت ہی خوشگوار شام گزارنے کا موقع فراہم کیا، وہیں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت جلد پنجم کا ایک نسخہ مرحمت کیا جسکی ترتیب، تدوین، کتابت اور طباعت پر علم و فن کو ناز ہوسکتا ہے، پروفیسر خلیق احمد اپنے تصنیفی سلیقہ اور فن میں اس اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں پہنچنا کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، شعبہ اسلامیات کے ڈاکٹر اقبال انصاری اپنی دیرینہ روایات کے ساتھ پیش آئے، ان ہی کے ساتھ انکے شعبہ کے اساتذہ سے ملاقات ہوئی، ان سے مل کر بہت اچھا وقت گزرا، وہیں ڈاکٹر محمود راشد ندوی سے بھی ملاقات رہی جو اب شعبہ عربی کے پروفیسر ہوگئے ہیں،

علی گڑھ سے واپسی پر فوراً ہی بہار اردو اکیڈمی کے سیمینار کیلئے پٹنہ روانہ ہوا، ساتھ مولوی ضیاء الدین اصلاحی، مولوی ابوالبقا ندوی اور حافظ عمیر الصدیق ندوی اور مولوی عبدالباری تھے، یہ سیمینار پٹنہ میں منعقد کیا گیا تھا، اسکے روح رواں جناب سید شاہ عطاء اللہ ... تھے جو اس وقت بہار اردو اکیڈمی کے نائب چیرمین ہیں، وہ ہر کام کو بڑی خوش سلیقگی سے انجام دینے میں ماہر ہیں جسکا اظہار اس موقع پر بھی ہوتا رہا، انکے پر مغز اور جامع خطبہ استقبالیہ ...

ے گئی گردونوں جلسوں کا اہتمام بڑی خوبی سے کیا گیا تھا، صدارت بھاسکے بہت ہی محبوب ہر دلعزیز باوقار اور
نسار گور نر جناب خلاق الرحمن قدوائی کی تھی، خصوصی مہمان حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی تھے، انکو حضرت سید صاحب
ے جو والہانہ عقیدت ومحبت اور شیفتگی تھی، اس کا اندازہ انکی تقریر کی شیوہ بیانی اور شیریں گفتاری میں پورے طور
ہو رہا تھا، جس کو سن کر پورا مجمع مسرور اور مخمور تھا، پروفیسر عبدالقوی دسنوی سیفیہ کالج بھوپال نے یادگار سلیمان
ے نام سے بڑی محنت سے ایک کتاب تیار کی ہے، جس کا اجرا حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی کے دست مبارک
ا، یہ حضرت سید صاحب کے سوانح حیات اور علمی کارناموں کی بڑی مفید ببلوگرافی ہے، اس سے ان کو سمجھنے اور
ن پر کوئی تحریر لکھنے میں برابر مدد ملتی رہے گی۔

اس سیمنار میں جو مقالات پڑھے گیے ان کے عنوانات ہی سے اسکے علمی رنگ کا اندازہ ہوگا، (۱) مولانا سید سلیمان ندوی بہ حیثیت
سیرت نگار از پروفیسر عبدالمغنی پٹنہ یونیورسٹی (۲) مولانا سید سلیمان ندوی کی نثر نگاری، از پروفیسر وہاب اشرفی (۳) علامہ
ید سلیمان ندوی طرز انشا پرداز، از ڈاکٹر سید مظفر اقبال (۴) علامہ سید سلیمان ندوی محقق حقیقت مبصر از ڈاکٹر لطف الرحمن بھاگلپور
، مولانا سید سلیمان ندوی اور تصوف از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی دہلی (۶) علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت محقق از
اکٹر خورشید احمد نعمانی بمبئی (۷) مولانا سید سلیمان ندوی بہ حیثیت لسانی محقق از ڈاکٹر حامد حسن بھوپال (۸)
ولانا سید سلیمان ندوی بہ حیثیت شاعر از پروفیسر ممتاز احمد پٹنہ (۹) تاریخ ارض القرآن میں مستشرقین کے اعتراضات
ے جوابات از حافظ عمیر الصدیق اعظم گڈھ (۱۰) مولانا سید سلیمان ندوی کے افکار واسالیب از ڈاکٹر فریح فرید بمبئی
ا حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت نگاری از مولوی ضیاء الدین اصلاحی اعظم گڈھ (۱۲) حضرت مولانا
ید سلیمان ندوی اور معارف کے شذرات از مولوی ابوالبقاء ندوی اعظم گڈھ (۱۳) حضرت مولانا سید سلیمان
دوی اپنے کچھ خطوط کے آئینے میں از پروفیسر سید حسن پٹنہ (۱۴) مولانا سید سلیمان ندوی کی شاعری از پروفیسر
بدالقوی دسنوی (۱۵) مولانا سید سلیمان ندوی اور دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی کوشش از جناب شہاب
سین دہلی (۱۶) مولانا سید سلیمان ندوی کی لسانی خدمات از ڈاکٹر خلیق انجم دہلی (۱۷) ایسا کہاں سے لائیں کہ
ہ سا کہیں جسے از مختار کسریاسرم۔

اس سیمینار میں سید صاحب کے خطوط، مسودات تصنیفات، مقالے، متعلقات کی نمائش بھی سلیقے سے ترتیب دی گئی تھی، پورے سیمینار کی فضا پر حضرت سید صاحب کی روح چھائی ہوئی تھی، یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی تھی، جناب شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب [illegible] کے [illegible] ہے جس خاکساری اور ملنساری کا ثبوت دیتے رہے، اس کا گہرا نقش دلوں پر پڑا۔

اس سفر میں پٹنہ یونیورسٹی کے اردو ایم۔ اے کلاس کے طلبہ کو ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے ساتھ مخاطب کرنے کا موقع ملا، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات کے سابق پروفیسر جناب ڈاکٹر محمد محسن کے ساتھ ان کے گھر پر ایک بہت اچھی شام گزری، ان کی ذاتی علمی اور ادبی خوبیوں کے تحائف لے کر ان سے ملنے کے لیے گیا تھا، وہ اس وقت ممتاز ماہرین نفسیات میں شمار ہوتے ہیں، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں وہ ا محسن کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں، انہوں نے اپنی دو نئی تصانیف نفسیاتی زاویے اور سعادت حسن منٹو (ایک نفسیاتی تجزیہ) تحفے کے طور پر دیں، جن پر معارف میں جلد ہی ریویو ہوگا۔

اس سفر میں پھلواری شریف بھی جانے کا اتفاق ہوا، جہاں امارت شرعیہ کی نئی عمارت دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی، اس کے ناظم مولانا نظام الدین صاحب نے ہر طرح کی تواضع کی، جس کو [illegible] کا کام اس کے ذریعہ سے ہو رہا ہے، اس کی حیثیت پورے ہندوستان کے اندر منفرد کہی جا سکتی ہے، اس میں جو دینی جذبہ اور خدمت نظر آیا کاش وہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں دکھائی دے، خانقاہ مجیبیہ میں بھی حاضری دے کر جناب حضرت شاہ امان اللہ کی دست بوسی کی اور جناب شاہ محمد صاحب کے صاحبزادے شاہ نصر احمد مرحوم کی بے وقت موت پر ان کے ساتھ تعزیت کی اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان کی خوبیوں کی بدولت جنت نعیم اور والدین کو صبر جمیل عنایت فرمائے، یہیں بہار کے مشہور شاعر جناب جوہر نظامی نے چلتے وقت اپنا مجموعہ کلام [illegible] عطا کیا، ان کی کرم فرمائیوں کا بھی ممنون ہوا۔

مقالات

تاریخ ارض القرآن
میں
مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات

از حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

"تاریخ ارض القرآن" مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہے، مگر علم و نظر اور تحقیق و تنقید کی وسعت اور جامعیت کے لحاظ سے اس کا شمار ان کی شاہکار تصنیفات میں ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں عرب کی قدیم قوموں مثلاً عاد، ثمود، مدین، سبا اور قوم تبع وغیرہ کا ذکر بار بار آیا ہے، پیغمبروں اور ان کی قوموں کے ساتھ ان کے علاقوں اور بستیوں کا بھی ذکر ہے، قدیم مفسرین کا اصل مقصد جغرافی اور تاریخی انکشافات کی تحقیق نہ تھا، اس لیے ان سے بعض اسرائیلی روایات کے نقل کرنے میں کچھ تسامح ہوا، اور ایک زمانہ کے بعد جب مستشرقین یورپ کے سامنے جدید جغرافی و تاریخی حقیقتیں آئیں تو ان کی کلیسانہ فطرت کو مسلمان مفسرین و مورخین پر حتی کہ خود قرآن مجید کے بیانات پر شک اور اعتراض کرنے کا

موقع ہاتھ آیا، ان کی ظاہری علمی سنجیدگی نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کو بھی کچھ حد تک متاثر کیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے پیش نظر یہ سارے حقائق تھے، چنانچہ ارض القرآن میں جہاں عرب کے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کی تحقیق ہے، وہاں مستشرقین کے بعض اعتراضات کے جوابات بھی ہیں، سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں بھی اسی جذبہ کی خاص کارفرمائی تھی، ارض القرآن کو سیرۃ النبیؐ کا دیباچہ سمجھنا چاہیے، جیسا کہ خود سید صاحبؒ نے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ لکھنؤ میں دفتر سیرت نبویؐ کے جب وہ اسسٹنٹ تھے تو اس موضوع کا خیال آیا، بلکہ اصل میں سیرت نبویؐ کے دیباچہ ہی کے طور پر اس کے لکھنے کی تحریک ہوئی، (دیباچہ ج ۱، ص ۶، اڈیشن ۱۳۵۵ھ) لیکن جیسے جیسے سید صاحب آگے بڑھتے گئے میدان زیادہ وسیع اور کشادہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ یہ بالکل مستقل ایک تصنیف بن گئی۔

سیرۃ النبیؐ کی طرح سید صاحبؒ کا طرز تحریر اس کتاب میں بھی مناظرانہ نہیں بلکہ محققانہ ہے، اس میں جہاں مستشرقین کے غلط اور باطل نظریات و تصورات کی نشاندہی کی گئی ہے، وہاں ان کی محنت و کاوش کی داد بھی دی گئی ہے، البتہ جب ذات رسالتمآبؐ پر کسی نے انگشت نمائی کی کوشش کی ہے تو سید صاحبؒ کے قلم میں ایک شدت ضرور پیدا ہوگئی ہے،

اس کتاب میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات جواہر ریزوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے، اس مضمون میں ان کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس طرح اس کتاب کے صرف ایک پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے، ورنہ درحقیقت اس کتاب کی علمی افادیت اور تاریخی اہمیت کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا تھا کہ اس کتاب میں ایک خاص پہلو نے "قرآن فہمی" کے معیار میں فکری انقلاب پیدا ہوگیا" (حوالہ مضمون تاریخ ارض القرآن از مولانا مناظر احسن گیلانی، معارف سلیمان نمبر ص ۲۱۰)

سید صاحبؒ نے شروع میں ایک بڑا قیمتی مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں اس کتاب کے موضوع اور اس کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی ہے کہ مقصد یہ ہے کہ قدیم وجدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن (عرب) کے حالات کی اس طرح تحقیق کی جائے کہ قرآن مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش علی الاعلان آشکارا ہوجائے۔

قرآن مجید نے عبرت کے طور پر عرب کی کئی قوموں اور ان کے انبیاء کے حالات بیان کیے ہیں، چونکہ عرب کی قوم تصنیف وتالیف سے آشنا نہیں تھی، اس لیے ان انبیاء واقوام اور ان کے تاریخی، سیاسی، قومی، مذہبی اور جغرافی حالات کی تفصیل میں مسلمان مصنفوں نے غیر محتاط طریقہ پر زبانی روایات سے کام لیا، جبکہ اہل یورپ نے اس کے برخلاف یونانی ورومی سیاحوں کے تحریری بیانات اور عرب کے آثار قدیمہ اور نقوش وکتبات کو دلیل میں پیش کیا، سید صاحب لکھتے ہیں:

"اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہوگا، قرآن مجید میں عرب کی بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں، جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں، اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی اور دوسری طرف غیروں کو انھیں افسانہ کہنے کی جرأت ہوئی۔" (تاریخ ارض القرآن ج ۱، ص ۴، ایڈیشن چہارم ۱۹۵۵ء)

سید صاحبؒ کو مستشرقین کی محنت وکاوش اور جانفشانی وکوشش کا بخوبی احساس تھا وہ ان جرمن، فرانسیسی، اٹالین اور انگریز مستشرقوں کے کام سے واقف تھے کہ ان لوگوں نے یونانی ورومی تصنیفات سے جو عرب قبل اسلام کے حالات سے پر تھیں، ان کا انتخاب وخلاصہ کیا

قرآن مجید نے جن قوموں اور بستیوں کا ذکر کیا ہے ان کے کھنڈروں کا ان لوگوں نے مشا
کیا، ان کے کتبات کو حل کیا اور پھر ان سے عجیب و غریب نتائج کا استنباط کیا، مگر سید
کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ یہ مستشرق مسلمان نہیں، یہودی یا عیسائی ہیں اور ان لوگ
نہایت بے دردی سے قرآن مجید کے فوائد کو پامال کیا ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

"بعض متعصب مستشرقین نے ان معلومات کو غلط طور سے قرآن کی مخالفت میں استعمال
کیا ہے، اٹھارہویں صدی کے وسط میں ریورنڈ فارسٹر نے عرب کا تاریخی جغرافیہ لکھا،
جس میں اس نے اپنی جہالت کے عجیب و غریب نمونے پیش کیے، جن کو پڑھ کر کبھی ہنسی اور
کبھی رونا آتا ہے، لیکن کیا کیجیے کہ ہماری غفلت سے وہ قرآن کی صداقت تاریخی کا معیار ہے
..... نولدیکی نے عاد و ثمود کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں ثابت کیا ہے کہ یہ
غیر تاریخی قومیں ہیں، ولکن اور روبرٹسن اسمتھ عرب کے ادعائے نسب کا انکار کرتے ہیں،
عرب کے بعض اثری اکتشافات کی بنا پر یورپ کے بعض سبک مغز مصنفین جرأت کے ساتھ
کہتے ہیں کہ "قرآن کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا، لیکن ایک
فرانسیسی مستشرق سینٹ ہلیر نے اس کا عمدہ جواب بھی دے دیا کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو قرآن تمدن
و تہذیب کے عام ابتدائی تعلیمات اور کم از کم محرمات نکاح کے بیان کی تکلیف گوارا نہ کرتا

(ایضاً، ص ۵)

سید صاحبؒ نے ارض القرآن کی تاریخ و تحقیق کے لیے چار ماخذ کو سامنے رکھا ہے
اسلامیہ (۲) ادبیات اسرائیلیہ (۳) ادبیات یونانیہ و رومانیہ اور (۴) اکتشافات اثریہ
ڈسکوریز) اس سلسلہ میں انھوں نے چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کو مستشرقین نے
دیکھا ہے، مثلاً ابن الحائک ہمدانی ایک عرب جغرافیہ نویس تھے، ان کی دو کتابیں صفۃ

در اکلیل" ہیں، پہلی کتاب عام جزیرۂ عرب کا جغرافیہ اور دوسری کتاب الاکلیل صرف یمن کی تاریخ ہے، یورپ میں اس کتاب کا اکثر حصہ برٹش میوزیم لندن اور رائل لائبریری برلن میں موجود ہے ان کے علاوہ سید صاحب نے کئی اور کتابوں کا ذکر کیا ہے (ایضاً ص ۱۷ - ۱۹)

انساب اور مستشرقین | فن انساب، عرب کا ایک محبوب فن تھا، فخر و مباہات کے اظہار کے لیے عرب کا بچہ بچہ اپنے نسب کا یاد رکھنا ضروری سمجھتا تھا، شعرائے عرب اکثر قبائل کے سلسلۂ انساب کو محفوظ رکھتے تھے، اور ان کے لیے یہ اس لیے ضروری تھا کہ مدح و ہجو کے موقعوں پر اس کا ذکر کر سکیں، زمانۂ جاہلیت میں بھی اور اسلام کے بعد بھی، عرب میں بڑے بڑے علمائے انساب گزرے ہیں جو عرب کے تمام قبائل کے اور اکثر ہر قبیلہ کے مشاہیر کے نسب سے واقف تھے اور جب دوسرے علوم کی تدوین کا کام شروع ہوا تو یہ فن بھی مدون ہوا، اور علمائے انساب نے اس فن میں کئی کتابیں لکھیں، دغفل بکری، ہشام کلبی، محمد بن سائب کلبی، مدائنی، فاکہانی، زبیری، زبیر بن بکار، اصمعی، ابوعبیدہ ابن ہشام، مبرد، ازرقی، بلاذری، سمعانی، ابن حزم اور قلقشندی وغیرہ اس فن کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں، ان میں سے بعض کی روایات میں کمزور اور یقینی صحت میں کمتر درجہ کی بھی ہیں، لیکن روبرٹسن اسمتھ اور نولدیکی ان روایات سے آگے بڑھ کر اس پورے فن کا ہی انکار کرتے ہیں، نولدیکی لکھتا ہے:

"اب علماء کے لیے موقع آگیا ہے کہ ان طفلانہ خیالات کو پس پشت ڈال دیں جو چاہتے ہیں کہ عربوں کی کتب انساب کو جن کو محمد کلبی اور اس کے بیٹے ہشام کلبی نے گھڑ لیا ہے، مان لیں تاکہ باہم قبائل عرب قدیمہ و جدیدہ کے تعلقات تحقیق و یقین کے ساتھ ظاہر ہوں، کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ تمام قبائل بنی قیس جو وسط ملک عرب میں آباد ہیں، وہ صرف ایک شخص کی نسل سے ہوں یعنی قیس کی، جو مسیح سے کچھ پہلے تھا، اس لیے ہماری تحقیق یہ ہے کہ کوئی قبیلہ

قرآن مجید نے بھی قوموں اور بستیوں کا ذکر کیا ہے ان کے کھنڈروں کا ان لوگوں نے مشاہدہ کیا، ان کے کتبات کو حل کیا اور پھر ان سے عجیب وغریب نتائج کا استنباط کیا، مگر سید صاحبؒ کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ یہ مستشرق مسلمان نہیں یہودی یا عیسائی ہیں اور ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن مجید کے فوائد کو پامال کیا ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"بعض متعصب مستشرقین نے ان معلومات کو غلط طور سے قرآن کی مخالفت میں استعمال کیا ہے، اٹھارہویں صدی کے وسط میں ریونڈ فارسٹر نے عرب کا تاریخی جغرافیہ لکھا، جس میں اس نے اپنی جہالت کے عجیب وغریب نمونے پیش کیے، جن کو پڑھ کر کبھی ہنسی اور کبھی رونا آتا ہے، لیکن کیا کیجیے کہ ہماری غفلت سے وہ قرآن کی صداقت تاریخی کا معیار ہے" ..... نولڈیکی نے عاد وثمود کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں ثابت کیا ہے کہ یہ غیر تاریخی قومیں ہیں، ولکن اور رابرٹسن اسمتھ عرب کے ادعائے نسب کا انکار کرتے ہیں، عرب کے بعض اثری اکتشافات کی بنا پر یورپ کے بعض سبک مغز مصنفین جرأت کے ساتھ کہتے ہیں کہ "قرآن کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا، لیکن ایک فرانسیسی مستشرق سینٹ ہلیر نے اس کا عمدہ جواب بھی دے دیا کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو قرآن تمدن وتہذیب کے عام ابتدائی تعلیمات اور کم از کم محرمات نکاح کے بیان کی تکلیف گوارا نہ کرتا"

(ایضاً، ص ۵)

سید صاحبؒ نے ارض القرآن کی تاریخ وتحقیق کے لیے چار مآخذ کو سامنے رکھا ہے (۱) ادبیات اسلامیہ (۲) ادبیات اسرائیلیہ (۳) ادبیات یونانیہ ورومانیہ اور (۴) اکتشافات اثریہ (آرکیالوجیکل ڈسکوریز) اس سلسلہ میں انھوں نے چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کو مستشرقین نے نظر انداز کیا ہے، مثلاً ابن الحائک ہمدانی ایک عرب جغرافیہ نویس تھے، ان کی دو کتابیں صفۃ جزیرۃ العرب

اور "اکلیل" ہیں، پہلی کتاب عام جزیرۂ عرب کا جغرافیہ اور دوسری کتاب "الاکلیل" صرف یمن کی تاریخ ہے، یورپ میں اس کتاب کا اکثر حصہ برٹش میوزیم لندن اور رائل لائبریری برلن میں موجود ہے ان کے علاوہ سید صاحب نے کئی اور کتابوں کا ذکر کیا ہے (ایضاً ص ۱۷ - ۱۹)

انساب اور مستشرقین فن انساب، عرب کا ایک محبوب فن تھا، فخر و مباہات کے اظہار کے لیے عرب کا بچہ بچہ اپنے نسب کا یاد رکھنا ضروری سمجھتا تھا، شعرائے عرب اکثر قبائل کے سلسلۂ انساب کو محفوظ رکھتے تھے اور ان کے لیے یہ اس لیے ضروری تھا کہ مدح و ہجو کے موقعوں پر اس کا ذکر کر سکیں، زمانۂ جاہلیت میں بھی اور اسلام کے بعد بھی، عرب میں بڑے بڑے علمائے انساب گزرے ہیں جو عرب کے تمام قبائل کے اور اکثر ہر قبیلہ کے مشاہیر کے نسب سے واقف تھے اور جب دوسرے علوم کی تدوین کا کام شروع ہوا تو یہ فن بھی مدون ہوا، اور علمائے انساب نے اس فن میں کئی کتابیں لکھیں، دغفل بکری، ہشام کلبی، محمد بن سائب کلبی، مدائنی، فاکہانی، زبیری، زبیر بن بکار، اصمعی، ابو عبیدہ، ابن ہشام، مبرد، ازرقی، بلاذری، سمعانی، ابن حزم اور قلقشندی وغیرہ اس فن کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں، ان میں سے بعض کی روایات میں کمزور اور یقینی صحت میں کمتر درجہ کی بھی ہیں، لیکن روبرٹسن اسمتھ اور نولدیکی ان روایات سے آگے بڑھ کر اس پورے فن کا ہی انکار کرتے ہیں، نولدیکی لکھتا ہے:

> "اب علماء کے لیے موقع آگیا ہے کہ ان طفلانہ خیالات کو پس پشت ڈال دیں جو چاہتے ہیں کہ عربوں کی کتب انساب کو جن کو محمد کلبی اور اس کے بیٹے ہشام کلبی نے گھڑ لیا ہے، مان لیں تاکہ باہم قبائل عرب قدیمہ وجدیدہ کے تعلقات تحقیق ویقین کے ساتھ ظاہر ہوں، کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ تمام قبائل بنی قیس جو وسط ملک عرب میں آباد ہیں، وہ صرف ایک شخص کی نسل سے ہوں یعنی قیس کی، جو مسیح سے کچھ پہلے تھا، اس لیے ہماری تحقیق یہ ہے کہ کوئی قبیلہ

در حقیقت اپنے اس پیدا اول سے واقف نہیں جس کی طرف وہ منسوب ہے (ایضاً ص ۲۰)

روبرٹسن سمتھ کا خیال بھی یہی ہے کہ :

"یہ محقق ہو چکا ہے کہ چند قبائل زمانہ ماضی غیر قدیم میں کسی تاریخی شخص کی طرف منسوب نہ تھے"

(ایضاً، ص ۲۱)

سید صاحبؒ نے ان دونوں مستشرقوں کی رائے کو نقل کر کے ان سے دریافت کیا ہے کہ آخر اس بے اعتباری کے دلائل کیا ہیں؟ وہ لکھتے ہیں کہ :

"عرب کے ایک ایک قبیلہ کے لیے ضروری تھا کہ دوستوں کی مدح اور دشمنوں کی ہجو کے لیے انساب محفوظ رکھے، عرب کا ہر وہ قبیلہ جو غیر پدر کی طرف انتساب کرتا وہ عرب میں حقیر و ذلیل سمجھا جاتا، اور بطور نشان ملامت کے اس کا نام لیا جاتا، شعرائے عرب مختلف مواقع کے لیے انساب کے زبانی یاد رکھنے پر مجبور رہتے تھے، کیا ان واقعات کے بعد بھی اس عام بے اعتباری کی کوئی مناسب وجہ ہے؟ بنو قیس کی طرح چھ سو برس کی مدت میں ایک شخص کی اولاد سے چند بطون و قبائل کا پیدا ہو جانا کوئی محال امر نہیں ہے" (ایضاً ص ۲۱)

سید صاحبؒ اس کے بعد ان مستشرقین کے اعتراض کی اصل وجہ بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :

"یورپ کے ان علمی توہم پرستوں کے انکار انساب کی بنیاد مسئلہ طوطمیت (ٹوٹزم) پر ہے، طوطمیت اس کا نام ہے کہ "اشخاص و قبائل کا اپنے کو دیویوں، ستاروں، حیوانوں اور درختوں کی طرف منسوب کرنا" قدیم زمانہ میں جب انسان بچہ تھا، جب کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا تھا تو وہ انسانوں کی ولدیت سے نکل کر دیویوں کی نسل قرار پاتا تھا، وہ دیویاں خواہ ستارے ہوں یا حیوانات ہوں یا درخت ہوں، ہندوؤں میں سورج بنسی اور چندر بنسی وغیرہ قبائل تھے، جو اپنے کو انسانوں کے نہیں بلکہ آفتاب و ماہتاب کے بیٹے

کہتے تھے، اس لیے سورج اور چاند کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اس قبیلہ کے مورث اول کا نام ہے، بلکہ وہ اس قبیلہ کی دیوی کا نام ہے۔"

"قبائل عرب میں بھی بنو شمس وغیرہ اسی قسم کے نام ہیں، اور حیوانات کے نام تو بکثرت آتے ہیں، جیسے بنو اسد، بنو فہد، بنو ثعلب، بنو کلب، بنو نمل، بنو جمل وغیرہ۔ نظریہ طوطمیت کے مطابق شمس، اسد، فہد، ثعلب، کلب، نمل، جمل اشخاص تاریخی نہیں ہیں، اور نہ ان قبائل کے مورث اول کے نام ہیں، بلکہ یہ ان ستاروں اور جانوروں کے نام ہیں، جن کی پرستش وہ قبیلے کرتے تھے اور ان ہی کی طرف اپنے کو منسوب سمجھتے تھے، لیکن یہ بعض علمی توہم پرستی ہے، عرب میں کبھی اس قسم کا خیال نہیں پیدا ہوا، اس خیال کی پیدائش عراق، ہندوستان، مصر اور یونان کی میتھالوجی (علم الاصنام) میں ممکن ہے، اس قسم کے نام عرب میں صرف چند ہیں اور جو ہیں ان میں کلب (کتا) نمل (چیونٹی)، ثعلب (لومڑی) کون سی گرامی قدر ہستیاں ہیں جن کے انتساب سے خاندان کی بنیاد قائم ہو اور یہ اس قسم کے نام ہیں جن سے اس زمانۂ روشن کا طبقۂ متمدن بھی خالی نہیں، تم نے بعض انگریزوں کے نام ہوف (لومڑی) بل (Bull) بیل سنے ہوں گے، کیا یہ بھی طوطمیت ہے؟" (ایضاً ص ۲۰، ۲۱، ۲۲)

سید صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے نولدکی اور ان کے ہم نواؤں کے اعتراضات کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

ادبیات رومانیہ کا ایک جغرافیہ نویس

سید صاحب نے ادبیات یونانیہ ورومانیہ کے زیر عنوان ایک باب قائم کیا جس میں ان یونانی و رومانی مورخوں اور سیاحوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے جو قرآن کی مذکورہ قوموں کے معاصر یا قریب العصر تھے، ان میں بطلیموس اسکندریہ کا مشہور ہیئت داں و جغرافیہ نویس تھا، اس نے خود تو عرب کی سیاحت نہیں کی تھی، تاہم اسکندریہ میں

عرب تاجروں سے [illegible] کرتا تھا، ان تاجروں اور دوکانداروں سے دریافت کرکے اس نے عرب کا جغرافیہ ترتیب دیا تھا، اور اس میں عرب کے مشہور قبائل، شہر، گاؤں، پہاڑ سواحل، تجارتی منازل اور تجارتی راستوں کو بیان کیا تھا، عرب آبادیاں میں اس کے بیان کے مطابق ۱۱۴ آبادیاں تھیں، لیکن سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ چند ناموں کے سوا اب ان قبائل و منازل کے نام خارج از فہم ہیں، جرمن مستشرق اسپرنگر کی کتاب "قدیم جغرافیہ عرب" جو ۱۸۶۴ء میں شایع ہوئی تھی، اس میں بطلیموس کے ناموں اور مقاموں کا عرب جغرافیہ نویسوں اور موجودہ سیاحوں کے بیانات سے مقابلہ کیا گیا تھا اور بطلیموس کے مذکورہ ناموں کی صحت ثابت کی گئی تھی، لیکن سید صاحب اسپرنگر کی اس تحقیق و تطبیق سے متفق نہیں، وہ لکھتے ہیں کہ

"حقیقت یہ ہے کہ چند ناموں کے سوا اور تمام ناموں کی تطبیق بہ تکلف ہوسکتی ہے، اور اس کی مثالیں ہماری کتاب میں جابجا ملیں گی، اور یہی شکایت مسعودی اور یاقوت حموی تقریباً آٹھ سو برس پہلے کرچکے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ قبائل عرب زیادہ تر بدویانہ زندگی کے عادی تھے، اس لیے ان کے مقامات کی تعیین نہایت مشکل ہے، پھر بطلیموس کی، قافلوں اور کاروانوں کی زبانوں سے ان کی تحقیق اور یونانی حرف ولہجہ میں ان کی تعبیر اور پھر انقلابات و حوادث روزگار کا تواتر، کاتبوں کی جہالت اور ناآشنائی فن، ان وجوہ سے قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ایک لفظ اپنے صحیح مخرج سے کہاں کہاں جا پڑا ہوگا" (ایضاً ص ۲۸، ۲۹)

اکتشافات اثریہ اور مستشرقین

اکتشافات اثریہ (ص ۳۱) کے زیر عنوان سید صاحبؒ نے قدیم عربوں کے بہت سے آثار، عمارات اور یادگاروں کی بازیافت کی مہم میں علمائے یورپ کی کوششوں کی تعریف کی ہے، کتبات اور نقوش زیادہ تر حمیری، سبائی، آرامی

اور نبطی خط میں ہیں، ان کتبات کو حل کرنے کے فن کو مستشرقین نے بے حد ترقی دی اور اس شاخ میں بے انتہا برگ و بار پیدا کرکے اس کو مستقل ایک فن بنا دیا، لیکن سید صاحبؒ کی تحقیق کے مطابق بہرحال اولیت کا سہرا ان کے سر نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:

"دولت بنی امیہ اور عباسیہ کے ابتدائی زمانہ میں جبکہ تاریخی مذاق مجتہدانہ حیثیت رکھتا تھا ان آثار کی تحقیق کی گئی اور ان میں سے اکثر خطوط اور زبانوں سے اس عہد کے علماء واقف تھے، ذوالنون مصریؒ جو دوسری صدی میں تھے، مصر کے خط برابی (بیروگلفی) پڑھتے تھے، حمیری محقق علامہ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب اور اکلیل میں تمام مشہور آثار کے نام گنائے ہیں اور ان کے تفصیلی حالات کے لیے اپنی کتاب 'اکلیل' کا حوالہ دیا ہے، قلعہ ناعط جو سلاطین یمن نے پہاڑ کی چوٹی پر بنایا تھا، اسلام سے تقریباً پندرہ سو برس قبل کی تعمیر ہے، وہب ابن منبہ (جنھوں نے صحابہؓ کا زمانہ پایا تھا) اس کا ایک کتبہ پڑھا تھا ہمدانی کے علاوہ مقدسی نے اپنے سفرنامہ میں، یاقوت نے اپنی معجم میں، نویری نے اپنے جغرافیہ میں اور قزوینی نے اپنی آثار البلاد میں اسی قسم کے آثار و کتبات کا ذکر کیا ہے۔" (ارض القرآن ج ا ص ۴۲، ۴۴، ۳۵)

لیکن سید صاحبؒ نے فراخدلی سے اس کا اعتراف کیا کہ یہ بہرحال ادھوری کوششیں تھیں، علمائے یورپ نے ان کو بہت ترقی دی، اس کے بعد سید صاحبؒ نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور مختلف سیاحوں مثلاً نیوبھر، ہزبرگ، ہیمپرچ، ارناؤ، ہالوے، وریڈے، ہرش، برکھارڈ، بیڈے ایچ، چارلس ڈوٹے اور ہیوبر کی تحقیقات و اکتشافات کا ذکر ایجاز کے ساتھ کیا ہے، ہیوبر کی تحقیقات کو وہ عام حالات و واقعات سے بلند تر اور زیادہ علمی سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ہیوبر کو عرب کی آرکیالوجی اور ٹاپوگرافی کا محسن سمجھتے ہیں۔ (ایضاً ص ۴۴)

تاریخ قدیم کے بعض اصول | سید صاحبؒ نے تاریخ قدیم کے بعض اصول کے تحت مختصر مگر نہایت ؒ[illegible]

بحث کی ہے، تاریخ قدیم کی ترتیب و تدوین میں سب سے بڑی دقت اور دشواری جو پیش آتی ہے، وہ زمانہ کی تعیین اور ناموں کے اتحاد و اختلاف کی ہوتی ہے، سید صاحب نے اس ضمن میں چند اصول مقرر کیے ہیں، مثلاً اصول تعیین زمانہ یعنی جدید طرز تاریخ کی رو سے قبائل کے دور اور عہد کی تعیین کی جائے، عام طور سے کسی مجہول العہد قوم کے زمانہ کی تعیین اس طور پر کی جاتی ہے کہ اسی قوم کی ہمعصر قوم یا کسی شخص کے زمانہ سے اس کا قیاس کیا جاتا ہے، ایک اصول یہ بھی ہے کہ تاریخی اشخاص اور ان کے مقامات سکونت کے ناموں کا یا دو قوموں کی زبان، اشخاص اور دیوتاؤں کے ناموں کی آپس میں تطبیق دی جائے جس سے مقامات سکونت اور اتحاد قومیت کی طرف اشارہ مل سکتا ہے، مستشرق فارسٹر نے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر اپنی کتاب "عرب کا تاریخی جغرافیہ" میں چند نتائج پیدا کیے، سید صاحبؒ ان نتائج کو کارآمد قرار دیتے ہیں، گو بعض مقامات پر فارسٹر صاحب کے استنباطات سید صاحبؒ کی رائے کے مطابق وہم و ظن سے آگے کا علم نہیں بخشتے اور کہیں علم کے بجائے وہ جہالت کا ثبوت پیش کرتے ہیں، فارسٹر کے اخذ کردہ اصول کے متعلق سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"اس اصول کے اجراء میں دو بہت بڑی دقتیں پیش آتی ہیں، پہلی یہ کہ زمانہ کے امتداد، قوموں کے انقلابات اور زبانوں کے تغیر سے نام کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں، اس لیے مقامات اور باشندوں کے ناموں میں تطابق کے بجائے کبھی صرف تشابہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے، دوسری دقت جو پہلے سے سہل تر ہے، یہ ہے کہ سامی زبانوں میں باہم اور نیز یونانی زبان میں جس میں توراۃ کا قدیم ترجمہ ہے اور اب زیادہ تر وہی پھیلا ہوا ہے، جب ایک نام ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو بعض حروف کا خصوصیت زبان

کی وجہ سے مبادلہ ہو جاتا ہے، مثلاً آجر اور ہاجر، اسمٰعیل اور اسماعیل، ثمود

اور ثمود، حصارموت اور حضارموت، اضحاک اور اسحاق، حدرموت اور

حضرموت، ابی رہام اور ابراہیم وغیرہ" (ارض القرآن ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے اصول اتحاد اسماء والسنۃ کو اس بحث میں سب سے مفید اور کارآمد قرار دیا ہے کہ ہر قوم کے ناموں کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے، جس میں اس کی قومیت کا امتیاز پوشیدہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر دو قوموں کے ناموں میں باہمی تشابہ نظر آئے گا تو بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں قومیں حقیقت میں متحد الاصل ہیں، یہی حال مذہبی اعتقادات کے تشابہ اور زبان کے الفاظ کی مماثلت کا بھی ہے، سید صاحبؒ کی نظر میں اقوام کے اتحاد نسل کی یہ بھی ایک دلیل ہے، گو مبہم ہے۔

<u>جغرافیۂ عرب اور فارسٹر</u> اوپر بطلیموس کا ذکر آ چکا ہے، جس نے عرب کی جغرافی تقسیم کو مرتب کیا، اور اس کی یہ ترتیب سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہوئی، اس نے اپنے جغرافیہ میں عرب کے ۵۴ قبائل، ۱۶۴ مقامات، ۵۰ کوہستانی سلسلے اور ۴ دریاؤں کا ذکر ہے، لیکن بطلیموس کے مخالفوں کو ان ناموں کے تسلیم کرنے میں پس و پیش ہے، ان کا کہنا ہے کہ ان ناموں کا وجود و مصداق بطلیموس کے دماغ کے سوا خارج میں کہیں نہیں ہے، لیکن بطلیموس کے معتقدین اس الزام سے برہم نظر آتے ہیں، ان کی نمائندگی فارسٹر کرتے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب میں ۱۵۰ ناموں کی تحقیق کی ہے، سید صاحبؒ اس تحقیق کو 'عالمانہ جہالت' سے تعبیر کرتے ہیں' وہ لکھتے ہیں کہ:

"غریب فارسٹر کو نہیں معلوم کہ یہ قبائل کب پیدا ہوئے، ان مقامات میں کب آباد ہوئے اور عربی میں ان کا صحیح نام کیا ہے، وہ بطلیموسی قبائل کے

ناموں کو حروف کے ہیر پھیر سے موجودہ قبائل سے تطبیق دیتا ہے، اس کو نہیں معلوم کہ اب قدیم قبائل کے نام بالکل نئے ہیں۔" (ارض القرآن ۱ص ۱۷)

بطلیموسی جغرافیہ کے تحت تین قبیلوں کو سب سے زیادہ ادر پر زور اور طاقت ور بتایا گیا ہے، یہ قبائل ہیں: بنی زومین (۲) سیڈینی اور (۳) بنوبری، ان تینوں قبیلوں کو بحر احمر کے ساحلی علاقوں میں خلیج عقبہ سے عسیر تک حجاز و تہامہ میں متوطن ظاہر کیا گیا ہے، لیکن سید صاحبؒ پوچھتے ہیں کہ "ان کے اصلی اور صحیح نام کیا ہیں؟ کیونکہ ان ناموں کا قبیلہ عرب میں تو موجود نہیں ہے" لیکن ریونڈ فارسٹر بغیر کسی شک وسوال کے یقینی انداز میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بنی زومین بنی عمران ہیں، سیڈینی قبیلہ جہنیہ کا نام ہے، اور بنی بری یہ کنویں والا قبیلہ ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ بطلیموس کے ڈیڑھ ہزار برس کے بعد یورپین سیاحوں برکھارٹ اور نیوبھر نے انہی مقامات میں مذکورہ قبائل کو دیکھا ہے، سید صاحبؒ اس دلیل کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

> "صاف ظاہر ہے کہ زومین خزیمین ہے، سیڈینی سیدین ہے اور بنو بری بنو بربر ہیں، فارسٹر کی عربی دانی ملاحظہ ہو کہ عربی میں چونکہ کنویں کو بئر کہتے ہیں اس لیے انھوں نے بری کے معنی بھی کنویں کے ہی سمجھے، خزیمہ حجاز میں، سیدین اور بربر دیگر اطراف میں مشہور قبائل ہیں۔" (ص ۸۷)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے بطلیموسی قبائل کے ناموں کی ایک فہرست دی ہے، جس میں یونانی تلفظ انگریزی وفارسی رسم الخط میں دیا گیا ہے، پھر فارسٹر کی رائے دی ہے اور اس کے مقابل انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، مثلاً ڈیبائی کو فارسٹر زبید کہتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ اس کو ضبہ کہتے ہیں، الاٹیاری کو فارسٹر بنی یام اور سید صاحب بنو عیلام قرار دیتے ہیں، مانی ٹائی اور کیتھی بانی تائی کو فارسٹر اہل منیٰ اور بنو قحطان سمجھتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ

معین (واقع یمن) اور قتابین (قتاب واقع یمن) قرار دیتے ہیں، ایک نام و آخری مواتی ہے، اس کو فارسٹر وادالقرامطہ (واقع بحرین) سمجھتے ہیں، سید صاحبؒ اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں کہ :

"غریب مستشرق کو معلوم نہیں کہ بحرین میں قرامطہ کا وجود بطلیموس کے آٹھ سو برس بعد ہوا ہے" (ارض القرآن ج ۱، ص ۱۰۸)

ریورنڈ فارسٹر کو صرف اسی پر اصرار نہیں ہے کہ بنی زدمین بنی عمران ہیں اور یہ کہ ان کا مسکن حجاز نہیں ہے بلکہ خلیج عقبہ ہے، اور اس اصرار کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسیحؑ سے سولہ[16] برس پہلے سسلی کے ڈائڈورس نے لکھا تھا کہ "بنی زدمین کے ملک میں ایک معبد ہے جس کی تمام عرب عزت کرتے ہیں"، اس معبد کو ان علمائے یورپ نے جو کہ ریورنڈ یعنی پادری نہیں ہیں انھوں نے بھی کعبہ سمجھا ہے، ظاہر ہے کہ کعبۂ حجاز کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سید صاحبؒ نے اس نکتہ کو بھی محسوس کیا، اور اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس کی بحث وہ الگ کر چکے۔

امم سامیہ کا مسکن اول | اس عنوان کے تحت سید صاحبؒ نے نہایت محققانہ بحث کی ہے، جس کی اہمیت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس بحث میں سید صاحبؒ نے مستشرقین کی ایک جماعت کے خیالات کو قبول کیا ہے، بحث یہ ہے کہ زمانۂ تاریخ سے پہلے جو سامی قومیں الگ الگ لیکن متصل مقامات میں آباد تھیں اور صرف چند کنبوں میں تقسیم تھیں تو ان کا مسکن کہاں تھا؟ عرب کے مورخین کے پاس تو اس کا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا مسکن عرب تھا، لیکن یورپ کے علماء و محققین نے اس سوال کے جواب میں چار نظریے پیش کیے، ان کا پہلا نظریہ یہ ہے کہ ان سامی قوموں کا پہلا مسکن افریقہ ہے، جہاں حام کے بھائی حام کی اولاد زمانۂ تاریخی میں آباد ملتی ہے، ان محققین کی دلیل یہ ہے کہ

سامی اور حا[illegible] میں بہت مشابہت ہے نیز یہ کہ سامی اور حامی اور خصوصاً جنوبی عرب کے سامیوں اور حامیوں (حبشی) کے بعض اعضاء میں مکمل مشابہت پائی جاتی ہے، لیکن [illegible] اس دلیل کی پرزور تردید کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ :

"یہ دلیل نہایت عجیب ہے، دو بھائیوں میں اگر مشابہت پائی جاتی ہے اور ایک افریقہ میں رہتا ہو تو کیا ضرور ہے کہ دوسرا بھی افریقہ ہی میں پہلے رہتا ہو، یہ کیوں نہیں فرض کیا جا سکتا کہ خود حامی پہلے سامی خانوادوں کے ساتھ رہتے تھے، اور ایک مدت کی یکجائی کے بعد ان سے الگ ہوئے، اسی یکجائی و اجتماع و اتحاد نسل کے بقیہ آثار دونوں میں موجود ہیں۔" (ارض القرآن ج ۱ ص ۱۰۷)

جنوبی عرب کے سامیوں اور حامیوں میں مشابہت کی دلیل سے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ :

" جنوبی عرب (یمن) اور حبشیوں میں یقیناً تشابہ ہے، لیکن اس کا سبب بالکل ظاہر ہے، حبش کی کوئی مستقل آبادی و نسل نہیں ہے، بلکہ وہ یمنی عربوں کی ایک نو آبادی ہے اور ان کی نسل کا مخلوط حصہ ہے، اسی لیے عرب ان کو حبش (مخلوط) کہتے ہیں، اور اسی بنا پر قدیم مورخین، یمن و حبش کو دو مستقل ملک نہیں قرار دیتے ہیں، بلکہ ایک ہی ملک (ایتوبیا) کے ان کو دو ٹکڑے سمجھتے ہیں۔" (ایضاً ص ۱۰۷، ۱۰۸)

مستشرقین کا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بنو سام کا پہلا وطن آرمینیہ اور کردستان ہے، لیکن سید صاحبؒ کا خیال ہے کہ اس تھیوری کی صحت پر تورات کے چند الفاظ کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے، خود نولدکی بھی اس نظریہ کو صحیح نہیں مانتا۔ (ایضاً ص ۱۰۸)

تیسرا نظریہ ایک اطالوی مستشرق پروفیسر گیڈی کا ہے، ان کا خیال ہے کہ سامیوں کا مسکن اول فرات کا نشیبی حصہ تھا، پروفیسر گیڈی نے اپنے اس دعوی کو ان مقدمات پر قائم

کیا ہے کہ "ابتدائی زبان میں سب سے پہلے ابتدائی ضروریات اور گردوپیش کی چیزوں کیلیے الفاظ پیدا ہوں گے اور اس لیے یہ الفاظ عموماً مختلف خاندانوں اور زبانوں میں تقسیم ہونے کے بعد بطور ترکۂ موروثی کے مشترک طور پر باقی رہیں گے، سامی زبان میں اس قسم کی چیزوں کے لیے جو مشترک الفاظ ہیں مجموعی طور پر ان کا وجود جہاں پایا جائے گا وہی ام سامیہ کا مسکن اول ہوگا، اس حیثیت سے جو مشترک چیزیں معلوم ہوتی ہیں، ان کی شہادت ہے کہ وہ فرات کے حصۂ زیریں کی پیداوار ہیں۔" (ارض القرآن ج ۲ ص ۱۰۸)

پروفیسر گیڈی کی ان رایوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ان سے پہلے اسی قسم کی دلیل وان کریمر نے قائم کی تھی اور ان کا خیال یہ تھا کہ سامی قوموں کا ابتدائی مسکن، ایشیائے وسطی میں نہر جیحون و سیحون کے پاس ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"ایک ہی قسم کی دلیل سے دو مختلف نتائج کا ظہور، دونوں کے ابطال کی دلیل ہے۔" (ص ۱۰۹)

چوتھی دلیل اس بحث میں یہ ہے کہ بنو سام کا مسکن اول ملک عرب ہے، سید صاحبؒ کی رائے میں یہ دلیل قرین صواب اور باعتبار دلائل مستحکم ہے، مستشرقین کی ایک بڑی جماعت بھی اسی رائے کی موید ہے، ان لوگوں میں ڈی خویی، شریڈر، اسپرنگر، نولدیکی، رابرٹسن سمتھ سموال لے انگ، ولیم رائٹ اور راجرس وغیرہ شامل ہیں، سید صاحبؒ نے ان لوگوں کی رایوں کو تلخیص کے ساتھ نقل کیا ہے، بالخصوص انھوں نے نولدیکی کے ساتھ خاص اعتنا کیا ہے، ان کی راے کو نقل کرنے سے پہلے ان کو "موجودہ یورپ میں مشرقی زبان و تاریخ کا سب سے بڑا فاضل" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، ہم یہاں نولدیکی کی رائے کو نقل کرتے ہیں کہ اس کی افادیت کا یہی تقاضا ہے، نولدیکی کی عبارت یہ ہے:

"بعض مشہور محققین خیال کرتے ہیں کہ جنس سامی کا مولد عرب ہو سکتا ہے، بہت سی چیزیں ہیں"

جو اس [illegible] کی تائید کیا کرتی ہیں، تاریخ ثابت کرتی ہے کہ نہایت قدیم زمانہ سے عرب کے ریگستان سے قبائل نکل نکل کر قریب کے سرسبز ممالک میں آباد ہوتے رہے ہیں، آرامی اور عربی زبانوں میں بہت سے ایسے نشانات پائے جاتے ہیں جن سے ابتدائی خانہ بدوشانہ حالت پائی جاتی ہے اور عرب کا شمالی حصہ صحرائے مابین شام و عرب، خانہ بدوش قبائل کا مسکن ہے، اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان قریب ترین اصل زبان ہے۔"

"ہم خوشی سے قبول کرتے ہیں کہ یہ تھیوری کہ عرب امم سامیہ کا مسکن اول ہے، کسی معنی سے غیر معقول نہیں ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۲)

سید صاحبؒ اس بحث کے آخر میں اسی فیصلہ کا اعلان کرتے ہیں کہ عرب کے سوا قدیم زمانہ سے کوئی قوم اس کی مدعی نہیں ہے کہ ان کا ملک بنو سام کا مسکن اور امم سامیہ کا مسقط الراس ہے، عرب عام طور پر اس کے مدعی ہیں اور حق یہ ہے کہ شواہد و قرائن کی شہادت کے ساتھ جب کوئی دوسرا مدعی موجود نہیں تو مقدمہ ان ہی کے حق میں فیصل ہونا چاہیے، اس کے بعد سید صاحبؒ نے ابن قتیبہ اور یعقوبی کی دو تحریروں کو پیش کیا ہے، اور آخر میں یہ بلیغ فقرہ بھی سپرد تحریر کر دیا کہ:

"ان مقدمات پر ایک دفعہ کا اور اضافہ کرو کہ قرآن مکہ کو ام القریٰ (آبادیوں کی ماں) کا خطاب دیتا ہے: لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا۔" (ص ۱۱۵)

(باقی)

علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت تنقید نگار

از۔ پروفیسر عبدالمغنی صدر شعبہ انگریزی، پٹنہ یونیورسٹی،

بحیثیت ایک مورخ اور محقق یا عالم کے علامہ سید سلیمان ندوی عصر حاضر کی چند اہم ترین شخصیتوں میں ایک ہیں، اور ان حیثیتوں سے ان کے قلم کی فتوحات عالم گیر ہیں، ہندوستان اور مشرق وسطیٰ سے آگے بڑھ کر یورپ کے مستشرقین تک انھیں ایک سند مانتے ہیں، اس کے علاوہ دار المصنفین اعظم گڈھ کے نگراں، ندوۃ العلماء لکھنو کے سرپرست، معارف اعظم گڈھ کے مدیر اور قومی و ملی مجالس کے خطیب کی متنوع حیثیتوں سے وہ اپنے وقت کے ایک نمایاں ترین رہنما تھے، واقعہ یہ ہے کہ علمی اور عملی دونوں جہتوں سے وہ اپنے مشہور عالم استاد علامہ شبلی نعمانی کے بہترین جانشین تھے، علامہ شبلی اردو کے عظیم ترین نقاد تھے، اور ان کی معرکہ آرا تنقیدی کتاب شعر العجم، کا کوئی جواب اب تک کی اردو تنقید میں نہیں ہے، ان کی دوسری تصنیف موازنہ انیس و دبیر بھی اردو میں عملی تنقید کی بہترین کتاب ہے، بلاشبہ یہ دونوں عظیم تصنیفات مشرقی انداز تنقید کی نمایندہ اور نمونہ ہیں، لیکن مشرقی انداز تنقید بھی ایک مستند انداز تنقید ہے اور جہاں تک فن کی تنقید کا تعلق ہے، بہ وجوہ مغربی انداز تنقید سے بہتر ہے، اس لیے کہ مشرقی طریقہ ادب کی فصاحت و بلاغت کی تشریح اور تجزیے کا ہے، جو عناصر فن کی تفہیم و توضیح کا سب سے موثر اور مفید طریقہ ہے، جب کہ اس کے برخلاف عصر حاضر میں مغرب کی تنقید کے جو نمونے سامنے آئے ہیں، ان میں سارا زور موشگافی اور فقط الفاظ و تراکیب کی صوفیانہ حد تک مبہم تشریح پر ہے، اسی طرح ہیئت ادب کی ترکیب کا

جو تجزیہ عام طور پر مغرب میں کیا جاتا ہے، اس میں چند مفروضات کی بنیاد پر کھینچ تان کر مطلب پیدا کرنے کا میلان زیادہ ہے اور پوست کندہ حقائق کی دریافت کا رجحان کم، چنانچہ اس کے باوجود کہ چند مشہور مغربی نقادوں نے اپنی تشریحات و مطالعات کی بنا بعض جدید علوم کے انکشافات پر رکھی ہے، واقعہ یہ ہے کہ انکے یہاں سب سے زیادہ کمی علم ہی کی ہے، اور وہ بالعموم اس مفروضے پر کام کرتے ہیں کہ ان کے منتخب کردہ ادبی نمونے اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں، لہٰذا وہ مستقل بالذات وجود ہیں جنکی تشریح الابدان پر توجہ مرکوز کرکے ان کے عناصر وجود اور جمالیاتی اثرات دونوں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے، لیکن مشرقی تنقید کے وہ اعلیٰ نمونے جن کا حوالہ ابھی شبلی کے سلسلے میں دیا گیا ہے ایک طرف اپنے موضوع کا پورا علمی احاطہ کرکے اس کے تمام متعلقات کا سراغ لگاتے ہیں، اور دوسری طرف ادب کے سالم کارناموں کی بالکل فنی و جمالیاتی تشریح پر سارا زور صرف کرتے ہیں، لہٰذا آج بھی جو کام کسی ادبی موضوع کے متعلق اعلیٰ پایے کے مشرقی مطالعات سے ہوتی ہے وہ مغربی مطالعات سے کم ہی ہوتی ہے، اب یہ دوسری بات ہے کہ تنقید یا ادب کو مشرقی و مغربی دو حصوں میں تقسیم کرنا ہی نامناسب ہے، ادب و تنقید کا کارنامہ و مطالعہ خواہ مغرب میں ہوا ہو یا مشرق میں دونوں کی اہمیت ہے اور ان کی قدر شناسی کے لیے بلا امتیاز و تعصب ایک اصولی و آفاقی معیار سے کام لینا چاہئے۔

اس معیار سے جب ہم علامہ سید سلیمان ندوی کے تنقیدی کاموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ وصف و وزن کے اعتبار سے ان کی کاوشیں اپنے وقت کے کسی بھی اردو تنقید نگار سے کم نہیں اور ان کا ایک کام تو ایسا ہے کہ اپنے موضوع پر دنیا کے تنقیدی ادب میں اسی طرح بے نظیر ہے جس طرح ان کے استاد علامہ شبلی کی شعر العجم ہے، یعنی خیامؒ پر علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق و تنقید، اس کے علاوہ ان کے مشہور مجموعہ مضامین "نقوش سلیمانی" میں ان کی تنقیدی

بصیرت متعدد ان مقالوں اور تبصروں سے آشکارا ہے، جو انھوں نے متنوع موضوعات پر تحریر کیے ہیں، ان موضوعات میں غزل، نظم، مرثیہ، مکتوب نگاری، ظرافت نگاری جیسی اصناف ادب شامل ہیں، اور جس صنف پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اس کے فنی مضمرات پر بڑی فکر انگیز بحثیں کی گئی ہیں، جن سے باذوق قارئین کے علاوہ خود نقادانِ ادب فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ ایک ایسے عالم کی نکتہ سنجیاں ہیں، جس کی تنقیدی حسیات کثیر اور غائر مطالعۂ ادب سے ابھری ہیں، اور وہ اپنی ہر رائے بہت جانچ پرکھ اور ناپ تول کر پیش کرتا ہے، اردو کے بہتیرے موجودہ ناقدین کی طرح فقط اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور ذہنی تعصبات یا نفسیاتی میلانات کی بنا پر فتوے صادر نہیں کرتا حالاں کہ خوب و ناخوب کے درمیان قطعی فیصلہ کرنے میں اس کے اسلوب کی محکمی کسی بڑے سے بڑے ناقد سے کم نہیں۔

مثال کے طور پر سب سے پہلے میں علامہ سید سلیمان ندوی کے دو زبردست ادبی معرکوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں تاریخ تنقید کے اہم کارنامے ہیں، اور ناقد کے کمالِ فن کا ثبوت پیش کرتے ہیں، شاد عظیم آبادی کے متعلق مختلف وقتوں میں مختلف قسم کی باتیں اردو کے تنقیدی ادب میں کی گئی ہیں، مگر آج سے چونسٹھ سال قبل علامہ سید سلیمان ندوی نے شاد کی غزلیات کے صرف پونے دو سو اشعار پر مشتمل ایک غیر منتخب اور نامرتب مجموعۂ کلام کے مقدمے میں جو کچھ کہا تھا اس پر اردو تنقید آج تک کوئی اضافہ نہ کر سکی، بلکہ اس بصیرت انگیز مطالعے کا اتباع بھی نہ کر سکی اور بعض وقت تثلیث غزل، وغیرہ کی لایعنی مبالغہ آرائیوں میں الجھی رہی، اس مقدمے کی روح حسب ذیل پیراگراف میں جلوہ گر ہے :۔

"شاد کا خاندان دلی سے عظیم آباد آیا تھا لیکن ان کی صحبت اور ان کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ کے اربابِ کمال سے رہا، تاہم یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ان کی شاعری پر

لکھنؤ سے بہت زیادہ دہلی کا رنگ نمایاں ہے، ان کے کلام میں کہیں کہیں لکھنؤ والوں کے صنائع بدائع کا نمونہ بھی مل جاتا ہے، مگر شاعری کا مذاق مضامین، معانی، خیال، سنجیدگی، متانت ہر چیز دلی کا پتہ دیتی ہے، اس کے ساتھ جو چیز خصوصیت سے لکھنؤ کی اثر میں نظر آتی ہے وہ الفاظ کی صحت، محاوروں کا تتبع اور فارسی ترکیبوں کا معتدل کے ساتھ استعمال ہے، اس طرح ہم عظیم آباد کے حضرت شاد کو لفظی حیثیت سے لکھنؤ کا اور معنوی حیثیت سے دلی کا کہیں گے۔" (نقوش سلیمانی ص ۴۹)

شاد کے تغزل کی خصوصیت اور اہمیت پر اس سے بہتر تنقیدی تبصرہ ممکن نہیں، اور اس تبصرے کی خوبی یہ ہے کہ صرف چند چھے تُلے لفظوں میں پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ عصر حاضر کے ایک عظیم غزل گو کے امتیازی اوصاف کی نشان دہی کر دی گئی ہے، اس نشان دہی میں تاریخی و عمرانی نکات کے ساتھ ساتھ خالص لسانی و ادبی اشارات بھی ہم آمیز ہیں۔ یہ ایک عالمانہ تنقید ہے جو اعلیٰ ذوق ادب کے ساتھ کی گئی ہے، اور سر بسر صداقت پر مشتمل ہے، اس میں افراط و تفریط کا کوئی مبالغہ نہیں، ذاتی پسند و ناپسند اور نفسیاتی الجھن کا کوئی شائبہ نہیں، ایک بالکل معروضی و متوازن مطالعہ و تجزیہ ہے۔

اس کے علاوہ شاد کی جو خصوصیت علامہ سید سلیمان ندوی نے واضح کی ہے وہی درحقیقت اردو ادب میں عظیم آباد کے مکتب شاعری کا امتیازی نشان دلی اور لکھنؤ کے مکاتب کے مقابلے میں ہے، اور اس سلسلے میں شاد کی حیثیت ایک پورے دبستان کے نمونہ و معیار کی ہو جاتی ہے، چنانچہ دبستان عظیم آباد کا بانی شاعر جو بھی ہو اردو غزل میں اس کے سب سے بڑے نمایندہ شاد عظیم آبادی اور اس دبستان کو ایک تنقیدی بنیاد فراہم کرنے والے علامہ سید سلیمان ندوی ہیں، یقیناً یہ ہماری ادبی تنقید کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔

شاد کے سلسلے میں علامہ نے ایک بہت ہی اہم عصری نکتہ ان کے مزاج تغزل کے متعلق اٹھایا ہے، اور اس نکتے کی تشریح کرتے ہوئے شاد کو عصر حاضر کا میر قرار دیا ہے، زیر نظر مقدمے میں انکا بیان ہے۔

"تغزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں حسن وعشق کی داستان سرائی میں وہی سادگی اور متانت ہے چھوٹے چھوٹے الفاظ میں سادہ ترکیبیں ہیں، بیان میں وہی رقت ہے، میر ہی کے اوزان و بحور ہیں وہی انداز کلام ہے، وہی فقیرانہ صدا ہے، اس لیے شاد کو اس دور کا میر کہا جائے تو بالکل بجا ہے"

(نقوش سلیمانی، ص ۳۹۹)

ہماری تنقید میں عام طور پر میر کا جانشین فانی کو قرار دیا گیا ہے، لیکن علامہ کی رائے مختلف ہے، اور نہ صرف یہ کہ شاد کو میر کی جانشینی کے معاملہ میں فانی پر تقدم حاصل ہے، بلکہ علامہ کی رائے کو بھی دوسرے ناقدین کے خیالات پر تقدم ہے، شاد کے کلام نے فانی کے اشعار سے پہلے انداز میر کی عکاسی کی اور علامہ نے دوسرے ناقدین سے قبل دور جدید کے میر کو دریافت کیا، اس سے بھی زیادہ اہم تنقیدی نکتہ یہ ہے کہ علامہ نے اپنے تنقیدی مطالعے میں میر کی پوری ادبی شخصیت اور اس کے فنی اسلوب کو پیش نظر رکھا ہے، جب کہ دیگر ناقدین محض میر کی قنوطیت کو سامنے رکھتے ہیں، اور ان کے اسلوب کو نظر انداز کر دیتے ہیں، میر کے تغزل میں قنوطیت سے زیادہ بھی کچھ تھا، اور ان کے اسلوب میں وہ شوکت نہیں جو غالب کی خصوصیت اور جس کا عکس فانی کے انداز بیان پر نمایاں ہے بیان میں رقت، اور فقیرانہ صدا، کی جن خصوصیات کا اشتراک علامہ سید سلیمان ندوی نے میر اور شاد کے درمیان دکھایا ہے، وہ دونوں شاعروں کے مزاج تغزل کے متعلق سچے کی بات ہے جس کا سراغ علامہ کی تنقیدی بصیرت ہی لگا سکی، جب کہ دوسرے ناقدین انگریزی محاورے میں صرف Beating about the bush جھاڑیاں پیٹتے رہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی تنقیدی بصیرت کا دوسرا اہم معرکہ شعلۂ طور کا تعارف کرتے ہوئے ایک نوارد شاعر جگرؔ مراد آبادی کی قدر شناسی ہے۔ جگر کے پہلے مجموعۂ کلام پر یہ پہلی مبصرانہ تنقید ہے، جس میں اردو غزل کی بساط پر ایک تازہ وارد کا ایسا شاندار استقبال کیا گیا ہے، جو عصر حاضر میں اردو غزل کے مستقبل کے ایک روشن پہلو کی نشاندہی کرتا ہے آج سے نصف صدی پیشتر جگرؔ جیسے غزل گو کی یہ قدر شناسی تنقید کی دور بینی بلکہ پیش بینی کا ثبوت ہے ..... اور اس سے ایک بار پھر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا ذوقِ ادب کتنا اعلیٰ اور تنقیدی شعور کتنا گہرا تھا، اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر یہ حقیقت ہے کہ جگرؔ کی شاعری کے جو اوصاف علامہ نے تقریباً پچاس سال قبل بیان کیے تھے، وہی اردو کے اس منفرد و ممتاز غزل گو کی حقیقی توصیف کرتے ہیں، اس توصیف کی انصاف پسندی ملاحظہ ہو۔

"جگرؔ کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں، وہ انھیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں، مگر جب وہ کہتے ہیں تو سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے، ہر فطری شاعر کا رنگ مذاق یہی ہوتا ہے، کیونکہ وہ وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے، وہ نہیں کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہیں، اور جس طرح ہر شخص کا فطری رنگ طبیعت خاص ہوتا ہے کہ وہی اس سے ترادش کرتا ہے، اسی طرح شاعر کا فطری رنگ بھی ایک ہوگا جو ہر جگہ یکساں ہی ظاہر ہوگا۔" (نقوشِ سلیمانی، ص ۲۳۰)

ان سادہ و صاف جملوں میں جگرؔ کی تعریف ان کی شاعری کی اصلیت کے مطابق ہے، جسے بلا کم و کاست بیان کر دیا گیا ہے، یہ اصلیت فطری شاعری کی ہے، جس میں تمام حقیقی شاعروں کو شریک و رفیق بتایا گیا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں علامہ نے جگرؔ کو حافظؔ اور خیامؔ کے مشابہ قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

"فارسی غزل کا بہترین نمونہ حافظ کا کلام ہے، مگر اس کو ہر صاحب نظر محسوس کرتا ہوگا کہ حافظ کے خیالات میں نیرنگی نہیں، طرز بیان میں نیرنگی ہے، وہی چند بندھے ہوئے خیال ہیں جو حافظ کی ہر غزل میں ظاہر ہوتے ہیں، مگر ہر غزل اپنے طریق اظہار اور طرز تعبیر میں الگ ہے، ایک ہی خیال سو سو طرح اس میں ادا ہوتا ہے مگر ہر جگہ اس کی شان نرالی اور طرز نئی ہے، یہی حال خیام کی رباعیوں کا ہے، چند خیالات ہیں جو ہر دفعہ نیا قالب بدل کر اور نئی شکل میں جلوہ گر ہو کر سامنے آتے ہیں"

حافظ و خیام سے جگر کا یہ موازنہ علامہ نے تینوں شعراء کے احوال و کیفیات کو ملحوظ رکھ کر کیا ہے، واقعہ یہی ہے کہ مستی و سرشاری میں اگر کسی اردو شاعر کا کلام حافظ و خیام کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے، تو وہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جگر ہی ہیں، علامہ خود فرماتے ہیں:

"وہ (جگر) مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر آتا ہے، وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے مگر نہیں اٹھا سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے مگر نہیں دیکھ سکتا، اس کی تمنا کی آنکھیں اس کو کبھی بے حجاب دکھا دیتی ہیں، تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے مگر وہ تصویر نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے" (نقوش سلیمانی، ص ۲۳۱)

یہ اردو میں تاثراتی تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے، اس میں علامہ کی تنقیدی نگاہ شاعر کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے، اور اس کے تغزل کی تہوں میں غوطہ لگا کر اس کا گوہر آبدار نکال لاتی ہے، پھر اس گوہر کی آب و تاب کو ویسے ہی درخشاں الفاظ میں بیان کرنے کے لیے ناقد کا قلم گویا شاعر کا قلم بن جاتا ہے، یہ در حقیقت روح شاعری میں حلول کر کے اس کے عمیق ترین مضمرات کی تشریح کا کمال ہے، اس تشریح کی تکمیل حسب ذیل جملوں سے ہوتی ہے۔

"جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا مستانہ اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بتخانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے۔" (نقوش سلیمانی)

یہ الفاظ "شعلۂ طور" سے زیادہ "آتش گل" کے شاعر کے ذہن کی تصویر پیش کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ناقد نے پہلے ہی مجموعہ کلام کے متعدد اشعار کے اشارات سے سمجھ لیا کہ آگے چل کر کی منزل کیا ہوگی، جس کا نقشہ واقعی دوسرے مجموعۂ کلام کے اشعار سے بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ شاعر کی کیفیات کا رخ جان لینا یقیناً ایک زبردست تنقیدی بصیرت کا ثبوت ہے اس معاملے میں سب سے لطیف نکتہ یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے جب یہ الفاظ لکھے تھے تو وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ممکن ہے، از خود رفتگی میں شاعر کو خود معلوم نہ ہو کہ وہ کدھر جا رہا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں علامہ کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"جگر بہ ظاہر سرشار" مگر در حقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پرخمار مگر اس کا دل ہشیار ہے، اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں اثر نہ ہو۔" (ایضاً)

یہ ایک بے خود فطری شاعر کا تنقیدی مرقع ہے، اور اس سے جگر کے سرور انگیز اور معنی آفریں تغزل کی وہ حقیقت آشکار ہوتی ہے، جس کے فہم سے ان کے متعدد معاصرین قاصر رہے، خاص کر نیاز فتح پوری کے تو تنقیدی حواس ہی جگر کے کلام سے مختل ہو گئے، اور انھوں نے اپنے وقت کے ایک رئیس المتغزلین کی تحقیر و توہین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، لیکن جگر کی شاعری تو ادب میں اپنا مقام پا چکی ہے، جب کہ نیاز فتح پوری کی تنقید اب گویا کسی کو یاد بھی نہیں۔

اکبر الہ آبادی کے شاعرانہ کلام پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، اور اس سلسلے میں نقادوں نے بڑی افراط و تفریط کی ہے، اور کم ہی ایسے ہیں جنھوں نے اکبر کے فکر و فن کے عناصر و حقائق پر جامع بحث کی ہو، علامہ سید سلیمان ندوی کا اس موضوع پر بھی ایک قول فیصل ہے۔ ملاحظہ ہو

"میر صاحب (میر اکبر حسین) کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سعدیؔ، ابن یمین اور خیام کے مغز سخن کو، آتش کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا ہے کہ وہ نہ صرف تفریح طبع اور واہ واہ کا سامان رہا، بلکہ اس کی تہ میں پند و موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل، اجتماعی مباحث بھی نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے، میر صاحب اسی بادۂ فرنگی کی آمیزش سے ذوق کلام کو لطف دیتے ہیں۔" (نقوش سلیمانی ص ۱۹۵)

یہ نکات وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو بہ یک وقت اردو و فارسی ادبیات کی پوری تاریخ سے آگاہ اور اکبر کے عظیم شاعرانہ آرٹ کا اداشناس ہو۔ یہ ایک بہت ہی باخبر اور صاحب نظر تنقید نگار کے نکات ہیں، اور ذوق و شعور کے رسوخ و رسائی کا بہترین نمونہ، اس سے اکبر کے ذہن اور فن دونوں کے پیچ و خم بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

مسدس حالی پر اردو تنقید کا ایک پورا سرمایہ جمع ہو چکا ہے، اب دیکھیے کہ ۱۹۳۵ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے جو فکر انگیز جائزہ اس طویل تاریخی نظم کا لیا ہے، اس میں خاص شعریت کے بہ بصیرت افروز نکتے انھوں نے پیش کیے اور اس طرح موضوع کے ساتھ ساتھ اسلوب کی اس تاثیر کا بھی راز کھولا جو مسدس حالی کی مقبولیت کا سبب ہوئی۔

"اس نظم کے لیے نکتہ شناس شاعر نے مسدس کا رنگ اختیار کیا، مسدس

اس زمانہ میں وہ موضوع جس کے ساتھ بھرپور محبت کرم کے درد و مصائب اور شہید کربلا کے دل فگار سوانح کے بیان کے لیے ایک گونہ مخصوص ہو کر غم والم کی داستان سرائی کے لیے خاص ہو چکا تھا، اس لیے شاعر کو جب اپنی قوم کے زہرہ گداز ماتم کا خیال آیا تو اس مسدس سے زیادہ موزوں اور بہتر نظم کی کوئی صنف نظر نہیں آئی جس کا وزن ہی گویا درد و غم اور نالہ و ماتم کے لیے بن چکا تھا۔ (نقوش سلیمانی ص ۴۴۹)

اسی طرح مسدس کی سادگی و پرکاری پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ رقم طراز ہیں۔

"اس سادگی اور بے تکلفی کے باوجود مسدس کی نظم میں ایسی سلاست، روانی اور برجستگی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صاف و شفاف نہر کسی ہموار ترائی میں آہستگی سے بہتی چلی جا رہی ہے، نہ کہیں رکاوٹ ہے، نہ لفظ میں گرانی ہے نہ قافیہ کی تنگی ہے، زبان میں گھلاوٹ، بیان میں حلاوت، لفظوں میں فصاحت اور ترکیبوں میں لطافت ہے، ہماری زبان میں سہل ممتنع کی یہ بہترین مثال ہے۔"

یہ تو شاعری کے سہل ممتنع کا بیان ہوا، اگر تنقید میں بھی کسی سہل ممتنع کا تخیل قائم کیا جائے تو علامہ سید سلیمان ندوی کے مذکورہ بالا جملے نثر میں تنقید کے سہل ممتنع کی بہترین مثال بہ آسانی قرار دیئے جا سکتے ہیں، یہ تو اسلوبیات پر سید صاحب کی پرمغز نکتہ سنجی کا ایک نمونہ ہوا، اب اسی مسدس کے سلسلے میں اجتماعی نفسیات پر علامہ کے تبصرے کا انداز ملاحظہ ہو۔

"مسدس میں شاعر نے اس عظیم الشان قوم کے حادثۂ موت کے اسباب اس تفصیل سے بیان کیے تھے جن کو سن کر ان بے خبروں کو جن کو دفعتہً ۱۸۵۷ء کے حادثۂ خونیں کے وقت ہی سب سے پہلے اس موت کا حال معلوم ہوا، اس حسرت ناک انجام پر سخت حیرت تھی، شاعر نے موت کے طبعی اسباب سنا کر

ان کی حیرت کو دور کیا اور بتایا کہ ان اسباب کے موجود ہوتے ہوئے موت نہیں،
زندگی تعجب انگیز تھی۔ (نقوش سلیمانی، ۲۴۶-۲۴۷)

یہ تنقید کی جامعیت ہے کہ ادب کے موضوع اور اسلوب دونوں کو مد نظر رکھ کر کسی نمونۂ ادب کی ایسی تشریح و توصیف کی جائے جس سے فکر و فن کی باہمی ترکیب اور ہم آہنگی کے عناصر اندازِ مضمرات اور اثرات واضح ہوں، یہ جامعیت ہی اچھی اور بڑی تنقید نگاری کا جوہر اصل ہے، جو بہت کم یاب ہے، اور چند عظیم ناقدین ہی اس کے مایہ دار ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی اپنی قوت تنقید کے لحاظ سے انہی میں ایک ہیں۔

علامہ کا نظریۂ تنقید ان کے متعدد مضامین میں نمودار ہوا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص نقطۂ نظر سے ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کا تجزیہ، موازنہ اور فیصلہ کرتے ہیں، یہ ایک مرکب و متوازن نقطۂ نظر ہے، جس میں فن کی جمالیات کے ساتھ ساتھ فکر کی اخلاقیات کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے، اور بالکل اصولی طور پر متنوع ادبی تخلیقات کی منصفانہ قدر شناسی کی گئی ہے، ایک غیر معروف اردو شاعر محمود اسرائیلی کے مجموعۂ کلام ضیا باراں، پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے شاعری کے متعلق اپنے جن تصورات کا اظہار کیا ہے، ان کے مطالعے سے علامہ کی تنقیدی فکر کے چند اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں، یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ فردوسی نے محمود کو پیدا کیا، میں سمجھتا ہوں کہ محمود نے فردوسی کو پیدا کیا، اگر محمود کی تلوار یہ ہنگامہ آفریں جلد پیدا نہ کرتی تو رستم و سہراب اور کیکاؤس و افراسیاب کے بوسیدہ ڈھانچوں میں یہ جان نہیں پڑ سکتی تھی، اور نہ رزم و جنگ کی یہ رجز و نیب، تلواروں کی یہ جھنکار، اور داد شجاعت کے یہ افسانے فردوسی کی زبان و قلم سے ادا ہو سکتے تھے۔ (نقوش سلیمانی صفحہ ۴۷)

...معنوں کے لیے جس عشق کی ضرورت ہے اس سے مقصود صرف لیلیٰ اور مجنوں میں
عشق نہیں ہے، یہاں عشق اپنے وسیع معنوں میں بولا جا رہا ہے، اس سے قلب کی وہ
واقعی کیفیت مراد ہے جو عالم اور ماورائے عالم کی ہر چیز سے لگاؤ پیدا کر سکتی ہے،
مناظر فطرت سے عشق ہو سکتا ہے، قوم اور ملک سے عشق ہو سکتا ہے، کسی بلند مقصد
اور اہم مطمح نظر سے عشق ہو سکتا ہے، کسی مقدس ذات اور مقدس کام سے عشق
ہو سکتا ہے، اور اس میں سے ہر عشق شاعری کے ساز کو چھیڑ کر اس کو دھن موسیقی
بنا دیتا ہے، (نقوش سلیمانی ص۵۴)

۳۔ ملک اور دین کی خدمت میں جو تضاد بعض کم سوادوں کو نظر آتا ہے، اس کی
گہری نگاہ میں وہ منطقی مغالطہ کے سوا کچھ اور نہیں، غرض اس باب میں اس کے خیالات
و تعلیمات بے حد سنجیدہ ہیں، یعنی مذہب و سیاست اور دین و وطن کے جذبات
کی معتدل آمیزش، مشرق سے صحیح عقیدت اور مغرب کی صحیح تنقید (نقوش سلیمانی ص۱۴۶)

ان اقتباسات کی روشنی میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نظریۂ تنقید کے متعلق جن چند امور
پر زور دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں۔

اوّل، ادب اپنے مخصوص تکوینی مفہوم میں بجائے خود براہ راست کوئی تہذیب اور
نظام اقدار پیدا نہیں کرتا، لہٰذا وہ نہ اپنا محرک آپ ہو سکتا ہے نہ اپنا مقصود آپ یعنی ادب
اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، اور اپنے معاشرے کا عکاس۔ تاریخ ادب کے ساتھ نہیں چلتی،
ادب تاریخ کے ساتھ چلتا ہے، شاعری، افسانہ، ڈراما، ناول، تنقید سبھی اصناف ادب کو
تحریک اس اجتماعی فضا سے ملتی ہے، جس میں کوئی ادیب یا شاعر سانس لے رہا ہوتا ہے،
لہٰذا فن کار کی عظمت اس امر میں مضمر ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے حقائق کو پوری طرح محسوس

کر کے ان کی اپنی طرح عکاسی کرے، تاکہ اس کا فن روحِ عصر کا آئینہ دار اور ترجمان ہو، سماج میں اس کی قدر و قیمت ہو اور تاریخ میں اس کی جگہ بن سکے، اس لیے کہ ادب کا ہر نمونہ کسی روایت کے پس منظر میں رونما ہوتا ہے، اور وہ اپنی کوئی روایت اسی وقت بنا پاتا ہے، جب ورثے میں ملی ہوئی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں کچھ توسیع و اضافہ کرے اور اسے ترقی دے۔

دوم، ادب کا موضوع بہت وسیع اور رنگا رنگ ہوتا ہے، ادبی کوشش میں کام یابی کے لیے شرط اس موضوع سے ذہنی وابستگی، اس کا فہم و احساس اور اس کے اظہار کے لیے ایک جذبہ بے اختیار ہے، عشق محض ذات کا نہیں، کائنات کا بھی ہوتا ہے، اور کائنات بہت وسیع ہے، فرد، معاشرہ، قوم، ملت، دین، تہذیب اور فطرت سبھی اس میں شامل ہیں، لہٰذا ادیب و ناقد دونوں کی نگاہوں میں وسعت اور قلب میں کشادگی ہونی چاہیے حسن کی تعریفیں بھی بہت ہیں اور مظاہر بھی فراواں، حسن کو ہر رنگ میں دیکھنے کی صلاحیت ہی ایک شاعر یا ادیب کے ذہن کی سب سے بڑی پونجی ہے، اور یہی اس کے احساسِ جمال کی کسوٹی بھی۔

سوم، ادب زندگی کے لیے ہے، اور تمام مسائل حیات اس کا مواد، سیاست اور مذہب دونوں اس کے دائرے میں ہیں، اور مشرق و مغرب دونوں سے اس کی یکساں دل چسپی ہونی چاہیے، چنانچہ ادب کے ذریعے دین اور وطن دونوں کی خدمت ایک ہم آہنگی سے کی جا سکتی ہے، اس لیے کہ وطن دوستی اور دین داری کے درمیان اصلاً کوئی تضاد نہیں ہے، یہ ایک قسم کی وسیع تر انسانی یک جہتی ہے، جو ہر قسم کے تفرقوں پر حاوی ہے، اور زندگی کو ایک رخ دینے والی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے یہ ادبی تصورات تنقیدی شعور کی بلند ترین منزل کے نشانات ہیں، جن کا اتباع کر کے ہماری جدید تنقید متعدد گم راہیوں سے نکل کر راہِ مستقیم پر گام زن ہو سکتی ہے، اس لحاظ سے ہم علامہ کو عصرِ حاضر کا ایک مصلح تنقید کہہ سکتے ہیں، اور ان کے ادبی رہنما ہونے میں

ذکر ہی ضروری نہیں۔ ان کی اس ادبی دیریدی کی سب سے بڑی دستاویز اور اردو میں تحقیق و تنقید دونوں کا سنگ میل ان کا شاہکار خیام ہے۔ ادبی تحقیق کی صنف میں خیام سے بہتر کوئی کتاب آج تک اردو میں نہیں لکھی گئی، اور یہ تحقیق تنقید کی بہترین جہات کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس میں ایک طرف تمام متعلقہ اعداد و شمار اور جملہ ضروری حقائق کا احاطہ ہے، یہاں تک کہ موضوع سے متعلق دنیا کی تمام زبانوں میں پیش کیے گئے تازہ ترین مواد کا جائزہ ہے، جب کہ دوسری طرف رباعیات خیام کی تشریح و تفہیم اعلیٰ تنقیدی انداز سے کی گئی ہے اور ان کی صحیح قدر و قیمت کی تعیین کے لیے ایک بے خطا اور بے مثال تجزیے سے کام لیا گیا ہے۔

"خیام، وہ عہد آفریں کتاب ہے، جس نے فارسی کے اس مشہور رباعی گو کے متعلق مشرق و مغرب دونوں کے پھیلائے ہوئے تمام غلط تصورات کو چیلنج کیا، اور اعداد و شمار کی فراوانی کے ساتھ ساتھ تجزیے کی طاقت سے اپنے صحیح نقطۂ نظر کا لوہا منوا لیا، یہاں تک کہ علمائے عصر کو اقرار کرنا پڑا کہ خیام پر اس سے بہتر کتاب نہ پہلے کبھی دنیا کی کسی زبان میں لکھی گئی، نہ آیندہ متوقع ہے۔ اس لیے کہ اس کے مباحث نے موضوع کے تمام مضمرات کا استقصا کر کے ایک قول فیصل پیش کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب نے خیام کو بحیثیت ایک عظیم فلسفی صوفی کے نئی زندگی عطا کی اور اس کی رباعیات کی حقیقت و اہمیت پہلی اور آخری بار مکمل طور پر واضح کر دی، اس سلسلے میں خود رباعی کی اصلیت کا سراغ لگا کر علامہ نے دکھایا ہے کہ خیام ہی نے صحیح معنوں میں اس ہیئت سخن کا بہترین استعمال کیا اور اس کے دونوں اساسی عناصر فلسفہ و تصوف کو باہم ترکیب دے کر ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ کر دیا، جس سے رباعی کے مفہوم میں بیک وقت بلندی اور گہرائی دونوں آ گئی، حسب ذیل مختصر اقتباسات سے زیر نظر تصنیف کے کارنامہ و کمال کا کچھ اندازہ ہوگا۔

"وہ خیام ہی ہے، جس نے باقاعدہ اس دو رباعی سے فلسفہ و حکمت کے بیان کا

کام لیا، اور اس کے بعد اس کے طبقہ نے اس کی تقلید کی، میرے نظریہ کے مطابق
رباعی پہلے اہل سرود کے یہاں آئی، ان کے یہاں سے صوفیہ کی مجلس سماع میں اور
وہاں سے حکماء کے حلقہ درس میں، اور خیام پہلا حکیم شاعر ہے، جس کی رباعیوں کی
قدر ہوئی اور وہ اس کی شہرت کا ذریعہ ہوئیں۔" (صـ۲۵۵)

صوفیوں نے اس (خیام) کی رباعیات میں صوفیانہ رباعیوں کی آمیزش کی،
اور رندوں نے اباحی خیالات اور مستی و رندی کی رباعیاں بڑھائیں، چنانچہ ان مشکوک
رباعیات میں انہی دو قسموں کی رباعیاں کثرت سے ملیں گی، ایک اس کو صوفی صافی یعنی
مذہبی صوفی ثابت کرنا چاہتا ہے، اور دوسرا رند لاابالی، مگر درحقیقت خیام نہ یہ تھا،
نہ وہ، بلکہ وہ حکیم متقشف تھا، اور اس کا تصوف اگر تھا تو حکیمانہ تصوف تھا،
مذہبی صوفیانہ نہیں۔" (صـ۲۵۱)

" خواجہ حافظ کی طرح دنیا میں کتنے خوش قسمت بادہ پرست ہیں، جن کی شراب
کو لوگوں نے شرابِ معرفت سمجھا ہے، لیکن ایک بدقسمت خیام ایسا ہے کہ اس کی
شراب کو دوست دشمن سب ہی بھٹی والی شراب سمجھتے ہیں، اور انہوں نے یہ
تصور کیا ہے کہ وہ ایک رند میخوار تھا، جو ہمیشہ مست و سرشار رہتا تھا، جس کے ادھر
ادھر ٹوٹی صراحی اور چھوٹے پیالوں کے ٹکڑے پڑے رہتے تھے، مگر کیا واقعہ ایسا
ہی ہے؟ (نقوش سلیمانی صـ۳۳۱)

یہ فیصلہ مشکل ہے کہ خیام جب شراب کا متوالا تھا، وہ کون سی شراب ہے، اس کے
ساتھ اس مقدمہ کو بھی خیال کیجئے کہ خیام کے جس قدر قدیم اور مستند سوانح نگار ہیں ان میں
سے کسی نے خیام کی بادہ پرستی و میخواری کا ذکر کیا معنی اشارہ تک نہیں کیا ہے.....

کہ ... [illegible]

اس موضوع پر ایک اور ... [illegible]

ایسی لچک ہوتی ہے، کہ جس مذاق کا آدمی جس خیال کو دل میں لے کر پڑھے اسکا

مطابق معنی اس شعر میں اس کو نظر آتے ہیں، خواجہ حافظ کے ایک ہی شعر میں ایک

میخوار کو رندی کی تعلیم، اور ایک پیر طریقت کو زہد و ترک کا سبق ملتا ہے یہی حال

خیام کی ان رباعیوں کا ہے۔ (نقوش سلیمانی صہ ۳۵۰)

ان تحقیقی و تنقیدی مباحث کے بعد کتاب کے آخر میں سید صاحب نے رباعیات کے علاوہ خیام کے بعض عربی و فارسی علمی رسایل کی تالیف و ترتیب انہی زبانوں میں کی ہے، جب کہ مباحث کے دوران وہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی ماخذ کے حوالے کثرت سے دیتے ہیں اور خیامیات کے تمام علما کی رایوں پر پورے اعتماد و استناد کے ساتھ محاکمہ کرکے، اپنے قطعی فیصلے صادر کرتے ہیں، کسی ادبی موضوع پر ایسی معرکہ آرا کتاب شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں لکھی گئی ہو، اور یقیناً خوش قسمت ہے کہ اس کے سرمایے میں تحقیق و تنقید کا یہ نادر و نایاب جوہر پایا جاتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اسلوب نگارش صاف، صریح، پُر معنی اور شگفتہ ہے، جیسا کہ مولہ بالا اقتباسات سے مترشح ہے، عربی و فارسی کے بہت بڑے عالم ہونے کے باوجود سید صاحب کی عبارت میں ثقاہت جتنی بھی ہو، ثقالت بالکل نہیں، ان کے الفاظ ثقیل نہیں، دبیز مین ان کے جملے پیچیدہ نہیں، حاشیہ وہ ہیں، ان کے بیانات پُر پیچ نہیں سلیس ہیں، ان کی ترکیبوں میں کوئی اغلاق نہیں اور تشبیہیں اشکال سے خالی ہیں، فقروں کی دروبست چست ہے، اور استعارات و کنایات نہایت واضح، سید صاحب کی نثر کا رنگ شستہ اور آہنگ رواں ہے، اس طرز تحریر میں شائستگی بھی ہے

رہا تنقید بھی [illegible] صدق طور پر

پیش کرتے ہیں، اپنی بات [illegible] بلکہ تنقید کی طرح [illegible]

ہے حجازی کی قارونی کا [illegible] نہیں کرتے، بلکہ ایک خوش مزاج صوفی کی طرح نرم [illegible]

اسلوب سے اپنے موعظت کو قاری کے لیے دلنشین بنا دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تنقید کی ساری خشکی

ادب کی شادابی میں بدل جاتی ہے، اور تنقید کی صلابت ایک لطافت کے ساتھ آشکار ہوتی ہے،

یہ شبلی کے دبستان تنقید کا ایک امتیازی جوہر ہے، جس کو عصر حاضر میں علامہ سید سلیمان

ندوی کے ساتھ ساتھ اور کہنا چاہئے کہ ان کے زیر سرکردگی عبدالسلام ندوی، نجیب اشرف

ندوی، ابوالحسن علی ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی اور اب سید صباح الدین عبد الرحمان

نمایاں کرتے رہے ہیں، یہ ایک علمی دبستان ہے، مگر تنقیدی حیات اور ادبی محاسن کا بھی مایہ دار رہا،

یہی وجہ ہے کہ جن ادبی موضوعات پر اس دبستان کے عمائدین نے قلم اٹھایا ہے اس کی جمالیات و اخلاقیات

دونوں کا ایک ایسا مرقع تیار کر دیا ہے، جس سے معلومات کے حصول کے ساتھ ساتھ احساسات

کی تحریک کا بھی سامان ہوتا ہے، اور موضوعات کی تمام جہتیں روشن ہو جاتی ہیں۔ یہ محض تنقید کا

خام مواد نہیں، وہ پختہ و بالیدہ کارنامہ ہے، جس نے کئی ادبی نسلوں کے ذوق کی پرورش اور

شعور کی تربیت کی ہے، شبلی و سلیمان اور ان کے رفقاء نے اردو ادب میں مستند، متین اور موثر

افکار و خیالات کی ایک فضا بنائی ہے، جس سے وقت کے ادبا و شعرا نیز عام قارئین نے

بہ کثرت استفادہ کیا ہے، شبلی کی شعر العجم کے ساتھ ہی سید سلیمان ندوی کی خیام نے

اپنے معاصر اردو ادب میں فارسی شاعری کے ساتھ اہل ذوق کے شغف میں اضافہ کیا اور

انھیں اس کے مطالعے کا زیادہ سے زیادہ شوق دلایا، یہ اردو شاعری کی بنیادی روایات

کو زندہ و تابندہ رکھنے کا کارنامہ تھا، اور جدید اردو ادب نے جس حد تک اس کو بے اعتنائی

برتی ہے، اپنا اتنا ہی نقصان کیا ہے،

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ شبلی و سید سلیمان ندوی کے تنقیدی کمالات کی تاریخی عظمت کے علاوہ ان کی عملی اہمیت کو بھی سمجھا جائے، اور ان سے بیش از بیش استفادہ کرکے جدید اردو ادب و تنقید کی راہیں ہموار اور ان کا رخ درست کیا جائے، یہ درحقیقت اپنی تنقیدی روایات سے قوت حاصل کرکے انفرادی تجربات کے راستوں پر مضبوط قدموں اور روشن نگاہوں کے ساتھ گام زن ہوتا ہے، آج کے ادب میں مشرق کی بازیافت کے لیے شبلی و سید سے بہتر کسی مصنف و ناقد کی تحریریں نہیں ہوسکتیں، اس معتبر بازیافت سے مغرب کا بھی صحیح مصرف دریافت ہوگا، ادبی توازن کے قیام اور متوازن ترقی کے لیے یہ بازیافت و دریافت دونوں ہی ضروری ہیں۔

نوٹ۔ یہ مضمون حضرت سید صاحب کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب میں بہار اردو اکادمی میں پڑھا گیا۔

بزم رفتگاں

یہ مصنف کے بعض بزرگوں، دوستوں، عزیزوں، معاصر دانشوروں، ادیبوں، مصنفوں اور سیاسی و قومی رہنماؤں کی وفات پر تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے، جن سے ان کو محبت اور عقیدت اور گوناگوں مراسم و تعلقات تھے۔

حصہ اول میں جو مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالسلام ندوی جیسے حلقۂ شبلی کے ارباب کمال و اصحاب قلم پر مضامین ہیں، اور حصہ دوم میں جو معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپا ہے، مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مشاہیر و اکابر پر مضامین ہیں۔

از۔ سید صباح الدین عبدالرحمن۔

قیمت۔ علی الترتیب ۱۰روپیے

ہندوستانی جامعات میں عربی کی درس و تدریس ایک مطالعہ

از جناب فیضان اللہ فاروقی لکچرار شعبہ عربی سنٹرل انسٹیٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد۔

ہندوستان میں عربی زبان کب اور کیسے آئی، یہ ایک تاریخی بحث ہوگی، ہماری بات وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب یہاں عربی زبان آچکی تھی۔

اہل ہند نے اسے ایک مذہبی زبان کی حیثیت سے قبول کیا تھا، چنانچہ اسلام کی زیادہ تر تعلیمات مثلاً فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کی تعلیم عربی پر منحصر تھی، کیونکہ یہ تمام علوم عربی میں تھے، اور یہ بھی تھا کہ عربی پڑھنا پڑھانا حدیث کی رو سے باعث اجر و ثواب سمجھا جاتا تھا، جو بلاشبہ ایک حقیقت ہے، لیکن اس کا دارومدار نیت پر ہے، فارسی زبان بحیثیت سرکاری زبان کے حکمران تھی، کیونکہ دہلی سلطنت کے تمام حکمران ایران و افغانستان کے باشندے تھے، اور فارسی انکی مادری زبان تھی، (عموماً ایسا ہی تھا) بعد میں ان نوواردین کا میل جول جب مقامی لوگوں سے ہوا تو ایک تیسری زبان نے جنم لیا جسے بعد میں اردو کہا گیا، اردو مقامی زبانوں کی نسبت فارسی اور عربی سے زیادہ متاثر ہوئی، لیکن عربی کا اثر فارسی کی بنسبت زیادہ، اس طرح رہا کہ فارسی نے ایران پر تسلط کے بعد عربی الفاظ کثیر تعداد میں اپنے اندر جذب کرلئے تھے، چنانچہ اردو نے فارسی سے جو کچھ اخذ کیا وہ بھی دراصل عربی ہی کے سرچشمے سے تھا، لیکن جو الفاظ فارسی کے توسط سے آئے وہ فارسی قواعد اور ایرانی تہذیب کے پس منظر میں لیے گئے اور وہ الفاظ جو براہ راست

خیام کے حیدر [illegible] میں شہرت کا جتنا [illegible] ہیں، صاحب ذوق کی نظر انداز کر دو
کر دو یکساں نوعیت کی شے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (نقوش سلیمانی ص [illegible])

اس طرح پر ایک اور نکتہ ہے، جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، شاعر کے شعر میں ایسی لچک ہوتی ہے، کہ جس مذاق کا آدمی جس خیال کو دل میں رکھ کر پڑھتا ہے اسی کے مطابق معنی اس شعر میں اس کو نظر آتے ہیں، خواجہ حافظ کے ایک ہی شعر میں ایک میخوار کو رندی کی تعلیم، اور ایک پیر طریقت کو زہد و ترک کا سبق ملتا ہے، یہی حال خیام کی ان رباعیوں کا ہے۔ (نقوش سلیمانی ص ۳۵۸)

ان تحقیقی و تنقیدی مباحث کے بعد کتاب کے آخر میں سید صاحب نے رباعیات کے علاوہ خیام کے بعض عربی و فارسی علمی رسائل کی تالیف و ترتیب انہی زبانوں میں کی ہے، جب کہ مباحث کے دوران وہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی ماخذ کے حوالے کثرت سے دیتے ہیں اور خیامیات کے تمام علما کی رایوں پر پورے اعتماد و استناد کے ساتھ محاکمہ کر کے، اپنے قطعی فیصلے صادر کرتے ہیں، کسی ادبی موضوع پر ایسی معرکہ آرا کتاب شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں لکھی گئی ہو، اور وہ یقیناً خوش قسمت ہے کہ اس کے سرمایے میں تحقیق و تنقید کا یہ نادر و نایاب جوہر پایا جاتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اسلوب نگارش صاف، صریح، پُرمعنی اور شگفتہ ہے، جیسا محولہ بالا اقتباسات سے مترشح ہے، عربی و فارسی کے بہت بڑے عالم ہونے کے باوجود سید صاحب کی عبارت میں فقاہت جتنی بھی ہو، ثقالت بالکل نہیں، ان کے الفاظ دقیق نہیں، دبیز میں ان کے جملے پیچیدہ نہیں، حاشیہ ہیں، ان کے بیانات پُرپیچ نہیں سلیس ہیں، ان کی ترکیبوں میں کوئی اغلاق نہیں اور تشبیہیں اشکال سے خالی ہیں، فقروں کی در و بست چست ہے، اور استعارات و کنایات نہایت واضح، سید صاحب کی نثر کا رنگ شستہ اور آہنگ رواں ہے، اس طرز تحریر میں شائستگی بھی ہے

اور چاشنی بھی، سید صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر نکتہ ایک منطقی انداز سے اور مدلل طور پر پیش کرتے ہیں، اپنی بات مثالوں اور حوالوں سے ثابت کرتے ہیں، لیکن فقیہ شہر کی طرح لغت ہائے حجازی کی قارونی کا مظاہرہ نہیں کرتے، بلکہ ایک خوش مزاج صوفی کی طرح بڑے دل چسپ اسلوب سے اپنے موقف کو قاری کے لیے دل نشین بنا دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تحقیق کی ساری خشکی ادب کی شادابی میں بدل جاتی ہے، اور تنقید کی صلابت ایک لطافت کے ساتھ آشکار ہوتی ہے۔

یہ شبلیؒ کے دبستان تنقید کا ایک امتیازی جوہر ہے، جس کو عصر حاضر میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ ساتھ اور کہنا چاہئے کہ ان کے زیر سرکردگی عبدالسلام ندوی، نجیب اشرف ندوی، ابوالحسن علی ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی اور اب سید صباح الدین عبدالرحمان نمایاں کرتے رہے ہیں، یہ ایک علمی دبستان ہے، مگر تنقیدی حیات اور ادبی محاسن کا بھی مایہ دار ہے، یہی وجہ ہے کہ جن ادبی موضوعات پر اس دبستان کے عمائدین نے قلم اٹھایا ہے اس کی جمالیات و اخلاقیات دونوں کا ایک ایسا مرقع تیار کر دیا ہے، جس سے معلومات کے حصول کے ساتھ ساتھ احساسات کی تحریک کا بھی سامان ہوتا ہے، اور موضوعات کی تمام جہتیں روشن ہو جاتی ہیں۔ یہ محض تنقید کا خام مواد نہیں، وہ پختہ و بالیدہ کارنامہ ہے، جس نے کئی ادبی نسلوں کے ذوق کی پرورش اور شعور کی تربیت کی ہے، شبلی و سلیمان اور ان کے رفقا نے اردو ادب میں مستند، متین اور موثر افکار و خیالات کی ایک فضا بنائی ہے، جس سے وقت کے ادبا و شعرا نیز عام قارئین نے بکثرت استفادہ کیا ہے، شبلی کی شعر العجم کے ساتھ ہی سید سلیمان ندوی کی خیام نے اپنے معاصر اردو ادب میں فارسی شاعری کے ساتھ اہل ذوق کے شغف میں اضافہ کیا اور انھیں اس کے مطالعے کا زیادہ سے زیادہ شوق دلایا، یہ اردو شاعری کی بنیادی روایات کو زندہ و تابندہ رکھنے کا کارنامہ تھا، اور جدید اردو ادب نے جس حد تک اس سے بے اعتنائی

برقی ہے، اپنا اتنا ہی نقصان کیا ہے،

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ شبلی و سید سلیمان ندوی کے تنقیدی کمالات کی تاریخی عظمت کے علاوہ ان کی عملی اہمیت کو بھی سمجھا جائے، اور ان سے پہلی از پیش استفادہ کر کے جدید اردو ادب و تنقید کی راہیں ہموار اور ان کا رخ درست کیا جائے، یہ وہ حقیقت اپنی تنقیدی روایات سے قوت حاصل کر کے انفرادی تجربات کے راستوں پر مضبوط قدموں اور روشن نگاہوں کے ساتھ گام زن ہوتا ہے، آج کے ادب میں مشرق کی بازیافت کے لیے شبلی و سید سے بہتر کسی مصنف و ناقد کی تحریریں نہیں ہو سکتیں، اس معتبر بازیافت سے مغرب کا بھی صحیح مصرف دریافت ہوگا، ادبی توازن کے قیام اور متوازن ترقی کے لیے یہ بازیافت و دریافت دونوں ہی ضروری ہیں۔

نوٹ:۔ یہ مضمون حضرت سید صاحب کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب میں بہار اردو اکادمی میں پڑھا گیا۔

بزم رفتگاں

یہ مصنف کے بعض بزرگوں، دوستوں، عزیزوں، معاصر دانشوروں، ادیبوں، مصنفوں اور سیاسی و قومی رہنماؤں کی وفات پر تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے، جن سے ان کو محبت اور عقیدت اور گوناگوں مراسم و تعلقات تھے۔

حصہ اول میں جو مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبد السلام ندوی جیسے حلقۂ شبلی کے ارباب کمال و اصحاب قلم پر مضامین ہیں، اور حصہ دوم میں جو معارف پریس اعظم گڈھ میں چھپا ہے، مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مشاہیر و اکابر پر مضامین ہیں۔

از۔ سید صباح الدین عبد الرحمن۔

قیمت۔ علی الترتیب ۱۷، روپے

ہندوستانی جامعات میں عربی کی درس وتدریس
ایک مطالعہ

از جناب فیضان اللہ فاروقی لکچرار شعبہ عربی سنٹرل انسٹیٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد۔

ہندوستان میں عربی زبان کب اور کیسے آئی، یہ ایک تاریخی بحث ہوگی، ہماری بات وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب یہاں عربی زبان آچکی تھی۔

اہل ہند نے اسے ایک مذہبی زبان کی حیثیت سے قبول کیا تھا، چنانچہ اسلام کی زیادہ تر تعلیمات مثلاً فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کی تعلیم عربی پر منحصر تھی، کیونکہ یہ تمام علوم عربی میں تھے، اور یہ بھی تھا کہ عربی پڑھنا پڑھانا حدیث کی رو سے باعث اجر وثواب سمجھا جاتا تھا، جو بلاشبہ ایک حقیقت ہے، لیکن اس کا دارومدار نیت پر ہے، فارسی زبان بحیثیت سرکاری زبان کے حکمران تھی، کیونکہ دہلی سلطنت کے تمام حکمران ایران وافغانستان کے باشندے تھے، اور فارسی انکی مادری زبان تھی، (عموماً ایسا ہی تھا) بعد میں ان نوواردین کا میل جول جب مقامی لوگوں سے ہوا تو ایک تیسری زبان نے جنم لیا جسے بعد میں اردو کہا گیا، اردو مقامی زبانوں کی بنسبت فارسی اور عربی سے زیادہ متاثر ہوئی، لیکن عربی کا اثر فارسی کی بنسبت زیادہ، اس طرح رہا کہ فارسی نے ایران پر تسلط کے بعد عربی الفاظ کثیر تعداد میں اپنے اندر جذب کر لئے تھے، چنانچہ اردو نے فارسی سے جو کچھ اخذ کیا وہ بھی دراصل عربی ہی کے سرچشمے سے تھا، لیکن جو الفاظ فارسی کے توسط سے آئے وہ فارسی قواعد اور ایرانی تہذیب کے پس منظر میں لیے گئے اور وہ الفاظ جو براہ راست

عربی سے لئے گئے ہیں انھیں حالات اور زبان کے اور زبان کے تقاضوں کے تحت مقامی رنگ دیدیا گیا۔ آسانی کے لیے ان کی کچھ مثالیں دیکھیے۔

لفظ	عربی استعمال	فارسی استعمال	اردو استعمال
غریب	اجنبی ۔ مسافر	اجنبی	مفلس
شراب	پینے کی چیز	مئے ۔ شراب	خراب ۔ مئے
تشریف	عزت افزائی کرنا بحیثیت مصدر متعدی	تشریف ۔ بحیثیت اسم جامد	ایضاً
دولت	غلبہ گھومنے والی چیز یعنی حکومت	ریاست ۔ جائیداد	مال
تسکین	غیر متحرک بنا دینا آباد کاری	دلاسا ۔ اطمینان	ایضاً
تعریف	توضیح ۔ شناخت کرادینا	تعریف بمعنی توصیف ۔ مدح سرائی	تعریف بمعنی مدح اور شناخت
انتقال	ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا	″ ″	مرجانا ۔ سفر آخرت
تعلق	چپک جانا (ربط)	لگاؤ ۔ نسبت	ایضاً
اخبار	خبر کی جمع	خبرنامہ	روزنامہ
خط	لائن	بمعنی مکتوب ۔ لکیر	چٹھی
مجال	جولانگاہ (دائرہ کار)	طاقت، حوصلہ، ہمت	طاقت
ہجوم	حملہ	بھیڑ ۔ اژدہام	بھیڑ

لفظ	عربی استعمال	فارسی استعمال	اردو استعمال
غلام	لڑکا	غلام - عبد	عبد - زرخرید
محل	اترنے کی جگہ - مقام	قصر - جا	قصر
جہاز	آلہ - سامان	جہاز	جہاز
عورت	شرمگاہ	”	عورت (جنس)

یہ اور اسطرح کے اور بہت سے الفاظ ایسے مل جائیں گے، جو اپنی اصل سے ہٹ کر استعمال ہونے لگے میں یہ تبدیلی فارسی کے توسط سے ہوئی ہے۔ یہاں آپ ڈکشنری کی بات اس لئے نہ کریں کہ میں کثرت استعمال کی بات کر رہا ہوں، مذکورۂ الفاظ کے معنی اردو ڈکشنری میں عربی مفاہیم کے ساتھ مل سکتے ہیں، لیکن استعمال ہرگز ان تمام معنوں میں نہیں ہے، اس کے علاوہ کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جنپر ہندوستانی زبانوں کا اثر ہے، بہرحال ہوا یہ کہ عربی کا ہندوستانی طالبعلم جب ان الفاظ کو عربی ادب میں دیکھتا ہے، تو اس کو خوشی ہوتی ہے کہ یہ لفظ وہ پہلے ہی سے جانتا ہے، لیکن جب وہ انھیں استعمال کرتا ہے، تو بالکل مقامی معنوں میں استعمال کر دیتا ہے، جنوبی ہند کی زبانوں پر عربی کا اثر کس حد تک ہے، یہ مجھے بہت کم معلوم ہے، لیکن شمالی ہند کے عربی طلبہ بنگال سے لیکر گجرات تک عموماً اردو جانتے ہیں، اور اردو کے توسط سے یہ غلطی کرتے ہیں، گجراتی زبان میں بجائے خود کم از کم چالیس فیصد (۴۰٪) الفاظ فارسی کے ہیں جو عربی سے آئے ہوئے ہیں۔

عربی زبان کی درس و تدریس اور ترجموں میں سب سے زیادہ لغزش اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ شراب کے ہندوستانی ترجمے ہی نے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ جنت میں شراب ملے گی، حالانکہ قرآن نے جس شراب کا ذکر کیا ہے ذخریا سے کے لیے نہیں ہے،

بلکہ صرف ایک حرف کے معنی میں ہے، الفاظ کا مقامی استعمال حرف معانی کی حد تک نہیں ہے۔ بلکہ جنس پر بھی اس کا اثر ہے، بہت سے الفاظ عربی میں مونث استعمال ہوتے ہیں، لیکن اردو میں مذکر ہیں، اور اس کے برعکس بہت سے مذکر مونث ہو جاتے ہیں، چنانچہ۔ کرسی، قلم، کتاب، علم دعا، دوا، قمیص، تعریف، توصیف، میزان، منزل، تخلیق، مخلوق، فکر، موقع اور اسی طرح کے کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں، جو اردو میں مونث استعمال ہوتے ہیں، جب کہ عربی میں یہ تمام مذکر ہیں، اور اس کے برعکس مدرسہ، کلمہ، مکتبہ، داخلہ، نکرہ، معرفہ، فاصلہ، فیصلہ، اخبار، افکار وظیفہ، اخلاق، نفس وغیرہ، عربی میں مونث استعمال ہوتے ہیں، اور اردو میں مذکر، عربی کا ہندوستانی طالب علم (میری مراد ان طلبہ سے ہے، جو اردو جانتے ہیں)، یہاں بھی لغزش کرتا ہے، اور تذکیر و تانیث کی ادنی سی غلطی کر کے ایک عرب کے سامنے اپنی عربی دانی کی حیثیت مجروح کر لیتا ہے، تیسری بار وہ حروف کے استعمال میں لغزش کرتا ہے، حروف یعنی صلہ کا استعمال ہر زبان میں اہمیت رکھتا ہے، اور بہت نازک ہوتا ہے، اسی پر زبان کی بنیاد ہوتی ہے عربی زبان صلات کے استعمال میں بہت شدت پسند ہے، ادنی سی لغزش معنی بدل کر رکھ دے گی، یہ ایک الگ بحث ہے، جسے کسی اور وقت چھیڑا جا سکتا ہے، یہاں اردو کے اثر سے عربی کے استعمال میں غلطی کرنے کی چند مثالیں دیتا ہوں۔

اردو حرف	اردو فعل	عربی فعل	عربی حرف	عربی حروف کے اردو معانی
سے	کہا	قال	ل	لئے
کا	جواب	اجاب	علی / عن	پر۔ سے
سے	بھر گیا	حفل	ب	ساتھ / سے
میں	بدل گیا	تحول	الی	تک طرف

Library stamp

اردو حرف	اردو فعل	عربی فعل	عربی حرف	عربی حروف کے اردو معانی
میں	بدل دیا	حول	الی	تک / طرف
پر	حیرت کی	تحیر	حار فی	میں
سے	پڑھا	درس	علی	پر
سے	پوچھا سوال کیا	سال	×	
کی	نگرانی کی	تفرج	علی	پر
میں تقسیم	تقسیم ہوگیا	انقسم	الی	تک/طرف
سے	قصہ بیان کیا	قص	علی	پر
کا	ارادہ کیا	قصد	الی	تک ۔ طرف
پر	ایمان لایا	آمن	ب	ساتھ ۔ سے
کی	ناشکری کی	کفر	ب	ساتھ ۔ سے
پر	اصرار کیا	لج	فی	میں
سے	مرگیا	مات	ب	ساتھ ۔ سے
پر	ختم ہوا	انتھی	من	سے
سے	روایت کی	روی	ل ۔ عن	لئے ۔ سے
(غور) سے	سنا	استمع	الی	تک ۔ طرف

اصل میں اس طرح کی غلطی تعبیرات کی غلطی کا ایک جزء ہے، جو اردو کیساتھ مخصوص نہیں۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے اور دیکھیں کسی دوسری زبان میں غلط استعمال ایک جیسا ہوگا، زبان خواہ کوئی بھی ہو، اور اردو میں انگریزی الفاظ بھی بکثرت در آئے ہیں لیکن اردو کا مزاج فارسی اور عربی سے بنا یا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ انگریزی کے الفاظ ابھی اردو نے اپنے اندر جذب نہیں کئے ہیں، چنانچہ انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے ہم خوب سمجھتے ہیں، کہ یہ لفظ اردو کا نہیں ہے، اس لئے عربی اور انگریزی الفاظ کے اردو میں استعمال کی نوعیت ایک جیسی نہیں ہو۔ انگریزی الفاظ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کبھی اپنی مادری زبان سے کم علمی کی بنا پر استعمال کرتے ہیں یا کبھی اپنی زبان میں مفہوم کو ادا کرنے کے لئے مناسب لفظ کی عدم موجودگی اسکا سبب ہوتی ہے، لیکن عام طور پر انگریزی کی ہمہ گیری اس کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے، بلفظ دیگر اپنی بات کو بہتر طریقے سے پیش کرنے کے لیے ہم انگریزی کا سہارا لیتے ہیں انگریزی کے ہمہ گیر اثرات سے انکار نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تحریری اردو زبان پر ابھی انگریزی کا وہ اثر نہیں ہے، جو عربی کا ہے۔

انگریزوں کے اقتدار کے بعد جب یہاں مغربی طرز کی جامعات و کلیات کا رواج ہوا تو امید تھی کہ عربی زبان وادب کی درس و تدریس پر بھی اس کا اثر پڑے گا لیکن ایسا ہوا نہیں، علماء کرام نے مذہب کے تحفظ کے پیش نظر مدارس پر اپنی گرفت سخت کردی اور بدقسمتی سے یا پھر ایک خاص پالیسی کے تحت یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بھی عام طور پر عربی زبان وادب کا وہی نصاب رکھا گیا، جو مدرسوں میں رائج تھا، سبعہ معلقہ، حماسہ مقامات حریری وغیرہ کے علاوہ آپ مشکل ہی سے کوئی نام پائیں گے، جو یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں مل سکے، ان عصری جامعات کے عربی شعبے عموماً مدرسوں کی ایک شکل نظر آئیں گے کیونکہ طلبہ اور مدرسین کی اکثریت انھیں مدرسوں سے آئے ہوئے، افراد پر مشتمل ہوتی تھی، اور وہ

تا ہیں جو وہ مدرسوں میں پہلے سے پڑھ چکے ہوتے تھے، انھیں دوبارہ پڑھکر یونیورسٹی کی ڈگریاں
ور پھر سرکاری ملازمت دونوں ہی مل جایا کرتی تھیں، اس صورت حال نے دو طرفہ نقصان
ہونچایا، اول یہ کہ طلبہ اور مدرسین دونوں ہی آرام پسند ہو گئے، کیونکہ بغیر محنت کے انھیں امتیازی
حیثیت سے ڈگریاں مل سکتی تھیں اور اساتذہ تدریس کی محنت شاقہ سے بچ گئے، دوسری طرف
صری علوم سے یہ حضرات یکسر بے بہرہ ہوتے گئے اس کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ صرف حصول
لازمت مطمح نظر تھا، نصابی عربی میں اطمنان بخش صلاحیت اس کے لئے کافی تھی مقاصد
ی پستی پرپرواز کو توڑ کر کس طرح ہوا میں اڑا دیتی ہے، اس کی ایک مثال ہماری جامعات میں
عربی کی درس و تدریس میں ملتی ہے، یہ کہنے کا شاید مناسب ترین موقع نہیں ہے اگرچہ زبان کے
سی مذہب کا اجارہ نہیں لیکن عربی زبان کا مزاج مذہب سے بنا یا گیا ہے، اور اس کے پڑھانے
والے ہمارے ملک کی جامعات میں عموماً علماء ہی ہیں یا ایسے مسلمان جو کسی نہ کسی طرح مذہب سے
وابستگی رکھتے ہیں، اور جب مذہب کی روح اس سے نکال لیجائے گی، تو باقی کیا رہے گا۔
ے ملاحظہ فرمائیں۔

کچھ طلبہ ایسے بھی تھے، جو عصری کلیات و جامعات کے ذریعہ آگے آئے، اور عربی کو
دیگر مضامین کیساتھ بحیثیت ایک مضمون کے پڑھا انھیں دوسری زبانیں خصوصاً انگریزی تو
نسبتاً اچھی آگئی، لیکن عربی میں وہ مدرسوں سے آئے ہوئے طالب علموں کے برابر نہ ہوسکے،
کیونکہ مدرسوں سے آئے ہوئے طلبہ گو رہ و رسم شاہبازی بھول چکے تھے لیکن تھے تو شاہین زادے
دیگر غیر ملکی زبانیں مثلاً فرنچ و جرمن وغیرہ کی درس و تدریس اور عربی میں یہی فرق ہے کہ عربی پر مذہب
اور مدرسوں کا پس منظر چھایا ہوا ہے، جب کہ دیگر زبانیں صرف عصری جامعات و کلیات ہی میں
پڑھائی جاتی ہیں، اس لئے ان کے طلبہ اور مدرسین عصری علوم سے بھی آگاہ ہوتے ہیں جب کہ

عربی والے صرف عربی جانتے ہیں، اور اگر عصری علوم سے ان کی واقفیت ہے تو وہیں ان کی صلاحیت صفر سے کچھ ہی اوپر ہوگی۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ یہی صورتحال تھی کہ جب زمانے نے کروٹ بدلی اور عرب ممالک تیل کی دولت سے مالامال ہو گئے تو ایک بار پھر عربی کے چراغ میں تیل بھر گیا، زبان کی قیمت محسوس کی جانے لگی، اور نگاہیں باصلاحیت عربی کی تلاش میں بھٹکنے لگیں، ایسا عربی دان جو صرف مولوی نہ ہو بلکہ زمانے کے تقاضوں سے واقف ہو، جو ایسی زبان استعمال کر سکتا ہو، جو روزمرہ کی عملی زندگی میں کام آنے والے معانی و مفاہیم کا ترجمہ کر سکے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا سمجھ لیا گیا تھا کیونکہ ابھی تو ہم صرف فرسٹ کلاس میں پاس کرتے یا ہوتے رہے ہیں، راتوں رات اسکالر پیدا کرنے کیسے شروع کر دیں، مزید وضاحت کے لیے ہمیں ہندوستان کو یہیں چھوڑ کر عرب ممالک پر ایک نگاہ ڈالنی ہوگی۔

عرب ممالک میں فکری انقلاب کی ابتدا ۱۷۹۸ء میں مصر پر نیپولین اعظم کے حملے سے ہوتی ہے۔ لیکن ہم بات مختصر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمی صورتِ حال تیزی سے بدلنے لگی، سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں غیر معمولی رفتار سے ترقی ہوئی، عربی زبان کی ہمہ گیری اور وسعت سے انکار نہیں، لیکن اب زمانے کی باگ ڈور مغرب کے ہاتھ میں تھی، ایجادات و اکتشافات وہاں ہو رہے تھے، ان ہی کی زبانوں میں نئے نئے نام اور اصطلاحات کا وجود ہو رہا تھا، دوسری زبانوں کے لیے صرف دو ہی راستے تھے یا تو وہ اپنے اندر وسعت پیدا کریں یا پھر سہل پسندی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے غیر ملکی ایجادات کو مع ان کے ناموں کے قبول کر لیں جیسا کہ ہمارے یہاں اردو نے کیا۔ بطور ردِ عمل ساری دنیائے عرب میں شعری انقلاب کے ساتھ ہی زبردست لسانی انقلاب آ گیا، اس کا دائرہ کار نہایت وسیع تھا، شعر میں نئے نئے تجربے جن کا تعلق ہیئت اور فکر

دونوں سے تھا، اس طرح نثر میں نئے اسالیب و انداز سامنے آئے ہم یہاں صرف لغت سے بحث کریں گے، جدید عربی لغت کے پس منظر میں دو الگ الگ نظریئے سامنے آئے ایک یہ کہ زبان میں جو بھی اضافہ ہو وہ خالص عربی کے اپنے مادے سے ہو اور عجمی الفاظ سے عربی کو پاک کرنا ضروری ہے، یہ نظریہ شام اور لبنان میں بہت مقبول رہا، چنانچہ زبان کی وسعت اور عجمیت سے تحفظ کے پیش نظر اکیڈمی اور دار الترجمے قائم کئے گئے، جن کا مقصد یہ تھا کہ مغربی زبانوں سے آئے ہوئے جدید الفاظ و اصطلاحات کے لیے عربی الفاظ عربی کے اپنے مادے سے وضع کئے جائیں، یہ کام بہت تیزی سے شروع ہوا، عراق میں المجمع العلمی العراقی کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شام المجمع علمی السوری کے نام سے ۱۹۲۱ء میں، اسکندریہ میں المجمع العلمی المصری کے نام سے ۱۸۵۹ء میں اسی طرح مجمع اللغۃ العربیۃ کے نام سے قاہرہ میں ۱۹۳۲ء میں دار الترجمے انہی مقاصد کی تکمیل کے لیے قائم کئے گئے،

ان سب سے پہلے محمد علی پاشا کے عہد میں مصر کے اندر ۱۸۰۵ء میں قصر عینی کے نام سے ایک دار الترجمہ قائم ہو چکا تھا، اس میں فرانسیسی اور اطالوی زبانوں سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ اسے مشہور مصنف نبیہ غطاس کے الفاظ میں سنئے،

"چونکہ اصطلاحات اور الفاظ علمی باہمی افہام و تفہیم کا واحد ذریعہ ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن کے معانی قطعی ہوں، اور عربی دنیا میں ابتک یہ بات پیدا نہ ہو سکی، ادارہ سے متعلق جتنی اصطلاحیں ایجاد ہوئیں ان میں سے کوئی بھی ہر جگہ مساویانہ طور پر تسلیم شدہ ہے نہ ہی پورے معنی پر حاوی ہے، حتی کہ خود ادارہ کا لفظ ابتک قطعی معنی کے لیے خاص نہ ہو سکا، اس کا مفہوم کوئی کچھ لیتا ہے، اور کوئی کچھ، بیسویں صدی کے نصف اول میں

توحید اصطلاحات کی بہت کوشش کی گئی اور ایسے الفاظ جن کے معانی بہت وسیع تھے، انھیں محدود کرنے کی کوشش کی گئی، مثلاً ادارہ، تنظیم، الادارۃ، التنفیذیۃ، مسئلۃ، مسئولیۃ وغیرہ، لیکن بہت جلد مفہوم کے تعین میں اختلافات پیدا ہوگئے،

(دیباچہ قاموس الادارہ مکتبۃ لبنان بیروت ۱۹۶۷ء)

اس اقتباس سے عرب ممالک میں عربی زبان کی ترقی کی رفتار اور اس کی سمتوں کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی اس کے پیدا شدہ مسائل پر روشنی پڑتی ہے، زبانوں کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، عربی کے ساتھ بھی یہ واقعہ کئی بار ہو چکا ہے، اوائل اسلام میں یہ لغوی انقلاب بڑے زور و شور سے آیا تھا، چنانچہ مسجد صوم صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ، اسلام ایمان اور اس طرح تمام وہ الفاظ جن کا تعلق اسلام سے بحیثیت مذہب کے ہے، مثلاً فقہی اصطلاحات وغیرہ ان تمام الفاظ کا استعمال اب لغوی معنی میں نہ ہو کر صرف وہی ہے، جو اسلام نے اصطلاحی طور پر متعین کر دیئے ہیں، مسجد سے غیر اسلامی سجدہ گاہ، صلوٰۃ سے غیر اسلامی عبادت، زکوٰۃ سے غیر اسلامی ٹیکس وغیرہ مراد لینا درست نہیں، اور اگر آپ اجازت دیں تو میں کہونگا کہ لفظ اللہ کی شرح بھی اب صرف وہی ہے، جو اسلام نے متعین کر دی ہے، دوسری زبانوں میں اللہ کے مترادف الفاظ مثلاً GOD یا ایشور وغیرہ کو اللہ کے معنوں میں استعمال کرنے کا میں قائل نہیں، اس کے بعد عہد عباسی میں بغداد کے دار الترجمے میں یونانی اور سنسکرت کی کتابوں کے عربی ترجمے کے وقت اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں چنانچہ ARISTOTLE کے لئے ارسطاطالیس PLATO کیلئے افلاطون RHITORIC کے لئے بطریقہ اور پھر خطابۃ اور پھر بلاغۃ اس طرح ARITHMATIC کے لیے ارثماطیقی اور پھر حساب Geometry کے لیے جیومطریا، اور پھر ھندسہ اس طرح سنسکرت میں کون

پھول کے لئے قرنفل ۔ دوشالا سے ورشنال اور پھر پورشنال وغیرہ عربی الفاظ وضع کیے گئے ۔ (واضح ہو کہ سنسکرت سے بنائے ہوئے یہ الفاظ عہد جاہلیت میں بھی ملتے ہیں) اور اب بیسویں صدی میں مغربی آثار وتمدن نے ایک بار پھر عربی لغت کو تیزی سے نئے الفاظ وضع کرنے پر مجبور کردیا ہے، لیکن آج کے طرز وضع اور عباسی دور کے طرز میں فرق ہے، اس فرق کو مشہور مصری مترجم اور مصنف استاذ اسماعیل مظہر کی زبان سے سنئے ۔

"لیکن یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ ان حضرات نے عربی کے مزاج سے ہم آہنگ الفاظ ترجے کے لیے تراشے تھے، اس لئے آج مغربی الفاظ واصطلاحات کے سلسلے میں بھی ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ عربی اصطلاحات بناتے وقت لفظ کے معنی کو اس حد تک قریب کردیں کہ وہ محدود اور متعین ہو جائے، جیسا کہ ماضی میں ہمارے اسلاف نے فقہ، اصول فقہ، فلسفہ اور ریاضیات وغیرہ کی اصطلاحات متعین کرتے وقت کیا تھا، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن آج تعریب کا جو سلسلہ چل رہا ہے اس میں ان امور کی رعایت نہیں کی جارہی ہے، چنانچہ عامیہ کے الفاظ ادب میں داخل کرلینا، اسی طرح غیر عربی الفاظ کو بجنسہ نقل کرلینا عام ہوگیا ہے اس سے احتراز کرنا مناسب ہے ۔

(مقدمہ کتاب الفرید فی المصطلحات)

یہ پہلا نظریہ ہے، جو زبان کے خالص کرنے پر زور دیتا ہے، لیکن خالص عربی کے ہمدرد سرپٹک کر رہ گئے ہوا وہی جو ہوتا تھا، کیونکہ مغربی آثار وتمدن نے عربی کے سامنے ایسے ایسے مسائل رکھ دیئے، جو عربی میں پہلے سے تھے ہی نہیں، مثلاً سائنس، ٹکنولوجی، طب ونفسیات وغیرہ کے مسائل ومصطلحات یا یہ کہ عرب تہذیب میں وہ پائیں نہ تھیں، مثلاً یوروپین ممالک سے آئے ہوئے تہذیبی آثار ۔ اور یہ اضافات اس تیزی سے ہوتے چلے گئے کہ سوچنے کا وقت کم

تھا، اس لئے زبان کو عالمی مسائل کے قابل بنانے کے لیے المجمع علم عرب کی ایک معتدبہ جماعت اس حق میں ہے کہ یورپین الفاظ بجنسہ عربی میں استعمال کر لیے جائیں، یہ دوسرا نظریہ ہے۔ آپ عربی کا کوئی اخبار اٹھالیں فی صفحہ کم و بیش پچاس لفظ ضرور ایسے مل جائیں گے جو عربی عبارت کی برادری میں مہمان نظر آئیں گے۔ تکنولوجی، آتومیتک، استراتیجی، ہوتل، استاسون، تکنیک، تلغراف، تلفزیون، الکترونیک، رادیو، بنک، وغیرہ سامنے کی مثالیں ہیں،

یہ تھا عالم عرب کا ایک سرسری جائزہ جس سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں،

۱۔ الفاظ کے معانی میں حیرت انگیز وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے کس لفظ نے اب اپنا قدیم لباس اتار کر نیا لباس پہن لیا ہے یہ جاننا اُس وقت تک مشکل ہے جب تک کہ زبان پر مسلسل نظر نہ ہو۔ مثالیں دیکھئے۔

لفظ	قدیم استعمال	جدید استعمال
اجازہ	اجازت	تعطیل، رخصت، سند وغیرہ
اشارہ	اشارہ	نشان، علامت، ٹرین کا سگنل وغیرہ
اشاری	اشارے والا	سگنل مین Signal man
صحف	آسمانی کتابیں	روزنامہ
تصویت	آواز نکالنا، آواز دینا	بذریعہ آواز ووٹ دینا
اقتراع	قرعہ اندازی	ووٹ بذریعہ طریقہ مروّجہ
مدمرہ	تباہ کن	تباہ کن جہاز
غواصہ	غوطہ خور (موتی نکالنے کیلئے)	آبدوز
تشریح	تشریح کرنا، کھول کھول بیان کرنا	پوسٹ مارٹم

لفظ	قدیم استعمال	جدید استعمال
مشروع	شریعت کی طرف سے لگایا ہوا قانون	پروجیکٹ ۔ اسکیم وغیرہ
علم	جانکاری	سائنس
عالم	جانکار	سائنس دان
محفظة	حفاظت گاہ ۔ بستہ وغیرہ	کیپسول
استاذ	استاذ	پروفیسر (صرف)
ہاتف	غیبی آواز	ٹیلیفون پر بات

میں نے بالکل سامنے کی یہ چند مثالیں پیش کی ہیں، ورنہ حال یہ ہے کہ آپ خالص ادبی الفاظ کو چھوڑ کر کوئی لفظ ڈکشنری میں دیکھیں اس کے کم از کم ایک درجن معانی اور مواقع استعمال ایسے مل جائیں گے جو زبان میں اضافے کی حیثیت کے ہوں گے، اور اس سے زیادہ نازک صورت حال یہ ہے کہ قدیم معانی اب عموماً متروک ہوتے جا رہے ہیں، چنانچہ علم اور عالم کے الفاظ اب سائنس اور سائنس داں کیساتھ تقریباً مخصوص ہو چکے ہیں، ویسے ہی استاذ سے اب صرف پروفیسر ہی سمجھا جاتا ہے،

۱۔ جدید اصطلاحات اور الفاظ ہر جگہ بالکلیہ تسلیم شدہ نہیں ہیں، مثلاً ٹیلیفون سٹ کیلئے ملغاز، - INTUITION کے لیے حدس، گرامفون اور فونوگراف کے لیے محدث FUSE ۔ کے لئے حارزہ، اسٹوڈیو کے لیے محنوت، سیفٹی ریزر کے لیے آلۃ الحلاقۃ وغیرہ، طب اور سائنس کے مختلف شعبے اور ٹکنولوجی کی مصطلحات اسی ضمن میں آتی ہیں اس لیے لکھا ضمانت بہت مشکل ہے کہ آپ نے جو لفظ جس مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے، اس سے آپ کا

مخاطب بھی وہی سمجھے گا، اب اس مشکل پر قابو پانے کے لیے یعنی ایسی اصطلاحات وضع کرنے کے لیے جو ہر ملک کے لیے یکساں طور پر تسلیم شدہ ہوں خاص توجہ دی جا رہی ہے، رباط میں مکتبۃ التنسیق و ترجمۃ کا قیام اس کوشش کی عملی شکل ہے۔

۲۔ مقامی بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ اور اس طرح کورٹ، دفاتر، سرکاری نیم سرکاری اداروں کی اصطلاحات بھی ہر ملک میں الگ الگ ہیں، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ آپ نے جس لفظ کا عراقی استعمال کیا ہے، مصر میں اس کا دوسرا ہی مفہوم لیا جائے محکمہ دفاع اور محکمہ قانون یعنی فوج اور عدلیہ کی تمام اصطلاحات اس ضمن میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ صرف ۳ لفظ مجلس۔ محکمہ اور ادارہ لیں اور مصطلحات کی یا پھر کسی عام عربی انگریزی ڈکشنری میں ان الفاظ کے مواقع استعمال دیکھیں آپ کو مشکلات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا، اور اس طرح کے تغیرات موجودہ صدی میں عربی زبان میں کچھ اس کثرت سے ہوئے ہیں کہ آج کی عربی کا نام ہی جدید عربی رکھ دیا گیا ہے، زبان کے قواعد نہیں بدلے اصول جو تھے، وہ اب بھی ہیں اگر کوئی تبدیلی ہوئی تو وہ اب بھی غیر معیاری ہے، پھر جدیدیت نام کس کا ہے۔ جدیدیت صرف الفاظ و معانی کے انہی عظیم الشان تغیر و تبدل کا نام ہے۔

اس درمیانی مقدمہ کے بعد آئیے اب پھر واپس ہندوستان چلتے ہیں، یہ مسائل جن کا میں نے ابھی ذکر کیا، ان ممالک کے ہیں جہاں عربی بحیثیت مادری زبان کے بولی اور سمجھی جاتی ہے، بھلا بتائیے ہندوستان جس کے عربی کی درس و تدریس کے مسائل یوں ہی کیا کم ہیں۔ اس مزید اضافے کے بعد یہاں ہمارے طلبہ کا کیا حال ہوگا، ہمارے تمام عربی ادارے اور یونیورسٹیاں اب جدید عربی کی شدت سے ضرورت محسوس کرتی ہیں، اور جدید عربی سے ان کی مراد صرف ابلاغ کی زبان ہوتی ہے، دعویٰ یہی کیا جاتا ہے کہ ہم جدید عربی پڑھنے

پڑھاتے ہیں، یہ ممکن ہوتا کیا ہے کہ اول تو ہمارے کم وبیش ۱۰۰/۹۰ فیصد طالب علم زبان کی نحوی اور صرفی غلطیوں سے عہدہ برآ نہیں ہو پاتے ان میں وہ غلطیاں بھی شامل ہیں جن کی طرف اس مضمون کے ابتدائی صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے، چنانچہ ہمارے یہاں جو شخص عربی میں بے تکلف باتیں کرتا ہو، وہ ملک کے کامیاب ترین عربی دانوں میں شمار ہوتا ہے۔

طلبہ تو الگ رہے، ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ میں پچاس فیصد ایسے نہیں، جو عربی میں بے تکلف باتیں کر سکتے ہوں (بشرطیکہ موضوع صرف درسیاتی نہ ہو) اور جو زبان پر قدرت رکھتے ہیں، ان میں اکثریت ان حضرات کی ہوتی ہے، جو مدرسوں کے توسط سے آتے ہیں، اس لیے ان کا مسئلہ انگریزی ہوتی ہے، بے چارے انگریزی سے ناآشنا ہوتے ہیں، اور اب جو انگریزی سیکھنی شروع کرتے ہیں، تو آپ ہی بتائیں کہ عمر کے تیسرے دہے میں سیکھی ہوئی زبان پر وہ قدرت کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے، جو ابتدائی عمر سے سیکھنے والوں میں ہوتی ہے، اس لیے لاکھ کوشش کے باوجود جناب شیخ کی داڑھی مولوی مدن کی سی نہیں ہونے پاتی۔

وہ حضرات جو محنت اور ذہن کی بدولت دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں ان کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ عرب ممالک سے شائع ہونے والے جرائد ورسائل اور کتابوں کی درآمد اتنی مشکل ہے کہ زبان پر مسلسل نظر رکھنی سخت دشوار ہے، میں نے عرب ممالک میں زبان کی ترقی اور تبدیلیوں کا جو ذکر اوپر کیا ہے، وہ اس تیزی سے ہو رہا ہے، اور اتنا ہمہ جہتی ہے کہ ان تغیرات اور اضافوں سے آگاہی اس وقت تک مشکل ہے، جب تک آپ ہر ملک سے شائع ہونے والے رسائل پابندی سے نہ پڑھتے ہوں، ساتھ ہی مختلف عربی اکیڈمیوں سے شائع ہونے والی مصطلحات کی میگزینیں آپ کے زیر نظر ہونی بھی ضروری ہیں لیکن ہمارے یہاں کتنے لوگ یہ کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں، اس کا جواب ہم سب ملکر دیں،

تو زیادہ [illegible] ہوگا۔

نصاب تعلیم کیا ہونا چاہیئے، طریقہ تعلیم میں کیا اصلاح ہونی چاہیئے، [illegible] کس طرح پیدا کئے جا سکتے ہیں، ان تمام باتوں کا جواب دانشور اور ماہرین تعلیم دیں گے، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جب تک طلبہ عربی کو ادھر بیٹھنے والے مضمون کی حیثیت سے پڑھتے رہیں گے، اور ہمارے اساتذہ اس گمراہ کن بلکہ مہلک رجحان کی علاً حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے، ہماری یونیورسیٹیاں صرف فرسٹ ڈویژن پیدا کریں گی، اسکالر پیدا کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔

ترسم کہ نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

بزم تیموریہ حصہ اوّل

بزم تیموریہ کا پہلا اڈیشن تمام عظیم مغل سلاطین اور مغل شاہزادوں اور شاہزادیوں اور ان کے امرار و فضلاد شعراء کے تذکرے اور ان کے علمی و ادبی وشعری کمالات پر مشتمل تھا، اس کے دوسرے اڈیشن میں اتنے اضافے ہوئے کہ اس کے تین حصے کرا دیئے گئے، اس پہلے حصہ میں شروع کے تین مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے تمام قابل الذکر امراء، شعرای دادبار، فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً دربار اکبری کا تو پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آگیا ہے۔

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت ۔ ۲۰ روپیے

وفیات

آہ! مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

از: ضیاء الدین اصلاحی

"مولانا عبدالرحمٰن پرواز مرحوم دارالمصنفین آئے اور تقریباً ساڑھے تین سال کے بعد یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اپنی سیرت کی نیکی اور پاکیزگی، اخلاق کی طہارت و شرافت کی جوت جگا کر اچانک دائمی جدائی اختیار کر لی، وہ ہم لوگوں کے درمیان آکر بیٹھتے تو ان کے خوبصورت چہرے سے عیاں ہوتا کہ لوگوں کی دلآزاری اور ایذا رسانی کیا بلکہ ان کی دلشکنی کا وسوسہ بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوتا ہوگا، ان کی نورانی داڑھی سے ان کا علم و فضل ظاہر ہوتا رہتا تھا، انھوں نے راہ طریقت کے ایک سچے سالک کی طرح اس دنیا میں باہمہ و بےہمہ کا مسلک اختیار کر کے پوری زندگی گزاردی انکا بڑا وصف یہ رہا کہ وہ اپنے نفس کو دبا کر بلکہ اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کو آرام پہنچانے ہی میں اپنی راحت و مسرت محسوس کرتے تھے،

انھوں نے بمبئی کے قیام میں مخدوم علی مہائمی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے نام سے دو کتابیں لکھیں، جو علمی حلقوں میں بڑے شوق سے پڑھی گئیں، دارالمصنفین آئے تو انھوں نے خود مفسرین ہند پر ایک کتاب لکھنے کی خواہش ظاہر کی، خیال تھا کہ یہ

کتاب تیار ہوگی تو ان کی مذکورہ بالا دونوں کتابوں کی طرح علمی حلقے میں شوق سے پڑھی جائے گی، مگر مصلحت خداوندی سے یہ ادھوری رہ گئی، ان کی اچانک وفات سے یہاں جو سوگواری اور غمناکی کی فضا پیدا ہوئی ہے، اس سے یہ خاکسار متاثر ہوکر ان پر خود مضمون لکھنا چاہتا تھا، لیکن مولوی ضیاء الدین اصلاحی ان کے ہم وطن ہیں اور ایک ہی درسگاہ کے پڑھے ہوئے ہیں یہاں ان کی زندگی سے بہت قریب تر رہے، اس لیے خیال ہوا کہ وہی ان پر اچھا تعزیتی مضمون لکھکر ہم لوگوں کے غمناک جذبات کی صحیح ترجمانی کریں گے۔ اس لئے انکی یہ تحریر میری ہی تحریر تصور کی جائے، مرحوم جا چکے لیکن وہ یہاں کی مجلسوں میں یاد آئیں گے، اکثر اور برابر یاد آئیں گے۔ اور دل سے یہ دعائیں نکلتی رہیں گی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت ان کی روح کو اپنی رحمتوں کے پھولوں اور برکتوں کی خوشبوؤں سے ہمیشہ ہمیشہ معطر رکھے۔ آمین!

"ص، ع"

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۳، ۴ دسمبر ۱۹۹۰ء کی درمیانی شب میں ۲ بجے مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

وہ بظاہر بالکل ٹھیک تھے، اور انھوں نے دن بھر کے اپنے سارے معمولات بھی انجام دیے اس لئے یہ سانحہ بالکل غیر متوقع طور پر پیش آیا جس کی وجہ سے دارالمصنفین کی فضا بہت غمناک ہوگئی، یہ عجیب اتفاق ہے کہ انتقال کے وقت وہی تنہا دارالمصنفین میں موجود تھے، راقم الحروف اور بعض دوسرے رفقا محترمی جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ناظم دارالمصنفین کی معیت میں بہار اردو اکاڈمی کے دعوتنامہ پر اس کے زیر اہتمام ہونے والی علامہ سید سلیمان ندوی

Hussain Library Nagar

کی صد سالہ تقریبات ولادت میں شرکت کے لیے پٹنہ گئے ہوئے تھے، اس لیے ہم سب اپنی غیر حاضری اور ان کی تجہیز و تدفین میں شرکت سے محروم رہجانے پر سخت ملول، نادم اور دوہرا غم محسوس کر رہے تھے،

دو برس قبل انھیں ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہوئی تھی مگر ہومیو پیتھی کے علاج سے افاقہ ہوگیا تھا، اس کے بعد جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری صاحب کے اصرار پر وہ چیک اپ کے لیے بمبئی تشریف لے گئے، وہاں سے آنے کے بعد ان کے ساتھ ہم لوگ بھی مطمئن تھے، ۳۰ نومبر کو جب ہم لوگ پٹنہ کے لیے روانہ ہو رہے تھے، تو انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ سب کو رخصت کیا، میں نے کاتب کو دینے کے لیے ایک مضمون ان کے حوالہ کیا، اس وقت انھوں نے مجھ سے کہا "مجھے ایک ضرورت سے گھر جانا تھا، مگر دارالمصنفین بالکل خالی ہو جائے گا، اس لئے میرا یہاں سے ہٹنا مناسب نہیں، میں سب لوگوں کی واپسی کے بعد ہی گھر جاؤں گا" کیا پتہ تھا کہ یہ اُن سے آخری گفتگو ہو رہی ہے اور اب ہم ان سے اس عالم ناسوت میں ملنے کے بجائے ان کی قبر پر باچشم نم حاضر ہوں گے۔

پٹنہ میں کئی حضرات نے ان کی خیریت دریافت کی، بمبئی سے ان کے دوست جناب شیخ فرید برہانپوری اور ڈاکٹر خورشید نعمانی تشریف لائے تھے، دونوں نے ان کو بار بار یاد کیا، اور تاکید سے کہا کہ ان کا سلام ان سے کہدیا جائے، خدا بخش خاں لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار نے ہم لوگوں کے ذریعہ ایک دعوت نامہ بھی ان کے پاس بھیجا مگر کیا خبر تھی کہ اس نامہ و پیام کے درمیان موت حائل ہو جائے گی۔

ان کا وطن اعظم گڈھ ضلع کا ایک گاؤں سید حا سلطان پور ہے، جو یہاں کے مشہور اور قدیم قصبہ سرائے میر سے تین چار میل کے فاصلہ پر شمال مشرق میں واقع ہے، ان کا شجرۂ نسب محفوظ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے،

جو سلطان بہلول لودھی کے زمانہ میں افغانستان سے ہندوستان آئے، جونپور کی شرقی سلطنت پر جب بہلول لودھی نے حملہ کیا تو داد شجاعت دینے والوں میں اس خاندان کے سالار خان پیش پیش تھے، اس کے صلے میں انھیں تیس گاؤں پیش کئے گئے۔ اسی بنا پر پہلے یہ گاؤں تیس دہ کہلاتا تھا، جو آگے چلکر سیدھا سلطان پور کے نام سے موسوم ہوا، اس گاؤں کی بڑی آبادی انہی سالار خان کی نسل سے ہے۔

مولانا عبدالرحمن پرواز اسی گاؤں کے ایک متوسط درجہ کے کھاتے پیتے خاندان میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے تھے، ان کا خاندان پیشہ زراعت کے علاوہ علمی و دینی حیثیت سے بھی ممتاز تھا، ان کے والد بزرگوار مولانا محمد شفیع مرحوم ایک جید عالم اور متورع و متقدس بزرگ تھے، جن کی تعلیم دانا پور پٹنہ کے نارل گھاٹ کے ایک بڑے اہلحدیث مدرسہ میں ہوئی تھی جہاں انکے چچا حافظ قادر بخش مرحوم ایک مدت سے تعلیمی خدمات پر مامور رہتے تھے، مولانا محمد شفیع صاحب نے یہاں مولانا سخاوت علی جونپوری کے تلمیذ رشید مولانا فیض اللہ مئوی سے درس لیا جو علامہ شبلی نعمانیؒ کے بھی استاذ تھے، اس کے بعد دہلی جاکر میاں سید نذیر حسین صاحب دہلوی محدث سے بھی حدیث کے چند اسباق پڑھے،

مولانا محمد شفیع صاحبؒ درسیات کی تکمیل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس آئے تو انھوں نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور شرک و بدعات کے انسداد کے لیے انجمن اصلاح المسلمین کی داغ بیل ڈالی، جس کے کاموں کا دائرہ آگے چلکر بہت وسیع ہو گیا، چنانچہ اسی سلسلہ میں انھوں نے علم دین کی اشاعت و فروغ کے لئے مدرستہ الاصلاح قائم کیا، اور مدۃ العمر اس کی خدمت کرتے رہے، انہی کی درخواست پر علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ نے بھی اس مدرسہ کی جانب توجہ کی اور مولانا فراہیؒ کی بدولت اس مدرسہ نے بڑی ترقی کی، اور

اس سے مسلمانوں کو بڑا فیض پہنچا، اور اب بھی پہنچ رہا ہے۔

مولانا محمد شفیع مرحوم کے پانچ صاحبزادے تھے، سب سے چھوٹے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم، ہیڈ شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھے، مولانا عبدالرحمٰن پرواز ان سے بڑے، اور باقی تین بھائیوں سے چھوٹے تھے، بڑے چاروں بیٹوں کی تعلیم مدرستہ الاصلاح میں ہوئی مولانا عبدالرحمٰن پرواز سنہ ۱۹۴۱ء میں مدرسہ سے فارغ ہوئے، اس کے بعد وہ درس و تدریس کے مشغلہ میں لگ گئے، سنہ ۱۹۴۶ء میں مشہور شاعر جناب احسان دانش مرحوم کی دعوت پر وہ لاہور چلے گئے، مگر ایک برس بھی یہاں نہیں گزرے تھے کہ تقسیم کی خبر سن کر وطن واپس آگئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوگئے، یہاں سے "الہدیٰ" کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکلتا تھا جس کے ایڈیٹروں میں ان کا نام بھی تھا وہ ۱۹۵۵ء میں ممبئی آگئے اور انجمن اسلام کے مختلف اسکولوں میں عربی کے استاد ہوئے، آخر میں احمد سیلر ہائی اسکول ڈونگر روڈ سے وابستہ ہوئے اور یہیں سے ریٹائر ہوکر دارالمصنفین آئے۔

وہ ممبئی کے قیام کے زمانہ میں مختلف اردو اخباروں سے بھی وابستہ رہے، روزنامہ "ہندوستان" "آشکار"، "اردو ٹائمز" اور "انقلاب" وغیرہ میں عرصہ تک مذہبی، علمی اور تاریخی کالم لکھتے رہے، گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر سے بھی ان کا تعلق رہا، میں ایک دفعہ ان سے ملنے کے لیے یہاں گیا تو بہت خوش ہوئے اور اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور حامد اللہ ندوی وغیرہ سے ملایا۔

اردو زبان و ادب اور اس کی تاریخ پر ان کی اچھی نظر تھی، ان کے والد اپنے تمام بچوں کو ادبی کتابوں کے مطالعہ کی تلقین کرتے تھے، پرواز صاحب نے ان کی ترغیب سے غالب کے خطوط اور سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور مولانا شبلی کی اکثر تصانیف کا مطالعہ کیا اور مسدس حالی

سبقاً سبقاً ان سے پڑھی، کہتے تھے کہ اس کے تقریباً نصف اشعار مجھے زبانی یاد ہو گئے تھے، مثنوی فارسی کی استعداد بھی اچھی تھی، میں اس کی مشکلات میں جب ان سے رجوع کرتا تو وہ تشفی کر دیتے، اس کا ذوق بھی انکے والد صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھا۔

وہ مدۃ العمر درس و تدریس کے مشغلہ سے وابستہ رہے، مگر تحریر و تصنیف کی جانب ہمیشہ انکا رجحان رہا، مضمون نگاری کا شوق بچپن سے تھا، اور طالب علمی ہی کے زمانہ سے ان کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں چھپنے لگے تھے، مختلف وقتوں میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

۱- مزدور اور اسلام (۲) مومنؔ، حیات و شاعری، (۳) علم و ہدایت کے چراغ (۴) نظام حق کے معمار (۵) حضرت مخدوم علی مہائمی، حیات آثار و افکار (۶) مفتی صدرالدین آزردہ، بمبئی کے قیام کے زمانہ میں انھیں پڑھنے لکھنے کا زیادہ موقع ملا، موخرالذکر دونوں کتابیں یہیں لکھی گئیں، اور یہ ان کی تلاش و تحقیق اور محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں، ان میں سے ایک میں کوکن کے مشہور اور بڑے صوفی و عالم حضرت مخدوم علی مہائمی کے حالات و واقعات زندگی کے علاوہ شروع میں ان کے وطن ماہم اور خاندان نوایط کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور انکے علمی کمالات، تصنیفات اور افکار و نظریات پر مبسوط بحث و گفتگو کی گئی ہے، اور تفسیر، فلسفہ اور تصوف میں ان کا امتیاز دکھایا گیا ہے، مخدوم صاحب کے صوفیانہ افکار کی وضاحت کے ضمن میں نظریہ وحدت الوجود پر مفید اور اچھی بحث کی ہے، یہ موضوع بڑا نازک ہے مگر مصنف اس مرحلہ سے اعتدال و سلامت روی کے ساتھ گذرے ہیں، اور اس کی اچھی وضاحت بھی کی ہے، اس کتاب کی وجہ سے وہ بمبئی میں پورے طور پر متعارف و مقبول ہو گئے تھے، اور علمی حلقوں میں بھی ان کا وزن محسوس کیا جانے لگا تھا۔

دوسری کتاب بھی علمی وتحقیقی حیثیت سے بلند پایہ اور اردو کے سوانحی ذخیرہ میں ایک اضافہ ہے، اس میں مغلیہ سلطنت کے دور زوال کے نامور فاضل مفتی صدرالدین آزردہ کے بارہ میں، پہلی مرتبہ اس قدر محنت وکاوش سے مواد ومعلومات جمع کئے گئے ہیں، جس سے ان کے خاندانی وذاتی حالات تفصیل سے معلوم ہوجاتے ہیں، اس میں ان کے فضل وکمال وغیرہ کے متعلق ان کے معاصرین کی شہادتیں بھی نقل کی گئی ہیں، اور ان کی قومی ومذہبی خدمات بھی بیان کی گئی ہیں، اور مصنف نے انکی فارسی وعربی تحریروں اور اردو، فارسی اور عربی کلام کے نمونے بھی دئے ہیں، اور ان کی تصنیفات کا تعارف دیدہ ریزی سے کرایا ہے،

مولانا عبدالرحمن پرواز نے مداحِ رسول حضرت حسان بن ثابتؓ کے حالات اور شاعری پر بھی ایک کتاب لکھی تھی، جس کے بعض اجزا ماہنامہ برہان میں عرصہ ہوا چھپے تھے، مگر یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوسکی، دو اور کتابیں بھی زیر ترتیب تھیں، ایک حضرت امیر خسرو پر، اور دوسری حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتی پر ہے۔

دارالمصنفین میں انھوں نے ہندوستانی مفسرین کے موضوع پر کام شروع کیا تھا جس کے لیے وہ اپنا مطالعہ مکمل بھی کرچکے تھے، اور وہ اس کا تقریباً نصف حصہ مرتب بھی کرچکے تھے، اگر ان کی عمر وفا کرتی تو غالباً چند ماہ میں اسے مکمل کرلیتے۔

شعر وسخن کا ذوق خاندانی تھا، ان کے والد بزرگوار کو بھی عنفوان شباب میں شعر وشاعری سے دلچسپی تھی، اور وہ شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے، ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی تو موجودہ معیار کے بلند پایہ شاعر خیال کئے جاتے ہیں، پرواز صاحب نے بھی موزوں طبیعت پائی تھی، بچپن ہی میں مشق سخن کرنے لگے تھے، اور ان کا کلام بھی اخباروں اور رسالوں میں چھپتا تھا، نجی محفلوں میں اشعار سناتے بھی تھے، مگر مشاعروں میں پڑھنے کے عادی نہ تھے،

وہ کبھی کبھی مشاعروں کی صدارت کرتے تھے، اُن کی نظمیں اور غزلیں نہایت پاکیزہ ہوتی تھیں اور ان میں اسلامی احساسات وجذبات کی ترجمانی ہوتی تھی، مگر اب شعروشاعری سے زیادہ رغبت نہیں رہ گئی تھی، تاہم ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے، جو طبع نہیں ہوسکا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے ان کو بڑا تعلق واخلاص تھا، یہ ان کے والد مرحوم کی یادگار بھی ہے، اور ان کی از اول تا آخر یہیں تعلیم بھی ہوئی تھی، اس لیے، وہ اس کی ہر خدمت کیلئے مستعد اور سرگرم رہتے تھے، اور اس کی ترقی کے لیے برابر فکرمند بھی رہتے تھے، کئی برس سے وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر بھی ہوگئے تھے، اور پابندی سے مجلس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، اور اس کی کارروائی اور مدرسہ کی تعمیر وترقی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتے تھے، انکی دلچسپی کی وجہ سے مدرسہ کی نظامت بھی پیش کی گئی مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا، بمبئی میں مدرسہ کی ایک موقوفہ جائداد میں اس کے متولی عرصہ سے بیجا تصرف اور ناجائز خرد برد کررہے تھے، بالآخر پرواز صاحب نے اس مسئلہ میں پوری دلچسپی لی اور منشی عبدالعزیز انصاری صاحب، مولانا مستقیم احسن اعظمی اور دوسرے خیرخواہان مدرسہ کے تعاون سے اسے ان کے تصرف سے نکالنے میں غیرمعمولی جدوجہد کی، حال میں مجلس انتظامیہ کے ارکان نے قرآن مجید کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور مدرسہ سے ان کی غیرمعمولی دلچسپی کی بناپر انھیں اجلاس کا ناظم مقرر کیا تھا، انھوں نے اس کے لئے ابتدائی تگ ودو بھی شروع کردی تھی کہ خود ان کا وقت آخر آگیا۔

ملی، قومی اور سیاسی سرگرمیوں سے انھیں نہ زیادہ دلچسپی تھی اور نہ وہ ان میں کوئی عملی حصہ لیتے تھے، تاہم مفید اور نیک کاموں میں تعاون سے دریغ بھی نہ کرتے تھے، ان کے گاؤں میں عیدگاہ کی تعمیر کا مسئلہ اٹھا تو انھوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا، حال میں شہر کے

بعض لوگوں نے ایک مسلم ہاسپٹل کی اسکیم بنائی ہے، وہ اسے قوم وملت کی ایک بڑی اور اہم ضرورت خیال کرتے تھے، اس لیے مسلم ہاسپٹل کے کارکنوں سے برابر رابطہ رکھتے اور انھیں مفید مشورے بھی دیتے۔

ان کے والد بزرگوار اپنے دور کے مشہور صاحب دل بزرگ حضرت چاند شاہ ٹانڈوی (متوفی ۱۳۱۱ھ) سے پہلے بیعت ہوئے ان کے انتقال کے بعد یادگار سلف حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی رائے بریلوی (متوفی ۱۳۲۹ھ) کی جانب رجوع کیا اور حضرت سید صاحب سے خلافت واجازت بھی حاصل کی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی، چند برس قبل وہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ملنے رائے بریلی گئے تو اپنے والد کے مرشد کے وطن اور مسکن کی زیارت کے لیے نصیر آباد بھی تشریف لے گئے۔ ان کو تصوف سے محض نظریاتی دلچسپی نہ تھی، بلکہ وہ اس راہ کے سالک بھی تھے، آٹھ، دس برس قبل وہ اس دور کے نامور شیخ طریقت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی کی خدمت میں حاضر ہو کر باقاعدہ ان سے بیعت ہوئے، اس کے متعلق جب میں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اصلاح باطن، تزکیۂ نفس اور نسبت مع اللہ پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ ان میں تقشف، اور گروہی عصبیت نہ تھی، طبیعت میں بڑا اعتدال اور توسع تھا، ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے،

وہ طبعاً خاموش، سنجیدہ، حلیم، بردبار، بے ضرر اور مرنجاں مرنج شخص تھے، نہ کسی کی ٹوہ میں رہتے اور نہ کسی کی غیبت وتنقیص کرتے، مردم آزاری اور ایذا رسانی کا ان میں کوئی مادہ ہی نہ تھا، طبیعت میں نرمی، مروت، ملاطفت اور شرافت تھی، کسی کے رویے سے تکلیف اور اس کے طرز عمل سے شکایت بھی ہوتی تو ضبط وتحمل سے کام لیتے، اور غصہ و برہمی کا اظہار نہ کرتے، ان میں تواضع وخاکساری تھی، ان کی کسی ادا سے رعونت و برتری کا

پتہ نہ چلتا تھا، انھیں خود نمائی اور خودستائی کی مطلق عادت نہ تھی، کبھی کوئی ایسی بات وہ کسی بھی طور پر اظہار نہیں ہوتا، نام ونمود، نمائش، ظاہر داری اور بناوٹ سے نفرت تھی، خود غرضی، ریا، منافقت اور رشک و حسد سے ان کا دل پاک صاف تھا، انکی زندگی نہایت سادہ اور تکلفات سے بری تھی بڑے قناعت پسند تھے جو کچھ میسر ہوتا اسی کو کافی سمجھتے اور اسی میں ہنسی خوشی گذر بسر کر لیتے، نہ کسی چیز کی ہوس ہوتی اور نہ کسی اعزاز و اکرام کی طلب، اس معاملہ میں ان کا مزاج بالکل صوفیانہ اور درویشانہ تھا، طبیعت میں غیرت و خودداری تھی، اس لئے دوسروں سے کوئی کام لینا اور کسی چیز کو طلب کرنا گوارا نہ تھا، اپنا ضروری کام بھی خود ہی کر لیتے تھے، خود تکلیف اٹھاتے مگر دوسروں کو آرام پہنچانے کی فکر رہتی، اللہ تعالےٰ نے انھیں کوئی اولاد نہ دی تھی، مگر اپنے عزیزوں اور متعلقین کی خبر گیری سے غافل نہ رہتے، اپنے ایک عزیز کی بچی کی پرورش کی، جو کچھ کمایا اس پر اور اس کے بال بچوں پر صرف کر دیا اور اپنے لیے کچھ بھی باقی نہ رکھا۔

نہایت وجیہ و شکیل، شایستہ اور باوقار شخص تھے، چہرہ بڑا پر نور تھا، اس سے متانت، سنجیدگی، طہارت، پاکیزگی اور معصومیت بھی ظاہر ہوتی تھی، سادہ لوحی اور معصومیت کی بنا پر بعض معاملات کی گہرائی تک انکی نظر نہ جاتی، اور خود غرض قسم کے لوگ ان سے اپنا مطلب حاصل کر لیتے۔ کسی قدر جذباتی بھی تھے، اور چونکہ لاگ لپیٹ اور رو رعایت کے عادی نہ تھے، اس لئے وقتی طور پر طبیعت میں اشتعال بھی پیدا ہو جاتا مگر نہ اس کا اثر دیر پا ہوتا، اور نہ کسی سے کینہ و کدورت رکھتے۔

اپنی نیکی، شرافت اور اخلاق و سیرت کی پاکیزگی کی بنا پر جہاں بھی رہے مقبول اور ہر دلعزیز رہے نہ کسی کو ان سے اور نہ ان کو کسی سے کوئی شکایت ہوئی، خداوندا اپنے اس نیک اور مقبول بندے کی مغفرت فرما اور اسے اعلیٰ علیین میں جگہ دے! آمین۔

مولانا عبدالرحمٰن پرواز کے مخلص دوست حکیم عبدالباقی نامی اعظمی کو ان کے انتقال پر بڑا ملال ہوا، اور انھوں نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ وفات کہا۔

صد حیف جو پرواز اپنا بے تکلف دوست تھا — اب چھوڑ کر یہ عالمِ رنج و محن جاتا رہا

جس سے قائم شام کا تھا لطف صحبت آدہ — اک ہمدمِ دیرینہ در چشم زدن جاتا رہا

برپا نہ کیوں ہو حشرِ غم اب انجمن در انجمن — ہیہات جو تھا رونقِ صدر انجمن جاتا رہا

اب بزم علم و فن نظر آئے نہ کیوں بے نورسی — جس سے روشن تھا چراغِ علم و فن جاتا رہا

بیتاب نامی نے کہا یوں مصرعِ سالِ وفات

اُب عالمِ دیں رونق افزائے سخن جاتا رہا

۴ ۸ ۱۹ ء

دارالمصنفین کی نئی کتاب

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

(جلد سوم)

اس سے پہلے اس کتاب کی دو جلدیں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں، پہلی جلد میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کے واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے لکھے گئے ہیں اور دوسری جلد میں اورنگ زیب سے پہلے کے مغل فرمانرواؤں اور سوری خاندان کے حکمرانوں کی مذہبی رواداری کے موثر واقعات درج ہیں۔

تیسری جلد میں مغل خاندان کے گل سر سبد شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری اور فراخ دلی معاصر تاریخوں کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے اورنگ زیب نے مختلف مندروں کی مدد اور ہندو پجاریوں کو جاگیر دینے کیلئے جو فرمان لکھے تھے، انکا اور وشواناتھ مندر کے انہدام کا قصہ بھی اس میں آگیا ہے،

قیمت:- ۳۰ روپے — مرتبہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ محمدی

(از ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی دہلی)

تاریخ محمدی مصنفہ میرزا محمد بن رستم مخاطب بہ معتمد خاں بن قباد مخاطب بہ دیانت خاں حارثی بدخشی دہلوی ایک اہم تاریخی دائرۃ المعارف ہے۔ اس میں ہجری سال کے شروع سے ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء تک کے چند ہزار اہم اشخاص کی وفات اور بعض تاریخی امور کا اجمالی ذکر ہے۔ یہی سال غالباً مصنف کی وفات کا سال ہے۔

اس تاریخی دستاویز کی جلد دوم کا چھٹا حصہ ہندوستان کے معروف عالم و محقق امتیاز علی عرشی صاحب مرحوم نے تصحیح و تحشیہ کے بعد شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔ اس حصے میں مصنف نے اپنے معاصر یعنی بارہویں صدی ہجری کے مختلف اہل علم، وزراء، امراء اور ان کے متعلقین کی وفیات کا سال بسال ذکر کیا ہے۔ عرشی صاحب مرحوم نے ایک سو چوالیس (۱۴۴) صفحات کے اس متن پر ستاسی صفحے کے حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ ان حواشی کی ترتیب میں چورانوے (۹۴) اہم منابع سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ اشاعت رضا لائبریری رامپور کے اس نسخے پر مبنی ہے جو بقول مرتب خود مؤلف کا کتابت کردہ ہے۔

یہ کتاب جہاں مصنف کی دقت نظری اور اعلیٰ علمی کوشش کی مظہر ہے وہاں مرتب کے تبحر علمی، وسیع معلومات اور محققانہ جد وجہد کا بین ثبوت بھی ہے۔ تاریخ محمدی کا وہ خطی نسخہ جو مرتب کے پیش نظر تھا ایک لحاظ سے ناقص ہے۔ اس میں چند جگہ نسخے کی کرم خوردگی کی بنا پر

پڑھے نہیں جاسکے۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے مرتب نے دوسرے دستیاب منابع سے مدد لی ہے۔ اس کے باوجود ابھی بعض مقامات پر الفاظ و عبارات پڑھی نہیں جاسکیں۔

راقم حروف نے حال ہی میں سیر المنازل کا فارسی متن مرتب کیا ہے۔ اس میں دہلی کی مختصر تاریخ، جغرافیہ اور یہاں کی تاریخی عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسے سنگین بیگ نے انیسویں صدی عیسوی میں تالیف کیا تھا۔ سیر المنازل کا یہ متن اور اس کا اردو ترجمہ ایک ہی جلد میں ایوان غالب نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ سیر المنازل کے حواشی کی ترتیب میں تاریخ محمدی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک مقام پر خود مطبوعہ تاریخ محمدی میں ایک مفقود نام کی نشاندہی بھی سیر المنازل کی مدد سے ہو گئی۔ یہ نام عرشی صاحب مرحوم کے پیش نظر خطی نسخے میں کرم خوردگی کی وجہ سے موجود نہیں۔ ان سطور میں اسی کی طرف اشارہ منظور ہے۔

مطبوعہ تاریخ محمدی کے صفحہ ۱۳۰ پر درج ذیل عبارت مرقوم ہے :

"..... بنت حسن بیگ مخاطب بصف شکن خاں، زوجۂ معزالدولہ حیدر قلی خاں بہادر ظفر جنگ و والدۂ پسرانش حیدر قلی خاں و جعفر قلی خاں، اوائل عشرۂ ثالثہ صفر در شاہجہان آباد فوت شد"

اس عبارت میں حسن بیگ مخاطب بصف شکن خاں کی لڑکی اور معزالدولہ حیدر قلی خاں کی زوجہ کی تاریخ وفات دی گئی ہے لیکن اس خاتون کا نام موجود نہیں جس کی تاریخ وفات درج کرنا مؤلف کا مقصد ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ محمدی کے درج بالا اقتباس میں حسن بیگ مخاطب بصف شکن خاں، معزالدولہ حیدر قلی خاں بہادر ظفر جنگ، حیدر قلی خاں اور جعفر قلی خاں کے نام ملتے ہیں۔

حسن بیگ مخاطب بعنایت خاں فرخ شاہ کے میر آتش تھے۔ یہ فرخ سیر اور جہاندار شاہ
کے درمیان ہونے والی جنگ کے دوران ۱۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴/۱۷۱۲ء میں مارے گئے[1]

"معز الدولہ حیدر قلی خاں بہادر ظفر جنگ" یہ خطاب آقا محمد رضا اسفراینی کو دیا گیا تھا، جو محمد شاہ کے میر آتش تھے۔ یہ نہایت سخت گیر انسان تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ خس خانے میں سوتے ہوئے کسی وجہ سے آگ سے جل گئے اور کچھ مدت بعد پچاس سال سے زیادہ زندہ رہ کر شب جمعہ ۱۴ رمضان ۱۱۴۶/ ۱۷۳۴ء کو شاہجہان آباد میں فوت ہوئے[2] چاندنی چوک دہلی میں مسجد فتح پوری کے نزدیک حویلی حیدر قلی آج بھی ایک محلے کا نام ہے۔ غالباً یہاں واقع حویلی انہی حیدر قلی کے نام سے موسوم رہی ہو گی۔

خود تاریخ محمدی میں معز الدولہ کے دو لڑکوں کی وفات کا ذکر موجود ہے۔ ان کا ایک لڑکا محمد عسکری، محمد شاہی امرا میں شامل تھا اور ۱۱۵۰/۸-۱۷۳۷ء کے اواخر محرم میں شاہجہان آباد میں فوت ہوا[3] ان کا دوسرا لڑکا محمد کاظم تھا۔ یہ بھی اپنے زمانے کا ایک امیر تھا اور فتح علی خاں بن ثابت خاں کے خلاف جنگ میں ۷ رجب ۱۱۵۱/۹-۱۷۳۸ء میں مارا گیا۔ بہرحال یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان دونوں میں بڑا لڑکا کون تھا۔ تاریخ محمدی کے درج بالا فارسی اقتباس میں معز الدولہ کے دو لڑکوں کے نام تحریر ہیں۔ ایک حیدر قلی خاں اور دوسرا جعفر قلی خاں۔ گمان غالب یہ ہے کہ تاریخ محمدی میں ایک دوسرے مقام پر مذکور (جہاں معز الدولہ کے دو لڑکوں کی وفات کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے اور درج بالا سطور میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے) معز الدولہ کے دو لڑکوں محمد عسکری اور محمد کاظم کو حیدر قلی خاں اور جعفر قلی خاں

---

[1] تاریخ محمدی، ص ۳۱ [2] تاریخ محمدی، ص ۶۲، منتخب اللباب، ج ۲، ص ۹۴۳، [3] مآثر الامرا ج ۳
ص ۶۷۶-۵۱۰، یہاں ان سے متعلق تفصیلی حالات تحریر ہیں، سیر المتاخرین، ج ۲، ص ۴۹۵

کے انتخابات سے نوازا گیا ہے۔

دہلی میں علاقہ موتیاں کھان کے عقب میں ایک بستی "حبش پورہ" ہے۔ اس آبادی میں ایک مسجد واقع ہے۔ اس میں درج ذیل کتبہ کندہ تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

"[illegible] ہجری برای ثواب بخشیدن نواب معزالدولہ بہادر و بی بی ارجمند خانم و نواب کاظم خان مرحوم۔ ہر کس کہ نماز بخواند ثواب باین سہ ارواح بخشد و ہر کہ خدمت اینجا قبول کند شرط این است: چیزیکہ در سال از اینجا پیدا شود، اول عرس نواب معزالدولہ بکند چہاردہم رمضان المبارک و عرس بی بی ارجمند خانم بکند ہفتم ماہ صفر و عرس نواب کاظم خان مرحوم ہفتم ماہ رجب۔ اگر برین شرط قبول کند و در خدمت عمل نکند بر وطلاق است و ہر روز چراغ تا فجر نشود و ہر شب جمعہ شیرینی گلمای تا تحرکند و مالک این مسجد و چاہ میرزا مہدی علی خان بہادر ولد نواب کاظم خان بہادر بن معزالدولہ بہادر، بی بی دیانت نسا خانم والدہ میرزا مہدی علی خان، خرچ اخراجات ہمہ در قبض و تصرف او شان است"[1]

تاریخ محمدی سے درج بالا اقتباس اور اس سے متعلق ضروری تشریحات کے پیش نظر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ سیر المنازل میں منقول اس کتبے کا تعلق آقا محمد رضا اسفرائینی مخاطب بہ معزالدولہ حیدر قلی خان بہادر ظفر جنگ سے ہے۔ دیگر قابل توجہ امر یہ ہے کہ معزالدولہ کی زوجہ کا نام بی بی ارجمند خانم تھا، جو تاریخ محمدی کے مطابق ۱۰۵۰ ہجری میں صفر کے اوائل عشرۂ ثالثہ میں فوت ہوئیں۔ فارسی کتبے کے مطابق ان کی تعلق تاریخ وفات ۷ صفر ہے۔ بہرحال مطبوعہ تاریخ محمدی میں معزالدولہ کی زوجہ کا نام کرم خوردگی کی نذر ہوگیا ہے جو اس کتبے کی مدد سے معلوم ہو جاتا ہے۔ علاوہ فارسی کتبے سے محمد کاظم خان کی بیوی بی بی دیانت نسا خانم اور ان کے لڑکے میرزا مہدی علی خان کے ناموں کا علم بھی ہوتا ہے۔

---

[1] سیر المنازل، سنگین بیگ، مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، ایوان غالب، ۱۹۸۲، ص ۵۲

ادبیات

غزل

از پروفیسر جگن ناتھ آزاد صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی

بدن کی خاک میں دل اس طرح پر نور رہتا ہے ۔ شرارہ جیسے قلب سنگ میں مستور رہتا ہے

عجب جلوہ ہے جو ہو کر قریب شہ رگ جاں بھی ۔ نگاہوں کی رسائی سے بہت ہی دور رہتا ہے

خوشا وہ دل کہ مالا مال ہے فرقت کی دولت سے ۔ وہی دل وصل کے عالم میں بھی مہجور رہتا ہے

تصور میں نہ آئے گا وہ جب تک کیسے جانوں گا ۔ مرے نزدیک رہتا ہے کہ مجھ سے دور رہتا ہے

اب اس سے کیا زیادہ مرتبہ درکار ہے اے دل! ۔ کہ تو ان کے حضور آکر بھی نا منظور رہتا ہے

صدف جب دے دیا ہے آنکھ کا پھر اور کیا مانگوں ۔ ہمیشہ موتیوں سے یہ صدف بھرپور رہتا ہے

درون دل جہاں ظلمات کی دولت عطا کر دی ۔ وہیں ظلمات میں روشن چراغ طور رہتا ہے

دیار حسن میں اے دل! وفا کی جستجو کیسی ۔ کہ یہ وہ ملک ہے جس کا یہی دستور رہتا ہے

خدا نے علم سے آزاد کو نا آشنا رکھا ۔ عجب انساں ہے لیکن جہل پر مغرور رہتا ہے

غزل

از ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر، رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی، بمبئی

ہر رنج، ہر الم کے طلب گار ہم ہوئے : ہم جیسے جنس غم کے خریدار کم ہوئے

مشفق ہوئے، شفیق ہوئے، محترم ہوئے ۔ حیرت ہے پھر بھی لطف کے قابل نہ ہم ہوئے

ہوں [illegible] خواہ کرم پر تو آج تک ۔ جو بھی ستم ہوئے وہ بنام کرم ہوئے

اپنے [illegible] زندہ پاؤ گے رسوا نہ تو ہوا ۔ بدنام بھی ہوئے تو زمانے میں ہم ہوئے

گردی لگا زبان کو نہ بیچے و ماغ و دل . تب جا کے لوگ صاحب لوح و قلم ہوئے
سر سے کفن جو باندھ کے میداں میں آ گئے . سر ہی کٹے نہ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پھر اعتبار اہلِ سیاست کا کر لیا
لو پھر شکارِ وعدۂ فردا کے ہم ہوئے

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب ایم اے ہنرلی چمپارن

آپ نے عزت کبھی بخشی کبھی رسوا کیا . شکریہ میرے لیے جو کچھ کیا اچھا کیا
عقل و اہم مکر و حیلہ میں الجھ کر رہ گئی . عشق نے دشواری منزل کو سر تنہا کیا
ان کی زلفوں سے بھی وہ پُر پیچ تر ہوتا گیا . جیسے جیسے گیسوئے قسمت کو سلجھایا کیا
میری بدنامی کا چرچا ہر طرف ہونے لگا . اس دلِ خود غرض نے جیسا کہا ویسا کیا
وادیٔ غربت میں میرا ہم سفر کوئی نہ تھا . اپنی بربادی کا منظر آپ ہی دیکھا کیا
وہ جفا کر کے سبب پوچھا رہے دل کے قرار . میں وفاؤں پر نگاہِ لطف کو ترسا کیا
ترکِ الفت پر وہ احساسِ پشیمانی کے بعد . مجھ کو سمجھایا کیے میں ان کو سمجھایا کیا
امتحاں گاہِ محبت میں سجے اللہ نے . دردِ دل دے کر برائے امتحاں پیدا کیا
اس کی عقل و آگہی پر ہے بہت حیرت مجھے . جو خدا کی خلق کو حاجت روا سمجھا کیا

میں نے ہی کھایا ہے ہر دم آشنائی کا فریب
اس نے تو وارث مجھے نا آشنا سمجھا کیا

مطبوعاتِ جدیدہ

الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند] مرتبہ مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۰۰، قیمت ۲۰ ل، س، پتہ: مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق، شام

مولانا حکیم سید عبد الحیؒ مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی نظر ہندوستان کے اسلامی عہد خصوصاً مسلمانوں کی علمی تاریخ پر بڑی وسیع اور عمیق تھی، انھوں نے اس موضوع پر تنہا کام کیا ہے، جس کو دوسرے ملکوں میں اکیڈمیاں اور متعدد اشخاص مل کر انجام دیتے ہیں، ہندوستان کے ہر اسلامی دور کے شعراء و مشائخ اور سلاطین و امراء کے متعدد تذکرے اور تاریخیں لکھی گئیں ہیں، لیکن یہاں کے علماء و فضلاء کے تذکرے اور ان کے کارناموں پر مستقل کتابیں کم لکھی گئی ہیں، مولانا نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نزہۃ الخواطر کی آٹھ جلدوں میں علمائے ہند کے تراجم لکھے، اور اس کے مقدمہ کے طور پر یہ کتاب لکھی جو ہندوستانی علماء و مصنفین کی مختلف النوع تصنیفات کی ایک جامع فہرست ہے، انھوں نے اس میں صرف کتابوں کے نام درج کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ہر علم کی تعریف اور اس کی مختصر تاریخ بھی تحریر کی ہے، اور دنیائے اسلام میں اس موضوع پر جو مستند و معروف کتابیں لکھی گئی ہیں، پہلے ان کا ذکر کیا ہے، اور آخر میں ہندوستانی علماء کی عربی، فارسی، اور اردو تصانیف کا تذکرہ کیا ہے، شروع میں ہندوستان کے قدیم نصاب درس کا خاکہ اور اس میں ہونے والی عہد بہ عہد ترقی و تبدیلی کا ذکر کیا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی وہی حیثیت ہے جو ابن الندیم کی الفہرست، طاش کبری زادہ کی مفتاح السعادۃ اور ملا کاتب چلپی کی کشف الظنون

کی بھی اور اس سے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی، تعلیمی اور ذہنی و فکری تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں المجمع العلمی العربی دمشق سے شایع ہوئی تھی، جس کا نام تبدیل ہوکر اب مجمع اللغۃ العربیہ ہو گیا ہے، ۱۹۶۹ء میں دارالمصنفین سے اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" کے نام سے بھی چھپ چکا ہے، اب اس کا دوسرا عربی ایڈیشن بھی دمشق ہی سے شایع ہوا ہے، جس کے آخر میں مصنف مرحوم کے لایق و فاضل فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولوی شمس تبریز خاں صاحب کے تعاون سے ایک ضمیمہ کا اضافہ بھی کیا ہے، اس میں ہر فن کی ان کتابوں کا ذکر ہے، جو مصنف کے بعد مرتب کی گئی ہیں، اس سے یہ کتاب "اپ ٹو ڈیٹ" ہوگئی ہے، اور اس کا فائدہ بھی بڑھ گیا ہے،

صاعقۂ طور مرتبہ جناب تاج پیامی صاحب، لکچرر شعبۂ جغرافیہ ایچ۔ ڈی، جین کالج آرہ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۳۲، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت ۵ روپیہ ناشر۔ اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد ۳،

پروفیسر کلیم الدین احمد اردو کے مشہور اور بڑے نقاد بلکہ بہار میں فن تنقید نگاری کے امام سمجھے جاتے تھے، مگر ان کی زندگی ہی میں ان پر سخت تنقیدیں ہونے لگی تھیں، یہاں تک کہ خود بہار کے بعض ادیبوں و نقادوں نے انہیں ہر اعتبار سے تہی مایہ اور فن تنقید سے نابلد قرار دینا شروع کیا، اور انھوں نے ان کی تحریروں میں زبان و بیان کے اغلاط بھی دکھائے، اکتوبر ۸۳ء میں ہفتہ سہیل گیا نے ان کے متعلق ایک خصوصی شمارہ شایع کیا، جس میں بہار کے ایک برگزیدہ و باوقار اہل قلم پروفیسر سید محمد محسن سابق صدر شعبۂ نفسیات پٹنہ یونیورسٹی کے کئی مضامین شایع ہوئے تھے، جن میں ان کی ادبی و تنقیدی خامیوں، زبان و بیان کے اغلاط یہاں تک کہ اخلاقی کمزوریوں

کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ جناب تاج پیامی کی زیر نظر کتاب میں بھی کلیم الدین صاحب کے تنقیدی نظریات کو مضحکہ خیز اور باطل قرار دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ان کی زندگی ہی میں شائع ہوگئی تھی مگر اس پر تبصرہ کی گنجائش اب نکلی۔ یہ تیرہ مضامین پر مشتمل ہے اور ہر مضمون میں کلیم الدین کے انتہاپسندانہ تنقیدی نظریات اور اردو شعراء، اردو شاعری خصوصاً غزل کے بارے میں ان کے الزامات کا تجزیہ کرکے کلیم صاحب کی غلطی، بے راہروی اور غیر ذمہ داری ثابت کی گئی ہے۔ پہلے مضمون کی حیثیت مقدمہ کی ہے۔ اس میں ان کی تنقید کو یکسر تخریبی ثابت کیا گیا ہے، اس کے بعد کے مضامین میں ان کے مندرجۂ ذیل اعتراضات پر بحث وگفتگو کرکے ان کی مدلل تردید کی گئی ہے، اردو شاعری فارسی کی کورانہ تقلید ہے، ہر لفظ، ہر بندش، ہر قاعدہ اور ہر صنعت کیلئے سند کی تلاش اردو کی ترقی اور اس میں جدت طرازی کے لیے سدراہ بنی، انسان کو اصول کا پابند سمجھنا محض اختراع ہے، ادب و معاشرہ میں تعلق نہیں، غزل پر بحث کے لیے ہندوستان کے سماجی، سیاسی، روایتی، لسانی وغیرہ پس منظر کو زیر بحث لانا غیر متعلق بات ہے، اردو شاعری محض قافیہ پیمائی کے مترادف ہے، اردو شعراء شاعرانہ خوبیوں سے نابلد ہیں، میر، سودا، درد، مومن، ذوق اور غالب اگر نظمیں کہتے تو بڑے شعراء ہوسکتے تھے، مسدس حالی شعریت سے اچھی نثر سے خالی ہے، اکبر کا نظمیں نہ لکھنا اور اپنا وقت مفرد اشعار اور دو شعروں کے قطعوں پر برباد کرنا اور جوش کا الفاظ کا کھوکھلا ڈھول ندرشور سے بجانا، اردو شعراء کی کردار کشی یعنی کلیم الدین کا ان پر عشق سادہ رویاں، ہوس پرستی، اوباشی اور رندی و میخواری کا الزام، اردو غزل میں کوئی خاص مسلسل مضمون نہ بیان کرنا، غزل کو غیر مہذب، نیم وحشی اور مبتذل ترین صنف قرار دینا، اور اس میں ربط، ارتقائے خیال اور مکمل تجربہ کا نہ ہونا۔ مصنف کے نزدیک کلیم الدین صاحب کے الزامات کا بنیادی اور اصلی سبب ان کی مغرب سے مرعوبیت ہے

اس لیے جواب کی تائید کے لیے انگریزی ادیبوں کے حوالے اکثر دیئے گئے ہیں۔ کلیم الدین مرحوم چونکہ انگریزی ادب و شاعری کو اصل معیار سمجھتے تھے، اور اسی کسوٹی پر اردو شاعری کو بھی پرکھتے تھے، اس لیے مصنف نے خود انگریزی شاعری میں بھی اسی قسم کے جھول اور نقص دکھلائے ہیں جو کلیم الدین صاحب کو اردو شاعری میں نظر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو شاعری کو انگریزی شاعری کے مقابلہ میں فائق اور مہذب بھی ثابت کیا ہے، اس ضمن میں اردو شاعری خصوصاً غزل کی گوناگوں خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، اور اس کی دروں بینی، معنی آفرینی اور اس کے اعجاز و ایجاز کا کمال بھی دکھایا ہے۔ اردو زبان کے شہ پاروں اور اس کے ادیبوں اور شاعروں کو کمتر بناکر پیش کرنے کی کلیم الدین صاحب کی کوششوں کا تحلیل و تجزیہ ہی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مصنف نے جا بجا ان پر کوتاہ بینی، حقائق سے چشم پوشی، ان کی علمی تہی مائیگی اور تنقیدی صلاحیت کے فقدان کا الزام بھی عائد کیا ہے، مثلاً کلیم الدین احمد کا انگریزی ادب میں کوئی مقام نہیں (ص ۱۱) حالی نے انگریزی زبان کی کتابوں کے ترجمہ سے جتنا کچھ حاصل کر لیا تھا، کلیم الدین انگریزی زبان کے پروفیسر ہو کر بھی حاصل نہ کر سکے (ص ۱۳) کلیم الدین احمد انگریزی ادب خاص کر اس کی رومانی شاعری کو چھوڑ کر دوسرے علوم و فنون سے قطعی واقف نہیں (ص ۲۵) وہ علم عمرانیات، علم نفسیات، علم جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ سیاسیات اور خاص کر علم لسانیات سے بالکل ناآشنا ہیں (ص ۲۵) وہ انسانی تہذیب و تمدن، قوموں کے عروج و زوال اور زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے اسباب اور اثرات سے بھی بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں، جبکہ ایک ناقد کو ان ساری باتوں کا علم ہونا چاہیے (ص ۲۵) ان کے اندر فہم و ادراک اور غور و فکر کی بھی کمی ہے، اور وہ انگریزی رومانی شاعری کے علاوہ دیگر علوم و فنون سے بھی قطعی واقف نہیں (ص ۶۳) انہوں نے ہمالیائی، تاریخی اور ادبی غلطیاں کی ہیں (ص ۶۹)

کلیم الدین احمد اپنی قیمت سے کی بات سے بلند ہو کر کم نہیں سوچتے ، اس لیے جس منزل تک
قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں ، لوگوں نے انہیں سنبھالنے کی کوشش بھی کی ، مگر وہ گرنے پر مصر
رہے (ص ۱۱۳) ، انہوں نے اپنی تنقید کے لیے خود کوئی اصول وضع نہیں کیا ، دوسرے ناقدین
کے وضع کردہ اصولوں کو اپنی تنقید کے لیے بروئے کار لاتے ہیں (ص ۱۲) ، عربی ، فارسی اور
اردو زبان کے ناقدوں کے ذریعہ وضع کردہ اصولوں کی طرف سے چشم پوشی ہی نہیں کی ہے
بلکہ ان میں زبردستی کیڑے بھی نکالے ہیں (ص ۱۱) ، انگریزی اور فرانسیسی ناقدوں کے اصولوں
کو پیش نظر رکھ کر تنقید کی ہے (ص ۱۲) ، وہ مغربی ناقدین کے خوشہ چیں رہے بلکہ [illegible] (ص ۱۳)
وہ انگریزی شاعری ہی کو معیار شاعری سمجھتے ہیں (ص ۹) ، وہ اردو زبان کے بڑے ناقد نہیں
(ص ۱۳) ، وہ تنقید کے بنیادی اصول سے بھی واقف نہیں (ص ۲) ، ان کے اندر ناقدانہ
صلاحیتوں کا بھی فقدان ہے (ص ۹) ، ان کے اندر تنقیدی صلاحیت کا سخت فقدان
ہے (ص ۱۱۶) ، کلیم الدین تنقیدی اصول جانتے ضرور ہیں مگر اس کی روح سے ناآشنا ہیں (ص ۱۴۹)
کلیم الدین کا تنقیدی شعور اتنا بالیدہ اور ترقی یافتہ نہیں کہ وہ شاعری اور قافیہ پیمائی میں
امتیاز کر سکے (ص ۱۱۲) ، حالی کلیم الدین کے مقابلہ میں تعمیری اور صالح تنقیدی شعور رکھتے
تھے ، انہیں نثر اور شعر کی پہچان کلیم الدین سے بہتر تھی (ص ۱۵۱) ، کلیم الدین کے یہاں تضاد
کی کمی نہیں (ص ۱۴) ، انہوں نے سوائے اپنے والد عظیم الدین اور اپنی ذات کے کسی کو نہیں چھوڑا
(ص ۲۱) ، وہ غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہیں اس لیے غیر ذمہ دارانہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں ،
(ص ۳۵) ، اردو شعراء پر ان کا تن آسانی کا الزام لگانا حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے ،
انہوں نے خود تن آسانی سے کام لیا ، اور بغیر غور و فکر سے کام لیے ایک غلط بات کہہ دی (ص ۳۶) ،
حالی کے متعلق کلیم الدین کا یہ نامہ زمانہ جملہ خود کلیم الدین پر لفظ بہ لفظ صادق آتا ہے کہ "خیالات

واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر وادنی، دماغ و شخصیت اوسط، یہ ہے کلیم الدین کی کائنات" (ص ۱۶) اور یہ سب محض دعوے نہیں ہیں، بلکہ پوری کتاب میں انکی مفصل و مدلل وضاحت ہے، جناب تاج پیامی جغرافیہ کے لکچرر ہیں، مگر اردو شعر و ادب اور تنقید نگاری سے بھی ان کو دلچسپی ہے، اور انگریزی ادب پر بھی ان کی اچھی نظر ہے، انہیں اپنی بات کو مدلل طور پر منطقی انداز میں پیش کرنے کا اچھا سلیقہ بھی ہے، مگر پتہ نہیں کیوں انھوں نے اس کی بار بار معذرت کی ہے کہ یہ کتاب "میں نے کلیم الدین احمد کی مخالفت میں نہیں لکھی ہے، بلکہ اردو زبان، اس کے شعراء اور اسکی شاعری کی حمایت میں لکھی ہے" نتیجہ کے لحاظ سے دونوں باتیں تو یکساں ہی ہیں، بعض لفظوں کا املا غلط درج ہے، جیسے ہدی خوانی ص ۲۶ (حدی خوانی) اخترا ص ۱۶۳ (اختراع)، توجیح ص ۲۴ اور ص ۱۳ (توجیہ) سلسلۂ نصب ص ۱ (سلسلۂ نسب) بزعم خود ص ۲۱۵ (بزعم خود) مندرجۂ ذیل جملہ میں ہندی کا خط کشیدہ لفظ اردو میں بالکل نامانوس معلوم ہوتا ہے، "ایک نہیں انیک مضامین باندھے ہیں"، کتاب کی قیمت بہت زیادہ ہے،

سفر نامۂ ہند۔ مولانا محمد یوسف قریشی تقطیع اوسط، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۱۶، قیمت پندرہ روپیے، پتہ:۔ موتمر المولفین، جامعہ اشرفیہ، پشاور، پاکستان،

مولانا محمد یوسف قریشی شیخ الحدیث و مہتمم جامعہ اشرفیہ پشاور ۱۹۸۰ء میں دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت کے لیے ہندوستان تشریف لایے تھے، یہ کتاب ان کے اسی سفر کی روداد ہے، اس میں اجلاس کی مختصر کارروائی بھی درج ہے، اور دار العلوم دیوبند کے قیام، اس کی عمارتوں، اس کے اصول ہشتگانہ اور اس کی صد سالہ خدمات کا مختصر خاکہ بھی دیا ہے، اور دار العلوم سے وابستہ مندرجۂ ذیل حضرات کے حالات اور کارنامے بھی بیان

گئے ہیں، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حاجی سید عابد صاحب، مولانا محمد یعقوب، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا قاری محمد طیب، مولانا اسعد مدنی، مصنف دیوبند کے علاوہ سہارنپور، گنگوہ، تھانہ بھون، میرٹھ، دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری بھی گیے، اور سب جگہوں کی قابل ذکر عمارتوں، باغوں، مسجدوں، مقبروں، قلعوں، صنعتوں اور وہاں کے مشاہیر کا مختصر تذکرہ بھی لکھا ہے، سہارنپور کے سفرنامہ میں مدرسہ مظاہر علوم، اس کی عمارتوں اور خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد مولانا خلیل احمدؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے حالات و خدمات قلمبند کیے ہیں، گنگوہ کے سلسلہ میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، اور تھانہ بھون کے ضمن میں مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا ذکر کیا ہے، قابل دید عمارتوں کے عکس بھی دیئے گیے ہیں، اس طرح یہ سفرنامہ دلچسپ معلومات پر مشتمل ہے، اس سے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ پاکستان میں ہندوستان سے زیادہ گرانی اور دفتروں میں بدعنوانی ہے،

سرگذشت آصف :- مرتبہ پروفیسر ہارون الرشید صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۸۰ مع رنگین جلد، قیمت ۱۲ روپے،

ناشر :- مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۷۔ سندری موہن ایونیو، کلکتہ ۱۴ سی،

رضا علی وحشت کے تلمیذ رشید جناب عبد الرحمٰن آصف بنارسی مرحوم کی عمر کا بڑا حصہ کلکتہ میں بسر ہوا، آخر میں ڈھاکہ گیے اور وہیں ۱۹۵۸ء میں آسودہ خاک ہوئے۔ وہ بڑے پرگو، خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے، مگر گوشہ نشینی، طبعی بے نیازی اور نام و نمود سے بیزاری کی وجہ سے نہ ان کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی، اور نہ مجموعۂ کلام شایع ہوا، اب پروفیسر ہارون الرشید صاحب مقیم ڈھاکہ نے ان کی سرگذشت شایع کی ہے، اس میں انھوں نے ان کے حالات اور زندگی

سیرت و شخصیت کے خط و خال بھی نمایاں کیے ہیں، اور ان کی شاعری پر تبصرہ کرکے اس کی خصوصیات بھی دکھائی ہیں، اس کے آخر میں آصف کے کلام کا ایک مختصر انتخاب بھی درج ہے، جو خود انہوں نے تحریک کے لائق مرتب کے حوالہ کیا تھا، یہ اٹھارہ غزلوں اور سات رباعی پر مشتمل ہے، آصف صاحب کا کلام طرز قدیم کا حامل ہے، اس لیے یہ موجودہ دور کی شاعری کی بے اعتدالی، ناہمواری اور ابتذال سے پاک ہے، اور اس میں زبان اور محاوروں کی صحت کا لحاظ کرنے کے علاوہ مضمون آفرینی بھی کی گئی ہے، اور یہ لطف و اثر سے بھی خالی نہیں ہے، مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے قدمت ادب کے سلسلے سے یہ سرگذشت شایع کی ہے، جس کے لیے وہ قابل ستایش ہے، صفحہ ۲۵ پر دو جگہ اجرہ کو بره لکھا ہے، شاید یہ کتابت کی غلطی ہے،

محسوسات و معقولات ، مرتبہ جناب حمد اللہ فراہی علیگ، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۶۸، قیمت آٹھ روپیہ پچھتر پیسے پتہ (۱) مسکین بکڈپو ایم ڈی روڈ جے پور (۲) ہجوم بکڈپو، ۱۳۳۳-A ذاکر نگر، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔

حکیم ڈاکٹر حمد اللہ فراہی لکچرر راجستھان یونانی میڈیکل کالج جے پور ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی کے پوتے اور ذی صلاحیت نوجوان ہیں، انہوں نے طب یونانی کے فروغ، اسکی قدیم تحقیقات کو نئے انداز میں اردو لٹریچر میں پیش کرنے، طلبہ کے کورس کیلئے معیاری طبی کتابوں اور ایک طبی جریدہ کی اشاعت کیلئے جے پور میں سائنٹفک طبی ریسرچ سنٹر قائم کیا ہے، یہ کتاب سنٹرل کونسل انڈین میڈیسن کے تیار کردہ نصاب کے مطابق پری طب کیلئے لکھی گئی ہے، اس میں حکمت و منطق کی اہمیت اور انکے مبادی و مصطلحات کی تعریف و توضیح مثالوں کے ذریعہ کی گئی ہے، اور چونکہ کتاب طب کے طلبہ کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے، اس لیے مثالیں بھی عموماً اسی کی دی گئی ہیں، یہ موضوع خشک ہے لیکن نوجوان مصنف نے اسکو تر بنانے کی کوشش بھی کی ہے، اور تفہیم کا جدید طریقہ اور دلنشین انداز اختیار کیا ہے، اور جدید اور انگریزی اصطلاحیں

کے بالمقابل تحریک علی ہی، مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے مگر اپنے موضوع پر اچھی ہے [illegible] مطالعہ کے لائق ہے، اس سے ان کے چھوٹی سے مباحث کو سمیٹ کر لکھنے کے بہتر نشانات پتہ چلتا

اسلامی انقلاب، مخالف قوتیں اور مسلمان } مرتبہ جناب سید علی صاحب متوسط تقطیع کاغذ [illegible] و طباعت عمدہ، صفحات سو، قیمت پانچ روپے،

پتہ:- مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی،

اس کتاب میں اسلامی انقلاب کی موجودہ لہر اور اسکی مخالفت و مزاحمت کا جائزہ لیا گیا ہے، اس سلسلہ میں ایران کے انقلاب پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے عزم اور افغانستان میں مجاہدوں کی سرفروشی کا حال بیان کیا گیا ہے ضمناً مصنف نے کئی مسلم ملکوں میں اسلامی تحریکوں اور مسلمانوں کی اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کا تذکرہ کیا ہے اور یورپ کے ملکوں میں بھی مسلمانوں کی دینی بیداری کا ذکر کیا ہے، اور جن گوشوں سے اور جو عناصر اسلامی انقلاب میں رخنہ انداز رہے ہیں، انکی نشاندہی کی ہے، ایران کے جائزہ میں شاہ ایران کی بے تدبیری، اسلام دشمنی اور امریکہ نوازی وغیرہ کا ذکر کیا ہے جس کے نتیجہ میں عوامی بیداری اور اسلامی تحریک برسرِ کار آئی، انقلاب کے بعد کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ ہر انقلاب کی طرح اس انقلاب کے بعد بھی مسائل و مشکلات پیدا ہوگئے جنکو حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، مگر اسلام دشمن عناصر اس کے خلاف بے بنیاد پروپگنڈہ کر کے لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں پاکستان کے ذکر میں جناب ضیاء الحق سے قبل کے ابتر حالات اور انکی اسلام کو غالب کرنیکی مخلصانہ جدوجہد اور انکی راہ کی رکاوٹوں کا جائزہ لیا ہے، پھر افغانستان میں مجاہدین کی انقلابی سرگرمیوں اور روسی مظالم کا ذکر ہے، اسلامی انقلاب کے خلاف ہونیوالی سرگرمیوں اور خطرناک سازشوں کے سلسلہ میں کمیونزم، مغرب کے سامراجی نظام اور یہودی صیہونیت کا ذکر کیا ہے، ہندوستان کی جماعت اسلامی کی مخالفت میں کمیونسٹ اور بعض دوسری پارٹیوں کے طرزِ عمل اور انکی سازش کے شکار مسلمانوں کے رویے پر بھی بحث کی ہے، اور آخر میں بتایا ہے کہ اسلامی انقلاب کے سلسلہ میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہیئے، یہ کتاب دلسوزی اور اسلام کی خیرخواہی کے جذبہ سے لکھی گئی ہے مگر اسکا انداز تحریر جذباتی ہوگیا ہے،

ض''